خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

خواتین ڈائجسٹ

دسمبر 2017



دسمبر 2017

جلد 45 شمارہ 8

قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اُردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

مدیرہ

کہی سُنی

دسمبر کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

دسمبر سالِ رواں کا آخری مہینہ۔ کچھ دن گزریں گے یہ سال بھی ماضی کا حصّہ بن جائے گا۔ سچ ہے کہ وقت ٹھہرتا ہے نہ ٹھہرنے دیتا ہے۔ انسانی زندگی پہلے سانس سے آخری سانس تک تغیر و تبدّل سے گزرتی فنا کی منزلوں تک جا پہنچتی ہے۔ کامیاب وہی ٹھہرتے ہیں جنہوں نے نیک اعمال کیے اور سیدھے راستے پر چلے۔

سالِ گزشتہ وطنِ عزیز کے حوالے سے کوئی خوش کن منظر تشکیل نہ دے سکا۔ سیاسی اُتار چڑھاؤ نے کرب، بے چینی اور اضطراب میں اضافہ کیا۔

خدا خدا کرکے ملک میں امن و امان کی صورتِ حال بہتر ہوئی تھی۔ دہشت گردی اور بم دھماکوں میں کمی آئی تھی۔ کراچی کی روشنیاں بحال ہوئی تھیں۔ ملک میں معاشی استحکام کی امید پیدا ہوئی تھی کہ ایک بار پھر وہی صورتِ حال ہے۔ اس ملک پر جانے کس آسیب کا سایہ ہے کہ دو قدم آگے بڑھتے ہیں، چار قدم پیچھے چلے جاتے ہیں۔

لسانی، صوبائی تعصبات ہی کم نہ تھے کہ اب عقائد کی بنیاد پر بھی تقسیم کی جارہی ہے۔ دُکھ کے سائے بہت گہرے ہو چلے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم پر رحم فرمائے۔ آمین۔

سالِ نو سروے،

جنوری کا شمارہ سالِ نو نمبر ہوگا۔ سالِ نو نمبر میں حسبِ روایت قارئین سے سروے بھی شامل ہوگا۔ سوالات یہ ہیں۔

① سپاٹ سے گزرتے شب و روز میں کچھ باتیں، کچھ یادیں، کچھ تعریفی جملے، کچھ محبتیں ہمیشہ زندگی میں گلاب بن کر مہکتی ہیں۔ جگنو کی طرح ذہن کے پردے پر جھلملاتی ہیں۔ سالِ گزشتہ کی کوئی یاد، کوئی بات، کوئی خوش کن جملہ، کوئی سراہتی نظر، کوئی معصوم سی شرارت۔ جو آپ کی یادوں کا حصّہ ہو۔

② زندگی میں ہم اچھے، بُرے بہت سے کام کرتے ہیں۔ کچھ کام ایسے ہوتے ہیں جنہیں کرکے ہمیں اطمینان اور ذہنی سکون کا احساس ہوتا ہے۔ کوئی ایسا کام لکھیں جو آپ نے بے لوث صرف دوسروں کی خوشی کے لیے کیا ہو۔

③ سنہ 2017 میں بہت سی تحریریں آپ نے پڑھیں۔ کوئی ایسا جملہ جو آپ کے دل کو چھو گیا۔ آپ کو بہت اچھا لگا۔

ان سوالات کے جوابات اس طرح بھجوائیں کہ 22 دسمبر تک ہمیں موصول ہو جائیں۔

سانحہ ارتحال،

ہماری دیرینہ ساتھی خالدہ جیلانی کے بھانجے جمال صدیقی جو انہیں بیٹوں کی طرح عزیز تھے، اس دارِ فانی کو الوداع کہہ گئے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ہ

اللہ تعالیٰ سے دعاگو ہیں کہ جمال صدیقی کی مغفرت فرمائے اور ان کے متعلقین کو صبرِ جمیل سے نوازے۔ آمین۔

اس شمارے میں،

- سائرہ رضا کا مکمل ناول۔ حسن المآب، ، فرزانہ کھرل کا مکمل ناول۔ تھم گیا شورِ جنوں،
- نمرہ احمد اور آمنہ ریاض کے ناول، ، راشدہ رفعت اور افشین نعیم کے ناولٹ،
- ایمل رضا، تہمینہ چودھری، شازیہ الطاف ہاشمی، عندلیب زہرا اور عنبرین اعجاز کے افسانے،
- ای این ٹی اسپیشلسٹ ڈاکٹر عمر فاروق سے ملاقات، ، ٹی وی فنکارہ حبہ عزیز سے باتیں،
- کرن کرن روشنی۔ احادیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- نفسیاتی ازدواجی اُلجھنیں اور عدنان کے مشورے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

دسمبر کا شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ آپ کی رائے کے منتظر ہیں۔ ہمیں خط لکھ کر ضرور بتائیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دینِ اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امتِ مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگانِ دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

بدترین حاکم

حضرت عائذ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ عبیداللہ بن زیاد کے پاس گئے اور ان سے کہا۔

”اے بیٹے! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ۔

”بدترین حاکم، رعایا پر ظلم کرنے والے ہیں، لہذا تو اس سے بچ کہ تو ان میں سے ہو۔“ (بخاری و مسلم)

اس میں ظالم حکمرانوں کے لیے وعید اور سخت تنبیہ ہے۔

حضرت ابومریم ازدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے۔

”جسے اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے کچھ امور کا والی بنائے اور وہ ان کی ضرورتوں، حاجتوں اور فقر کے درمیان آڑے آجائے (یعنی انہیں پورا نہ کرے) تو اللہ تعالیٰ بھی روز قیامت اس کی حاجت و ضرورت اور فقر کے درمیان آڑے آجائے گا۔“

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے (یہ حدیث سن کر) ایک آدمی کو لوگوں کی حاجات معلوم کرنے کے لیے مقرر فرما دیا۔ (اسے ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔)

فوائد و مسائل :

1- آڑے آنے کا مطلب ہے کہ حکمران اہل حاجات کو اپنے تک پہنچنے نہ دے اور خود ان کے مسائل و معاملات پر توجہ نہ دے۔

2- اللہ کے آڑے آنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ بھی روز قیامت اس کی کوئی پروا نہیں کرے گا جب کہ انسان اس روز اللہ کی رحمت کا سب سے زیادہ محتاج ہوگا۔

3- اس میں ایسے حکمرانوں کے لیے سخت وعید ہے جو ضرورت مند عوام سے براہ راست رابطہ نہیں رکھتے اور نہ انہیں اپنے دروازوں تک آنے دیتے ہیں۔

منصف حکمران

اللہ تعالیٰ نے فرمایا : ”بے شک اللہ تعالیٰ عدل و انصاف اور احسان کرنے کا حکم دیتا ہے۔“ (النحل۔90)

اور فرمایا : ”اور تم انصاف کرو، یقیناً اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔“ (الحجرات۔9)

انصاف کرنے والے

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”بے شک انصاف کرنے والے اللہ کے پاس نور کے منبروں پر ہوں گے۔ (یعنی) وہ لوگ جو اپنے حکم میں، اپنے گھر والوں کے بارے میں اور ان کاموں میں جو ان کے سپرد ہیں، انصاف کا اہتمام کرتے ہیں۔“ (مسلم)

فائدہ :

1۔ نور کے منبر کس طرح ہوں گے؟ اس کی اصل حقیقت سے گو ہم واقف نہیں ہیں، تاہم اس کی حقیقت پر ایمان رکھنا ضروری ہے اور یہ بھی کہ یہ لوگ یقیناً عرش یا رحمت الٰہی کے سائے تلے ہوں گے جبکہ لوگ پسینے میں ڈوبے ہوئے ہوں گے۔

2۔ اس میں عدل و انصاف کی فضیلت اور انصاف کرنے والوں کا مرتبہ بیان کیا گیا ہے۔

حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ ”تمہارے بہترین حکمران وہ ہیں جن سے تم محبت کرو اور وہ تم سے محبت کریں، تم ان کے حق میں دعائے خیر کرو اور وہ تمہارے حق میں دعائے خیر کریں۔ اور تمہارے بدترین حکمران وہ ہیں جنہیں تم ناپسند کرو اور وہ تمہیں ناپسند کریں، تم ان پر لعنت کرو، وہ تم پر لعنت کریں۔“

راوی بیان کرتا ہے کہ ہم نے کہا۔

”اے اللہ کے رسول! کیا ہم ان کی بیعت توڑ کر ان کے خلاف بغاوت نہ کریں؟“

آپ نے فرمایا : ”نہیں، جب تک وہ تمہارے اندر نماز قائم کرتے رہیں۔ نہیں، جب تک وہ تمہارے اندر نماز قائم کرتے رہیں۔“ (مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ اس میں دونوں قسم کے حکمرانوں کی نشاندہی کر دی گئی ہے۔ ایک وہ حکمران جو عوام کے خیر خواہ اور انہیں عدل و انصاف مہیا کرنے والے ہیں۔ یہ بہترین حکمران ہیں۔ ان کے لیے عوام دعائیں کرتے ہیں اور یہ عوام کے لیے کرتے ہیں۔ اور دوسرے بدترین حکمران، جنہیں صرف اپنے اقتدار اور مفادات سے غرض ہوتی ہے۔ عوام کو عدل و انصاف مہیا کرنے اور ان کی مشکلات حل کرنے سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی، سب لوگ ان پر لعنت بھیجتے ہیں۔ اس میں بھی حکمرانوں کو دراصل عدل و انصاف کرنے کی ترغیب دی گئی ہے کیونکہ عنداللہ و عندالناس محبوب بننے کا یہی طریقہ ہے۔

2۔ ظالم حکمران بھی جب تک کفر صریح کا ارتکاب نہ کریں اور شعائر اسلام بالخصوص نماز کی پابندی کریں، ان کے خلاف خروج و بغاوت کی اجازت نہیں کیونکہ بغاوت میں فائدہ موہوم ہے جب کہ نقصان بہت زیادہ ہے۔

جنتی

حضرت عیاض بن حمار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ۔

”تین قسم کے لوگ جنتی ہیں : ایک وہ حکمران جو انصاف کرنے والا اور اعمال خیر کی توفیق سے بہرہ ور ہو۔

دوسرا وہ آدمی جو ہر مسلمان اور رشتہ دار کے لیے مہربان اور نرم دل ہو۔

تیسرا مانگنے سے گریزاں وہ شخص جو عیال دار ہونے کے باوجود سوال سے بچنے والا ہو۔“ (مسلم)

فائدہ : یہ تینوں مذکورہ صفات اہل ایمان کی خاص صفات ہیں جو ایک مومن کو جنت میں لے جانے کا باعث ہیں۔ ہر مومن کو ان صفات حسنہ سے آراستہ ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔

حکمران کی اطاعت

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

”اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان کی جو تمہارے حکمران ہیں۔“ (النساء۔59)

فائدہ آیت:

1۔ اللہ اور رسول دونوں کے ساتھ لفظ اطاعت کے ذکر سے اس بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ ان دونوں کی اطاعت مستقل بالذات ہے۔ جس کا مفاد یہ ہے کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ پر عمل کرنا واجب ہے جبکہ مسلمان حکمرانوں کی اطاعت مستقل نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع ہے۔ اس لیے ان کا جو حکم قرآن و حدیث کے موافق ہوگا، اس میں ان کی اطاعت لازم اور جو حکم ان کے مخالف ہوگا اس کی اطاعت غیر لازم ہوگی

اطاعت کی حدود

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”مسلمان مرد پر (اپنے مسلمان حکمران کی بات) سننا اور ماننا فرض ہے، وہ بات اسے پسند ہو یا ناپسند، مگر یہ کہ اسے گناہ کرنے کا حکم دیا جائے۔ چنانچہ جب اسے اللہ کی نافرمانی کا حکم دیا جائے تو پھر اس پر سننا اور ماننا فرض نہیں (بلکہ انکار کرنا ضروری ہے)۔“ (بخاری و مسلم)

فائدہ : اس میں مسلمانوں کے لیے مسلم حکمرانوں کی اطاعت کی حدود واضح کر دی گئی ہیں۔ مسلم حکمرانوں کی عزت اسی میں ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکموں سے انحراف نہ کریں، ورنہ وہ اخروی عذاب کے علاوہ دنیوی ذلت سے بھی محفوظ نہیں رہیں گے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے۔ ”جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات پر بیعت کرتے تھے کہ ہم آپ کی بات سنیں گے اور مانیں گے تو آپ فرماتے تھے۔

”ان چیزوں میں جن کی تم طاقت رکھتے ہو۔“ (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسلم حکمران کی اطاعت کے لیے جہاں یہ ضروری ہے کہ اس کا حکم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے مخالف نہ ہو وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ وہ عوام کی طاقت سے بالا نہ ہو۔ اگر ایسا ہوگا تو اس کی اطاعت بھی ضروری نہیں ہوگی۔

2۔ اس میں حکمرانوں کو تنبیہ ہے کہ وہ عوام کو ایسی مشقت میں نہ ڈالیں کہ جس کا اٹھانا ان کے لیے مشکل ہو، جیسے فی زمانہ ناروا قسم کے ٹیکس اور بوجھ ڈالے جا رہے ہیں اور پابندیاں عائد کی جا رہی ہیں۔

حکمران کی نافرمانی

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

”جس نے (حکمران کے جائز کاموں میں) اطاعت سے ہاتھ اٹھا لیا تو وہ اللہ تعالیٰ سے قیامت کے روز اس حال میں ملے گا کہ اس کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوگی۔ اور جو شخص اس حال میں فوت ہوا کہ اس کی گردن میں کسی کی بیعت نہیں تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔“ (مسلم)

اور مسلم کی ایک اور روایت میں ہے۔

”جس شخص کو اس حال میں موت آئی کہ وہ جماعت کو چھوڑے ہوئے تھا تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔“

فوائد و مسائل :

1-اس حدیث میں بھی مسلمان حکمران کی اطاعت کولازم اوراس کی بیعت واطاعت سے گریز و انحراف کوکفر وضلال سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔اسے جاہلیت کی موت اس لیے فرمایا کہ اسلام سے قبل ایک امیر کی اطاعت کا کوئی تصور نہیں تھا بلکہ اس میں وہ اپنی عار اور ذلت محسوس کرتے تھے۔اسلام نے اس طوائف الملوکی کا خاتمہ کر کے انہیں نظم وضبط کا پابند بنایا اور اطاعت امیر کی تاکید کی۔تاہم اس میں جس امیر کی بیعت اوراطاعت کوضروری اوراس سے خروج وبغاوت کوجاہلیت قرار دیا گیا ہے،اس سے صاحب امرو اختیار امیر ،یعنی حکمران اور بادشاہ وقت مراد ہے۔مسلمانوں کی محدود جماعتوں کے بے اختیار امیر مراد نہیں ہیں کیونکہ ان کی اطاعت سے ملکی استحکام وابستہ ہے نہ ان کی عدم اطاعت سے نظم مملکت میں کوئی خلل واقع ہوتا ہے۔اس لیے ان کی بیعت واطاعت سے انکار یا انحراف اتنا بڑا جرم نہیں کہ اسے کفر وضلال قرار دیا جاسکے، جب کہ حدیث میں اسے کفر وضلال ہی کہا گیا ہے جس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ امیر سے مراد مسلمانوں کا با اختیار حاکم ہے نہ کہ تنظیمی معاملات کے امیر اور جماعت سے مراد مسلمانوں کی جماعت ہے نہ کہ مسلمانوں کا کوئی ایک گروہ یا دھڑا۔

2-اپنے اپنے گروہ کے امیر یا صدر کی اطاعت بھی ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر کسی گروہ میں نظم وضبط قائم نہیں رہ سکتا، گو اس نظم جماعت سے خروج کفر نہیں، جیسا کہ جماعت المسلمین اوراس کے امیر سے خروج کفر ہے۔نیز بعض لوگ کسی نہ کسی پیرومرشد کی بیعت کرنا ضروری سمجھتے ہیں حالانکہ یہ بھی کوئی مسئلہ نہیں۔

حکمران

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"(حکمرانوں کی بات) سنو اور اطاعت کرو، اگرچہ تم پر کسی حبشی غلام ہی کو حاکم مقرر کر دیا جائے گویا کہ اس کا سر انگور ہے۔" (یعنی انگور کی طرح چھوٹا سا ہے ، جس سے انسان بڑا عجیب سا لگتا ہے۔)(بخاری)

فائدہ : غلام کو اور وہ بھی سیاہ فام اور چھوٹے سے سر کا ہو، کوئی بھی احترام کی نظر سے نہیں دیکھتا۔ لیکن حدیث میں اس کی مثال دی گئی ہے جس سے مقصود اطاعت امیر کی تاکید ہے، چاہے اس کا رنگ کیسا ہی ہو اور وہ کسی بھی جنس اور نسل سے تعلق رکھتا ہو بشرطیکہ اس کا حکم قرآن وحدیث کے مخالف نہ ہو۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تجھ پر سننا اور ماننا ضروری ہے ، اپنی تنگی کی حالت میں بھی اور خوشحالی میں بھی ، اپنی خوشی میں بھی اور ناخوشی میں بھی اور حکمرانوں کے تجھ پر دوسروں کو ترجیح دینے کی صورت میں بھی۔"(مسلم)

فوائد و مسائل : حکمرانوں کی اطاعت چونکہ ملت کے مجموعی مفاد کے لیے ضروری ہے، اس لیے تاکید کی گئی کہ تم اپنے ذاتی مفادات اور حالات و جذبات مت دیکھو بلکہ ان سے بالا ہو کر سوسائٹی کے مفادات کے پیش نظر ہر صورت میں حکمرانوں کی اطاعت کرو۔سوائے نافرمانی کے کاموں کے کہ ان میں اطاعت کرنا جائز نہیں۔

اس حدیث میں معاشرتی استحکام کا خیال رکھنے کی ترغیب دلائی گئی ہے اور خودغرضی ، جو امن وامان اور استحکام کو ختم کر دیتی ہے ، سے باز رہنے کا حکم ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ سے روایت ہے کہ۔

"ایک سفر میں ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، پس ہم نے ایک منزل پر قیام کیا، ہم میں سے بعض اپنے خیمے درست کر رہے تھے، بعض تیر اندازی وغیرہ میں مقابلہ کر رہے تھے اور بعض اپنے مویشیوں میں لگے ہوئے تھے کہ اچانک رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کے منادی نے آواز لگائی کہ نماز تیار ہے۔

ہم سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جمع ہو گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"مجھ سے پہلے جو نبی بھی ہوا، اس کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ اپنی امت کی رہنمائی ایسے کاموں کی طرف کرے جنہیں وہ ان کے لیے بہتر جانتا اور انہیں ان کاموں سے ڈرائے جنہیں وہ ان کے لیے برا جانتا اور تمہاری یہ امت جو ہے اس کی عافیت اس کے ابتدائی حصے میں رکھ دی گئی ہے اور اس کے آخری حصے میں آزمائش اور ایسے معاملات پیش آئیں گے جنہیں تم برا سمجھو گے۔اور ایسے فتنے ظہور پذیر ہوں گے کہ ایک دوسرے کو ہلکا کر دے گا (یعنی ایک سے بڑھ کر ایک فتنہ رونما ہوگا اور بعد میں آنے والے فتنے کے مقابلے میں پہلا فتنہ بالکل ہلکا لگے گا۔)

ایک فتنہ سامنے آئے گا تو مومن کہے گا: یہی میری ہلاکت کا باعث ہوگا۔پھر وہ دور ہو جائے گا اور کوئی اور فتنہ ظہور پذیر ہوگا تو مومن کہے گا: یہی وہ فتنہ ہے جو سب سے بڑا ہے۔پس جس شخص کو یہ پسند ہو کہ وہ جہنم کی آگ سے دور ہو اور جنت میں داخل کر دیا جائے تو اسے موت اس حالت میں آنی چاہیے کہ وہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو اور لوگوں کے ساتھ وہی سلوک کرے جو اپنے ساتھ کیے جانے کو پسند کرے۔اور جو شخص کسی امام کی بیعت کرے اور اسے اپنا ہاتھ اور اپنے دل کا پھل دے دے (یعنی دل میں اس کی بیعت کے پورا کرنے کا عزم رکھے)

تو اسے چاہیے کہ مقدور بھر اس کی اطاعت کرے، پھر اگر دوسرا کوئی اسے اپنا تابع بنانے کے لیے اس سے جھگڑا کرے تو دوسرے کی گردن مار دو۔ (اسے قتل کر دو)۔"(مسلم)

فوائد و مسائل:

1-اس میں ابتدائی حصے سے مراد صحابہ و تابعین و تبع تابعین کا عہد ہے جسے دوسری حدیث میں خیرالقرون سے تعبیر کیا گیا ہے۔یہ عہد، مابعد کے تمام عہدوں سے زیادہ خیر و عافیت اور برکت و سعادت کا عہد ہے۔اس کے بعد یکے بعد دیگرے فتنوں کے ظہور کی پیشن گوئی کی گئی ہے جو ایک دوسرے سے بڑھ کر ہوں گے۔اس پیشن گوئی کی صداقت آج ہر شخص پر روز روشن کی طرح واضح ہے۔

2-فتنوں کے ظہور کی خبر سے مقصد، امت کو متنبہ کرنا ہے تاکہ وہ ان سے اپنا دامن بچا کر رکھے، اسی لیے اس سے بچنے کا طریقہ بھی بتلا دیا اور وہ ہے ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کے عقیدے پر مضبوطی سے قائم رہنا اور لوگوں کے ساتھ حسن معاملہ اور حسن اخلاق کا اہتمام کرنا۔

3-اس میں اقتدار پسندوں کی کثرت کی بھی پیش گوئی کی گئی ہے اور اس کا حل یہ بتلایا ہے کہ پہلے حاکم کی اطاعت کرو اور اس کے ساتھ مل کر دوسرے مدعیء خلافت کی گردن اڑا دو کیونکہ اس طرح ہی ملت اسلامیہ کی وحدت قائم رہ سکتی ہے اور وہ انتشار و تفریق سے بھی محفوظ رہ سکتی ہے۔

عہدہ ومنصب کا سوال کرنا

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"یہ آخرت کا گھر ہم ان ہی لوگوں کے لیے کرتے ہیں جو دنیا میں نہ بڑائی چاہتے ہیں اور نہ فساد کرنا اور اچھا انجام پرہیزگاروں کے لیے ہے۔" (القصص۔83)

فائدہ آیت: طلب امارت کا مطلب ہے کہ اس کا طالب دنیا میں بڑائی کو پسند کرتا ہے اور بڑائی پسندوں کا رویہ ہی زمین میں فساد کا باعث بھی ہوتا ہے۔کہ عہدہ ومنصب کی خواہش اور اس کے لیے سعی وکوشش کا انجام بالعموم برا ہی ہوتا ہے۔حسن انجام اور عافیت اسی میں ہے کہ انسان حکومتی مناصب سے کنارہ کش رہے۔

خاموش رہو

انشا جی

کچھ کہنے کا وقت نہیں یہ۔ کچھ نہ کہو، خاموش رہو
اے لوگو خاموش رہو۔ ہاں اے لوگو، خاموش رہو

سچ اچھا، پر اس کے جلو میں، زہر کا ہے اک پیالہ بھی
پاگل ہو؟ کیوں ناحق کو سقراط بنو، خاموش رہو

حق اچھا۔ پر اس کے لیے کوئی اور مرے تو اور اچھا
تم بھی کوئی منصور ہو جو سولی پہ چڑھو؟ خاموش رہو

اُن کا یہ کہنا سورج ہی دھرتی کے پھیرے کرتا ہے
سر آنکھوں پر، سورج ہی کو گھومنے دو، خاموش رہو

مجلس میں کچھ حبس ہے اور زنجیر کا آہن چبھتا ہے
پھر سوچو، ہاں پھر سوچو، ہاں پھر سوچو، خاموش رہو

گرم آنسو اور ٹھنڈی آہیں، من میں کیا کیا موسم ہیں
اس بگیا کے بھید نہ کھولو، سیر کرو، خاموش رہو

آنکھیں موند کنارے بیٹھو، من کے رکھو بند کواڑ
انشا جی لو دھاگا لو اور لب سی لو، خاموش رہو

ای این ٹی اسپیشلسٹ

ڈاکٹر عمر فاروق سے ملاقات

شاہین رشید



کہتے ہیں کہ جو بچہ پیدائشی طور پر کوئی جسمانی نقص لے کر پیدا ہوتا ہے وہ ساری زندگی اسی معذوری کے ساتھ گزارتا ہے۔ مگر اب ایسا نہیں ہے۔ اب سائنس نے بہت ترقی کر لی ہے...... ساری دنیا میں اکثر بچے "سماعت و گویائی" سے محروم پیدا ہوتے ہیں مگر سائنس کی ترقی نے انہیں سماعت فراہم کردی ہے۔

Cochlear Implant

(کوکلیر امپلانٹ) کے ذریعے بچہ بولنے اور سننے کے قابل ہو جاتا ہے۔ یہ طریقہ علاج خاصا پرانا ہے مگر ترقی یافتہ ممالک کے لیے...... ہمارے یہاں اس طریقہ علاج کو چند ہی سال ہوئے ہیں اور اس طریقہ علاج کے ماہر ڈاکٹر بھی پورے ملک میں تین یا چار ہی ہیں اور ان ہی میں ایک ڈاکٹر عمر فاروق بھی ہیں۔

سابق وائس چانسلر ڈاؤ میڈیکل یونیورسٹی اور سول اسپتال میں ای این ٹی ڈیپارٹمنٹ کے یونٹ ون کے انچارج اور پروفیسر ہیڈ آف ای این ٹی۔ ڈاکٹر عمر فاروق صاحب کے ہم انتہائی ممنون ہیں کہ انہوں نے اپنی بے حد مصروفیات میں سے وقت نکال کر ہمارے ڈائجسٹ کو انٹرویو دیا۔

"کیسے ہیں ڈاکٹر صاحب؟"

"الحمدللہ...... آپ ٹھیک ہیں؟"

"جی الحمدللہ ...... ڈاکٹر صاحب آپ سے آپ کے پیشے کے بارے میں اور بھی بہت سی باتیں ہوں گی لیکن پہلے میں آپ سے اس طریقہ علاج کے بارے میں معلومات لینا چاہوں گی جو "قوت سماعت و گویائی" سے محروم بچوں کے لیے ہے...... آپ یہ بتائیں کہ یہ کوکلیر امپلانٹ کیا ہے؟"

"یہ دو حصوں پر مشتمل ایک آلہ ہے۔ ایک اندرونی حصہ ہے جسے ہم الیکٹروڈ یا ریسیور کہتے ہیں۔ ...دوسرا حصہ باہر لگتا ہے۔ ہیئرنگ ایڈ کی طرح سے ......اس کو ہم ریسیور ٹرانسفارمر کہتے ہیں...... اس لیے کہ کان جو آواز سنتا ہے برین اس کو الیکٹریکل impulses کی فارم میں Pereceine کرتا ہے تو کوکلیر جس بچے کا پیدائشی طور پر کام نہیں کر رہا ہوتا تو جب آواز کان میں جا کر پردے سے ٹکرانے کے بعد اعصاب تک پہنچتی ہے تو کوئی سگنل جنریٹ نہیں ہوتا تو اس آلے کا بیرونی حصہ جب آواز کو باہر سے کھینچ کر کیچ کر کے اس کو الیکٹریکل امپلس میں ٹرانسفارم کر کے انٹرنل ڈیوائس جو اندر فکس ہے اس کو الیکٹریکل کرنٹ کی صورت میں اندر ٹرانسمنٹ کرتا ہے پھر سماعت کی نس کے ذریعے پیغام برین میں جاتا ہے اور بچہ یا مریض اس آواز کو سن یا

سمجھ سکتا ہے......

یہ تو میں نے آپ کو ٹیکنیکل پوائنٹ آف ویو سے ساری بات بتائی ہے تاکہ پڑھنے والے کو بھی اندازہ ہو کہ کوکلیئر امپلانٹ کیا ہے......اور آسان زبان میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک ایسا آلہ ہے جو دو حصوں پر مشتمل ہوتا ہے جس کا ایک حصہ دماغ میں فکس کرتے ہیں اور دوسرا باہر لگاتے ہیں اور اس آلے کی مدد سے بچہ سن اور بول سکتا ہے۔"

"کیا یہ آپریشن یا آلہ لائف ٹائم ہوتا ہے ؟ اس کی کوئی میعاد ہوتی ہے؟"

"جو کمپنی یہ آلہ دیتی ہے وہ اندرونی ڈیوائس کی گارنٹی یا "وارنٹی" دس سال کی دیتی ہے اور جو بیرونی آلہ ہے اس کی پانچ سال دیتی ہے۔ اب اس کا یہ مطلب بالکل بھی نہیں ہے کہ دس سال کے بعد یہ ختم ہو جاتی ہے۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کا پندرہ سال یا بیس سال پہلے آپریشن ہوا تھا اور آلہ آج تک بالکل صحیح کام کر رہا ہے۔

وارنٹی پریڈ کے دوران ٹوٹنے کے علاوہ کوئی خرابی آتی ہے تو کمپنی بغیر کسی چارجز کے یا بغیر کسی قیمت کے ری پلیس کر دیتی ہے اور اسے دوبارہ لگانے کا بھی کوئی بڑا ایشو نہیں ہوتا ہے۔ لیکن عام طور پر جو دیکھنے میں آیا ہے یا جو لٹریچر دنیا میں دستیاب ہے اس کے مطابق بہت کم کیسز ایسے ہوئے ہیں جن میں دوبارہ آپریشن کرنا پڑا ہو۔"

"کوکلیئر پلانٹ کی طرف آپ کا رجحان کیسے ہوا؛ کیونکہ یہ تھوڑی مختلف فیلڈ ہے۔"

"اصل میں جب Cochlear Implant پاکستان میں آیا تو اسے کمرشل کی بنیاد پر شروع کیا گیا۔ اور پندرہ لاکھ سے لے کر بیس لاکھ تک کا یہ آپریشن تھا اور ہر آدمی کے بس کی بات نہیں ہوتی تھی یہ بہت ہی کم لوگ اس تک پہنچ پاتے تھے۔

میرے اندر بھی یہ خواہش تھی کہ میں یہ آپریشن کروں اور کمپنی والے بھی مجھ سے رابطے میں رہتے تھے کہ آپ یہ آپریشن کریں گے، آپ کو یہ فائدہ ہوگا اور آپ مریض بھیجیں گے تو بھی آپ کو یہ فائدہ ہوگا، یعنی ایک طرح کا لالچ دیا جاتا تھا......مگر میں ان چیزوں سے ہمیشہ دور رہا اور میری خواہش تھی کہ میں اس فائدے کے بغیر کچھ کر سکوں تو جب میں ڈاؤ میڈیکل یونیورسٹی کا پرو وائس چانسلر بنا تو اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک موقع دیا ایک فورم ملا مجھے اور ظاہر ہے کہ جب آپ پاور میں ہوتے ہیں تو فیصلے کرنے کا بھی آپ کو اختیار ہوتا ہے......تو پھر ہم نے ایک انٹرنیشنل کمپنی کے ساتھ مل کر ایک معاہدہ کیا کہ ہم پاکستان میں غریب بچوں کے لیے فری آف کاسٹ اس آپریشن کو کریں گے......لیکن ہمارا فری آف کاسٹ کا تجربہ اچھا نہیں تھا ......یعنی ہمیں جو hearing aid (آلہ سماعت) جو باہر سے ملتے تھے اور لگتے تھے وہ ہم نے مفت بانٹ دیے اور جب فالواپ کے لیے پندرہ دن بعد بلایا تو 99.9 فیصد یہ "ہیرنگ ایڈ" یا تو ٹوٹ چکے تھے یا کھو چکے تھے۔

پھر ہم نے پانچ سو روپے میں دیے تو چونکہ آٹھ دس ہزار کی چیز کو پانچ سو روپے میں دی تو لوگوں نے خیال کیا۔ پھر ہم نے سوچا کہ اگر اسے ہم نے فری کر دیا یا کم قیمت دیا تو پندرہ بیس لاکھ کی چیز کو لوگ اہمیت نہیں دیں گے اور ادھر ادھر کر دیں گے اور آپریشن کے بعد اس کی زیادہ حفاظت بھی کرنی پڑتی ہے اور بچے پہ یا مریض پہ محنت بھی زیادہ کرنی پڑتی ہے لیکن لوگ محنت کریں گے نہیں کہ پائی پیسہ تو لگا ہوا نہیں ہے۔ یعنی "مال مفت دل بے رحم" والی بات ہو گی۔

لیکن جب پیسے لگے ہوئے ہوتے ہیں تو اس کی اونرشپ بن جاتی ہے اور "مال مفت دل بے رحم" والا سلسلہ نہیں ہوتا۔

"یعنی ایکچوئلی یہ اتنا مہنگا نہیں ہے؟"

"نہیں ......نہیں، مہنگا تو بہت ہے......ہم نے تو فنڈ جمع کیے تھے اور دو فنڈ بنائے ایک زکوٰۃ کا اور ایک ڈونیشن کا اور دونوں کے اکاؤنٹ بھی الگ الگ

تھے، کیونکہ ہر کوئی زکوٰۃ لینا بھی نہیں چاہتا......تو جب آپ لوگوں کی فلاح و بہبود کا کام کرنا چاہتے ہیں تو اس میں ایمانداری بھی بہت ہونی چاہیے اور مذہب کے پوائنٹ آف ویو سے بھی اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ کس کو زکوٰۃ دینی ہے اور کس کو امداد دینی ہے......تو جب یہ سلسلہ شروع کیا تو ہم نے تقریباً سینتالیس آپریشن کیے ڈاؤ یونیورسٹی اسپتال (اوجھا) میں اور یہ بات ہے 2013ء، 2014ء کی۔

"یہ طریقہ کار کتنا پرانا ہے اور آپ کب ٹریننگ لے کر آئے؟"

"آپ مجھے پیچھے کی طرف لے گئیں، جب فنڈنگ کا سارا سلسلہ طے پا گیا اور ہم نے سوچ لیا کہ کس طرح کام کرنا ہے تو پھر 2012ء میں، میں انگلینڈ گیا اور وہاں تین ماہ رہا اور اس زمانے میں سارے دوست یار اور کلاس فیلو وہیں ہوتے تھے اور وہ حیران ہوتے تھے کہ تم اس اسٹیج پر سب کچھ چھوڑ کر آئے جبکہ تم سیٹ ہو چکے ہو اور بیوی بچوں سے دور تین ماہ رہو گے اور پھر تمہارا یہ مقصد ہے کہ تم نے اس سے کمانا بھی نہیں ہے تو بڑی عجیب سی خواہش ہے تمہاری......تو میں نے کہا کہ بس میری خواہش ہے کہ میں کچھ کر سکوں دوسروں کے لیے۔

اور یوں 2012ء میں میں ٹریننگ لے کر پاکستان آ گیا اور میں نے پہلا آپریشن نومبر 2012ء یا شاید دسمبر 2012ء میں کیا......پھر پاکستان میں آپ کو پتا ہی ہے کہ کچھ لوگوں کو اچھے کام اچھے نہیں لگتے۔ تو کچھ اختلافات ہو گئے اور وائس چانسلر نے ہماری "پرخاش" یا عداوت میں غریبوں کا یہ کام بھی بند کروا دیا......تو میں نے سوچا کہ اگر ہم فنڈ جمع نہیں کر سکتے تو اتنا تو کر سکتے ہیں کہ اگر کوئی امپلانٹ ارینج کر سکتا ہے تو ہم آپریشن کے پیسے نہیں لیں گے۔ فری میں کر دیں گے۔ مگر ہمیں اس کی بھی اجازت نہیں ملی اور کافی عرصہ کام بند رہا۔

پھر ہم نے سول اسپتال میں آپریشن کرنا



شروع کر دیے۔ حالانکہ وہاں آپریشن کی خاطر خواہ سہولتیں بھی نہیں تھیں۔ تو اللہ تعالیٰ کائنات کا مالک ہے وہ برائی میں سے بھی اچھائی کا پہلو نکال دیتا ہے......مجھے منع کیا گیا کہ ڈاؤ یونیورسٹی میں آپ آپریشن نہیں کر سکتے تو میں نے سول اسپتال میں شروع کر دیا تو وہ ایک ہسٹری بن گئی کہ پاکستان کے پہلے سرکاری اسپتال میں پہلا امپلانٹ کوکلیئر ہوا ہے تو یہ اعزاز اللہ نے مجھے دیا۔ تو ہم سول اسپتال میں بھی سات آٹھ آپریشن کر چکے ہیں۔

لوگ ایمپلانٹ ارینج کروا کے لے آتے ہیں اور ہم آپریٹ کر دیتے ہیں، فری میں......اور جو پرائیویٹ کروانا چاہتے ہیں تو پرائیویٹ میں کر دیتے ہیں۔ جو جس طرح افورڈ کر سکتا ہے اس طرح کرتے ہیں۔"

"آپ پہلے ڈاکٹر ہیں کوکلیئر امپلانٹ کے؟"

"نہیں ......آج سے پندرہ سال پہلے ایک ڈاکٹر نے کیا تھا یہ آپریشن مگر ایک کے بعد دوبارہ نہیں کیا البتہ لاہور میں یہ امپلانٹ ہو رہے تھے اور کافی ٹائم سے ہو رہے تھے لیکن سرجن باہر سے آتا تھا اور ظاہر ہے کہ جب سرجن باہر سے آئے گا تو وہ امپلانٹ کتنا مہنگا پڑے گا......تو اس وقت پاکستان

میں تین ڈاکٹر ہیں جو امپلانٹ کر رہے ہیں ان میں سے میں بھی ایک ہوں۔ لیکن وہ پرائیویٹ سیکٹر کے ڈاکٹر ہیں۔ میں وہ واحد ہوں جو پبلک سیکٹر کا ہوں۔"

"تو پرائیویٹ سیکٹر میں کام زیادہ ہو رہا ہے یا پبلک سیکٹر میں؟"

"دونوں میں ہو رہا ہے...... ابھی کچھ ہی دنوں کی بات ہے کہ "ایدھی فاؤنڈیشن" نے کسی کے لیے اپروول دیا ہے۔ کچھ لوگوں کے لیے پرائم سینٹر اپروو کر دیتے ہیں تو اس سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ اپنا بندوبست کروا لیتے ہیں تو جو پانچ چھ لاکھ روپے زیادہ اسپتال میں خرچ ہونے ہوتے ہیں اس سے وہ بچ جاتے ہیں۔"

"جو پہلا آپریشن آپ نے کیا تھا کوکلیئر امپلانٹ کا اس بچی سے آپ کی ملاقات ہوتی ہے۔ وہ صحیح طرح بول اور سن سکتی ہے؟"

"جی بالکل ...... اس بچی کا نام "مصفیہ musfiah ہے...... تو ایک دن اس کے والد بچی کے ساتھ نظر آئے تو میں نے پوچھا کہ بچی کا کیا حال ہے تو انہوں نے دور کھڑی اپنی بچی کو آواز دی اور کہا کہ "انکل کو سلام کرو"۔

بچی نے کہا۔ "السلام علیکم۔"

تو وہ اتنا جذباتی لمحہ تھا کہ میری آنکھوں میں نمی آ گئی اور میں نے اس بچی کو اٹھا کر کھیلنا شروع کر دیا اور فورتھ فلور تک وہ بچی میری گود میں ہی رہی۔

اس وقت میں ڈاؤ یونیورسٹی کا پرو وائس چانسلر تھا اور میں بچی کے ساتھ کھیل رہا تھا اور سب دیکھ رہے تھے کہ وائس چانسلر صاحب کو کیا ہو گیا کہ بچی کو اٹھا کر کھیل رہے ہیں۔ لیکن وہ میرے اندر کی ایک خوشی تھی کہ میرا کیا ہوا آپریشن کامیاب ہوا اور یہ بچی سننے اور بولنے لگی ہے۔"

"کیا یہ آپریشن سو فیصد کامیاب ہے؟"

"اس میں بہت ساری چیزیں کاؤنٹ کرتی ہیں۔ جتنی کم عمر میں یہ آپریشن ہو گا اتنا ہی رزلٹ اچھا ہو گا۔ ایک سال کی عمر کے بچے کا اگر امپلانٹ کروائیں گے تو سو فیصد اچھا رزلٹ ہو گا۔ دوسرے سال میں نوے فیصد، ہر سال میں دس فیصد کم ہو جاتا ہے اور دس سال کے بعد "زیرو" ہو جاتا ہے، کیونکہ دماغ میں جو بولنے کا حصہ ہوتا ہے وہ ایکٹی ویٹ نہیں ہو پاتا کہ نہیں سنا تو نہیں بولتا...... اور سننا تو پھر شروع کر دیتا ہے مگر بولنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔

آپریشن سے پہلے صرف مریض کو ہی نہیں دیکھتے، مریض کی فیملی کے بارے میں بھی معلومات کا ہونا بہت ضروری ہے کہ فیملی میں کتنے بچے ایسے ہیں۔ خاندان میں کتنے بچے ایسے ہیں۔ گھر کا ماحول کیسا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان میں یہ فکر و عمل کتنا ہے کہ ان کا بچہ سن اور بول سکے اور وہ اس کے لیے کتنے بے چین ہیں اور آپریشن کے بعد اصل کوشش والدین کی ہوتی ہے کیونکہ چوبیس گھنٹے بچہ ان کے پاس رہتا ہے اور اتنے آپریشن میں صرف ایک امپلانٹ فیل ہوا ہے اور وہ بھی اس وجہ سے کہ بچہ تھوڑا ابنارمل تھا اور اس نے اپنا سر دیوار پر مار لیا تھا تو امپلانٹ خراب ہو گیا تھا مگر چونکہ وہ وارنٹی میں تھا تو کمپنی نے اسے تبدیل کر کے دے دیا اور ہم نے آپریشن کر دیا۔

ماشاء اللہ اب وہ ٹھیک ہے...... تو ایک بار جیو میں عامر لیاقت نے ان بچوں کی ویڈیوز دکھائی تھیں اور والدین کی خوشی دیکھنے کے قابل تھی۔"

"باہر کے ترقی یافتہ ممالک میں یہ امپلانٹ مفت ہوتا ہے؟"

"جی بالکل ...... نہ صرف مفت ہوتا ہے بلکہ اب دونوں کانوں میں ہوتا ہے...... اور ساری بات یہ کہ وہ جو فلاحی اسلامی مملکت کا جو تصور تھا اسے ان لوگوں نے لے لیا...... وہاں تو بچہ پیدا ہوتا ہے تو حکومت کی طرف سے بچے کا الاؤنس شروع ہو جاتا ہے، دودھ اور خوراک کا اور یہ سب کچھ حضرت عمرؓ کے زمانے میں ہوتا تھا تو ہم نے تو ان باتوں کو نہیں

اپنایا۔ غیر مسلموں نے اپنا لیا۔

ہمارے یہاں تو عام مرض کے لیے کوئی سہولت نہیں ہے تو خاص کے لیے کیا ہو گی۔ ہم کچھ بھی کہہ لیں، ان لوگوں میں انسانیت بہت زیادہ ہے۔ ہر شخص اپنے کام سے مخلص ہے۔"

"جو بچے گونگے بہرے پیدا ہوتے ہیں۔ اس کی وجوہات کیا ہوتی ہیں؟"

"کچھ موروثی بھی ہیں اور کزنز میرج بھی وجوہات ہیں۔ ہمارے ملک میں تو بہت زیادہ کزنز میرج ہوتی ہیں۔ یا پھر بچے کی پیدائش سے پہلے ماں کو کوئی انفیکشن ہو گیا۔ یا ماں نے کوئی ایسی دوائیں استعمال کر لیں۔ ڈیلیوری کے دوران بھی اگر پیچیدگی ہو جائے۔ یا پیدائش کے بعد بچے کو یرقان ہو جائے یا کوئی وائرل انفیکشن ہو جائے۔ تو بس یہ وجوہات ہیں کہ بچے بولنے اور سننے سے محروم پیدا ہوتے ہیں۔"

"ڈاکٹر صاحب یہ ایک مہنگا علاج ہے جو غریب آدمی کی دسترس سے بہت دور ہے تو آپ اس سلسلے میں حکومت سے کچھ کہنا چاہیں گے؟"

"جی بالکل ...... یہ ایک واقعی بہت مہنگا علاج ہے لیکن حکومت کے لیے یہ بہت بڑی رقم نہیں ہے۔ حکومت اپنے افسران کے لیے پجیرو اور لینڈ کروزر جیسی مہنگی گاڑیاں جن کی قیمت کروڑ دو کروڑ سے کم نہیں ہوتی خرید کر دیتی ہے تو اتنی مہنگی گاڑیاں نہ دیں یا کم کر دیں اور اپنے سالانہ کوٹے میں سے بھی اگر دو سو امپلانٹ دے دیں جن کی قیمت دو ڈھائی کروڑ سے زیادہ نہیں ہو گی تو یہ ان بچوں پر اور ان کے والدین پہ بہت بڑا احسان ہو گا۔

اگر حکومتی سطح پر ان کمپنیز سے جو یہ ڈیوائس بناتی ہیں، روابط رکھے جائیں تو کمپنیز ان سے بہت تعاون کریں گی۔ ویسے بھی یو این پالیسی کے تحت تھرڈ ورلڈ کنٹریز میں یہ ڈیوائس سستی فراہم کی جاتی ہیں، ترقی یافتہ ممالک کی بہ نسبت، یہی ڈیوائس اگر آپ برطانیہ میں خریدیں تو ڈبل دام میں ملیں گی۔ تو جب ہم فنڈنگ کے تحت کام کر رہے تھے تو جس کمپنی سے ہم یہ خریدتے تھے تو ہم نہ صرف ان سے پیسے بھی کم کرواتے تھے اور اگر تیس ڈیوائس خرید رہے ہوتے تھے تو ان ہی کم کروائے ہوئے پیسوں میں پینتیس ڈیوائس لیتے تھے اور ایسے کاموں میں کمپنیاں بھی بہت تعاون کرتی ہیں کہ آپ کارِ خیر کر رہے ہیں تو ہم بھی آپ کے ساتھ ہیں۔

اب دیکھیں نا ایک بچہ جب قوت سماعت سے محروم پیدا ہوتا ہے، اسے اگر ہم ایک آلہ فراہم کر دیں اور آپریشن کر کے اس کو ایک کارآمد شہری بنا دیتے ہیں تو وہ بچہ نہ صرف کسی پہ بوجھ نہیں بنتا بلکہ وہ خود بہت سارے لوگوں کا سہارا بن جاتا ہے اور یہ صرف ایک بچے کا علاج نہیں بلکہ ایک فیملی اور ایک خاندان کی تشکیل ہے کیونکہ اس بچے سے ایک خاندان تشکیل پائے گا......

اور یہ حقیقت بھی ہے اور میرا مشاہدہ بھی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی کو ایک کمی کے ساتھ پیدا کرتا ہے تو اس میں دوسری بہت سی صلاحیتیں بھی دے دیتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جو پیدائشی نابینا ہوتے ہیں وہ ایسے چل رہے ہوتے ہیں جیسے ہم اور آپ کیونکہ ان کی سننے کی اور محسوس کرنے کی ''حس'' بہت تیز ہوتی ہے تو اس طرح ان بچوں میں بھی بہت سی صلاحیتیں ہوتی ہیں اور اکثر بچے اپنی کلاس میں بہت نمایاں ہوتے ہیں۔''

''چلیں جی ڈاکٹر صاحب! بہت باتیں ہو گئیں۔ اب آپ اپنا فیملی بیک گراؤنڈ بتایئے؟''

''میں کراچی میں 12 نومبر 1958ء میں پیدا ہوا، میرے والدین انڈیا سے مائیگریٹ کر کے پاکستان آئے تھے 1947ء میں۔ میرے والد صاحب ڈاکٹر بننا چاہتے تھے، لیکن چونکہ اس زمانے میں صرف لاہور میں میڈیکل کالج تھا تو میرے دادا نے انہیں اتنی دور جانے کی اجازت نہیں دی تو پھر انہوں نے علی گڑھ سے ایل ایل بی کیا۔ انہوں نے انگریزی لٹریچر میں گولڈ میڈل لیا...... علی گڑھ یونیورسٹی میں ...... میرے نانا ڈاکٹر تھے۔ اور 1921ء میں انہوں نے کنگ ایڈورڈ کالج لاہور سے ایم بی بی ایس کیا تھا اور 1923ء میں بلوچستان میں وہ پہلے مسلم ڈاکٹر کی حیثیت سے تعینات ہوئے۔

والدہ ہماری کوئی خاص پڑھی لکھی نہیں تھیں لیکن انہوں نے ہماری تربیت میں اہم رول ادا کیا۔ تقسیم پاک و ہند سے پہلے میرے دادا بینک میں بہ حیثیت منیجر کے جاب کرتے تھے۔ بعد میں انہوں نے اپنا بزنس شروع کیا تو والد بھی ان کے ساتھ بزنس ہی کرنے لگے اور پاکستان آنے کے بعد بھی انہوں نے بزنس ہی کیا۔ میں اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ بہنیں پانچ تھیں جن میں تین بہنیں حیات ہیں۔''

''والد آپ کے ڈاکٹر بننا چاہتے تھے مگر نہیں بن سکے۔ تو کیا ان ہی کی خواہش پہ آپ ڈاکٹر بنے یا آپ کو خود شوق تھا؟''

''جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ میرے نانا ڈاکٹر تھے اور ہمارے گھر میں کسی ایک کا ڈاکٹر بننا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ میرے ایک ماموں کے علاوہ سارے ماموں ڈاکٹر تھے۔ ایک وکیل تھے اور ددھیال میں بھی والد کی فیملی میں کوئی نہ کوئی ڈاکٹر ضرور تھا۔ چچا کی فیملی میں یا پھوپھی کی فیملی میں۔

میری ایک خالہ بھی پاکستان آرمی میں ڈاکٹر تھیں۔ تو چونکہ خاندان میں ایک ڈاکٹر کا ہونا ضروری تھا تو کہا گیا کہ میرا بیٹا بھی ڈاکٹر بنے گا۔ جبکہ میرا رجحان بزنس کی طرف تھا مگر میرے والد نے بھی بزنس کے لیے میری حوصلہ افزائی نہیں کی بلکہ پڑھائی پر ہی زور دیا تو ان کی خواہش کا احترام کیا۔

''چونکہ فیملی میں ایک ڈاکٹر ہونا ضروری تھا اس لیے آپ کو بھی ڈاکٹر بننا پڑا...... تو کوئی مشکل تو نہیں ہوئی؟''

''نہیں...... کوئی مشکل نہیں ہوئی۔ میں کوئی بہت پڑھاکو قسم کا طالب علم نہیں تھا۔ ایک عام سا طالب علم تھا اور اب بھی اپنے آپ کو ایسا ہی سمجھتا ہوں...... اور میں شروع سے ہی اپنے استادوں کا پسندیدہ طالب علم رہا، خواہ وہ اکیڈمیز کی ایکٹویٹی تھیں یا غیر نصابی سرگرمیاں تھیں۔ یعنی نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتا تھا۔ اس لیے سب لوگ میرے نام سے واقف تھے۔

پرائمری کی تعلیم میٹروپولیٹن انگلش میڈیم اسکول سے جو کہ پرائیویٹ اسکول تھا اور میٹرک سینٹر ماڈل اسکول پی ای سی ایچ سے کیا جو کہ ''پہاڑی والا'' اسکول کے نام سے مشہور تھا۔ جبکہ انٹر کی کہانی کچھ یوں ہے کہ میٹرک کے رزلٹ کے بعد میں بیمار ہو گیا اور جب ڈی جے کالج کا ایڈمیشن کا پروسس ختم ہو گیا تو میں اسپتال سے فارغ ہو کر گھر آیا اور کالج گیا تو انہوں نے کہا کہ آپ نے دیر کر دی ہے پھر میں سن پیٹ کالج گیا، وہاں بھی پروسس ختم ہو چکا تھا مگر جب میں نے دیر سے آنے کی وجوہات بتائیں تو انہوں نے مجھے ایڈمیشن دے دیا۔ کیونکہ میرے نمبرز کافی اچھے تھے۔ اور انٹر کے بعد ڈاؤ میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کیا۔ اور الحمد للہ فیل کبھی نہیں ہوا تھا۔''

''ای این ٹی میں اسپیشلائزیشن کرنے کا خیال آپ کو کیسے آیا؟''

''ای این ٹی میں جانے کا فیصلہ میں نے ایم بی بی ایس کے چوتھے سال میں کر لیا تھا...... اور وجہ اس کی یہ تھی کہ ہمارے ایک ایک پروفیسر تھے آئی ایچ جعفری (مرحوم)۔ ان کا بڑا نام تھا اور اللہ پاک نے انہیں بڑا ہنر دیا تھا۔ ہم نے تو استادوں سے سیکھا انہوں نے کتابوں سے سیکھا اور یہ ان میں بہت یونیک بات تھی۔ وہ 1958ء میں ایف آر سی ایس کر کے باہر سے آئے اور پھر 1958ء کے بعد وہ باہر نہیں گئے اور کتابیں پڑھ پڑھ کر وہ سرجن بنے...... دنیا میں وہ ایک نرالے سرجن تھے اور Head and neck کینسر سرجری انہوں نے پاکستان میں شروع کی۔ بڑا رول ہے ان کا اس سلسلے میں...... تو ہماری کلینیکل پوسٹنگ ہوئی تھی اور میں نے ان کا ایک آپریشن دیکھا تھا جس سے میں بہت متاثر ہوا تھا۔

اس زمانے میں سول اسپتال کے آپریشن تھیٹر بہت اچھے ہوا کرتے تھے...... نیچے آپریشن تھیٹر ہوتے تھے اور اوپر کلاس روم جہاں سے ہم آپریشن ہوتے ہوئے دیکھا کرتے تھے۔ تو جب کلینیکل پوسٹنگ میں پہلا دن تھا اور اپنے گروپ کے ساتھ گیا۔ تو آپریشن شروع ہوا صبح نو بجے سے دو بج گئے مجھے پتا ہی نہیں چلا، باقی دوست جا چکے تھے، میں اس میں اس لیے اتنا انوالو ہو گیا تھا کہ اتنا پیچیدہ آپریشن ہے یہ سب کچھ صحیح کیسے ہوگا۔ سب کچھ کھول کر رکھ دیا آنکھ، کان، ناک، منہ...... تو یہ سب فٹ کیسے ہوگا۔

پوسٹنگ ساڑھے دس بجے تک ہوتی تھی مگر میں نے یہ آپریشن آخر تک دیکھا...... اور بس وہیں سے فیصلہ کیا کہ میں بھی اسی میں اسپیشلائز کروں گا اور ایم بی بی ایس کے بعد ڈائریکٹ ای این ٹی میں چلا گیا میں۔ بس ایک جذبہ تھا کہ کچھ بڑا کام کرنا چاہیے...... اور ہاؤس جاب کے دوران جب طالب علم چھوٹے چھوٹے کیسز کے لیے لڑ رہے ہوتے تھے ہم بڑے بڑے آپریشن کے لیے اپنے پروفیسرز کے ساتھ کھڑے ہوتے تھے۔ اور قسمت نے ساتھ دیا اور جعفری صاحب نے ہمیں اپنے ساتھ رکھ لیا...... اور ہاتھ پکڑ کر سکھایا اور جب میری جاب جناح اسپتال میں ہو گئی بیچلر کے بعد تو شفیع حیدر زیدی جو کہ اپنی ذات میں ایک یونیورسٹی اور انسٹی ٹیوشن کا درجہ رکھتے تھے ان سے ہم نے نہ صرف سرجری سیکھی بلکہ اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا اور بولنا سیکھا۔ یعنی زندگی کے ہر طریقے ان سے سیکھے۔

وہ ایک پرفیکٹ اور آئیڈیل پرسنالٹی کے مالک تھے۔ وہ جب انگریزی بولتے تھے تو انگریز لگتے تھے اور جب اردو بولتے تھے تو اردو دان لگتے تھے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ شروع سے ہی استادوں کی شفقت اور محبت ملی......

خیر پھر جب 2000ء میں انڈواسکوپی شروع ہوئی تو ایک جذبہ بھی تھا اور ماں کی دعا بھی اور یہ بھی کہ کچھ بڑا بن کے دکھانا ہے اور کچھ نئے کام کرنے ہیں...... تو اس کے لیے ہم نے ایک بہت بڑا اسٹیپ لیا کہ پورے پاکستان میں جو چیزیں دستیاب نہیں تھیں، اس کے لیے ہم نے بینک سے لون لیا اور جرمنی سے انڈواسکوپی سرجری کا سامان منگوایا اور آسٹریا جہاں سے یہ انڈواسکوپی شروع ہوئی تھی، وہاں جا کر ٹریننگ لی اور پاکستان آ کر چھ نئے آپریشن شروع کیے جو اس سے پہلے نہیں ہوتے تھے اور پھر یہاں کے ڈاکٹرز

جو باہر نہیں جاسکتے تھے ان کے لیے ورک شاپس کروائیں۔ تو ان کی وجہ سے بھی بڑا نام ملا۔

2002ء میں میں نے ایک سرجری کی۔ ''حمیرا'' نام کی لڑکی کی جس کی بینائی ضائع ہو رہی تھی اور میں نے اس کا آپریشن کیا اور الحمدللہ اس کی بینائی واپس آ گئی۔ چار پانچ گھنٹے کا آپریشن تھا...... دلچسپ بات یہ کہ اس زمانے میں صرف پی ٹی وی ہوتا تھا تو پی ٹی وی نے اس آپریشن کو کور کیا تھا اور ویڈیو بنائی جس میں میرا انٹرویو، لڑکی کا انٹرویو اور فیملی کا انٹرویو شامل تھا جو کہ خبرنامے میں دکھایا گیا تھا۔ تو دوسرے دن میرے ایک دوست کا فون آیا کہ آج پرائم منسٹر کی نیوز تیرہ منٹ چلی ہے اور ڈاکٹر عمر فاروق ساڑھے تیں منٹ چلا ہے...... تو بہت اچھا لگا۔

تو جناب یہ ہے اسٹوری ہمارے سب کاموں کی۔ امپلانٹ کے بارے میں تو آپ نے تفصیلی بات کر ہی لی۔''

''گڈ...... اب بتایئے کہ شادی کب ہوئی۔ پسند سے ہوئی وغیرہ وغیرہ؟''

''میں نے تھوڑی لیٹ شادی کی۔ 1996ء میں میری شادی ہوئی کہ پہلے کچھ بن جائیں۔ شادی ارینج میرج تھی۔ چار بچے ہیں ماشاءاللہ سے' دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ ایک بیٹی میڈیکل کے فرسٹ ایئر میں ہے جس کا نام مریم ہے۔ پھر بیٹا ہے مصطفیٰ، بیٹی ہے ماریہ اور بیٹا ہے مرتضیٰ۔ بیگم ہماری ہاؤس وائف ہیں...... اور میرا اپنا بھی خیال تھا کہ اگر بیگم ہاؤس وائف ہوگی تو میرا بھی اور بچوں کا خیال بھی احسن طریقے سے رکھ لے گی...... اور الحمدللہ ایسا ہی ہے۔

گھر میں محبت ہو تو سب صحیح رہتا ہے۔ اور بچے ہماری جان ہیں اور ہم ان کی جان ہیں۔ جب میری پہلی اولاد یعنی بیٹی ہوئی تو میں نے ہفتے میں دو چھٹیاں شروع کر دی تھیں اور آج تک ایسا ہی ہے۔ ہفتے میں دو دن اپنے پرائیویٹ کلینک سے چھٹی کرتا ہوں۔ ''سرکار'' کی نہیں۔ ان دو چھٹیوں میں فیملی کے ساتھ بہت ٹائم گزارتا ہوں۔''

''ان دو چھٹیوں میں بیگم کے ساتھ گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹاتے ہیں یا صرف گھومنا پھرنا ہی رہتا ہے؟''

''جب بچے چھوٹے تھے تو گھومنا پھرنا ہی رہتا تھا...... مگر جب سے بچیاں بڑی ہوئی ہیں تو انہیں کوکنگ کا شوق ہو گیا ہے تو جب مجھے موقع ملتا ہے تو میں ان کے ساتھ ان کی ایکٹیوٹیز میں ضرور حصہ لیتا ہوں۔ گھومنا پھرنا ملک کے اندر اور باہر بہت ضروری ہوتا ہے تاکہ بچوں کو معلوم ہو ہر بات کا۔''

''سیاست سے کچھ دلچسپی؟ ڈرامے دیکھتے ہیں؟''

''زمانہ طالب علمی میں سیاست سے دلچسپی تھی مگر اب آج کل کے زمانے کی سیاست سے چڑ سی ہونے لگی ہے...... اور ٹی وی پہ جو پروگرام آ رہے ہوتے ہیں، ان کو دیکھ کر شرم ہی آ رہی ہوتی ہے اور ڈرامے دیکھنے کا بہت شوق ہے اور بقول میری بیوی کہ اگر میاں صاحب کو آدھی قسط کے بعد بھی ڈرامہ دیکھنا پڑے تو ایسے دیکھتے ہیں جیسے شروع سے دیکھ رہے ہیں اور اگر کسی ڈرامے کی سو دیں قسط چل رہی ہو تو یہ اسے بھی اس طرح سے دیکھنے بیٹھ جاتے ہیں جیسے پہلی قسط سے دیکھ رہے ہوں۔

خبریں ہماری اتنی ڈپریسنگ ہوتی ہیں کہ دل نہیں کرتا دیکھنے کو...... مجھے پرندے پالنے کا شوق ہے اور میرے پاس برڈ ہیں۔ گارڈننگ کا شوق ہے۔ میوزک بہت پسند ہے مگر اب ان ساری باتوں کے لیے وقت نہیں ہے۔''

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے ڈاکٹر صاحب سے اجازت چاہی۔



عائشہ رباب...... کراچی

حسب معمول کہنی سنی پڑھی، مصنفین کو کی جانے والی نصیحت بڑی دل موہ لینے والی تھی۔ ''کرن کرن روشنی'' روشنی ہی ہے۔ ہر لحہ، ہر لحظہ راستہ دکھاتی ہوئی ہر موڑ پر قدم پر رہنمائی کرتی ہوئی۔ بڑھ کر سنبھال لینے والی ''انٹرویو'' میں ''احد میر'' سے باتیں کر کے بہت اچھا لگا۔

''ہمارے نام'' مسرت الطاف کا خط حیرت کے سمندر میں غوطہ کھانے پر مجبور کر گیا کچھ پسند ہی نہیں آ رہا انہیں، ان کا خط تو پچھلے تمام خطوں سے مختلف تھا۔ ''سیما آصف'' بہت خوشی ہوئی انہیں پڑھ کر اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف سب سے پہلے ناول ''دشت جنوں'' ہمیشہ کی طرح خوش نصیب کی غصہ دلانے والی حرکتیں، شامیر کی چالاکیاں اور کیف کی بے وقوفیاں، سب سے منفرد اور حقیقت سے قریب کردار منفرا کا ہے، نقاب پوش سیلز گرل یقیناً آئے گی ہے۔ ''حالم'' کیا لکھوں اس کے بارے میں قدم قدم پر چونکا دینے والی' لحہ لحہ آپ کی ذہانت کا امتحان لینے والی کہانی۔ ہر ہر کردار اپنی جگہ جامع اور بھرپور ہے۔ ''آریانہ کی موت کا پڑھ کر تو سکتہ ہی ہو گیا۔ آگے کچھ پڑھا ہی نہیں گیا۔ ''مکمل ناول'' میں ''حسن المآب'' موسیٰ کا دین کی طرف مائل ہونا بہت اچھا لگا حسن المآب کا بار بار اختلاف کرنا بہت دکھی کر گیا ہے اور ماہ رو کے وہ الفاظ نہیں بھولتے کہ ''حلیمہ'' نے میرا اللہ بھی چھین لیا۔

''ادھوری'' جوانی کی نادانی' منہ زوری' تن مالی اور گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ' کمزوری بڑھاپے میں گھر کھونے کا خوف ہما صادق کے کردار میں بڑی مہارت سے سمو دیا ہے۔ ''پورب، پچھم'' نازیہ رزاق نے بہت کمال لکھا ہے۔ سبق آموز' معاشرے کی برائیوں کی نشاندہی کرتی' طرز تحریر' بے ساختگی بہت نمایاں تھی۔

ناولٹ میں ''حادثہ'' حیا جیسی معصوم اور نادان لڑکیوں کے لیے مشعل راہ بنی' بہترین کہانی تھی۔ طرز تحریر کچھ خاص پسند نہیں آیا'' افسانے'' ''اس در کا جوگی'' سمیرا حمید اپنا ریکارڈ قائم رکھے ہوئے ہیں۔ حکیم صاحب کے حبس زدہ قید خانے کا قیدی ان کا ہیرا چرا لے گیا، بہت ہی عمدہ کہانی تھی۔ ''سکندر کا مقدر'' مزاحیہ سی' بے تکلف سی کہانی اچھی لگی'' میکے کا مان'' سبق آموز اور دکھی کر دینے والی کہانی تھی۔ ''میں عورت ہوں'' افسانوں میں نمبر لے گئی۔



نادرہ خاتون



خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com

غزلوں میں ''افتخار'' کی غزل پسند آئی۔ رنگا رنگ پھول میں 'پہلا ایڈیشن' پڑھ کر ہنسی۔

ج: پیاری عائشہ! حسب روایت آپ کا تبصرہ دلچسپ اور جامع ہے۔ بہت اچھا تبصرہ کرتی ہیں آپ۔ بہت شکریہ۔

ناہید اسماعیل...... کراچی

روحی انشاء کی وفات کا پڑھ کے بہت دکھ ہوا۔ ابھی تو محترمہ شکیلہ انشاء کا غم تازہ ہے کہ روحی انشا کی وفات۔ اللہ تعالیٰ مرحومین کی مغفرت فرمائے۔

ٹائٹل پسند نہیں آیا۔ کہنی سنی اچھی لگی۔ واقعی رائٹرز کی صلاحیتیں اللہ کا تحفہ خاص ہیں جو خاص لوگوں کو ودیعت کیا جاتا ہے۔ سو سب سے پہلے خاص رائٹر سمیرا حمید کی تحریر پڑھی۔ کچھ جملے تو بے ساختہ دل میں اتر گئے جیسے، ''آواز ہی کچھ ایسی تھی کہ وہ سوتا ہی رہ جاتا تو کتنا

ظلم ہوتا اس پر۔۔۔اس پر۔۔۔دونوں پر۔۔۔"

"اسے بھی برا لگا کہ آخر ایسا کون ہے جو اس کے آگے جھک جانے کے لیے تیار نہیں ہے۔"

"اسے بڑا انتظار تھا کہ۔۔۔کوئی جوگن ہو کر اسے جوگی کر دے۔"

"جان دے کر یہ جان لینے کے لیے کہ محبت کے تاج میں ہجر کے موتی کون پرو دیتا ہے ایک سے دوسرے۔۔۔ماہی ماہی کون کوکتا ہے۔"

اور یہ کہ "وہ کہہ دیتا میں ہار گیا۔۔۔اس کے در کا جوگی روگ کا کاسہ توڑ دیتا۔"

اور اختتام نے تو دل کو بڑا قرار دیا "میں جس کا نام نہیں جانتا اسے میرے نام کر دیں۔"

سچ میں اس بے نام کے "اب" نے تو ہمیں بھی تڑپا دیا، واہ سمیرا کتنا پیارا لکھا آپ نے، دل خوش ہو گیا۔

راشدہ رفعت کی تحریر کے تو عنوان نے ہی لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دی، راشدہ کی خوبی ہے کہ وہ بظاہر معمولی اور غیر اہم نظر آنے والی (لیکن حقیقت میں اہم اور حساس) چیزوں کی طرف بڑے ہلکے پھلکے اور دلچسپ و دلکش پیرائے میں توجہ دلا کر دل موہ لیتی ہیں۔ ان کی بہن بشریٰ احمد بھی بہترین رائٹر ہیں، ان سے بھی کچھ لکھوائیں ناں۔

"حالم" میں ایک طرف تالیہ کی ذہانت اور چالاکی متاثر کر گئی تو دوسری طرف آریانہ کا فاتح سے بچھڑنا بے اختیار آنکھیں نم کر گیا۔ "دشت جنوں" میں اس بار خوش نصیب کا نصیب یاوری کر گیا جو وہ سبز طوطا بنتے بنتے رہ گئی۔ تین سال بھی گزر گئے، اب ہم ان تین سالوں کی روداد جاننے کے لیے بے چین ہیں۔ نعیمہ ناز کی "ادھوری" بہت اچھی لگی کچھ جملے تو بہت اچھے لگے، ہما کہیں کہیں ٹھیک بھی لگی تو کہیں غلط، شادی کا فیصلہ اس کا حق تھا تو معاشرتی لحاظ سے اس کا انتخاب غلط۔ اس طرح قرۃ العین کی تحریر "حادثہ" میں بھی حرا کے غلط انتخاب نے اس کی زندگی کی خوشیوں کو نگل لیا۔ ناظمہ زیدی کی تحریر اچھی اور سچی۔ سرور فاطمہ نے ہلکے پھلکے انداز میں ایک رائٹر کا احوال سنایا۔ نازیہ رزاق نے محبت کی روایتی کہانی خوبصورت انداز میں بیان کی۔ رائٹر نئی مگر انداز پختہ ہے۔ صبا فیصل سے ملاقات پسند آئی مستقل سلسلے بھی اچھے لگے۔

نفسیاتی الجھنوں میں حنا کوثر کے حالات پڑھ کے بے حد دکھ ہوا، کیا وہ اپنی پھپھو کے گھر نہیں رہ سکتیں، والا الامان سے تو بہتر ہوگا۔

ج: پیاری ناہید! اتنے خوبصورت تبصرے کے لیے تہہ دل سے ممنون ہیں۔ آپ نے تمام کہانیوں کے بارے میں بالکل درست رائے دی ہے۔

حنا کوثر پھپھو کے گھر نہیں رہ سکتیں کیونکہ وہ جوائنٹ فیملی میں رہتی ہیں۔ پھپھو کے گھر رہنے کے لیے ان کے سسرال والوں کی رضامندی ضروری ہے۔

زارا، اذکر، جنت، شمائلہ۔۔۔۔گوجرانوالہ

ٹائٹل اچھا تھا۔ حسب معمول سب سے پہلے دشت جنوں پڑھا۔ یہ والی قسط اعلا تھی۔ ٹاپ آف دی لسٹ' حالم۔۔۔ الفاظ ہی نہیں ملتے تعریف کے لیے آریانہ کا پڑھ کر بہت دکھ ہوا اور یہ تالیہ کیا چیز ہے اف۔۔۔ حسن المآب۔ حسنل کی ہٹ دھرمی اور کیا رنگ لائے گی۔ مجھے لگتا ہے کہ سمیع الدین اور حسنل علیحدہ ہوں گے اور یہ ماہ روفیانش کیسے انگلینڈ پہنچ گئی۔ میری فرینڈز بھی پورا شمارہ بہت شوق سے پڑھتی ہیں بلکہ آپ کے تینوں ہی شمارے۔ شاہین رشید سے گزارش ہے کہ صبا قمر کا بھی انٹرویو لیں۔ احمد رضا میر اور صبا فیصل سے ملاقات اچھی رہی۔ خطوں میں کوثر خالد جی کا بے ساختہ انداز بہت اچھا لگتا ہے۔

ج: زارا، جنت اور شمائلہ! خواتین کی پسندیدگی کے لیے بہت شکریہ۔ حسنل کا کیا انجام ہوگا۔ اس کے لیے اب صرف ایک ماہ انتظار کرنا ہوگا۔

اقراء جٹ۔۔۔۔ منچن آباد

نومبر کا ٹائٹل نارمل رہا۔ کہنی سنی میں اچھی اچھی باتیں پڑھیں!! روبی انشاء کے لیے دعائے مغفرت!! کرن کرن روشنی سے دل کو منور کیا انٹرویو "احد میر" سے زبردست رہا۔ "دشت جنوں" جو ہوا اچھا ہوا کیف اور خوش نصیب پھر سے ایک ہو جائیں گے کبھی نہ کبھی تو "حالم" نمرہ جی کیا سسپنس پھیلا دیا ہے، شدت سے اگلی قسط کا انتظار ہے۔ "حسنل المآب" لگتا ہی جا رہا ہے؛ "حادثہ" قرۃ العین ونڈرفل "ادھوری" نعیمہ ناز زبردست۔ پورب پچھم نازیہ رازق رلا دیا، بہت سپر اسٹوری تھی۔ اسی طرح دھماکہ دار انٹریاں دیتی رہیں۔ افسانے چاروں

بہت اچھے تھے۔

ج: پیاری اقراء! آپ کے خط تاخیر سے موصول ہوتے ہیں۔ اس لیے شامل نہیں ہو پاتے۔ آپ جلد لکھیں گی تو ضرور شامل ہوں گے۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

اقصیٰ اقبال اور اقراء اقبال۔۔۔۔شاد باغ لاہور

نومبر کا سرورق ہمیں پسند نہیں آیا کیونکہ ہر چیز آؤٹ آف فیشن سی لگی۔ پلیز سرورق کی ماڈلز کو چاہیے کہ اپنے انداز میں اب تبدیلی لائیں کیونکہ دوپٹہ اور جھمکا پکڑنا، ٹیکہ اور بال صحیح کرنا اسی کی دہائی کا انداز لگتا ہے۔

ہم ایک فرمائش کرنا چاہتی ہیں کہ کرن کرن روشنی میں طلاق یا بیوہ ہونے کے بعد مسلم خواتین جو عدت میں بیٹھتی ہیں، اس عدت کے متعلق احادیث کو شامل کریں۔ شاہین رشید سے گزارش ہے کہ ایف ایم 89.4 کے آر جے عتیق الرحمن بھٹی کا تصویر سمیت انٹرویو شائع کریں۔

اس ماہ ہمارے نام میں سب سے مزے کا خط گڑیا راجپوت کا لگا۔

اس قسط میں کیف چھا گیا تھا کر کے! دشت جنوں تقریباً دو سال ہونے والے ہیں لیکن کسی بھی قسط میں ہمیں اکتاہٹ محسوس نہیں ہوئی۔

حسن المآب اور ایک اچھی تحریر ہے، حسنل کو ہم شروع سے ہی ناپسند کر رہے تھے اور حسنل نے یہ ثابت کر دیا کہ ہم ٹھیک ہی کر رہے تھے۔

نمرہ جی آپ کا بے حد شکریہ کہ آپ کی وجہ سے ہمیں جنت کے پتے، نمل اور اب حالم جیسی بہترین تحریر پڑھنے کا موقع ملا۔ حالم میں ہمارا پسندیدہ کردار داتن عرف موٹی مرغی ہے، ادھوری کی ہما صادق جیسی خود غرض عورتیں ہمیشہ ادھوری زندگی ہی گزارتی ہیں اور فرحت جیسی قناعت پسند اور ایثار کرنے والی خواتین مطمئن اور مکمل زندگی گزارتی ہیں۔

نازیہ جی کی پورب پچھم ہمیں بہت پسند آئی۔ ڈائیلاگز اور منظر نگاری بھی خوب تھی۔

حادثہ کی قرۃ العین صاحبہ سے ہمارا سوال ہے کہ کیا مشکلات کا حل یہ ہے کہ ایک عورت اپنی شکل و صورت کو بگاڑ کر بدصورت ہو جائے؟ یہ کیسا پیغام دیا جا رہا ہے؟ سکندر کا مقدر ایک ہلکی پھلکی اور اچھی تحریر تھی۔ دیگر افسانے بھی اچھے تھے۔

پٹھانوں، سندھیوں اور پنجابیوں پر لکھی گئی بہت سی تحریریں ہم نے پڑھ لی ہیں مگر بلوچوں پر لکھی گئی کوئی تحریر ہم نے آج تک نہیں پڑھی۔ ہم بلوچستان کی تہذیب و ثقافت کو جاننا چاہتے ہیں لہٰذا کسی بہترین مصنفہ سے بلوچ قوم پر بھی کچھ لکھوائیں۔

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں میں حنا کوثر کی روداد جان کر بہت دکھ ہوا اور دل میں یہی بات آئی کہ رسول کریم نے دیور کو موت بلاوجہ نہیں کہا۔

بیوٹی بکس کی امت الصبور سے درخواست ہے:
بعض جوتے پاؤں پر کالے نشان چھوڑ جاتے ہیں، گھریلو ٹوٹکا بتائیں کہ پاؤں ان نشانات سے پاک ہو جائیں۔

پیاری اقصیٰ! 2017 کا فیشن دیکھا ہے؟ لگتا ہے کپڑے کی صنعت زوال پذیر ہے ماڈل نے تو آپ کی تنقید سن کر ہی کان پکڑ لیے، جوتے کے نشان کے بارے میں ٹوٹکا ہم بھی جانتے ہیں سو بتا رہے ہیں کہ جوتے ہی نہ پہنے جائیں۔ نہ جوتے ہوں گے نہ نشان بنیں گے۔ اور ویسے بھی جوتا کلب میں بڑے بڑے عالمی لیڈروں کے نام شامل ہوتے رہتے ہیں۔ آپ ایک نشان سے پریشان ہیں ایک وہ ہیں کہ جوتے کھا کے بے مزہ نہیں ہوتے۔

حادثہ میں آپ نے آخری سطریں نہیں پڑھیں، حرا اپنے چہرے کے نشان پر ہاتھ پھیرتے ہوئے، سوچتی ہے کہ میں اللہ کی رحمت سے مایوس کیوں ہو گئی تھی، حرا نے اپنے حالات کے مطابق جو درست سمجھا کیا۔ ضروری نہیں ہے کہ ہر شخص یہ فیصلہ کرے۔ بلوچستان کے بارے میں اگر کسی مصنفہ نے لکھا تو ضرور شائع کریں گے۔

ثوبیہ شین۔۔۔ باغ خورد

پتا نہیں زندگی کسے کہتے ہیں، مسلسل الجھنیں، کشمکش پریشانیاں۔۔۔ زندگی ایسی کیوں نہیں ہوتی جیسے پھولوں کی سیج، مسلسل جدوجہد اور کوششیں بھی بار آور کیوں نہیں ہوتیں مسلسل امتحان' یہی ہمارا مقدر کیوں؟ زندگی آسان کیوں نہیں ہو جاتی۔ زندگی ایک تھکا دینے والا سفر کیوں؟ جو چاہیے وہ مل کیوں نہیں جاتا۔ کوئی تو حرف تسلی دے مجھے۔۔۔

ثوبیہ! زندگی میں خوشی اور غم ساتھ ساتھ چلتے ہیں، ہاں یہ بھی حقیقت ہے کہ کچھ لوگوں کی زندگی مسلسل آزمائش ہوتی ہے نسلوں کی غربت' بیماری' معذوری' بدحالی ان کی پیچھا ہی نہیں چھوڑتی۔ آپ کے سوالوں کا کیا جواب دیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی مصلحتیں ہیں۔ ہمیں ہر حال میں صبر اور شکر کا حکم دیا گیا ہے۔

ہاں آپ کے اس سوال کا کہ جو چاہیے وہ مل کیوں نہیں جاتا۔ جواب ہے کہ ہمیں جو نہیں ملتا وہ ہمارے حق میں بہتر نہیں ہوتا۔

''حرا ملک''۔۔۔۔۔۔وہاڑی

موسم سرما آخر کار آ ہی گیا۔ میرے تقریباً تمام گھر والوں اور دوستوں کو یہ برفیلا' دھند والا موسم بہت ''فینسی نیٹ'' کرتا ہے کئی کئی دن سورج کا نہ نکلنا اور ہر چیز میں نمی مجھے عجیب سی کوفت میں ڈال دیتا ہے۔

ہاہاہا۔ خیر موسم تو سب ہی پیارے ہوتے ہیں اب آتے ہیں شمارے کی طرف ٹائٹل بالکل بھی پسند نہیں' مطلب ماڈل کا انداز۔ ''حالم'' اور ''دشت جنوں'' دلچسپ ہوتے جارہے ہیں۔ جبکہ ''حسن المآب'' میں شروع شروع والا دلچسپی کا عنصر ختم ہوتا جارہا ہے۔

ایک فرمائش کی تھی میں نے' میری بڑی سسٹر ثمینہ نے' پلیز FM.99 کے RJ فہد عباسی اور ذیشان ناصر کے انٹرویوز شائع کردیں۔

حرا! موسم تو واقعی سب ہی اچھے ہوتے ہیں اور ہر موسم کی اپنی سوغات ہوتی ہے۔ ہمیں گرمیوں کی طویل دوپہریں اور سردیوں کی طویل راتیں بہت اچھی لگتی ہیں۔ سردی میں تو کوئی کام کرنے کو جی ہی نہیں چاہتا۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ شاہین رشید تک آپ کی فرمائش پہنچادی گئی ہے۔

امامہ ملک۔۔۔۔۔جنگلی بانڈی، ہری پور

خواتین ڈائجسٹ میں پہلا خط ہے اگر۔۔۔ اگر آپ نے ردی کی ٹوکری کا پیٹ بھرنے کا ارادہ کیا میرے خط سے (تو۔۔۔ میں آپ پر دفعہ 302 کے تحت مقدمہ درج کرواؤں گی۔ باہر جانے کی اجازت ہمیں نہیں۔۔۔ کالج وغیرہ بھی نہیں جاتے ہم کہ اسی بہانے خط پوسٹ کر والیں۔۔۔ اب رہ گئے بھائی۔۔۔ بڑے دونوں بھائیوں کے سامنے تو خط کا نام لینا بھی گویا ''ناپاک جانور'' کا نام لینا ہے پوسٹ کروانے کا تو چھوڑیے۔۔۔ صرف ایک چھوٹا بھائی ہے جو میری بات کبھی کبھار مان لیتا ہے۔۔۔ اگر خیالات اس کے بھی ایسے ہی ہیں لیکن وہ دل کا بہت اچھا ہے اور کچھ کچھ کراچی جانے اور اس ماحول سے نکلنے کا بھی اثر ہے (وہ کراچی نیوی کے شعبے میں ہے۔)

ہم نے بہت سے ڈائجسٹ پڑھے ہیں۔۔۔ لیکن خواتین جیسا معیار کسی میں نہ پایا۔ اس کی کہانیاں ہمارے گھر کی' ہمارے اردگرد کی کہانیاں ہیں۔ اور سب سے بڑی بات پروف کی غلطیاں بہت کم ہونا۔ آپ یقین کریں جتنا پروف کی غلطی کوفت میں مبتلا کرتی ہے نا۔ اتنا غصہ اور کسی چیز پہ نہیں آتا۔۔۔ اور اکثر ڈائجسٹوں میں یہ غلطی عام ہے۔۔۔ الحمدللہ خواتین' شعاع کو ہمیشہ بہترین رائٹرز کا ساتھ میسر ہوا ہے۔۔۔ کتنے ہی پتھروں کو تراش کے نگینہ بنایا ہے۔۔۔

خواتین کی تمام رائٹرز بہترین ہیں لیکن نمرہ احمد، ایمل رضا، سائرہ رضا اور سمیرا حمید میری پسندیدہ ترین رائٹرز ہیں۔۔۔ اور سمیرا حمید سے ایسی عقیدت اور محبت ہے کہ آپ اندازہ نہیں کرسکتیں۔ سمیرا حمید اب صف اول کی قلم کار شمار ہوتی ہیں۔ ان کا لفظ لفظ دل میں اترتا محسوس ہوتا ہے۔

نمرہ احمد تو جب لکھتی ہیں، جادو کردیتی ہیں ان کی کہانی ختم کیے بغیر اٹھنے کو جی نہیں چاہتا اور منظر نگاری اور مکالمے اتنے بے ساختہ ہوتے ہیں کہ لگتا ہے کردار ہمارے سامنے ہیں۔ نمرہ احمد کی ہیروئن اور ہیرو ہمیشہ اتنے ذہین، خوبصورت، ماڈرن، امیر کبیر اور اتنے پرفیکٹ کیوں ہوتے ہیں۔۔۔؟؟؟

ایمل رضا، سائرہ رضا اور عفت سحر بھی بہت بہترین لکھتی ہیں۔۔۔ آمنہ ریاض بھی معیاری نام ہے اور بہت بہترین مصنفہ ہیں۔۔۔ بس یہ خوش نصیب کے ساتھ مزید برانہ کریں اور آیو کستی کا بھید کھول دیں۔

مجھے لمبی لمبی کہانیاں بہت اچھی لگتی ہیں جیسے نمرہ احمد کی ''جنت کے پتے'' اور اب اگر وہ اس کا تیسرا حصہ بھی لکھ دیں تو کیا خوب ہو۔ ویسے نمرہ احمد سے شعاع کے لیے بھی لکھوائیں نا پلیز۔۔۔ یوں تو زیادہ تر قارئین نمرہ احمد اور شاہین رشید کا انٹرویو پڑھنا چاہتی ہیں لیکن شاہین

رشید! ہم آپکی صحافت اور انٹرویو لینے کے فن کے معترف اس وقت ہوگئے جب ہم رضیہ آنٹی اور نادرہ آنٹی کا انٹرویو پڑھیں گے۔۔ اور نمرہ احمد اور سمیرا حمید کا بھی انٹرویو شائع کردیں۔

خواتین میں ایک قاریہ لکھا کرتی تھیں۔۔۔ نام تو نہیں یاد۔۔۔ پر بڑا فلسفیانہ اور ''اوکھے اوکھے'' الفاظ والا خط ہوتا تھا شاید حرا۔۔۔ نام تھا۔ ثوبیہ نور بھی کہاں گئیں۔ کہاں گم ہیں پلیز ان کو بلائیں۔۔۔

ج: پیاری امامہ! چار کہاں، پورے چوبیس چاند لگ گئے ہیں آپ کے خط سے آپ کے خواتین کو، آپ کو نہیں پتا چھوٹی بہن ہونا بھی کم دردناک نہیں۔

ردی کی ٹوکری کہہ رہی ہے کہ اگر شاعر' میری شان میں دیوان لکھتا تو وہ بھی میرے ہی پیٹ میں جاتا۔ آپ کا خط اس لیے چھوڑ رہی ہوں کہ اتنی محنت اور محبت سے لکھی گئی باتیں میرا ہاضمہ خراب کردیتی ہیں۔

آپ نے جن قاری بہن کے خطوط کا ذکر کیا ہے۔ وہ حرا قریشی ہیں۔ ملتان سے ہمیں خط لکھتی تھیں۔ اب کافی عرصہ سے نہیں لکھا۔ ثوبیہ نور کہاں ہیں؟ یہ تو وہ خود ہی بتا سکتی ہیں۔ سمیرا حمید کا انٹرویو ان شاء اللہ بہت جلد پڑھیں گی امامہ! پورا خط تو آپ نے اردو میں لکھا اور نام انگریزی میں وہ غلط انگریزی میں آپ نے UMAMA لکھا ہے۔ اب اسے ہم بھی عمیمہ ہی پڑھیں گے ناں اگر آپ کے درمیان میں امامہ نہ لکھتیں تو ہم نے عمیمہ ہی لکھنا تھا۔

مہرالنساء۔۔۔۔۔۔نامعلوم شہر

جناب یہ ہماری زندگانی کا اکلوتا پہلوٹھی کا خط ہے جس کو کہ لکھنے کے بعد ہم باقاعدہ پوسٹ بھی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ نمرہ احمد، اف میرے خدا کیا ہی غضب کا شاہکار تخلیق کیا ہے۔

انڈیا کے لافٹر شوز دیکھ کر ہمیں لگتا تھا کہ مزاح کی حس شاید ہم میں ناپید ہوگئی ہے۔ یا بیمار ہے۔ جس بات پر وہاں کے تماشائی قہقہے لگاتے ہیں اس پر تو ہم کو ہنسی بھی نہیں آتی تھی۔ مگر اب جب ہم انشاء جی کو پڑھتے ہیں تو بے ادب اور باادب مزاح کا پتا چلتا ہے۔

اور ہم دو بہنیں ہیں جو آپ کے رسالوں کی گزشتہ بارہ سالوں سے کونگی قاری ہیں کیا آپ یقین کریں گی کہ ہم جس کاغذ پر آپ کو یہ خط لکھ رہے ہیں وہ چونتیس سال پرانا کاغذ ہے۔ ہمارے ابا حضور جب اپنی ہندوستان میں موجود سسرال کو خط لکھتے تھے تو یہی لیٹر پیڈ ان کا پیغام لے کر ہماری اماں حضور کے پاس جاتا تھا اور اب اس کو ہم نے ابا حضور کے بکسے میں سے یہ سوچ کر اس حبس بے جا سے نجات دلادی ہے کہ اب تو ابا حضور وہاں والوں سے واٹس ایپ پر بات کرلیتے ہیں۔

پیاری مہرالنساء! یہ پہلوٹھی کا خط تو بڑا پرلطف تھا مگر اکلوتا نہیں ہونا چاہیے اور جذباتی لوگ تو اپنے محبوب کو خون سے خط لکھ ڈالتے تھے آپ پنسل سے لکھ سکتی ہیں لیکن پینسل سے لکھے ہوئے کو پڑھے گا کون؟ گونگوں کو زبان مل جائے تو یہ تو بڑی اچھی بات ہے مگر اس سے بھی کمال بات' زبان رکھتے ہوئے دوسروں کو اس کے شر سے بچانا ہے اور اللہ کے واسطے' یہ آپ سب اپنی نگارشات کی اشاعت کے لیے' ہمیں اللہ کا واسطہ نہ دیا کریں، بہت سی چیزیں پالیسی سے متصادم ہوتی ہیں۔ اور اللہ کے واسطے کے بعد بھی ہم انہیں رد کردیتے ہیں تو اللہ سے بڑا ڈر لگتا ہے۔ انڈیا کے لافٹر شو کے بارے میں آپ کی رائے سے متفق ہیں۔ انہیں دیکھ کر ہنسی کے بجائے رونا آتا ہے۔ گھٹیا مذاق' پست ذوقی اور پھکڑ پن اور بے ہودگی کو مزاح نہیں کہہ سکتے۔

سدرہ بتول، رفعت، ماریہ۔۔۔۔۔۔ملتان

سائرہ رضا اور نمرہ احمد کے ساتھ سمیرا حمید کا نام دیکھ کر یوں لگا ہفت اقلیم کی دولت ہاتھ آگئی پھر رات سات بجے رسالہ اٹھایا اور ساڑھے گیارہ بجے تک کھوئی رہی (اتنا کھوئی کہ کھانا پینا سب گول) سکندر کا مقدر پڑھ کے مزہ آیا، نعیمہ ناز کا ناول اچھا تھا بٹ اینڈ میں تھوڑی کمی سی لگی لیکن بعض جگہ ڈائیلاگ بہت مزے کے تھے۔ پھر سمیرا حمید پڑھ کر بے ساختہ واہ واہ نکلا۔ آؤٹ اسٹینڈنگ اسٹوری اور ڈائیلاگ، کاجل کی جگہ سرمہ آنکھوں میں لگا تھا اور محبوب قدموں میں بیٹھا تھا'' اور'' اس کا ماننا تھا کہ محبوب قدموں میں گرانے کے لیے نہیں ہوتا۔ آخری لائن نے تو میلہ لوٹ لیا۔ سائرہ رضا کے بارے میں کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانے کے برابر ہے۔ ناظمہ زیدی کا نام دیکھ کر' مبارکاں جی آپ کا افسانہ چھپ گیا اور مزے کا تھا۔ ''پورب پچھم'' شروع میں بس منظر نگاری ہی زیادہ تھی

لیکن پھر آخر میں جب سب اچھا پڑھا تو پسند آیا۔ لیکن "ذا زرانم" کا مطلب تو پھر بھی نہیں بتایا رائٹر نے نمرہ احمد کا ناول پڑھ کے بھی واہ واہ کی۔

پیاری سدرہ! محبوب کی جگہ واقعی قدموں میں نہیں ہوتی مگر عاشق کے پاس بھی تو عزت نفس ہونی چاہیے۔ محبت کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ محبوب کو دیوتا کا درجہ دے کر اس کے در کے بھکاری بن جائیں۔ محبت غلامی کا نام نہیں، جو عزت نہ کرے، جذبات و احساسات کا خیال نہ رکھے، خامیوں سمیت قبول نہ کرے وہ اور سب کچھ ہو سکتی ہے مگر محبت نہیں۔

آپ کو جو ناول درکار ہیں۔ ان کے بارے میں قیمت اور دوسری معلومات کے لیے اس نمبر پر فون کریں

021-32735021

پروین عزیز ۔۔۔۔۔ کراچی

نومبر کے شمارے میں نعیمہ ناز کا ناول ادھوری پڑھ کر یہ سوچ در آئی کہ آخر نعیمہ ناز عورت کے کس روپ کو ظاہر کر رہی ہیں' ہما صادق کا کردار قابل رحم عورت کا ہے یا قابل نفرت اس میں ممتا بھی ہے مگر ممتا کا تقدس نہیں۔ نمرہ احمد حالم کی صورت شمارے پر چھائی ہوئی ہیں۔ سمیرا حمید کا اس در کا جوگی اچھی تحریر رہی سکندر کا مقدر میں راشدہ رفعت نے اللہ تعالیٰ کی حکمت کو بڑے خوب صورت انداز میں پیش کیا۔

ج: اسکرین پر جگمگاتے، روشنیوں میں نہاتے چہروں کے پیچھے کتنی تلخ سچائیاں' کتنے دکھ چھپے ہوئے ہیں۔ اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہوئے کتنے سمجھوتے کرنا پڑتے ہیں نعیمہ ناز نے ان ہی حقیقتوں سے پردہ اٹھایا ہے۔ ظالم اور مظلوم کی بات نہیں، ہر چیز کی ایک قیمت ہوتی ہے' ہما صادق مظلوم تھی نہ ظالم وہ صرف اپنی خواہشات کی غلام تھی جس کے لیے وہ ہر قربانی دینے کے لیے تیار تھی۔

گلفرین مشتاق ۔۔۔۔۔ رائے ونڈ

اردو ادب کا ادب ہمیں گھٹی میں پلایا گیا۔ ہوش سنبھالتے ہی اپنے پیارے دادا جان کو "نسیم حجازی" کے ناولز پر دل گیر ہوتے دیکھا بڑے بھائیوں کو چھپا چھپا کر جاسوسی ناولز پڑھتے اور امی جان اور بڑی بہنوں کو بھی کسی نہ کسی کتاب کا مطالعہ کرتے دیکھ کر ہمارا معصوم دل بھی اردو ادب کے اس عمیق سمندر میں غوطہ کھانے کے لیے مچلنے لگا اور پھر ایسا غوطہ لگایا کہ آج تک ابھرنے کی چاہ نہیں۔ میں گزشتہ چار سالوں سے ادارے کے تینوں پرچوں کی باقاعدہ قاری ہوں۔ عمیرہ احمد ہوں یا نمرہ احمد' سمیرا حمید ہوں یا سائرہ رضا سب کو اللہ نے اتنا اعلا انداز بیاں دیا ہے کہ بیان سے باہر ہے۔

نمرہ احمد کے "نمل" کے سحر سے نکل نہ پائے تھے کہ "حالم" نے اپنا جال پھینک کر اپنی گرفت میں لے لیا۔ تالیہ مراد کرمنل ہو یا فراڈ، چور ہو یا جھوٹی لیکن دل کے بہت ہی قریب جگہ پائی ہے اس کردار نے، حسن المآب کے کیا کہنے۔۔ چھا گئیں سائرہ رضا آپ تو لیکن یہ کیا حسنل کی وجہ سے جہاں دعاؤں پر یقین محکم ہوا وہیں اس کی باغیانہ روش نے دل دکھایا۔

"دشت جنوں" آمنہ ریاض آپ نے خوش نصیب کو بے چارہ سا بنا کر اچھا نہیں کیا۔ اللہ پوچھے گا اس شامیر منحوس کو تو، ویسے ایکسٹریم پر ہے ناول ۔۔۔ ویل ڈن جی ویل ڈن۔

ج: پیاری گل فرین! دیر سے آئیں مگر خوب آئیں، بہت خوشی ہوئی کہ آپ نے ہمارے بارے میں اتنے اچھے جذبات کا اظہار کیا۔

جہاں تک شاہ میر کی بات ہے تو اسے اللہ بھی پوچھے گا اور بندے بھی۔ تھوڑا انتظار کر لیں کہ وہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ اور یہ کون سی عجیب بات ہے کہ تالیہ آپ کے دل کے قریب ہے۔ دل تو کسی پر بھی آ سکتا ہے۔



آمنہ ریاض

دشتِ جنوں

قلعہ فلک بوس کا آسیب آیوشمنی۔۔۔ ایک بھٹکتی روح جس کے اسرار سے کوئی واقف نہیں ہے۔

معاویہ فلک بوس آتا ہے تو اسے وسامہ کی ڈائری ملتی ہے۔

فلک بوس میں وسامہ اپنی بیوی آئے کت کے ساتھ رہتا ہے۔ وسامہ بہت اچھا اور ذہین مصنف ہے۔ وہ باوقار اور وجیہہ شخصیت کا مالک ہے لیکن ایک ٹانگ سے معذور ہے۔ وہ غیر معمولی سا اس ہے۔ اسے قلعہ فلک بوس میں کوئی روح محسوس ہوتی ہے۔ آوازیں سنائی دیتی ہیں لیکن کوئی نظر نہیں آتا۔ معاویہ' وسامہ کا پھوپھی زاد بھائی ہے' آئے کت اور وسامہ' معاویہ کو یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ قلعہ فلک میں آیوشمنی کی روح ہے لیکن معاویہ مضبوط اعصاب کا مالک ہے' اسے اس بات پر یقین نہیں آتا۔

کہانی کا دوسرا ٹریک جہاں بھائی جوائنٹ فیملی سسٹم کے تحت رہتے ہیں۔

صابر احمد سب سے بڑے بھائی ہیں۔ صابر احمد کی بیوی صباحت تائی جان ہیں اور تین بچے' رامین' کیف اور فہمینہ ہیں۔ رامین کی شادی ہو چکی ہے۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ ملائیشیا میں ہے۔

شفیق احمد کی بیوی فضیلہ چچی ہیں۔ مالی لحاظ سے وہ سب سے مستحکم ہیں۔ شفیق احمد نے ان سے پسند کی شادی کی تھی۔ دو بیٹیاں صیام اور منہا ہیں اور دو بیٹے شاہ جہاں اور شاہ میر ہیں۔ بڑے بیٹے شاہ جہاں منصو بھائی کا دماغ چھوٹا رہ گیا ہے۔

باسط احمد تیسرے بھائی کا انتقال ہو چکا ہے۔ ان کی بیوی روشن امی اور دو بیٹیاں خوش نصیب اور ماہ نور ہیں۔ خوش نصیب کو سب منحوس سمجھتے ہیں' جس کی وجہ سے وہ تنگ مزاج ہو گئی ہے۔ خوش نصیب کی نانی بھی ان کے ساتھ رہتی



ہیں۔ خوش نصیب کو دونوں چچاؤں سے شکایت ہے کہ انہوں نے ان کا حق نہیں دیا ہے۔ گھر کا سب سے خراب حصہ ان کے پاس ہے۔ صباحت تائی جان اور روشن امی خالہ زاد بہنیں ہیں۔ صباحت تائی جان کے چھوٹے بھائی عرفات ماموں، جو بہت نرم گفتار اور دل موہ لینے والی شخصیت کے مالک ہیں۔ انہوں نے شادی نہیں کی۔ وہ کیف کے ماموں ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا آئیڈیل بھی ہیں۔

کہانی کا تیسرا ٹریک منفرا اور نیمی ہیں۔ منفرا امریکہ میں پڑھنے آئی ہے۔ ہاسٹل میں رہتی ہے۔ زیر زمین ٹرین میں ان کی ملاقات معاویہ سے ہوتی ہے۔ منفرا کی نظریں معاویہ سے ملتی ہیں تو اسے وہ بہت عجیب سا لگتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی سفاکی اور بے حسی ہے۔ منفرا چونک سی جاتی ہے۔

ایک حادثے میں آئے کت اپنے بچے سے محروم ہوجاتی ہے اور اس کا ذمہ دار معاویہ کو سمجھتی ہے۔ معاویہ اس سے شادی کا فیصلہ کرتا ہے، مگر وہ انکار کرکے اپنے وطن لوٹ جاتی ہے۔ معاویہ اپنے گھر آجاتا ہے۔ کچھ سالوں بعد صاعقہ ممانی کے بھتیجے کی شادی میں دونوں کی ملاقات ہوتی ہے۔ جہاں معاویہ آئے کت سے اپنی شادی کا اعلان کرتا ہے۔ صاعقہ ممانی، ماموں، معاویہ کے والد سب اس رشتے سے ناخوش ہیں، مگر معاویہ اپنے دلائل سے انہیں قائل کرلیتا ہے۔ کچھ رد و کد کے بعد آئے کت بھی راضی ہوجاتی ہے۔

شاہ میر کچھ شعبدے دکھا کر پورے گھر کو متاثر کرتا ہے، مگر خوش نصیب اس کی باتوں میں نہیں آتی البتہ اس کے دل و دماغ پر ضرور ان باتوں کا اثر ہوتا ہے۔

منفرا کے والد مسٹر جمال پاکستان جانے کے لیے بضد ہیں، مگر ان کا بیٹا آدم تیار نہیں۔

معاویہ کی آئے کت سے شادی کو وادی کے تمام لوگ نیک شگون سمجھ کر سراہتے ہیں۔ اردشیر ازی ناراضی بھول کر اپنی دوسری بیوی اور تینوں بچوں سمیت فلک بوس پہنچ جاتے ہیں اور شادی کے انتظامات انتہائی اعلا پیمانے پر کرواتے ہیں۔ مہندی کی رات آئے کت کو فلک بوس کی عمارت پر ایک ہیولہ نظر آتا ہے۔

منّو بھائی خوش نصیب کو خودکشی کرتا دیکھ کر بچا لیتے ہیں۔ پورے خاندان میں اس بات کا بتنگڑ بن جاتا ہے۔ خوش نصیب اپنے اس فعل سے خود بھی حیران ہوتی ہے، اسے خود نہیں معلوم کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ صباحت بیگم کو فضیلہ چچی کی اس معاملے میں نکتہ چینی بری لگتی ہے۔ وہ فہمینہ کو روشن امی کی بھری جوانی میں بیوگی اور مشکلات کا بتاتی ہیں جنہوں نے روشن امی کے شوخ مزاج کو بدل کے رکھ دیا تھا۔

آدم کا خیال ہے کہ اس کے والد منفرا کی شادی اس کے بچپن کے دوست شامیر سے کریں گے۔ مگر وہ اس خیال کو رد کرتی ہے۔ وہ اسے صرف دوست سمجھتی ہے۔

خوش نصیب کی خودکشی کی خبر کیف کو بھی مل جاتی ہے۔ وہ اسے فون پر تنگ کرتا ہے تو وہ غصے میں شامیر کے جبران سے ملنے کی ضد کرتی ہے اور اگلے روز شامیر ایک زیر تعمیر بنگلے پر اس کی ملاقات جبران سے کراتا ہے۔ جبران روایتی جن نہیں بلکہ غیر معمولی حسن کا حامل پراسرار سا شخص ہے۔ شامیر خوش نصیب کو کمرے میں بند کرکے چلا جاتا ہے۔

آئے کت کسی بھی آسیب کو ماننے سے انکار کردیتی ہے اس کے خیال میں کوئی انہیں ڈرا رہا ہے۔ مگر معاویہ اسے آسیب ہی سمجھتا ہے۔ کسی بھی ناخوشگوار واقعے سے بچنے کے لیے وہ نکاح کا انتظام کرتا ہے۔ مگر عین نکاح کے وقت آئے کت پراسرار انداز میں غائب ہوجاتی ہے۔

خوش نصیب تھوڑی کوشش کرکے باہر آجاتی ہے۔ ایک دوسرے کمرے میں اسے شامیر پیری والے ملنگ بابا کے ساتھ شیطانی عملیات میں مصروف نظر آتا ہے، وہیں جبران ہوتا ہے جو اسے دیکھ لیتا ہے۔ جبران خوش نصیب کو وہاں سے نکال دیتا ہے فرار ہونے شامیر کی اصلیت سے آگاہ کرتا ہے۔ جبران درحقیقت معاویہ ہے جو کسی روح کی تلاش میں شامیر سے ٹکرایا ہے۔

شامیر کے دھمکانے پر خوش نصیب گھر میں کسی کو بھی اس کی اصلیت سے آگاہ نہیں کرتی۔ فضیلہ چچی صیام کا رشتہ شامیر اور کیف کے لیے منہا کا عندیہ دیتی ہیں۔ کیف گھر آتا ہے۔ جہاں خوش نصیب اسے شامیر کے بارے میں بتانا چاہتی ہے مگر صباحت تائی کے آنے سے بات ادھوری رہ جاتی ہے۔

شامیر کو شیطان کی بھینٹ چڑھانے کے لیے ایسی لڑکی کی ضرورت تھی۔ جس کی پیشانی پہ تل ہو۔ خوش نصیب اس کے خیالات اور دھمکیاں سن کر بہت پریشان ہوتی ہے اور اس کی حقیقت کیف کو بتاتی ہے، مگر کیف اس بات کو ہنسی میں اڑا دیتا ہے۔

شامیر اور صیام کی منگنی ہوتی ہے تو خوش نصیب کیف کی پسند کا بتاتی ہے، یوں صیام کی منگنی شامیر کے بجائے کیف سے ہوجاتی ہے۔ کیف خوب غصہ کرتا ہے، مگر خوش نصیب نے یہ سب صیام کو بچانے کے لیے کیا ہے کیوں کہ اس کی پیشانی پہ بھی تل ہے۔

شامیر خوش نصیب کو نئے سرے سے دھمکاتا ہے۔ اپنے والدین کی شادی کی سالگرہ پر منفرا کی اتفاقی ملاقات معاویہ سے ہوتی ہے وہ اسے سب سے ملواتی ہے۔ سب اس کے حسن اور دولت سے متاثر ہوتے ہیں۔

بشام کے جنگل سے ایک عورت کی مسخ لاش ملتی ہے۔ اس کے جسم پر آئے کت کا عروسی جوڑا تھا، مگر معاویہ نے اسے آئے کت ماننے سے انکار کردیا۔ وہ اس کی تلاش کا ارادہ رکھتا تھا، مگر اردشیر ازی نے اس سلسلے میں اس کی کسی بھی قسم کی مدد کرنے سے انکار کردیا۔ کیوں کہ آئے کت کے تمام اکاؤنٹس خالی پڑے تھے اور اس کا فریب کھل گیا تھا، مگر ان سب باتوں کے باوجود معاویہ اس کی تلاش کا ہر ذریعہ اپناتا ہے اور ناکام رہتا ہے۔ اس ناکامی نے اسے تلخ اور بدمزاج بنا دیا ہے۔

مونٹوک میں اس کی منفرا اور آدم سے ملاقات رہتی ہے۔

خوش نصیب، عرفات ماموں کو شامیر کی اصلیت سے آگاہ کرتی ہے۔ وہ مخمصے میں پڑ جاتے ہیں۔ کیف کو اس کی باتوں پر ذرا یقین نہیں آتا۔ عرفات ماموں کو فالج ہوجاتا ہے۔

شامیر خوش نصیب کو دھمکاتا ہے کہ ماموں کو یہ سزا اس نے دی ہے اور آئندہ اس کے حمایتیوں کا اور وہ برا حشر کرے گا۔

ماہ نور، شامیر سے محبت کا اعتراف کرتی ہے۔ خوش نصیب اسے باز رکھنے کی کوشش کرتی ہے تو وہ ناراض ہوجاتی ہے۔

فضیلہ چچی خوش نصیب کو بہو نہیں بنانا چاہتیں مگر شفیق چچا کے سمجھانے پر راضی ہوجاتی ہیں۔ خوش نصیب طوطے بھائی سے شادی پر معترض ہے مگر روشن امی اسے لفٹ نہیں کراتیں۔ خوش نصیب تمام سچائی عرفات ماموں کو بتاتی ہے، انہیں یقین آجاتا ہے۔ کیف بھی سن لیتا ہے مگر کشمکش و پیچ کا شکار ہوتا ہے۔

صیام کیف کی بے رخی سے تنگ آکر شامیر کو خود سے شادی کرنے کا عندیہ دیتی ہے۔ شامیر انکار کردیتا ہے۔

معاویہ، منفرا سے شادی کرنا چاہتا ہے اور یہ بات اپنے والد کو بتاتا ہے۔ وہ خوشی کا اظہار کرتے ہیں اور چاہتے کہ یہ شادی فلک بوس میں ہو۔ معاویہ راضی ہوجاتا ہے۔

بائیسویں قسط

☆☆☆

''تم...... تم معاویہ ہو نا؟ معاویہ اردشیر ازی؟'' ایک نسوانی ہاتھ آگے آیا تھا اور اس نے معاویہ کی جیکٹ کے کالر کو پکڑ کر اسے پیچھے گھسیٹنے کی کوشش کی تھی۔

معاویہ کو ایک جھٹکے سے رکنا پڑا تھا، ساتھ چلتی منفرا بھی رک گئی تھی اور اب حیرت سے پیچھے مڑ کر دیکھ رہی تھی۔

وہ جو کوئی بھی تھی، جس بھی مقصد کے لیے اس نے معاویہ کو روکا تھا، بہرحال کالر سے پکڑ کر روکے جانا نہ صرف معاویہ کے لیے حیرت کا باعث بنا تھا بلکہ ——— اس نے شدید ناگواری محسوس کی تھی۔ لحہ بھر میں ہی اس کے غصے کا گراف آسمان کو چھونے لگا۔ وہ رک گیا تھا، پیچھے کی طرف مڑ بھی گیا تھا لیکن اس کا چہرہ بتاتا تھا کہ اتنی جرات کا مظاہرہ کرنے والے انسان کا تعلق مخالف جنس سے نہ ہوتا تو اب تک وہ اسے دھول چٹا چکا ہوتا۔ بہت مشکل سے اس نے اپنے ہاتھ کو حرکت میں آنے سے روکا تھا۔

اور وہ لڑکی...... وہ سر سے پاؤں تک عبایا میں لپٹی تھی حتیٰ کہ اس کا چہرہ بھی نقاب کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔

مناسب قد و قامت والی وہ لڑکی...... اس کی پھولی ہوئی سانسیں گواہی دیتی تھیں کہ وہ بھاگتی ہوئی معاویہ اور منفرا کے پاس آئی تھی۔

معاویہ نے اس نقاب پوش چہرے کو کھوج کر اسے پہچاننا چاہا تھا لیکن ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ لمحے کے ہزارویں حصے میں معاویہ نے ایک جھٹکے سے اپنا کالر اس کی مٹھی سے آزاد کروایا تھا۔

"کون ہو تم؟ اور یہ کیا بدتمیزی ہے؟" معاویہ جب پہچاننے میں ناکام رہا تو بے حد سختی سے بولا تھا۔

اس کے لیے یہ سب صورت حال بہت ناگوار تھی۔ اس کی مینگی ساتھ تھی اور ایک انجان لڑکی مال میں اس کا گریبان پکڑے کھڑی تھی۔ دوسری طرف اب ان کے اردگرد لوگ اکٹھا ہونے لگے تھے۔ لوگوں کے ہاتھ مفت تماشا آیا تھا...... کیسے جانے دیتے۔

معاویہ اردشیر ازی...... بزنس کی فیلڈ کا ایک جانا پہچانا نام...... اسے سب سے الگ تھلگ نظر آنا پسند تھا...... سب سے بڑھ کر، سب میں نمایاں...... اسے ہجوم کا حصہ بننا بھی پسند نہیں رہا اور ایسے ہجوم کا تو کبھی بھی نہیں جس میں وہ کسی منفی انداز میں مرکزِ نگاہ بن جائے۔

"کیا بات ہے بی بی...... تنگ کر رہا ہے یہ آپ کو؟" ایک لڑکے نے آگے بڑھ کر ہیرو بننے کی کوشش کی۔

یہ بھی المیہ ہے ہمارے معاشرے کا کہ جب بھی کہیں کسی مرد اور عورت کو بحث کرتے دیکھتے ہیں، تو قصور وار ہمیشہ مرد کو ٹھہرایا جاتا ہے......

"نہیں...... نہیں...... ایسا کچھ نہیں ہے...... پلیز آپ لوگ جائیں یہاں سے......" وہ لڑکی ٹپٹا کر بولی تھی۔ اپنی حرکت کے بے تکے ہونے کا احساس اسے شدت سے ہوا تھا۔

"ایکسکیوزمی...... آپ مجھے بتائیں کیا مسئلہ ہے؟" منفرا معاویہ کے آگے آ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے لہجے میں حیرت بھی تھی اور خفگی بھی۔ اسے احساس ہوا تھا کہ وہ اس لڑکی سے بہتر طور پر ڈیل کر سکتی ہے۔

"آپ...... آپ کون؟" آگے سے سوال ہوا تھا۔

"میں وائف ہوں ان کی...... مگر آپ کون ہیں اور یہ سب کیا ہے؟" منفرا نے ایک نظر معاویہ کو دیکھتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"اوہ...... میں...... میں......" وہ ہچکچاتے ہوئے بولی تھی۔ "معاویہ جانتے ہیں مجھے۔"

"کیا۔۔۔؟" معاویہ ہکا بکا رہ گیا۔ "او بی بی! میں نہیں جانتا تمہیں۔"

اتنی دیر میں منیجر بھی وہاں پہنچ گیا۔ "ایکسکیوزمی راستہ دیجیے۔۔۔ راستہ دیجیے پلیز۔۔۔"

وہ مشکل سے ہجوم میں راستہ بناتے ہوئے ان لوگوں تک پہنچا تھا۔ اس کے ساتھ سیکیورٹی گارڈز بھی تھے جنہوں نے آتے ہی لوگوں کو وہاں سے ہٹانا شروع کر دیا تھا۔

"مسٹر معاویہ......؟" منیجر نے اسے پہچان لیا تھا۔ "کیا ہوا ہے سر؟"

"یہ تو آپ اپنی ان ورکر سے پوچھیے جنہوں نے اچھا خاصا تماشہ بنا دیا ہے یہاں......" معاویہ اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا تھا۔ منیجر معاویہ کی بات سن کر پیچھے مڑا تھا۔ ابھی تک وہ اس نقاب پوش لڑکی کی طرف متوجہ نہیں ہوا تھا۔

"خوش نصیب...... ؟ کیا ہے یہ سب؟"

منیجر نے گویا اپنا سر پیٹ لیا تھا۔ یہ لڑکی روز کوئی مسئلہ کھڑا کر دیتی تھی۔ اگر جنت صاحبہ کی سفارش نہ ہوتی تو وہ شاید کب کا اس سے جان چھڑا چکا ہوتا۔ وہ جواب سنے بغیر ہی معاویہ کی جانب متوجہ ہوا تھا۔

"سر! میں اس کی طرف سے آپ سے معذرت کرتا ہوں۔ آپ کائنڈلی میرے آفس میں آئیں، ہم وہاں بیٹھ کر آرام سے بات کر لیتے ہیں۔"

معاویہ نے کچھ سوچ کر اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ جانے کیوں "خوش نصیب" نام سنا سنا لگ رہا تھا۔ وہ منفرا کی طرف مڑا تھا اور گاڑی کی چابی اس کی طرف بڑھا دی تھی۔

"باقی شاپنگ کسی اور دن کر لیں گے منفرا! تم گاڑی میں بیٹھ کر میرا ویٹ کرو۔ میں دس منٹ میں آ رہا ہوں......"

منفرا تذبذب کا شکار لگ رہی تھی۔ "میں ساتھ چلوں......؟"

"نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ڈونٹ وری...... میں ابھی آتا ہوں تم جاؤ۔"

منفرا اثبات میں سر ہلا کر باہر جانے والے راستے پر مڑ گئی جبکہ معاویہ منیجر کے ساتھ اس کے آفس کی طرف مڑ گیا۔ وہ پبلک میں اس سے زیادہ ڈراما افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔

"تم بھی آؤ آفس میں......" منیجر نے جاتے جاتے کھا جانے والے انداز میں خوش نصیب کو آرڈر دیا تھا۔

"مسٹر معاویہ! بیٹھیے......" منیجر نے آفس میں پہنچ کر معاویہ کو کرسی پیش کی اور خود خوش نصیب کی طرف مڑ گیا۔ معاویہ کی کرسی سے کچھ فاصلے پر کسی اسٹوڈنٹ کی طرح سر جھکائے کھڑی تھی۔ "ہاں بھئی۔۔۔ تم بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟ کیا ڈراما کری ایٹ کیا ہے تم نے سب کے سامنے......"

"سر! معاویہ صاحب مجھ سے واقف ہیں...... مجھے ان سے بہت ضروری کام تھا۔ میں نے جو کچھ بھی کیا، نادانستگی میں کیا...... میں بہت عرصے سے انہیں ڈھونڈ رہی تھی۔ آج جب میں نے انہیں دیکھا تو ان کے پیچھے بھاگی۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں پھر میں انہیں کھو نہ دوں......"

"تو کیا اس کا مطلب ہے کہ تم کسی بھی شریف انسان کا کالر پکڑ دو اور سب کے سامنے اس کا تماشا بنا دو......" لہجہ بدستور سختی لیے ہوئے تھا۔ کم از کم معاویہ کے سامنے وہ خوش نصیب سے نرم برتاؤ نہیں کر سکتا تھا۔ ساکھ کا سوال تھا۔ اگر غلطی معاویہ کی ہوتی تب بھی کم بختی خوش نصیب کی ہی آتی پھر اب تو قصوروار بھی وہ ہی تھی۔

"آئی ایم سوری سر......" اس کا لہجہ بھیگ گیا تھا۔ وقت نے خوش نصیب کو بدل کر رکھ دیا تھا۔

منیجر نے مڑ کر سوالیہ نظروں سے معاویہ کو دیکھا جو ابھی بھی چہرے پر خوش نصیب کے لیے اجنبیت سجائے بیٹھا تھا۔ منیجر کو اپنی طرف دیکھتا پا کر اس نے لاتعلقی سے کندھے اچکا دیے۔

"میں ابھی بھی انہیں پہچان پایا......"

خوش نصیب نے اس کی بات کے جواب میں لمحہ بھر کے لیے ہی سوچا تھا اور پھر ہاتھ اٹھا کر اپنا نقاب ٹھوڑی تک سرکا لیا۔

معاویہ بغور اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے چند لمحے ہی لگے تھے اسے پہچاننے میں۔۔۔ اور جب اس نے سامنے کھڑی لڑکی کو پہچان لیا تو وہ کرسی دھکیل کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"تم۔۔۔ تم وہی ہو نا جسے شامیر نے۔۔۔"

ماضی کا ایک لمحہ خاموشی سے ان کے درمیان آ کھڑا ہوا تھا۔

خوش نصیب نے تیزی سے ہاں میں سر ہلا دیا۔ معاویہ نے منیجر کی طرف دیکھا اور سپاٹ لہجے میں بولا تھا۔

"آپ کچھ دیر کے لیے باہر چلے جائیں۔ میں ان سے اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں......"

منیجر نے جیسے ہی یہ بات سنی باہر جانے کے لیے مڑ گیا۔۔۔

"تمیز سے بات کرنا...... کوئی فضول بات نہیں......" خوش نصیب کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ تاکید کرنا نہیں بھولا۔

''میں نے تب بھی تم سے ایک بات کہی تھی...... کہ دوبارہ کبھی میرے سامنے مت آنا......'' منیجر کے باہر جانے کی دیر تھی، معاویہ تیزی سے خوش نصیب کے سامنے جا کھڑا ہوا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ خوش نصیب کو جادو کے زور سے کہیں غائب کر دے۔

''آپ نہیں جانتے کہ میں کتنے عرصے سے آپ کو ڈھونڈ رہی ہوں۔۔۔'' خوش نصیب نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہ تھی۔ اور اگر سنی بھی تو اسے قابلِ توجہ نہ سمجھا تھا۔ ''پچھلے تین سالوں میں، میں نے کتنی دعائیں کی ہیں آپ کے ملنے کی...... آپ...... آپ نہیں جانتے کہ مجھے کتنی ضرورت تھی آپ کی...... آپ کو نہیں پتا کہ شامیر نے میرے ساتھ......''

''ایک منٹ...... معاویہ نے چڑ کر اس کی بات کاٹی۔ ''سنو لڑکی! مجھے تم میں، یا شامیر میں کوئی انٹرسٹ نہیں ہے۔ تم نے جتنا وقت میرا ضائع کرنا تھا پچھلے چالیس منٹ میں کر لیا ہے...... جتنا ڈراما تم نے کری ایٹ کیا ہے، دل تو میرا چاہتا ہے کہ تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں...... مگر...... تم اب میری نظروں سے دور ہو جاؤ...... دوبارہ اگر تم میرے سامنے آئیں تو یاد رکھنا بہت بری طرح پیش آؤں گا۔'' بڑے ضبط کے ساتھ اس نے بات مکمل کی تھی اور باہر جانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھا تھا۔

''معاویہ...... معاویہ پلیز......'' خوش نصیب تقریباً بھاگ کر اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔ ''ایسے مت کریں پلیز۔۔۔ صرف آپ ہیں جو میرے حق میں گواہی دے سکتے ہیں معاویہ! پچھلے تین سال میں نے اپنوں سے کٹ کر گزارے ہیں، صرف اس آس پر کہ میں آپ کو ڈھونڈ لوں گی اور سب پر ثابت کر دوں گی کہ میں غلط نہیں تھی۔ میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں......'' اس نے حقیقتاً دونوں ہاتھ معاویہ کے سامنے باندھ لیے۔

''صرف ایک بار میرے ساتھ میرے گھر چلیں۔۔۔ اور سب کو شامیر کے بارے میں سچ بتا دیں......''

آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے اور چھلکتے ہوئے اس کے نقاب میں جذب ہونے لگے۔

''دیکھو بی بی! میں تمہاری جتنی مدد کر سکتا تھا...... تین سال پہلے کر دی تھی...... اور وہ پہلی اور آخری بار تھا کہ میں نے تمہاری مدد کی تھی اور بتایا بھی تھا کہ دوبارہ کبھی مجھ سے یہ امید نہ لگانا۔ میں نے ٹھیکا نہیں لے رکھا تم جیسی لڑکیوں کی مدد کرنے کا۔ ویسے بھی اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ تمہارے گھر والے میری بات سنیں گے اور یقین بھی کر لیں گے۔۔۔ اب برائے مہربانی...... جان چھوڑ دو میری...... جو کرنا ہے اپنے بل بوتے پر کرو...... دوبارہ میرے پیچھے آنے کا سوچنا بھی مت...... ورنہ یاد رکھنا میں تمہارے حق میں شامیر سے بھی زیادہ برا ثابت ہوں گا۔''

اس نے انگلی اٹھا کر اسے متنبہ کیا اور اس بار بغیر رکے کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

خوش نصیب بندھے ہاتھوں اور بہتے آنسوؤں کے ساتھ گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھتی چلی گئی تھی......

☆☆☆

منفرا نے گاڑی کے پاس پہنچ کر پہلے بچوں کو بیک سیٹ پر کاٹ میں لٹایا، سامان کو ڈگی میں رکھنے کے بعد وہ فرنٹ سیٹ پر جا بیٹھی۔ دل نجانے کیوں پریشانی سے بھر گیا تھا۔ اسے معاویہ پر پورا اعتماد تھا، وہ جانتی تھی کہ اس لڑکی کو یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی تھی...... شاید وہ کسی اور کی غلطی میں معاویہ کا کالر پکڑ بیٹھی تھی...... اب اللہ ہی اسے معاویہ کے غصے سے بچائے۔

اگلے بیس منٹ سخت ٹینشن میں گزرے تھے۔۔۔ یہاں تک کہ اس نے معاویہ کو تیزی سے پارکنگ کی طرف آتے دیکھا تھا۔ منفرا نے اس کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ کم از کم اس کے چہرے سے وہ اس کا موڈ جاننے سے قاصر رہی۔

شادی کے تین سال بعد بھی وہ اس ہنر سے نابلد تھی کہ آخر مجازی خدا کے چہرے کو دیکھ کر دل کا حال کیسے جانا جاتا ہے...... مگر خیر...... اسے اس ہنر کی کچھ خاص ضرورت بھی محسوس نہ ہوتی تھی کہ معاویہ نے کبھی اسے اس

مشکل میں نہیں ڈالا تھا۔

معاویہ گاڑی کے قریب پہنچ چکا تھا اور اگلے ہی لمحے وہ دروازہ کھول کر اندر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اس نے ایک نرم سی مسکراہٹ منفرا کی جانب اچھالی تھی مگر منفرا کو کچھ بتانے کی زحمت نہیں کی۔ منفرا نے چند لمحے اس کے بولنے کا انتظار کیا تھا مگر اسے بدستور خاموش دیکھ کر بالآخر اسے پکار بیٹھی تھی۔

''معاویہ......!''

معاویہ نے ابھی بھی جواب دینے کے بجائے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

''یہ سب کیا تھا؟ کون تھی وہ لڑکی؟'' منفرا نے پوچھا۔

''کچھ نہیں تھا یار...... اگنور کرو۔۔۔''

منفرا نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ منفرا کو اس طرح ٹال دینے کا عادی نہیں تھا۔ کم از کم آج سے پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔

''کچھ تو بتاؤ...... میں پچھلے آدھے گھنٹے سے یہاں پریشان بیٹھی ہوں اور تم کہہ رہے ہو، کچھ نہیں تھا۔'' وہ کچھ چڑ کر بولی تھی۔

''پریشان کیوں بیٹھی تھیں؟'' معاویہ نے شرارت سے کہا۔ ''کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ تمہیں لگ رہا ہے کہ تمہارے ہزبینڈ نے چھپ کر دوسری شادی کی ہوئی ہے...... اور یہ جو اندر محترمہ بدتمیزی پر اتر آئی تھیں یہ وہی خاتون تھیں جن سے میں نے دوسری شادی کی ہے...... اور اب وہ محترمہ مجھے کالر سے پکڑ کر ساری دنیا کے سامنے بے نقاب کرنے والی تھیں......'' وہ قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔ ''وہ جو فلمیں تم شوق سے دیکھتی ہو، ان میں ایسا ہی ہوتا ہے نا......''

منفرا چپ چاپ خفگی سے اس کی شکل دیکھتی رہی۔ جب اسے لگا کہ معاویہ اسے کچھ نہیں بتائے گا تو اس نے ناراضی سے چہرہ موڑا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ معاویہ اس کی بچوں کی سی خفگی پر نرمی سے مسکرا دیا۔

''منفرا......'' اس نے پکارا مگر منفرا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ''اے منفرا...... سنو نا...... ایک مسئلہ ہے......''

''کیا؟'' منفرا کی آواز ابھی بھی ناراض ناراض سی تھی۔

''یار! اس کے پاس کوئی بچہ نہیں تھا۔ ایسی فلمز میں ایک بے بی بھی تو ہوتا ہے لڑکی کے پاس۔۔۔ شاید گھر چھوڑ کر آئی تھی......'' معاویہ کا شرارت بھرا لہجہ...... منفرا کنٹرول کرتے کرتے بھی مسکرا دی تھی۔ اور معاویہ اس کی مسکراہٹ سے مطمئن ہو گیا کہ شاید وہ اب اس ٹاپک پر بات نہیں کرے گی...... مگر منفرا پھر سے اصل بات پر لوٹ آئی۔

''بتاؤ نا معاویہ! کیا ایشو تھا؟ مجھے بہت بری لگی تھی اس لڑکی کی حرکت...... اتنے لوگوں میں ڈراما کری ایٹ کر کے رکھ دیا۔ میں تو ڈر گئی تھی کہ لوگ مارنے نہ لگ جائیں ہمیں...... ایسے لوگوں کو ہمیشہ صرف لڑکی ہی مظلوم نظر آتی ہے۔'' اس کے لہجے میں خوف جھلک رہا تھا۔

''ارے ایسے کیسے مارنے لگ جاتے......'' معاویہ نرمی سے بولا۔ ''ان کے سامنے معاویہ اردشیر ازی کھڑا تھا۔ کوئی عام انسان نہیں کہ اس پر ہاتھ اٹھاتے...... اور میری جان! تم کیوں اس مسئلے پر اتنا سوچ رہی ہو؟ تمہیں نہیں معلوم...... یہ لڑکیاں ایسے ڈرامے اکثر جگہوں پر کرتی نظر آتی ہیں۔ مقصد صرف کچھ پیسے بٹورنا ہوتا ہے...... میں اس لڑکی کی باتوں میں نہیں آیا۔ آئی ایم شیور اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ لڑکی کوئی نہ کوئی جھوٹ بول کر لوگوں کو میرے خلاف کر لیتی اور کچھ پیسے لے کر جان چھوڑتی...... تم پریشان مت ہو...... میں سارا معاملہ منیجر کے سپرد کر کے آیا ہوں...... دوبارہ ہمت نہیں ہو گی اس کی کہ کسی شریف انسان کا گریبان پکڑے......''

منفرا اس جواب سے کسی حد تک مطمئن نظر آنے لگی تو معاویہ نے سکھ کا سانس لیا اور دوبارہ ساری توجہ سڑک پر مرکوز کر دی۔

''ویسے وہ لڑکی تھی کون؟ اس کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ تمہیں جانتی ہے...... اسے نام معلوم تھا تمہارا......''

منفرا کی آواز گاڑی میں گونجی۔ اس نے بات برائے بات کی تھی...... مگر معاویہ...... ''یار تم چھوڑ کیوں نہیں دیتیں اس ٹاپک کو؟'' معاویہ کا پارا ایک دم ہائی ہوگیا۔ ''تمہاری سمجھ میں ...... کیوں نہیں آرہا کہ میں مزید اس بارے میں بات نہیں کرنا چاہ رہا۔ ساری بات بتا تو دی ہے تمہیں اور کیا بتاؤں...... میرا نام جاننا کوئی بڑی بات نہیں، بہت سارے لوگ مجھے بزنس مین کے طور پر جانتے ہیں......'' غصے میں اس کی آواز قدرے بلند ہوئی تو پیچھے سویا ننھا وسامہ نیند میں کسمسا اٹھا اور رونے کی نیت سے منہ بسورنے لگا۔ منفرا فوراً پیچھے مڑکر اسے تھپکنے لگی...... معاویہ بھی چپ ہوگیا۔

''کیا ہوگیا ہے معاویہ؟'' منفرا خفگی سے بولی تھی۔ ''میں نے تو بس ایک بات کہی ہے۔ اتنا ہائپر کیوں ہو رہے ہو؟''

''ایک بات...... ایک بات نہیں کہی...... تم بار بار ایک ہی بات کہہ رہی ہو۔۔۔ اور مجھے یہ چیز تکلیف دے رہی ہے کہ میری بیوی مجھ پر شک کر رہی ہے......''

''میں شک نہیں کر رہی معاویہ......'' وہ بے چارگی سے بولی۔ ''میں کیوں تم پر شک کروں گی...... ایسے ہی پوچھ بیٹھی تھی۔ اگر نہیں بتانا چاہتے ہو تو اوکے فائن...... ہائپر مت ہو تم۔''

منفرا نے بات مکمل کرنے کے بعد رخ موڑ لیا اور کھڑکی سے باہر بھاگتے مناظر پر نظر جمادی۔

وسامہ دوبارہ سو چکا تھا۔

گاڑی میں مکمل خاموشی تھی جو فضا میں موجود تناؤ کو بڑھاوا دے رہی تھی۔

معاویہ پشیمانی محسوس کرنے لگا تھا۔ دل ہی دل میں کوسا...... پہلے خوش نصیب کو کہ جس نے اس کی پیاری بیوی کو تجسس میں مبتلا کیا تھا اور پھر خود کو کہ کیا ضرورت تھی منفرا سے اس طرح بات کرنے کی۔

''اب کیا کرنا ہے معاویہ صاحب......'' اس نے دل ہی دل میں خود سے پوچھا۔

''کرنا کیا ہے؟ مناؤ اسے...... جو لوگ سوچ سمجھ کر نہیں بولتے ان کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔'' دل نے ڈپٹ کر کہا۔

''کیسے مناؤں یار؟ مشورہ ہی دے دو......''

''خود سوچ...... یا دماغ سے پوچھ...... جس کے کہنے پر اسے ڈانٹا ہے۔'' دل نے ہری جھنڈی دکھادی۔

معاویہ نے گہرا سانس لیا۔ کچھ سوچ کر اپنا کندھا، منفرا کے کندھے سے ٹکرایا۔

''اے...... ناراض ہوگئی ہو؟''

''نہیں......'' لٹھ مار جواب...... ''پھر میری طرف کیوں نہیں دیکھ رہیں...... باہر دیکھتی جا رہی ہو۔'' وہ چھوٹے بچے کی طرح معصومیت سے بولا۔

''کیونکہ باہر کے مناظر دیکھنا تمہارا غصہ دیکھنے سے اچھا ہے۔''

''اچھا یار! سوری...... معاف کردو...... کہو تو کان بھی پکڑ لیتا ہوں......'' اتنا کہتے ہوئے اس نے ہاتھ بڑھایا اور منفرا کا کان پکڑ لیا۔

منفرا نے اس کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے اسے گھور کر دیکھنا چاہا لیکن اس کے چہرے پر چھائی شرارت اور معذرت نے منفرا کے غصے پر ٹھنڈے پانی کا سا کام کیا تھا۔ لمحہ بھر میں اس کے غصے کو ٹھنڈی کر دیا تھا۔ ٹھنڈا میٹھی مسکراہٹ چہرے پر سجائے وہ اسے دیکھتی رہی۔ معاویہ نے ہاتھ بڑھایا۔ ایک ہاتھ سے اسٹیرنگ وہیل کو سنبھالتے ہوئے اس نے منفرا کو دوسرے بازو کے حلقے میں لے لیا تھا۔ منفرا نے پرسکون ہوکر اپنا سر اس کے کندھے پر ٹکادیا۔

گاڑی میں ایک بار پھر خاموشی چھاگئی لیکن اس بار اس خاموشی میں بھی سکون تھا۔

''معاویہ......'' منفرا نے پکارا۔

''ہم م م م......'' معاویہ نے ہنکارا بھرنے پر اکتفا کیا۔

''نومبر اسٹارٹ ہوگیا ہے......'' اس نے جیسے اطلاع دی تھی۔ ''اس بار کیا پلان ہے اینورسری کا؟''

''جو تم کہو...... جیسا تم چاہو......'' معاویہ کے چہرے پر بھی مسکراہٹ رکی تھی۔

''پرومس......؟''

''ایسا پہلے کبھی ہوا ہے کہ تمہارے منہ سے بات نکلے اور میں پوری نہ کروں؟''

''تو پھر ٹھیک ہے......'' منفرا ایکسائیٹڈ ہوکر سیدھی ہو بیٹھی۔ ''اس بار ہم اپنی اینی ورسری بشام میں سیلیبریٹ کریں گے...... فلک بوس میں......''

''فلک بوس میں؟ یہ خیال تمہیں کیوں آیا؟'' معاویہ کا لہجہ سنجیدگی اختیار کر گیا۔

''میں...... میں کچھ دن ساری دنیا سے کٹ کر سکون سے گزارنا چاہتی ہوں معاویہ......'' وہ بھی سنجیدہ ہوگئی۔ ''تمہیں نہیں لگتا معاویہ کہ ہمارے پاس اب ایک دوسرے کے لیے زیادہ وقت نہیں بچتا۔ زندگی بہت مصروف ہوگئی ہے۔ میں چاہتی ہوں، کچھ دن اس بھاگتی دوڑتی زندگی سے ہٹ کر ہم اکٹھے گزاریں...... جہاں تم ہو، میں ہوں اور ہمارے بچے......''

''تم نے پہلے کبھی ایسی کسی خواہش کا اظہار نہیں کیا...... ٹھیک ہے، اس بار ہم پورے ہفتے کے لیے فلک بوس جائیں گے۔ خوش......؟'' معاویہ پرسوچ انداز میں بولا۔

''یہ ہوئی نا بات......'' منفرا نے دوبارہ سر اس کے کندھے سے لگاتے ہوئے نعرہ لگایا۔ ''ویسے بھی اس سے پہلے جتنی بار بھی ہم فلک بوس گئے ہیں، تم ایک دن سے زیادہ وہاں رکنے کو راضی نہیں ہوئے......'' منفرا لاڈ سے بولی۔

''ٹائم کی کمی ہے جناب...... کیا کروں......''

''اس بار ٹائم کا بہانا نہیں چلے گا...... اپنے وعدے پر قائم رہیے گا...... پورے سات دن...... اوکے......''

''اوکے......'' معاویہ نے اپنا سر نرمی سے اس کے سر سے ٹکرایا تھا۔ منفرا مطمئن ہوکر مسکرادی۔

''ارے ہاں...... یاد آیا......''

''کیا؟'' منفرا پھر سے سیدھی ہو بیٹھی۔

''میں نے مسز رضوی سے بات کی ہے وسامہ اور ہدیٰ کی کیئر ٹیکر کے لیے......''

''اچھا...... کیا کہتی ہیں وہ......؟''

وسامہ اور ہدیٰ پرسکون رہنے والے بچے تھے مگر آئیڈینٹیکل ٹوئنز تھے۔ ایک بچہ روتا تو دوسرا بھی رونا شروع کر دیتا۔ ایک ہنستا تو دوسرا بھی ہنس دیتا۔ دونوں کو بھوک بھی ایک ساتھ لگتی تھی۔ منفرا ان دونوں میں گھن چکر بن کر رہ گئی تھی۔ ان لوگوں نے کوشش کی تھی کہ کچھ عرصے کے لیے منفرا کی والدہ ان لوگوں کے پاس پاکستان آجائیں، مگر جمال صاحب اور ایڈم کے لیے بہت مشکل ہو رہا تھا سو کچھ دن ان لوگوں کے پاس رہ کر وہ واپس چلی گئی تھیں لہٰذا اب ان لوگوں نے کیئر ٹیکر کی تلاش شروع کر دی تھی۔

''کہہ رہی تھیں وہ فرائیڈے کو بھجوائیں گی کسی کو...... میں نے نیوز پیپر میں ایڈ بھی دے دیا ہے...... فرائیڈے کا ہی ٹائم دیا ہے ایڈ میں...... اب آگے تمہارا کام ہے...... اچھے سے تسلی کر کے سلیکٹ کر لینا۔۔۔ اوکے......''

''تھینک گاڈ...... یہ مسئلہ تو حل ہو جائے گا۔ قابو ہی نہیں آتے تمہارے بچے میرے تو......''

معاویہ مسکراتے ہوئے اسے مزید تفصیلات بتانے لگا۔

☆☆☆

اسلام آباد کے سیکٹر ایف میں مین روڈ پر واقع وہ ایک دو منزلہ عمارت تھی۔ پہلی منزل پر کسی ٹریول ایجنسی کا آفس تھا جب کہ دوسری منزل پر ہفت روزہ فیشن میگزین نئی دنیا کا آفس تھا۔

کیف اور زرگل نے جب بائیک لاکر وہاں روکی تو آفس کے آگے سڑک پر بے تحاشا رش لگا ہوا تھا۔ لوگوں کا سیلاب دائرے کی شکل میں کھڑا تھا اور جو بھی ہو رہا تھا وہ دائرے کے اندر تھا۔

"اوئے لالے..... یہ کیا ہو رہا ہے؟" زرگل حیرانی سے، کیف کے کندھے پر ایک دھپ رسید کر کے بولا۔

اب یہ زرگل بھی ایک انوکھا کیس تھا۔ راولاکوٹ سے تعلق رکھنے والا یہ نوجوان ایک معزز فیملی سے تعلق رکھتا تھا۔ باپ کا اپنا خشک میوہ جات کا وسیع کاروبار تھا مگر یہ حضرت جاب کرنے کے شوق میں اسلام آباد میں رہائش اختیار کیے ہوئے تھے۔ آبائی لحاظ سے تو پکا پٹھان تھا لیکن دل کے چار کونے چار صوبوں کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ پشتو نما اردو تو بولتا ہی تھا، ساتھ ساتھ پنجابی کا تڑکا بھی ڈالتا تھا اور سندھی اور بلوچی زبان کے تڑکے بھی لگاتا تھا۔ پٹھان تھا مگر پٹھانوں کے ہی بے تکے لطیفے سنا سنا کر سب کو ہنساتا تھا اور خود بھی ہنستا تھا۔ اب لطیفہ چاہے جتنا بھی بے کار ہو، اس کا انداز سب کو ہنسنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ "جیو اور جینے دو" پر یقین رکھنے والا یہ زندہ دل نوجوان پور پور پاکستان کے عشق میں ڈوبا ہوا تھا۔

کیف سے اس کی ملاقات اسلام آباد میں ہی ہوئی تھی۔ "نئی دنیا" میں ان دونوں کو ایک ساتھ ہی اپائنٹ کیا گیا تھا۔ چونکہ دونوں نے ہی نیا نیا پریکٹیکل لائف میں قدم رکھا تھا سو جلد ہی دونوں میں دوستی ہو گئی جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گہری ہوتی چلی گئی تھی۔ اب یہ حال تھا کہ دونوں ہر وقت، ہر جگہ ایک ساتھ ہی پائے جاتے تھے۔ ان کی ٹیم، اور مینجمنٹ انہیں اکٹھا دیکھنے کی اس حد تک عادی ہو گئی تھی کہ ہر پراجیکٹ اور ہر اسائنمنٹ انہیں ایک ساتھ ہی اسائن کی جاتی تھی اور حیران کن طور پر نتائج بھی بہترین ملتے تھے۔

"بندر کا تماشا.....؟" کیف نے پرسوچ انداز میں جواب دیا۔

"اوئے نہیں لالا...... بندر کا تماشا ہوتی تو اتنا رش نہ ہوتا۔ وہ تو عوام کو ہر نیوز چینل پر دیکھنے کو مل جاتی ہے۔ یہاں کچھ اور ہوتا لگ رہا ہے۔" وہ اچک اچک کر دائرے کے اندر جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"فری پیزا بانٹ رہے ہیں..... جا تو بھی لے لے۔" کیف نے اسے آگے کو دھکیلا۔

"ہیں بھائی؟ چیز ونڈی دی؟ آجا دونوں بھائی مل کر لیتے ہیں۔" اس نے ہنستے ہوئے کیف کا بازو پکڑ کر اسے بھی ساتھ گھسیٹا۔

دونوں رش میں جگہ بناتے ہوئے آگے بڑھتے تھے۔

"اوئے جگہ دے دو...... ہم کو بھی پیزا کھانی ہے۔" زرگل مسخرے پن سے بولتا ہوا آگے بڑھا تھا۔

کیف بھی ہنستے ہوئے اس کے پیچھے آ رہا تھا۔ مگر جب دونوں دائرے میں پہنچے تو، دونوں کی ہنسی کو بریک لگ گیا تھا۔

دائرے میں ان کے آفس کے ہی دو گارڈ ایک مفلوک الحال شخص کو بری طرح زدوکوب کر رہے تھے۔ وہ زمین پر گرا ہوا تھا اور گارڈز مسلسل اس پر ٹھوکریں برسا رہے تھے۔ زمین پر گرا ہوا وہ بوڑھا شخص خود کو بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا مگر بری طرح ناکام ہو رہا تھا۔

زرگل کو چند لمحے لگے تھے شاک سے نکلنے میں اور اس کے بعد وہ بجلی کی سی تیزی سے گارڈز کی طرف بڑھا تھا۔

اس نے ایک گارڈ کو دھکا دے کر اس بوڑھے آدمی سے دور دھکیل دیا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ دوسرے گارڈ کو کچھ کہتا

کیف اس گارڈ کو دور ہٹا چکا تھا۔

"یہ کیا کر رہے ہو تم لوگ؟ کیوں مار رہے ہو اسے؟" کیف غصے سے بولا تھا۔

گارڈز یک لمحے کے لیے ہچکچائے مگر پھر ایک ہمت کر کے بولا۔ "صاحب! یہ چوری کی نیت سے آفس کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے فون پر اس کی باتیں سنی ہیں۔"

زرگل سہارا دے کر اس آدمی کو زمین سے اٹھا رہا تھا۔ اس کے مٹی میں اٹے ہوئے کپڑے پھٹ چکے تھے۔ چہرے پر خراشیں تھیں اور ہونٹوں سے خون ٹپک رہا تھا۔

"صاحب! یہ جھوٹ بول رہے ہیں۔۔۔" وہ بندہ روتے ہوئے بولا تھا۔

اس سے پہلے کیف یا زرگل کچھ بول پاتے، ایڈیٹر یعنی علوی صاحب بذات خود وہاں تشریف لے آئے تھے۔ انہوں نے مسئلہ وہاں حل کروانے کے بجائے آفس میں بیٹھ کر بات کرنے کو ترجیح دی۔

لوگوں کے ہجوم کو تتر بتر کر کے وہ لوگ آفس میں آ گئے تھے۔ مفلوک الحال شخص بھی ان کے ساتھ تھا جبکہ کیف گارڈز سے تفصیل جاننے کے لیے باہر ہی رک گیا تھا۔

اسے ایک کرسی پر بٹھا کر پانی پلایا گیا۔ جب تک کیف کی واپسی ہوئی زرگل نے اس کے زخم صاف کر کے اسے درد کش دوا بھی کھلا دی تھی۔ زخم آئے ضرور تھے مگر کوئی بھی زخم خطرناک نہیں تھا۔ اس دوران آفس کے باقی لوگ بھی اس کے اردگرد جمع ہو گئے تھے۔

"ہاں جی بابا جی۔۔۔ اب بتاؤ، کیا بات ہے؟" کیف نے کہا۔

"پتر! کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے جانے دو۔۔۔ تمہاری مہربانی۔" وہ خوف زدہ سا بولا تھا۔

"او بابا جی۔۔۔ جانے دیں گے۔۔۔ پہلے ہمیں بتاؤ کہ باہر کیا ہوا تھا۔ گارڈز کہتے ہیں انہوں نے تمہیں باتیں کرتے سنا ہے۔ یہاں ڈکیتی کا پلان بنا رہے تھے تم۔ اگر ایسا ہے تو تمہیں تو ہم پولیس کے پاس بھیجیں گے۔" کیف نے دھمکی دی۔

"نہیں پتر جی!" وہ رو دیا۔ "میں نے کیا چوری کروانی ہے۔ میں تو خود لٹا ہوا ہوں۔ میں کیا ڈکیتی کرواؤں گا؟"

"اچھا۔۔۔ پھر تم ہمیں بتاؤ کہ باہر ہوا کیا تھا؟ کیوں مارا تمہیں گارڈز نے؟" علوی صاحب کا لہجہ بے حد سخت تھا۔

"صاحب! میں نے کچھ نہیں کیا۔۔۔" اس نے روتے ہوئے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ "میں تو بس اس آفس کے مالک سے ملنا چاہتا تھا۔ میں نے انہیں ساری بات بتائی تو ان لوگوں نے مجھے مارنا شروع کر دیا۔ وہ خود جگنو والی سرکار کے مرید ہیں۔"

"جگنو والی سرکار کیا ہے اب؟" علوی صاحب بولے۔

"ہیں؟ ایسا کیا بتایا تھا تم نے انہیں کہ وہ تمہیں مارنے لگے؟" علی زین بولا۔

"اور آفس والوں سے کیوں ملنا تھا تم نے؟" طاہر صاحب نے دوسرا نقطہ اٹھایا۔

وہ سب اس کے اردگرد دائرہ بنا کر کھڑے تھے اور وہ خود کرسی پر سہما ہوا بیٹھا تھا۔

"صاحب! مجھے دین محمد کے بیٹے نے کہا تھا کہ آپ لوگ میری مدد کریں گے۔ اس کا بیٹا یہاں شہر میں کام کرتا ہے نا۔"

کیف آگے بڑھا اور بابا جی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "بابا جی! آپ ہمیں ساری بات بتائیں۔۔۔ اس کے بعد ہی پتا چلے گا کہ ہم آپ کی مدد کر سکتے ہیں یا نہیں؟" کیف نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

"پتر! میری بہن کی بچی لاپتا ہے۔" اس بوڑھے نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"بابا جی! اس معاملے میں آپ کی مدد پولیس ہی کر سکتی ہے۔" کیف نے بولنا شروع کیا مگر زرگل نے

اسے ٹوک دیا۔

''شش۔۔۔ایک منٹ یار کیف۔۔۔انہیں بات پوری کرنے دو۔'' وہ بے حد سنجیدہ تھا۔''بابا جی! آپ بولو۔۔۔کیا ہوا ہے آپ کی بھانجی کے ساتھ۔''

''پتر! میرا نام دین محمد ہے۔میری ایک ہی بہن ہے۔ دو بچیاں ہیں اس کی۔شوہر اس کا بچیوں کے بچپن میں مر گیا تھا۔اس کی بچیوں کو میں نے ہی پالا ہے اپنی بیٹیوں کی طرح۔پالا پوسا،اپنی حیثیت کے مطابق لکھایا پڑھایا بھی۔ان میں سے بڑی بچی کا رشتہ ہو گیا تھا۔دو ماہ پہلے شادی تھی اس کی۔۔۔'' وہ اتنا بول کر چپ ہو گیا۔

''بولتے رہیں بابا جی! ہم سے جو ہو سکا،آپ کے لیے کریں گے۔۔۔'' طاہر صاحب نے انہیں مزید بولنے کا حوصلہ دیا۔

'' پھر پتا نہیں کیا ہوا،ایک دم اس پر دورے پڑنا شروع ہو گئے۔بیٹھے بیٹھے ہاتھ پاؤں اکڑ جاتے تھے، رونے لگتی اور چیخیں مارتی تھی۔کسی اور زبان میں باتیں کرنے لگتی تھی۔کسی سیانے نے بتایا کہ اس پر جن کا سایہ ہے۔کوئی بری بھٹکی ہوئی روح ہے جس نے قبضہ کر لیا ہے بچی کے جسم پر۔ہم نے بات چھپانے کی کوشش کی مگر ایسی باتیں کہاں چھپتی ہیں۔اس کے سسرال والے آئے رشتہ ختم کر گئے۔ ہمارے گاؤں سے دو گاؤں آگے بیٹا جی ایک بابا جی بیٹھتے ہیں۔۔۔ جگنو والی سرکار۔۔۔ ہمیں کسی نے کہا کہ ان کے پاس لے جائیں بچی کو۔۔۔وہ علاج کر دیں گے۔بیٹا! ہمیں کیا پتا تھا۔۔۔ہم ان کے پاس لے گئے۔۔۔''

بوڑھے کی آنکھوں سے پھر آنسو بہنے لگے۔ وہ اس شدت سے رو رہا تھا کہ کسی کی ہمت نہیں پڑی کہ اسے آگے بتانے پر مجبور کرے۔

کچھ دیر بعد جب اس کے آنسو تھمے تو اس نے پھر سے بولنا شروع کیا۔

''بابا جی نے بچی کو دیکھا اور دیکھتے ہی بتا دیا کہ بچی کے پیچھے کوئی بد روح پڑ گئی ہے جو اس سے یہ سب کروا رہی ہے۔ ہماری بدقسمتی کہ ہم نے اس کی بات مان لی۔اس نے ہماری بچی کا علاج شروع کیا۔پندرہ دن علاج ہوتا رہا۔میری بھانجی کی حالت سنبھلنے لگی مگر وہ ان بابا جی کے پاس جانے کو راضی نہ ہوتی تھی۔ہم مطمئن ہو گئے تھے کیونکہ بابا جی نے بتایا تھا کہ وہ بد روح لڑکی کو ایسی ضد کرنے پر مجبور کرے گی۔علاج ہوتا رہا۔پندرہ دن بعد بابا جی نے کہا کہ چلہ پورا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ بچی کو دو دن اور دو راتوں کے لیے ان کے آستانے پر ہی چھوڑا جائے۔بابا جی بڑے اللہ والے تھے۔ارد گرد کے گاؤں کے لوگ بھی ان کی ایسے عزت کرتے تھے جیسے وہ مائی باپ ہوں۔

ہم نے ان کے بھروسے بچی کو وہاں چھوڑ دیا۔وہ رکنا نہیں چاہتی تھی پھر بھی اسے وہاں چھوڑ آئے۔ایک بار بھی نہیں سوچا کہ ہماری بچی وہاں محفوظ رہے گی بھی یا نہیں۔بابا جی نے ہمیں دو دن بعد آنے کا بولا تھا۔ہم بھی سکون سے گھر میں بیٹھ گئے۔۔۔''

وہ بوڑھا آدمی کھوئے کھوئے انداز میں بولتا جا رہا تھا۔اس آنکھوں کے سامنے جیسے وہ تمام مناظر کسی فلم کی طرح چل رہے تھے۔میٹنگ روم میں فی الحال دین محمد کی آواز کے علاوہ کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

''دو دن بعد میں اور میری بہن آستانے پر پہنچے۔گھر پر باقی سب لوگ خوشی خوشی انتظار کر رہے تھے کہ جب ہم زلیخاں کو لے کر واپس آئیں گے تو وہ بالکل ٹھیک ہو گی۔ ہم آستانے پر پہنچے۔۔۔ہمیں بابا جی کے سامنے پہنچا دیا گیا۔۔۔انہوں نے کہا۔۔۔

زلیخاں آستانے پر نہیں ہے۔۔۔چلہ کامیاب نہیں ہو سکا۔۔۔وہ بد روح زلیخاں کو ساتھ لے جانے میں کامیاب ہو گئی ہے۔''

دین محمد پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور وہ سب کے سب خاموش کھڑے رہ گئے۔سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیسے اور کیا کہہ کر تسلی دیں۔

''بابا جی۔۔۔!'' کیف آگے بڑھا۔''یہ ممکن نہیں ہے۔آپ کو یقیناً بے وقوف بنایا گیا ہے۔یہ روح جن بھوت۔۔۔ان سب کا ہماری دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔یقیناً آپ کی بھانجی کے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوا جو بتایا گیا ہے۔'' کیف کی ہمت نہیں ہوئی کہ انہیں کوئی تلخ بات بتاتا۔

''بیٹا جی۔۔۔میں جانتا ہوں۔میری زلیخاں کے ساتھ وہ سب نہیں ہوا جو ہمیں بتایا گیا۔''

''پھر سچ کیا ہے؟'' علوی صاحب نے عینک کو ناک کی نوک سے پیچھے دھکیلتے ہوئے پوچھا۔

''دو ہفتے پہلے ساتھ کے گاؤں کی نہر سے زلیخاں کی لاش ملی ہے۔'' وہ گم صم سا بولا تھا۔

وہ سب کے سب سکتے میں رہ گئے۔

''بڑے اسپتال کے ڈاکٹروں نے بتایا ہے کہ زلیخاں کی موت لاش ملنے سے کم از کم چار دن پہلے ہوئی تھی۔ اسے گلا دبا کر مارا گیا ہے۔اس کے چہرے پر نوچ کھسوٹ کے نشان تھے اور اس کے جسم پر......''

بوڑھا آدمی بولتے بولتے بری طرح سسکنے لگا تھا اس سے اپنا جملہ بھی مکمل نہ کیا جا سکا۔

اب سارے آفس میں خاموشی چھا گئی بوجھل اور معنی خیز سی۔

بابا جی مزید کچھ نہ کہتے تب بھی سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ اس لڑکی پر مرنے سے پہلے کیا کچھ بیتا ہو گا۔

''تو آپ کو کیا خیال ہے کہ یہ کام اس بد روح کا ہے؟'' چند منٹ بعد کیف نے تلخی سے پوچھا تھا

''کاش اسی کا ہوتا۔۔۔مگر میری آنکھیں کھل گئی ہیں۔مجھے یقین ہے کہ میری بچی کو اس دردناک موت کا شکار کرنے والوں کا تعلق اسی آستانے سے ہے۔۔۔جگنو والی سرکار ہی ہے جو میری بچی کی موت کا ذمہ دار ہے۔''

وہ روتے ہوئے بولا تھا۔ پھر یک دم اس نے علوی صاحب کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

''صاحب! آپ بھی بیٹی والے ہو گے۔خدا کے واسطے۔۔ میری مدد کرو۔آپ کو اللہ کا واسطہ ہے مجھے انصاف دلا دو۔میری معصوم زلیخاں معلوم نہیں کیا کیا سہہ کر دنیا سے گئی ہے۔۔۔میں نے اپنی زلیخاں کھو دی۔ صاحب! تم باقی سب زلیخاں کو بچا لو اس سے۔۔۔میں پاؤں پڑتا ہوں آپ کے۔''

وہ سچ مچ اپنی جگہ سے اٹھا اور علوی صاحب کے پاؤں پکڑ لیے۔سب افسردگی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ بولنے کی ہمت کسی میں بھی نہیں تھی۔

علوی صاحب نے اس کے بندھے ہاتھ پکڑ کر کھولے اور اسے اٹھ کر کھڑا ہونے میں مدد دی۔

''دیکھو بابا جی! ہم آپ کی مدد ضرور کرتے۔۔۔اگر ہم کر سکتے تو۔۔۔آپ کے پڑوسی کے لڑکے نے آپ کو غلط جگہ بھیج دیا ہے۔آپ پولیس کے پاس جاؤ۔۔۔اسے سب بتاؤ۔۔۔یا کسی ٹی وی چینل والوں کے پاس۔۔۔ہمارا میگزین اس سلسلے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر پائے گا۔'' علوی صاحب نے اسے اندھیرے میں رکھنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

کیف کو، دین محمد کو سمجھانے بجھانے کا کہہ کر وہ وہاں سے چلے گئے تھے۔باقی لوگ بھی بجھے دل کے ساتھ وہاں سے چل دیے۔تلخ حقیقت چاہے جتنی بار سامنے آئے، ہمیشہ ایک سی تکلیف دیتی ہے۔کبھی انسان کو اپنا عادی نہیں ہونے دیتی۔

کیف نے سب کے جانے کے بعد دین محمد کو سمجھا بجھا کر رخصت کر دیا اور بھاری دل کے ساتھ اپنی سیٹ پر آ بیٹھا۔

☆☆☆

وہ نومبر کی ایک خوبصورت صبح تھی۔

صبح کے چہرے پر ابھی رات کا مہین پردہ پڑا تھا۔

رات کے سرکتے ہوئے پردے کی اوٹ میں رضوی ہاؤس بالکل خاموش تھا۔

فجر کی اذان شروع ہو چکی تھی۔ مسز رضوی نے اذان ختم ہونے کا انتظار کیا اور اذان ختم ہوتے ہی بستر سے نکل آئیں۔

مسٹر رضوی کو ضروری کام سے کل لاہور جانا پڑا تھا ورنہ خود جاگنے کے ساتھ ساتھ انہیں بھی نماز کے لیے جگا دیتی تھیں۔ یہ ان کا برسوں کا معمول تھا۔

مسٹر اینڈ مسز رضوی۔۔۔ کو اللہ نے دو بچوں سے نوازا تھا۔ بڑا بیٹا تھا جو کہ اپنی فیملی کے ساتھ آسٹریلیا میں رہتا تھا اور بیٹی بیاہ کر انگلینڈ جا چکی تھی۔ یہ دونوں میاں بیوی اب گھر میں اکیلے ہوتے تھے۔

کافی عرصے سے ان کا بیٹا پیچھے پڑا تھا کہ اب وہ دونوں اس کے پاس آسٹریلیا آجائیں اور اس کے پاس ہی رہیں لیکن تنہائی کا شکار ہونے کے باوجود دونوں میاں بیوی پاکستان چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔

تین سال پہلے اس تنہائی کے احساس کو کم کرنے کے لیے خوش نصیب ان کے پاس آئی تھی۔

ایسا نہیں تھا کہ انہیں کوئی معاشی مسئلہ تھا لیکن جب مسٹر رضوی کے دوست نے اپنی بھانجی کو ان کے پاس بھیجنے کی بات کی تھی تو سختی سے کوئی مفت خدمت لینے سے منع کر دیا تھا۔ مجبوراً رضوی صاحب تھوڑا بہت کرایہ لینے پر راضی ہو گئے تھے۔ یوں ایک طرف خوش نصیب کو رضوی ہاؤس میں رہنے کے لیے ایکسی مل گئی تو دوسری طرف ان کا بیٹا بھی گھر میں خوش نصیب کی موجودگی سے کچھ مطمئن ہو گیا۔

حالات شاید ایسے ہی رہتے اگر چار ماہ پہلے مسز رضوی کو رات میں انجائنا کا اٹیک نہ ہوتا۔۔۔ اس اٹیک نے ان کے بیٹے کو پھر سے فکر مند کر دیا تھا۔ اس بار اس نے صرف فون پر اصرار نہیں کیا۔ وہ خود پاکستان آیا اور تب تک ماں باپ کا پیچھا نہیں چھوڑا جب تک وہ دونوں اس کے ساتھ جانے پر راضی نہیں ہو گئے۔ وہ خود تمام کاغذی کارروائی پوری کر کے واپس گیا تھا اور اب دو ہفتے بعد وہ دونوں اپنے بیٹے کے پاس جا رہے تھے۔

باقی بچی خوش نصیب۔۔۔ تو وہ دونوں میاں بیوی آج کل اس کے لیے پریشان تھے۔ زیادہ برا یہ ہوا کہ دو دن پہلے خوش نصیب کو اس کی اکاؤنٹنٹ کی جاب سے بھی جواب دے دیا گیا تھا۔

مسز رضوی وضو کر کے نماز ادا کرنے میں مصروف ہو گئیں۔

نماز۔۔۔ پھر تلاوت قرآن۔۔۔

اس کے بعد وہ کچھ دیر گھر کے لان میں ہی چہل قدمی کیا کرتی تھیں۔ ساتھ ہی ساتھ تسبیحات بھی پڑھ لی جاتیں۔

چنانچہ دونوں کاموں سے فارغ ہو کر انہوں نے موسم کا جائزہ لینے کے لیے کھڑکی کا پردہ سرکایا۔

دور بہت دور مرگلہ کے پہاڑوں کے پیچھے سے سورج کی کرنیں سر نکال رہی تھیں اور ایسا ملگجا اجالا پھیل رہا تھا کہ نظر بدقت دور تک دیکھ سکتی تھی۔

تو اس ملگجے اجالے۔۔۔ میں انہوں نے غور سے دیکھا تو جان لیا کہ لان کے آخری کونے میں رکھی میز کرسیوں میں سے ایک پر خوش نصیب بیٹھی تھی۔ کالے رنگ کی شال اپنے گرد لپیٹے وہ اوپر آسمان کی جانب دیکھ رہی تھی۔

اب خدا معلوم کسی سوچ میں گم تھی یا اللہ سے شکوہ کر رہی تھی۔

مسز رضوی کا دل افسوس سے بھر گیا۔ خوش نصیب ان کے دل کے بہت قریب تھی۔ تین سال کے مختصر عرصے میں ہی وہ اسے اپنی بیٹی کی طرح چاہنے لگی تھیں۔ اب اسے یہاں اکیلا چھوڑ کر جانے کا خیال انہیں تکلیف دیتا تھا۔ وہ چاہتی تھیں کہ ان کے جانے سے پہلے پہلے وہ خوش نصیب کے لیے کسی محفوظ پناہ گاہ کا انتظام کر دیں۔



وہ چند لمحے لڑکی میں کھڑی خوش نصیب کو دیکھتی رہیں۔ وہ جانتی تھیں کہ خوش نصیب موجودہ حالات میں ڈپریشن کا شکار ہو رہی ہے۔ انہوں نے واک کا خیال دل سے نکال دیا اور اس سے بات کرنے کا ارادہ کر کے چائے بنانے کچن کی جانب چل دیں۔

صبح کا تر و تازہ آسمان اس کے عین سامنے تھا جہاں سورج کی نومولود کرنوں کی پاکیزگی اور پرندوں کی اونچی اونچی اڑانیں دکھائی دے رہی تھیں۔ آسمان پر بادل جمع ہو رہے تھے جو مختلف شکلیں بناتے بگاڑتے تھے۔ لگتا تھا آج بارش ہوگی۔

وہ سر اٹھائے آسمان کو دیکھتی رہی۔

فجر کی نماز پڑھنے کے بعد وہ کل کا باسی اخبار لے کر لان میں آ بیٹھی۔ آج سے پہلے وہ اس وقت مال جانے کی تیاری شروع کر دیتی تھی لیکن دو دن ہوئے یہ مصروفیت بھی ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ اسے جلد از جلد اپنے لیے جاب ڈھونڈنی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ رہائش کا انتظام بھی کرنا تھا۔

ہوا کا تیز جھونکا آیا تھا اور اسے اس کے خیالات سے چونکا گیا۔ وہ کپکپا کر رہ گئی۔ شال کو مضبوطی سے اپنے گرد لپیٹتے ہوئے وہ سیدھی ہو بیٹھی اور اخبار اٹھا لیا۔ ابھی اخبار کھولا بھی نہ تھا کہ سامنے سے مسز رضوی آتی دکھائی دیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی جس میں چائے کے دو کپ اور کوکیز کا جار تھا۔

خوش نصیب نے انہیں آتے دیکھا تو چہرے پر مسکراہٹ سجالی اور اخبار کو چپکے سے ساتھ والی کرسی پر لڑھکا دیا۔ وہ اپنی پریشانی ان پر ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی۔

''السلام علیکم۔۔۔''

ان کے قریب پہنچنے پر خوش نصیب اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ان کے ہاتھ سے ٹرے لے کر ٹیبل پر رکھی اور ایک چیئر ٹیبل سے تھوڑا پیچھے کھینچ لی تاکہ وہ بیٹھ سکیں۔

''وعلیکم اسلام میرے بچے۔۔۔ جیتی رہو، خوش رہو۔۔۔'' انہوں نے بیٹھتے ہوئے خوش نصیب کو کتنی ہی دعائیں دے ڈالیں۔ ''نماز پڑھی تم نے؟'' انہوں نے روز والا سوال دہرایا۔۔۔

''جی پڑھ لی تھی۔۔۔''

''اور تلاوت؟''

''جی وہ بھی۔۔۔''

''شاباش۔۔۔ خوش رہو، آباد رہو۔۔۔ نماز میں سب پریشانیوں کا حل موجود ہے میرے بچے۔۔۔ اور کچھ ہو یا نہ ہو دل کا سکون تو بس نماز اور قرآن میں ہی ہے۔'' انہوں نے روز والی بات دہرائی۔

خوش نصیب میں ان تین سالوں میں بہت تبدیلیاں آئی تھیں۔۔۔ اور یہ تبدیلیاں مسز رضوی کی ہی بدولت تھیں۔ بچپنا بے شک اپنی جگہ برقرار تھا لیکن طبیعت میں ٹھہراؤ ضرور آ گیا تھا۔ بے وقوف وہ ابھی بھی تھی لیکن زندگی کے بارے میں منفی سوچوں کی جگہ مثبت باتوں نے لے لی تھی۔

''میں نے تمہیں کھڑکی سے یہاں بیٹھے دیکھا۔۔۔ سوچا تمہارے ساتھ چائے بھی پی لوں اور کچھ گپ شپ بھی لگا لوں۔''

خوش نصیب مسکرا دی۔

''آپ کا چائے پینے کا دل تھا تو مجھے کہا ہوتا۔۔۔ میں بنا لیتی چائے۔۔۔''

''ارے کوئی بات نہیں بچے۔۔۔ اب تم ہمیں اتنا بوڑھا بھی نہ بناؤ کہ بالکل بستر پر ہی بٹھا ڈالو۔ گھر میں تھوڑا چلتے پھرتے ہیں تو اپنی ٹانگوں پر کھڑے ہونے کے قابل ہیں ورنہ تو شاید بستر سے اٹھنے کے قابل بھی نہ

رہیں۔'' وہ خوش دلی سے بولی تھیں۔

''تم یہ چائے پیو۔'' انہوں نے چائے کا ایک کپ خوش نصیب کے سامنے رکھا اور خود کوکیز کا جار کھولنے لگیں۔

''آپ کے جانے کی تیاری مکمل ہو گئی؟'' خوش نصیب نے کچھ جھجکتے ہوئے سوال کیا۔

''بس بیٹا! تیاری تو ہو ہی رہی ہے۔'' وہ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئیں۔

خوش نصیب خاموش ہو گئی۔۔۔ مزید کیا بات کرے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

''خوش نصیب! بیٹا پریشان ہو؟''

خوش نصیب نے ایک نظر ان کو دیکھا اور لہجے میں مصنوعی بشاشت بھر کر بولی۔ ''بس آنٹی یہ سب پریشانیاں تو زندگی کا حصہ ہیں۔۔۔ انسان کچھ نہیں کر سکتا سوائے ان سے لڑنے اور برداشت کرنے کے۔۔۔''

خوش نصیب۔۔۔ اور ایسی بات۔۔۔ واہ۔۔۔ بس ثابت ہوا کہ انسان کو عقل تب تک نہیں آتی جب تک سر پر تکلیف سے بچانے والا ایک انسانی ہاتھ موجود ہو۔۔۔ جیسے ہی یہ ہاتھ ہوا میں تحلیل ہوتا ہے انسان خود بخود صبر کرنے سے لے کر تکلیف سے لڑنے تک سب سیکھ جاتا ہے۔

''آپ فکر نہ کریں۔۔۔ کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔۔۔ آپ کے جانے سے پہلے کچھ انتظام کر لوں گی۔۔۔''

''تم کیا سوچ رہی ہو؟ کہیں تم اس لڑکے کو ڈھونڈنے کا تو نہیں سوچ رہیں جسے تم نے مال میں دیکھا تھا۔''

''میرے پاس اور کوئی چارہ نہیں ہے آنٹی! صرف وہی ہے جو میرے حق میں گواہی دے سکتا ہے، جو میرے کھوئے ہوئے رشتوں کو واپس لا سکتا ہے، اور کچھ نہیں تو مجھے کم از کم سر چھپانے کی جگہ تو مل ہی جائے گی۔''

خوش نصیب کا تلخ انداز انہیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔

''وہ لوگ مجھے ایسے قبول نہیں کریں گے آنٹی! ورنہ میں واپس چلی جاتی۔۔۔'' اس کا مایوسی بھرا لہجہ انہیں افسردہ کر گیا۔

اور پھر انہوں نے ایک حتمی فیصلہ کر لیا۔

''خوش نصیب! میں نے تمہارے لیے نئی جاب کا انتظام کر لیا ہے۔ دو ماہ کے دو بچے ہیں، انہیں سنبھالنا ہے، اچھی پے دیں گے، رہائش بھی وہاں ہی ہوگی۔۔۔ گھر میں بس میاں بیوی اور بچے ہی ہیں یا ایک دو اور سرونٹ ہوں گے۔۔۔ میں نے سوچا، پہلے تم سے پوچھ لوں پھر ان سے بات کر لوں گی۔۔۔ اب بتاؤ تم کیا کہتی ہو؟''

''آنٹی! اگر آپ کو لگتا ہے کہ مجھے یہ کام کرنا چاہیے تو مجھے آپ کے فیصلے پر پورا یقین ہے۔''

''رضوی صاحب چاہ رہے تھے کہ کسی اسکول میں بات کر لیں، لیکن رہائش کا مسئلہ تو برقرار ہی رہے گا۔ یہ فیملی ہماری دیکھی بھالی ہے۔ اچھے لوگ ہیں۔ تم وہاں محفوظ رہو گی اور پرسکون بھی۔''

''ٹھیک ہے آنٹی! اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی ہے۔ میں ساتھ ساتھ معاویہ اردشیر ازی کو ڈھونڈنے اور راضی کرنے کی کوشش بھی جاری رکھوں گی۔ کیا معلوم وہ مان ہی جائے میرے ساتھ لاہور چلنے اور تایا سے بات کرنے کو۔۔۔''

''جو اللہ کو منظور۔۔۔ تم جمعہ کو تیار رہنا۔۔۔ ڈرائیور تمہیں لے جائے گا۔ میں کال کر دوں گی انہیں۔۔۔''

''ٹھیک ہے۔۔۔'' خوش نصیب مسکرائی۔

مسز رضوی نے بات بدل دی۔ اب وہ اسے اپنی نواسی کی کسی شرارت کے بارے میں بتا رہی تھیں جس کے بارے میں ان کی بیٹی نے رات انہیں بتایا تھا۔

☆☆☆

منفرا نے تھکاوٹ زدہ انداز میں صوفے کی پشت سے کمر لگائی اور ذہن کو پرسکون کرنے کو آنکھیں موندلیں۔

آج جمعہ کا دن تھا۔

معاویہ کو کل کسی ضروری کام سے کراچی جانا پڑ گیا تھا اور جانے سے پہلے وہ منفرا کو ایک بار پھر کیئر ٹیکر کے انٹرویو کے لیے یاددہانی کروا کر گیا تھا۔

ساڑھے گیارہ کے قریب اسے چوکیدار نے انٹرکام پر کچھ امیدواروں کے آنے کی اطلاع دی تھی اور اب ڈیڑھ بج چکا تھا۔ پانچ میں سے چار خواتین سے وہ مل چکی تھی اور ان میں سے ایک بھی اسے اس کام کے لیے مناسب نہیں لگی تھی۔

ایک آخری امیدوار باقی تھی اور منفرا تھک گئی تھی۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ اس لڑکی کو ایسے ہی واپس لوٹا دے مگر اپنی تھکن کو ضرورت پر فوقیت دینا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔

اس نے انٹرکام اٹھا کر چوکیدار کو اس لڑکی کو اندر بھیجنے کا کہا اور خود سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

چند لمحوں بعد ایک نقاب پوش لڑکی دروازے سے اندر داخل ہوئی۔

''السلام علیکم۔۔۔'' اندر داخل ہوتے ہوئے اس نے مدھم لہجے میں سلام کیا تھا۔

''وعلیکم اسلام۔۔۔ آیئے بیٹھیں۔۔۔'' منفرا نے سامنے پڑے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

لڑکی باوقار طریقے سے چلتی ہوئی صوفے پر جا بیٹھی اور اپنے نقاب کو ٹھوڑی تک کھینچ لیا۔ اس کے صوفے پر بیٹھنے تک منفرا اس کا مکمل جائزہ لے چکی تھی۔

مناسب قد وقامت کی وہ لڑکی عبایا پہنے ہوئے تھی۔ اندر داخل ہونے تک اس نے نقاب بھی کر رکھا تھا مگر صوفے کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے اس نقاب کو ٹھوڑی پر کھینچ لیا تھا۔ اچھی خوش شکل لڑکی تھی۔ اس کی شکل بتاتی تھی کہ اس کی عمر بمشکل تئیس یا چوبیس سال تھی اور انداز اسے پڑھا لکھا ظاہر کرتے تھے۔ چہرے پر سنجیدگی تھی اور آنکھوں میں بے تحاشا کشش۔۔۔ بہت گہری آنکھیں تھیں اس کی۔۔۔ جن میں بہت اداسی بھری تھی۔ منفرا کو وہ لڑکی دیکھی دیکھی لگ رہی تھی بہرحال پہلی بار میں ہی اس نے منفرا پر ایک مثبت تاثر چھوڑا تھا۔

''کیا نام ہے آپ کا؟'' منفرا نے بات کا آغاز کیا۔

''خوش نصیب۔۔۔''

منفرا نے ابرو اچکا کر اسے دیکھا۔

''خوش نصیب۔۔۔'' اس نے زیر لب دہرایا۔۔ اس نے یہ نام بھی سن رکھا تھا۔۔۔ مگر کہاں۔۔۔؟ اس نے سوچنے کی کوشش کی مگر یاد نہیں آ رہا تھا۔

''آپ منفرا شیرازی ہیں نا؟'' اس لڑکی نے پوچھا تھا۔

''جی میں منفرا شیرازی ہی ہوں۔''

''آپ کو شاید یاد نہیں۔۔۔ ہم کچھ دن پہلے مل چکے ہیں۔۔۔ مال۔۔۔''

''اوہ۔۔۔ ہاں۔۔۔'' منفرا کو سب یاد آ گیا تھا۔

مال۔۔۔ معاویہ اور وہ کچھ شاپنگ کے لیے گئے تھے۔۔۔ وہاں ایک لڑکی نے معاویہ کا کالر پکڑا تھا اور آگے کے حالات معاویہ کو معلوم تھے اور اس نے منفرا کو اس بارے میں مزید کچھ نہیں بتایا تھا۔

اور سب یاد آتے ہی منفرا محتاط ہو گئی تھی۔ اسے یاد تھا کہ معاویہ نے کہا تھا کہ یہ لڑکی فراڈ ہے مگر بیڑا غرق ہو اس تجسس کا۔۔۔ منفرا جاننا چاہتی تھی کہ سچ کیا ہے؟ اور خوش نصیب معاویہ سے کیا چاہتی تھی۔

اتنا اسے معلوم تھا کہ معاویہ نے اسے چپ کروانے کے لیے یہ بہانہ گھڑا تھا ورنہ سچی بات پر معاویہ کبھی اتنا غصہ ظاہر نہ کرتا۔

اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور بولی۔ ''جی پہچان لیا میں نے آپ کو۔۔۔''

''مجھے مسز رضوی نے یہاں بھیجا ہے۔۔۔'' خوش نصیب نے محسوس کیا کہ منفرا اسے غلط سمجھ رہی ہے تو اس نے صفائی دینا مناسب سمجھا۔ ''مجھے جاب کی ضرورت تھی۔ اس دن جو کچھ بھی ہوا، میں اس پر شرمندہ ہوں۔ مجھے وہاں سے جاب سے نکال دیا گیا ہے۔ میں نئی جاب کی تلاش میں تھی تو مسز رضوی نے ہی مجھے آپ کے بارے میں بتایا تھا کہ آپ کو اپنے بچوں کے لیے کیئر ٹیکر کی ضرورت ہے۔ میں ان کی انیکسی میں پے انگ گیسٹ کے طور پر رہتی ہوں۔ یہاں آنے تک مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں آپ سے ملنے والی ہوں۔ یہاں آ کر معلوم ہوا کہ۔۔۔ باہر لان میں دیکھا تھا میں نے آپ کو۔۔۔''

اس کی باتوں میں کوئی ربط نہیں تھا۔ وہ یا تو بہت کنفیوز تھی یا بہت پریشان۔۔۔ انداز بتاتے تھے کہ حالات سے مار کھائے ہوئے تھی۔

منفرا ٹھان چکی تھی کہ آج سچ جان کر رہے گی۔

''جب آپ جان گئی تھیں کہ آپ معاویہ اردشیرازی کے گھر پہنچی ہیں تو آپ کو یہاں رکنا نہیں چاہیے تھا۔ کچھ دن پہلے آپ جتنا ایشو کری ایٹ کر چکی ہیں، اس کے بعد آپ میں اتنی سیلف ریسپیکٹ تو ہونی چاہیے تھی کہ ہمارے سامنے آنے کی ہمت نہ کرتیں۔''

''میں آپ کی بات سمجھ رہی ہوں۔۔۔ مگر حالات انسان کو اس طرح مجبور کرتے ہیں کہ وہ چاہ کر بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ میرے پاس بھی دو ہی آپشن تھے یا تو خود کو زندہ رکھوں یا اپنی سیلف ریسپیکٹ کو۔۔۔ میں نے خود کو زندہ رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔''

منفرا کو اپنی بات کی سختی کا شدت سے احساس ہوا، اللہ جانے کس مجبوری کے تحت وہاں پہنچی تھی۔

اگلی کسی بھی بات سے پہلے منفرا کے سیل پر کال آنے لگی۔ مسز رضوی ہی تھیں فون پر۔۔۔

منفرا ''ایکسکیوزمی'' کہتی ہوئی اپنی جگہ سے اٹھی اور ڈرائنگ روم سے باہر آ گئی۔

مسز رضوی، معاویہ کے بابا اردشیرازی کے بہت اچھے دوست کی بیوی تھیں۔ ان میاں بیوی کا شمار ان کے فیملی فرینڈز میں ہوتا تھا اور معاویہ ان دونوں کی اپنے والدین کی طرح عزت کرتا تھا۔ منفرا اور معاویہ جب پاکستان آئے تھے تو مسز رضوی نے منفرا کو پاکستان میں ایڈجسٹ ہونے میں بہت مدد کی تھی۔

سلام دعا کے بعد انہوں نے اپنا مدعا بیان کیا۔ وہ چاہتی تھیں کہ معاویہ اور منفرا خوش نصیب کو اپنے پاس جاب دے دیں۔ بقول ان کے خوش نصیب اچھی لڑکی تھی اور فی الحال کسی مجبوری کے تحت جاب ڈھونڈ رہی تھی۔ ان کی باتوں سے محسوس ہو رہا تھا کہ مسز رضوی خوش نصیب کو بہت اچھے سے جانتی ہیں۔

منفرا مزید الجھن کا شکار ہو گئی۔

معاویہ کی باتیں اس لڑکی کو کرپٹ ظاہر کرتی تھیں اور مسز رضوی کی باتوں سے خوش نصیب پر اچھے خاندان کی شریف لڑکی ہونے کا گمان ہوتا تھا۔

وہ سوچ میں پڑ گئی کہ دونوں میں سے کس کی بات پر یقین کرے۔ چونکہ مسز رضوی خوش نصیب کی گارنٹی دے رہی تھیں تو منفرا اسے نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ ان کی تسلی کروانے کے بعد اس نے کال بند کی اور ڈرائنگ روم میں واپس آ گئی۔

خوش نصیب ابھی بھی سر جھکائے اپنی جگہ بیٹھی تھی۔

''جی خوش نصیب۔۔۔ مجھے اپنے بارے میں بتائیں۔۔۔ کیا کوالیفیکیشن ہے آپ کی؟''

"میں نے لاسٹ ایئر اپنا ماسٹرز کمپلیٹ کیا ہے۔"

"گڈ۔۔۔تو پھر مال میں سیلز گرل کی جاب کرنے کی وجہ؟ آپ کو اس سے بہتر جاب مل سکتی تھی۔"

"سیلز گرل نہیں اکاؤنٹنٹ ۔۔۔۔وہ بھی مجبوری تھی۔۔۔ڈیڑھ ماہ پہلے میں نے جاب ڈھونڈنا شروع کی تھی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ مال میں اکاؤنٹنٹ کی جاب بھی رضوی انکل کی مہربانی سے ملی تھی۔ وہاں کے مینیجران کے دوست ہیں۔"

"وہاں جاب ختم ہونے کی وجہ یقیناً وہی واقعہ رہا ہوگا؟" منفرا نے کریدا۔

خوش نصیب خاموش رہی۔

"دیکھو خوش نصیب۔۔۔جہاں تک میں سمجھ پائی ہوں، تم ایک اچھی لڑکی ہو۔" منفرا نے تکلفات کو ایک سائیڈ پر کرتے ہوئے کہا۔ "اور یقیناً تم نے اس دن معاویہ کو روکا بھی کسی مجبوری کے تحت ہی تھا۔ میں جاننا چاہتی ہوں کہ وہ کیا مجبوری تھی جس نے تمہیں وہ سب کرنے پر مجبور کیا تھا۔"

"آپ کو مسٹر معاویہ نے کیا بتایا ہے؟" خوش نصیب نے کچھ پریشانی سے پوچھا۔ معاویہ کا دھمکی بھرا لہجہ اسے بھولا نہیں تھا اور مسز معاویہ کو کچھ بھی بتا کر وہ کوئی مشکل نہیں لینا چاہتی تھی۔

"تم معاویہ کی فکر نہ کرو کہ اس نے کیا بتایا ہے۔۔۔میں تم سے سننا چاہتی ہوں اور صرف سچ سننا چاہتی ہوں۔" منفرا نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"مگر آپ کیا کریں گی جان کر؟ مجھے نہیں لگتا مسٹر معاویہ یہ بات پسند کریں گے کہ میں آپ کو اس کے بارے میں بتاؤں۔"

"میں تمہاری مدد کروں گی۔" منفرا نے پرسکون انداز میں کہا۔ "معاویہ کی فکر مت کرو۔ وہ مجھے پہلے ہی سب بتا چکے ہیں۔ میں اب تمہارے منہ سے سننا چاہتی ہوں۔۔۔" منفرا بات مکمل کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تم سوچ لو۔۔۔میں ابھی آتی ہوں۔"

منفرا کمرے سے باہر نکل گئی۔ وہ خوش نصیب کو سوچنے کے لیے کچھ وقت دینا چاہتی تھی۔

کچن میں شیف کو چائے کا کہہ کر وہ بیڈ روم میں آئی اور بچوں کو چیک کیا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد وہ ڈرائنگ روم میں واپس آئی تھی۔

خوش نصیب نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"ٹھیک ہے مسز معاویہ۔۔۔میں آپ کو سب بتانے کو تیار ہوں۔ میری کہانی بہت لمبی ہے۔ کیا آپ وقت دے سکیں گی؟"

"بہت خوب۔۔۔" منفرا مسکرائی۔ "شروع کرو۔۔۔" اس نے خوش نصیب کے عین سامنے نشست سنبھال لی۔

خوش نصیب نے چند لمحے سوچا اور پھر بولنا شروع کیا۔۔۔

"میرا نام خوش نصیب ہے۔۔۔میرا تعلق لاہور سے ہے۔۔۔میرے والد کا انتقال میرے بچپن۔۔۔"

وہ بولنا شروع ہوئی تو ایک ٹرانس میں بولتی چلی گئی۔

منفرا غور سے اس کی بات سن رہی تھی۔

☆☆☆

زرگل کھانے کی ٹرے اٹھائے کمرے میں داخل ہوا تھا۔

کیف، زرگل اور ان کے ایک اور ساتھی طاہر نے راولپنڈی کے ایک متوسط ایریا میں ایک فلیٹ کرائے پر لے رکھا تھا۔

دو بیڈ روم، کچن اور ٹی وی لاؤنج پر مشتمل یہ ایک چھوٹا سا فلیٹ تھا جس کے صاف ستھرے رہنے کا تمام کریڈٹ زرگل کے سر جاتا تھا۔ وہ عجب ہر فن مولا قسم کا انسان تھا۔۔۔کھانا بنانے سے لے کر گھر کی صفائی ستھرائی تک سب کام خوشی خوشی کر ڈالتا تھا۔ کیف اور طاہر اسے چھوٹی امی کہہ کر چھیڑتے تھے۔

ابھی بھی کھانا ٹرے میں سجائے سگھڑ بیبیوں کی طرح کمرے میں لے آیا تھا۔ طاہر گھر پر نہیں تھا ورنہ ضرور ہی وہ یہ کھانا ٹی وی لاؤنج میں پڑی ٹیبل پر چن کر انہیں بلا لیتا۔

"ہاں بھئی، لالے آجا۔۔۔کھانا کھالے۔"

"یار تو کھالے۔۔۔میرا دل نہیں کرتا۔۔۔" کیف نے سر جھٹک کر کہا۔

وہ کھڑکی سے باہر کھڑا سڑک کی رونق دیکھنے میں مصروف تھا۔

"کس کو تاڑ رہا ہے وہاں کھڑا ہو کر۔۔۔؟"

"تاڑ نہیں رہا ڈفر۔۔۔ایسے ہی کچھ خیال آگیا تھا۔"

"کیوں بھائی! بات کیا ہے۔۔۔کھانا کھانے کو دل نہیں کر رہا اور اب کسی کا خیال بھی آیا ہے۔۔۔دل کس کے خیالوں میں گم ہے لالے۔۔۔؟" زرگل آنکھیں مٹکا کر بولا۔

"تیری ہونے والی بھابھی کے خیالوں میں۔۔۔"

"ہاہاہا۔۔۔" زرگل نے قہقہہ لگایا۔ "مجھے پہلے ہی شک تھا کہ تو ڈمپیک پوجا میں انٹرسٹڈ ہے۔"

"دفع دور۔۔۔اللہ کرے تیری شادی انجل والے طاہر شاہ سے ہو جائے۔۔۔آمین۔۔۔" کیف نے فٹ بدلا اتار لیا۔

"ہاہاہاہا۔۔۔ وہ ڈمپیک پوجا سے بہتر ہے۔"

"چل چل بکواس نہ کر زیادہ۔۔۔چپ کر کے کھانا کھالے۔" کیف نے آنکھیں دکھائیں۔

"یار آجا۔۔۔ساتھ کھالے میرے۔۔۔تسی جاندے او نا میرے سے اکیلے کھانا نہیں کھائی جاتی۔" اس نے اردو اور پنجابی کی ایک ساتھ ٹانگ توڑتے ہوئے کہا۔

"ابے یار۔۔۔ایک تو تیرے اندر کی امی ہمیشہ غلط وقت پر جاگتی ہے۔" کیف دھپ دھپ کرتا اس کے سامنے آبیٹھا۔

"چل بھائی انخرے نہ کر اب زیادہ۔" زرگل نے اس کے بیٹھ جانے کے بعد برا سا منہ بنا کر کہا۔

کیف نے پلیٹ میں چاول نکالے اور کھانا شروع کر دیا۔

"چل اب بتا بھی دے لالے۔۔۔! کیا سوچ رہا تھا؟" چند منٹوں بعد زرگل نے کھاتے ہوئے پوچھا۔

"یار۔۔۔دین محمد کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ذہن سے نکل نہیں رہا وہ۔ بہت۔۔۔بہت برا ہوا ہے بے چارے کے ساتھ۔" کیف افسردگی سے بولا۔ "اس بابے کو تو پکڑ کر پھانسی پر چڑھا دینا چاہیے۔"

"صحیح کہہ رہا ہے یار۔۔۔!" زرگل کی ساری خوش مزاجی ہوا ہو گئی تھی اس ذکر پر۔

"یار میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم لوگ کب ان بابوں، تانترک اور ایسے لوگوں کے چکر سے نکلیں گے۔ آخر ہمیں کب عقل آئے گی کہ یہ جن، روحیں، چڑیلیں۔۔۔ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ ہماری دنیا میں ان کا کوئی وجود نہیں۔"

"اوئے لالے بس کر۔۔۔ایسا نہیں بولتے۔" زرگل خفگی سے بولا تھا۔ "اللہ والوں کے بارے میں ایسا نہیں کہتے۔۔۔"

کیف کا چاول سے بھرا چمچ منہ کی طرف جاتے جاتے رک گیا۔ "تو مانتا ہے ان سب باتوں کو؟"

"اللہ والوں کو مانتا ہوں اور میری بات سن، جن بھی حقیقت ہیں۔۔۔قرآن کہتا ہے کہ جن ہیں پھر ہم کیسے

جھٹلا سکتے ہیں۔"

"اوہ اللہ کے بندے۔۔۔ یہ کوئی ہزار میں سے ایک بابا ہوتا ہے جو صحیح اللہ والا ہوتا ہے باقی سب ڈرامہ۔۔۔ پیسے کمانے کے طریقے۔۔۔"

"یار نہ کر۔۔۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سب سچے ہیں۔ مگر اتنا اندھیر نہیں مچا جتنا تو بول گیا ہے۔ میں نے بہت سے واقعات سنے ہیں جن میں ان لوگوں کی بدولت لوگوں کو نجات ملی ہے جنوں اور روحوں سے۔۔۔"

"یار تو سیریس ہے؟" کیف کھانا چھوڑ کر سیدھا ہو گیا۔ "یقین نہیں آرہا مجھے۔۔۔ اتنا پڑھ لکھ کر، اتنا روشن خیال ہو کر ایسی باتیں۔۔۔"

"لالے! انسلٹ کرنے کی کوشش نہ کر۔" زرگل نے منہ بگاڑ کر کہا۔

"اچھا چل۔۔۔ جعلی پیروں فقیروں کی بات چھوڑ دو۔۔۔ تم کہہ رہے ہو کہ قرآن کہتا ہے کہ جن بھوت ایک اٹل حقیقت ہیں۔ تو کیا قرآن نے ہمیں یہ نہیں بتایا کہ ان کی دنیا الگ ہے۔ وہ ہماری دنیا میں نہیں آسکتے۔ پھر تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ دنیا میں موجود ہیں اور ان کے شر سے بچنے کے لیے ہمیں ان پیروں فقیروں کی مدد لینی پڑتی ہے۔"

"دیکھ یار! بزرگوں کی باتیں بلاوجہ نہیں جھٹلاتے۔ کوئی نہ کوئی تو بات ہوگی نا جس کی وجہ سے ہمارے بزرگ ان سب باتوں پر یقین رکھتے تھے۔ ہمارے گاؤں میں ایک آدمی تھا جس پر حاضری ہوتی تھی۔ میں نے خود اسے دیکھا ہوا ہے۔" زرگل پرسکون لہجے میں بولا تھا۔

"دیکھ یار! میں بھی جنوں کے وجود پر یقین رکھتا ہوں۔ میں تجھے بتاؤں میرے ماموں بتاتے تھے کہ انہوں نے کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ زمین پر آکسیجن کے بغیر زندہ رہنا ممکن نہیں ہے۔ لیکن ہم یہ بات اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہیں کہ جہاں آکسیجن نہیں ہے وہاں زندگی کا نام ونشان بھی نہیں ہوگا۔ آکسیجن کے حصول کے سب سے بڑے ذرائع پودے، درخت اور سبزہ ہیں۔ لیکن ایک وقت تھا زمین پر پھول پودے بھی نہیں تھے۔ لیکن اس وقت بھی ایسی مخلوقات موجود تھیں جو آکسیجن کے بغیر زندہ رہ سکتی تھیں۔ تو جب ایسی مخلوق اسی دنیا میں موجود ہے جو اپنی زندگی کی بقا کے لیے آکسیجن کی محتاج نہیں ہے۔ تو کسی دوسرے سیارے پر کسی دوسری مخلوق کے پیدا ہونے کے چانسز کو ہم کیسے اگنور کر سکتے ہیں... ممکن ہے وہ سیارہ مریخ ہو، زحل یا کوئی اور سیارہ ہو۔" اس نے عرفات ماموں کے الفاظ دہرائے۔ "لیکن ان کی اس بات سے یہ بھی پتا چل رہا ہے کہ ان کی دنیا الگ ہے۔۔۔ ہماری دنیا میں ان کا کیا کام۔۔۔ میری نانی بھی یہی بات کہتی تھیں کہ جنوں بھوتوں کی الگ دنیا ہوتی ہے۔ جیسے انسانوں کو ان کی دنیا میں مداخلت کی اجازت نہیں ہے ویسے ہی جنوں کو انسانوں کی دنیا میں جانے کی اجازت نہیں ہے۔" کیف نے بات مکمل کر کے دادطلب نظروں سے زرگل کو دیکھا۔

"اور اگر میں تجھ پر ثابت کردوں کہ جن بھوت اس دنیا میں بھی موجود ہیں تو؟"

"میں تو ڈر گیا۔۔۔" کیف نے اس کا مذاق اڑایا مگر جب اسے مکمل سنجیدہ دیکھا تو خود بھی سنجیدہ ہو گیا۔

"اچھا چل ثابت کر یہ بات۔"

"تین سال پہلے میں نے ایک رپورٹ تیار کرنے کے لیے کچھ جگہیں وزٹ کی تھیں۔ ٹاپک سیرا بھوت پریت سے ریلیٹڈ ہی تھا۔ اسی رپورٹ کی تیاری کے لیے ہم ایک گاؤں میں گئے تھے۔۔۔ بشام نام ہے اس گاؤں کا۔۔۔ وہاں ایک بڑا خوبصورت قلعہ ہے۔ قلعہ فلک بوس۔۔۔ دیکھنے کے لائق چیز ہے وہ۔۔۔ مجھے پتا چلا تھا کہ اس پر کسی روح کا سایہ ہے۔ میں وہاں گیا اور وہاں کے مقامی لوگوں سے ملا۔۔۔ وہاں جا کر مجھے جو کچھ پتا چلا اس کے مطابق اس قلعے میں رہنے والی روح کسی کو وہاں ٹکنے نہیں دیتی۔ دس بارہ سال پہلے

وہاں دو تین قتل بھی ہوئے تھے۔ ان میں ایک تو پولیس کا آدمی تھا جو کہ وہاں کسی ڈکیتی کی پوچھ گچھ کے لیے گیا تھا اور مرکزی دروازے پر پہرہ دے رہا تھا۔ جس رات وہ پہرے پر بیٹھا تھا اس سے اگلی صبح اس کی کٹی پھٹی لاش دروازے سے کچھ فاصلے پر ملی۔ دوسرے قتل کی داستان زیادہ حیران کن ہے کیونکہ وہ قتل فلک بوس کے تہ خانے میں کیا گیا اور مقتول کوئی عام بندہ نہیں تھا۔ تم نے شاید نام بھی سنا ہو۔۔۔ بڑا مشہور رائٹر تھا۔۔۔ کیا نام تھا اس کا۔۔۔" زرگل نے سوچنے کی کوشش کی۔ "ہاں۔۔۔ وسامہ۔۔۔ وسامہ طالب۔۔۔"

وسامہ طالب کے نام پر کیف بھی چونک گیا۔ اس سے پہلے وہ لاپروائی سے بات سن رہا تھا۔

"وسامہ طالب وہاں کے اونر کا ماموں زاد بھائی تھا۔ وہ اور اس کی بیوی کچھ عرصہ وہاں رہے تھے۔ اور اسی دوران وسامہ کو تہ خانے میں قتل کر دیا گیا۔ معاملہ یہاں ختم نہیں ہوا۔ وسامہ طالب کا کزن معاویہ اردشیرازی۔۔۔ جو کہ فلک بوس کا اونر بھی ہے اس نے وسامہ طالب کی بیوی سے شادی کا عندیہ دیا اور فلک بوس میں ہی شادی کا فیصلہ کیا۔"

"لو بس۔۔۔ کیس تو یہاں ہی حل ہو گیا۔۔۔ افیئر ہوگا دونوں کا۔۔۔ وسامہ کو قتل کر کے دونوں نے الزام روح پر لگا دیا۔" کیف نے فٹ سے کہا۔

"جی نہیں۔۔۔" زرگل فخریہ مسکرایا۔ "میں بھی تمہاری طرح یہی سوچتا اگر وسامہ کی بیوی اور معاویہ کی ہونے والی بیوی عین نکاح سے پہلے غائب نہ ہو جاتی۔۔۔ اور آج تک اس لڑکی کا سراغ نہیں مل سکا کہ وہ کہاں ہے۔ جس رات وہ لڑکی۔۔۔ آئے کت غائب ہوئی، اسی رات ایک اور لاش بشام کے جنگل سے ملی جس کا چہرہ مسخ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ آئے کت کی ہی لاش تھی۔" زرگل اتنا بول کر خاموش ہو گیا۔ کیف کے چہرے پر بھی حیرت تھی۔ چند لمحے بعد زرگل پھر سے بولا۔ "یہ صرف چند واقعات ہیں جو میں نے تمہیں بتائے۔۔۔ وہاں کے لوگ بہت سی باتیں بتاتے ہیں جو فلک بوس کی روح کے بارے میں ہیں اور کئی لوگوں کے مطابق انہوں نے راتوں میں وہاں کسی عورت کے سائے کو بھی دیکھا ہے۔۔۔ ہاں جی کیف صاحب! اب آپ کیا کہتے ہیں؟"

"مجھے ذرا بھی یقین نہیں آیا کہ یہ کارستانی کسی روح کی ہے۔ کوئی غیر قانونی کام ہو رہا ہے روح کی آڑ میں۔۔۔" کیف ناک چڑھا کر بولا۔

"اچھا۔۔۔ چل پھر ایک کام کر لالے۔۔۔ بشام چل میرے ساتھ۔۔۔ اور وہاں جا کر فلک بوس کی سچائی سامنے لا۔۔۔ پتا کر کے دکھا کہ کیا غیر قانونی کام ہو رہا ہے۔"

"بیٹا اگر کوئی پورا قلعہ سنبھالے بیٹھا ہے تو کوئی چھوٹا موٹا بندہ نہیں ہوگا جس پر ہاتھ ڈالا جائے۔۔۔ معاویہ اردشیرازی کا نام لیا تھا نا تو نے؟ وہ اور اس کا باپ تو کافی مشہور انڈسٹریلسٹ ہیں۔"

"چل چل۔۔۔ اب اپنے ڈر کو چھپانے کا بہانہ نہ بنا۔۔۔ ہار مان لے کہ روح اور جن کا وجود ہوتا ہے۔" زرگل نے اسے چڑایا۔

"ارے تو مجھے چیلنج کر رہا ہے؟"

"ہاں کر رہا ہوں۔۔۔" زرگل چڑا رہا تھا۔

"چل ٹھیک ہے اب تو میں جان کر ہی رہوں گا کہ فلک بوس کی روح کو کیا موت پڑی ہوئی ہے۔۔۔"

"ٹھیک ہے لالے۔۔۔ تیری بہادری کو بھی دیکھ لیتے ہیں۔۔۔"

زرگل نے چیلنج کرنے کے انداز میں ہاتھ آگے بڑھایا جسے کیف نے مضبوطی سے تھام لیا تھا۔

☆☆☆

"امی کے انتقال کے کچھ دن بعد ہی ماہ نور کا نکاح شامیر سے ہو گیا اور اس دن اس نے میرے ساتھ تمام تعلق

توڑ دیے۔ میں جو ابھی روشن امی کے غم سے نہیں نکلی تھی، بہن کے جانے سے بالکل اکیلی ہوگئی۔

اس وقت عرفات ماموں نے مجھے بہت سہارا دیا۔ جب سب لوگوں نے مجھے اکیلا چھوڑ دیا تھا، اس وقت صرف ماموں تھے جو میرے ساتھ کھڑے رہے۔"

منفرا دم سادھے اس کی بات سن رہی تھی۔ اس کی شکل دیکھ کر کوئی بھی بتا سکتا تھا کہ منفرا خوش نصیب کا غم اپنے دل میں محسوس کر رہی تھی۔

چائے پڑی پڑی ٹھنڈی ہوگئی تھی۔ دونوں میں سے کسی نے بھی اسے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔

خوش نصیب کی نظریں چائے کے کپ پر تھیں۔ چائے کی سطح پر موٹی کالی بالائی جگہ بنا چکی تھی۔ خوش نصیب کو اس چائے اور اپنی زندگی میں بے پناہ مماثلت محسوس ہوئی تھی۔ ٹھنڈی، بے مزہ۔۔۔ جسے بیکار بول کر اکثر ضائع کر دیا جاتا ہے۔

"تو اسلام آباد کیسے پہنچیں تم؟" منفرا نے سوال کیا۔

"عرفات ماموں کی مہربانی سے ہی۔۔۔" وہ مسکرائی۔ "گھر والوں نے تو بائیکاٹ کر دیا تھا۔ ماموں کو لگنے لگا کہ ان حالات میں اگر میں فضل منزل میں رہی تو یا تو پاگل ہو جاؤں گی یا حرام موت کو گلے لگا لوں گی۔ اور یہ دونوں باتیں ان کی برداشت سے باہر تھیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ انہوں نے تایا کو کیسے راضی کیا اور اس سلسلے میں انہیں کتنی مخالفت سہنی پڑی مگر ایک ماہ بعد وہ مجھے لے کر اسلام آباد آگئے۔ یہاں میرا یونیورسٹی میں ایڈمیشن کروا دیا۔

عرفات ماموں اور رضوی انکل یونیورسٹی فرینڈز تھے۔ ماموں نے انکل سے بات کی تو وہ بخوشی مجھے اپنے پاس رکھنے کے لیے راضی ہوگئے۔ انہوں نے میرے لیے اپنے گھر کی انیکسی سیٹ کروا دی۔ میری جو ذہنی حالت تھی ماموں اس حالت میں مجھے ہاسٹل چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ ماموں نے انکل کو راضی کر لیا تھا کہ میں پے انگ گیسٹ کے طور پر وہاں رہوں گی۔ ان تین سالوں میں ماموں نے ہی میرے تمام اخراجات اٹھائے ہیں۔ میں نے یہاں اپنا ایم اے کمپلیٹ کیا۔۔۔ اس سے بڑھ کر میری زندگی میں بہت سے پوزیٹو چینجز آئے۔۔۔ میں نے خود کو بے کار سمجھنا چھوڑ دیا، میں نے یہ سمجھا کہ دنیا میں مجھ سمیت کوئی بھی انسان بے کار نہیں ہے۔ اور میں نے سیکھا کہ اللہ ہمیں تب تک ہی آزماتا ہے جب تک ہم میں برداشت ہو۔۔۔ برداشت سے زیادہ آزمائش وہ کسی پر نہیں ڈالتا۔"

خوش نصیب ایک بار پھر چپ ہوگئی اور اپنے سامنے پڑے پانی کے گلاس کو اٹھا کر منہ سے لگا لیا۔

"تمہارے ماموں نے تمہیں واپس لے جانے کی کوشش نہیں کی اور کیا انہیں تمہاری جاب پر کوئی اعتراض نہیں ہوا؟"

"کی تھی۔۔۔ بہت کوشش کی تھی۔ میرا ایم اے کمپلیٹ ہوتے ہی وہ آگئے تھے مجھے لینے۔" خوش نصیب مسکرائی۔ "مگر میں نہیں مانی۔۔۔ میں دوبارہ سے ذہنی مریض بننا نہیں چاہتی تھی۔ ماموں بھی اس بات سے اچھی طرح واقف تھے کہ مجھے اس گھر میں قبول نہیں کیا جائے گا۔۔۔ انہوں نے میری بات مان لی مگر مجھے جاب کی اجازت نہیں دی۔ انہیں لگتا تھا کہ میں ان کی ذمہ داری ہوں اور اگر میں جاب کروں گی تو وہ محسوس کریں گے اپنی ذمہ داری میں کوتاہی کر رہے ہیں۔"

"تو پھر۔۔۔ یہ جاب کیوں؟"

"تین ماہ پہلے۔۔۔ ماموں کا انتقال ہوگیا۔"

ایک آنسو خوش نصیب کی آنکھ سے ٹوٹا اور نقاب میں جذب ہوگیا۔

منفرا دھک سے رہ گئی۔۔۔

"میں نے اپنی زندگی میں بچ جانے والا واحد رشتہ بھی کھو دیا اور اب جاب کرنا میری مجبوری بن گئی ہے۔ اس دن مال میں معاویہ صاحب کو دیکھ کر ایک امید جاگی تھی کہ اگر وہ سب کو سچ بتا دیں تو شاید میری لائف نارمل ہو

جائے۔ مگر۔۔۔"

اس نے بات کو نامکمل چھوڑ دیا اور کچھ باتیں سمجھنے کے لیے ان کا مکمل ہونا ضروری نہیں ہوتا۔

منفرا نے بھی اس کی نامکمل بات کو مکمل طور پر سمجھ لیا تھا۔

"رضوی انکل اور آنٹی اپنے بیٹے کے پاس جا رہے ہیں ہمیشہ کے لیے۔ آپ کے پاس جاب فی الحال میری سب سے بڑی ضرورت ہے لیکن مجھے نہیں لگتا کہ معاویہ صاحب اس بات پر راضی ہوں گے۔۔۔ اور آپ میری مدد کر پائیں گی۔" اس کی مایوسی انتہا پر تھی۔

"مجھے اب چلنا چاہیے۔۔۔ آپ کے ٹائم کا شکریہ۔۔۔ مجھے امید ہے کہ آپ کا دل میری طرف سے صاف ہو گیا ہوگا۔ اللہ حافظ۔۔۔"

وہ اٹھی اور دروازے کی طرف بڑھ گئی لیکن اسے ٹھٹک کر دہلیز میں رکنا پڑا۔ منفرا نے اسے پیچھے سے پکارا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑی ہو چکی تھی۔

"خوش نصیب! میں وعدہ نہیں کر رہی لیکن میں پوری کوشش کروں گی کہ میں معاویہ کو اس سلسلے میں تمہاری مدد کرنے پر راضی کر لوں۔"

خوش نصیب نے مڑ کر حیرت سے اسے دیکھا۔

"دعا کرنا کہ میں کامیاب ہوں اور تمہارے کسی کام آسکوں۔۔۔" اس کے چہرے پر بڑی بھلی مسکراہٹ تھی یا شاید خوش نصیب کو ہی محسوس ہوئی تھی۔

"آپ کا بہت شکریہ۔۔۔" اس نے تشکر سے لبریز لہجے میں کہا تھا۔

اور باہر نکل گئی تھی۔

☆☆☆

صبح دس بجے کا وقت تھا اور دن تھا جمعرات کا۔

نئی دنیا کے آفس میں کام کا آغاز ہو چکا تھا۔

دائیں طرف سے تیسرے ڈیسک پر کیف لیپ ٹاپ پر کام کر رہا تھا۔

اسے کچھ دیر پہلے ہی علوی صاحب نے اپنے آفس میں بلایا تھا۔ اس نے دو دن پہلے علوی صاحب سے بات کی تھی کہ وہ اور زرگل بشام جا کر فلک بوس پر رپورٹ تیار کرنا چاہتے ہیں۔ علوی صاحب کو صرف اس بات سے غرض تھی کہ وہ لوگ نئی دنیا کے ایک سلسلے، جو کہ سیاحت کے متعلق تھا، کے لیے ایک اچھی رپورٹ تیار کر کے لائیں گے۔ سو دو دن بعد کیف کو پندرہ دن کی چھٹی ملنے کی خوش خبری دی گئی تھی۔

دوسری طرف کیف خود بشام اور قلعہ فلک بوس کے بارے میں معلومات اکٹھی کرنے میں مصروف رہا تھا۔ ان چند دنوں میں ہی وہ فلک بوس کے بارے میں کافی کچھ جان چکا تھا۔ انٹرنیٹ سے اسے جتنی معلومات حاصل ہو سکتی تھیں، اس نے جمع کر لی تھیں۔

جب اس نے اس بارے میں سرچ کرنا شروع کیا تو اسے معلوم ہوا کہ قلعہ فلک بوس معاویہ اردشیرازی کے دادا کی ملکیت تھا۔ وہ ایران سے قالین کی خرید و فروخت کے لیے آئے تھے۔ کسی طرح وہ اپنے قالین بشام کے نواب تک پہنچانے میں کامیاب ہوگئے۔ وہ قالین نواب صاحب کو اس قدر پسند آگئے کہ انہوں نے انعام کے طور پر معاویہ کے دادا کو قلعہ فلک بوس دے دیا۔

یہ شیرازی خاندان کے پاکستان میں رہنے کی بنیاد تھی۔ نواب صاحب نے شیرازی صاحب کو مشورہ دیا کہ وہ پاکستان میں ہی رہیں اور ان کے لیے قالین بنائیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنی بیوی اور بیٹے اردشیرازی کو بھی پاکستان بلا

لیا جو ابھی صرف چند سالوں کا تھا۔ آہستہ آہستہ ان کا بزنس فروغ پانے لگا۔

وقت گزرتا رہا۔ اردشیرازی نے اپنے باپ کے کاروبار کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ کارخانوں میں استعمال ہونے والی مشینری بنانے کے کارخانے کا آغاز کیا۔ اور اب اردشیرازی کا کام کئی ملکوں میں پھیلا ہوا تھا۔ پاکستان میں اردشیرازی کے کام کو معاویہ اردشیرازی سنبھال رہا تھا جو کہ فلک بوس کا اصل مالک تھا۔ اسے فلک بوس اس کے دادا کی طرف سے وراثت میں ملا تھا۔

اس کے علاوہ جو معلومات کیف کو زرگل سے ملی تھیں، وہ یہ تھیں کہ فلک بوس کی روح کو آیوشمتی کا نام دیا جاتا تھا۔ اور اس نام کے پیچھے جو کہانی سنائی جاتی تھی، اس میں ایک ہندو عورت ایوشمتی کا تذکرہ تھا جسے بہت عرصہ پہلے فلک بوس میں ہی اس کے شوہر نے قتل کر دیا تھا۔ بشام کے لوگوں کا ماننا تھا کہ آیوشمتی کی آتما کو کبھی شانتی نصیب نہیں ہوئی، آج بھی فلک بوس میں موجود ہے اور وہاں رہنے والوں کو تباہ و برباد کر دیتی ہے۔ آج تک جس کسی نے بھی اس راز سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی، نقصان ہی اٹھایا ہے۔ ایک نکتہ جس سے کیف چونکا تھا، وہ یہ تھا کہ معاویہ اردشیرازی اور اس کا خاندان اس روح کے وجود سے انکاری تھے اور اس لیے معاویہ نے کچھ سال پہلے فلک بوس میں ہی شادی کی تھی جو خیر و عافیت سے انجام بھی پا گئی تھی۔

اس وقت بھی کیف اپنے لیپ ٹاپ پر اسی بارے میں سرچ کر رہا تھا۔ اس وقت اس کے سامنے فلک بوس کا ہائی کوالٹی امیج کھلا ہوا تھا اور وہ غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ چونکہ قلعہ فلک بوس بشام جانے والے ٹورسٹ کے لیے اٹریکشن کا باعث تھا سو اس کی بہت سی تصاویر گوگل پر موجود تھیں۔ مگر بہت تلاش کے باوجود کیف فلک بوس کے اندرونی حصوں کی تصاویر تلاش کرنے میں ناکام رہا تھا۔ اسے بیرونی حصوں کی جو تصاویر مل سکی تھیں، ان کا اس نے پرنٹ نکال کر ایک فائل تیار کر لی تھی۔

''کیف بھائی۔۔۔'' اسے پیچھے سے کسی نے پکارا تھا۔ مڑے بغیر بھی وہ جانتا تھا کہ آنے والا یاسر ہے۔

اکیس سالہ یاسر نے تین ہفتے پہلے انٹرن شپ کے لیے نئی دنیا کو جوائن کیا تھا۔ اور فی الحال وہ آفس میں سب سے چھوٹا ورکر تھا اور ان سب کے لیے بچے کی حیثیت رکھتا تھا۔

''ہاں جی بھائی۔۔۔'' کیف نے مڑ کر مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

''بھائی! آپ بشام جا رہے ہیں؟'' یاسر نے ایکسائٹمنٹ بھرے لہجے میں پوچھا تھا۔

''شہزادے! بڑی تیز سی آئی ڈی ہے تیری۔۔۔ کس نے بتایا ہے تجھے۔۔۔''

''بس بھائی! لگ گیا پتا۔۔۔ بھائی! میری ایک بات مانو گے؟''

''ہاں بولو۔۔۔'' کیف نے دلچسپی سے کہا۔

''بھائی! مجھے بھی ساتھ لے جائیں۔۔۔ پلیز۔۔۔''

''یار تو نے کیا کرنا ہے جا کر۔۔۔؟'' کیف کو حیرانی ہوئی تھی اس فرمائش پر۔

''بھائی! لے جاؤ نا۔۔۔ مجھے بہت شوق ہے ان ساری جگہوں کو وزٹ کرنے کا۔۔۔ مجھے ساتھ لے جاؤ' میں وہاں آپ کی خدمت کروں گا۔۔۔ پرامس۔۔۔'' وہ بچوں کی سی معصومیت سے بول رہا تھا۔

کیف ہنس دیا تھا۔۔۔

''اچھا اور علوی صاحب کو کون منائے گا؟''

''آپ منا لو گے۔۔۔ وہ آج کل کیف ازم کا شکار ہیں۔ آپ کے علاوہ کسی کی بات نہیں سنیں گے۔۔''

کیف نے اس کی بات پر قہقہہ لگایا۔

''اچھا چلو جاؤ۔۔۔ زرگل کو منا لو۔۔۔ اگر تم اسے منانے میں کامیاب رہے تو میں علوی صاحب سے

اجازت لے دوں گا۔''

کیف نے اسے زرگل کی طرف روانہ کر دیا۔

☆☆☆

جب منفرا کافی کے دو مگ لے کر کمرے میں داخل ہوئی تو معاویہ بچوں کے کاٹ کے پاس کھڑا تھا۔

پھر وہ نیچے جھکا اور نرمی سے باری باری دونوں بچوں کی پیشانی کو چوم لیا۔

اس کے چہرے پر باپ کی شفقت پھیلی تھی اور آنکھیں ہیروں کی طرح چمکتی تھیں۔

منفرا کو یہ روشنی اور چمک دنیا میں ہر چیز سے زیادہ عزیز تھی۔ وہ جب بھی معاویہ کی آنکھوں کو جگر جگر چمکتے دیکھتی تو دل ہی دل میں اس چمک کے قائم رہنے کی دعا مانگتی تھی۔

بروکن فیملی سے تعلق رکھنے کے باعث معاویہ اپنے بچوں کے لیے حد سے زیادہ حساس واقع ہوا تھا۔ اپنے بچپن کی محرومیاں اسے بھلائے نہ بھولتی تھیں۔ وہ جب جب اپنے بچپن کے بارے میں سوچتا تھا، اپنے بچوں کے لیے مزید حساسیت کا مظاہرہ کرنے لگتا تھا۔ کہیں نہ کہیں اس کے دل میں یہ عزم پختہ ہو چکا تھا کہ کچھ بھی ہو اسے خود کو ایک اچھا شوہر اور ایک بہترین باپ ثابت کرنا ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اسے اپنے باپ سے جو بھی شکایات تھیں، وہ اس کے بچوں کو بھی ہوں۔

منفرا نے آہستہ سے دروازہ بند کیا اور معاویہ کے قریب آ کھڑی ہوئی۔

معاویہ کو اس کی موجودگی کا احساس اس کے پاس آ کر کھڑے ہونے پر ہی ہوا تھا۔ وہ ایسا ہی تھا۔ بچوں کے ساتھ ہوتا تو اپنے اردگرد سے بالکل بیگانہ ہو جاتا۔ یکسر فراموش کر دیتا تھا وہ سب کو۔

''منفرا! یہ اتنے پیارے کیوں ہیں؟'' وہ محبت بھری مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''میں انہیں دیکھتا ہوں تو میرا دل کرتا ہے بس انہیں ہی دیکھتا رہوں اور کسی اور طرف نہ دیکھوں۔'' وہ ایک لمحے کو چپ ہوا اور پھر شرارت سے بولا۔ ''تمہیں بھی نہیں۔۔۔''

بات مکمل کر کے وہ ہنس دیا۔ منفرا بھی خفگی سے اسے دیکھتے ہوئے ہنس پڑی تھی۔

''دنیا کے تمام ماں باپ کو اپنی اولاد اتنی ہی اچھی لگتی ہے۔'' اس نے جیسے بڑے گر کی بات بتائی تھی۔ ''اب آپ ان دونوں کو سونے دیں اور کافی پی لیں۔۔۔''

اس نے کافی کا مگ معاویہ کی طرف بڑھا دیا۔

''تھینک یو۔۔۔'' اس نے مگ تھامتے ہوئے رسماً کہا۔ ''آؤ ٹیرس پر بیٹھتے ہیں۔''

وہ کہہ کر باہر کی طرف بڑھ گیا۔ منفرا نے بھی اثبات میں سر ہلا کر اس کی پیروی کی تھی۔

''کیسا رہا آپ کا آج کا دن آفس میں؟'' منفرا نے بیٹھتے ہوئے پوچھا تھا۔

''میرے دن کو چھوڑو۔۔۔ آج تم بتاؤ۔۔۔ تمہارا دن کیسا رہا؟ تم نے مجھے بتایا نہیں کہ کیئر ٹیکر سلیکٹ کر لی ہے؟''

معاویہ کے سوال نے منفرا کی مشکل آسان کر دی۔ اس کے ذہن میں آج صبح کے تمام واقعات تازہ ہو گئے تھے۔

خوش نصیب اور اس کی بتائی ہوئی تمام باتیں سارا دن اس کے دماغ میں ادھم مچاتی رہی تھیں۔ وہ دل سے چاہتی تھی کہ معاویہ اس لڑکی کے کام آئے لیکن مال والے پر معاویہ کے رویے نے اسے یہ ضرور باور کروا دیا تھا کہ معاویہ خوش نصیب کو سخت ناپسند کرتا ہے اور اسے خوش نصیب کی مدد کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اسے یقین تھا کہ معاویہ کے دل کو خوش نصیب کی طرف سے صاف کرنے اور اس کی مدد کرنے کے اس معاملے میں قائل کرنا ایک مشکل کام ہوگا۔

وہ جواب بھی تک سمجھ نہیں پارہی تھی کہ معاویہ سے خوش نصیب کے بارے میں کیسے بات کرے، اس موضوع کے شروع ہو جانے سے پرسکون ہو گئی۔

اس نے ایک گہری سانس لے کر خود کو معرکے کے لیے تیار کیا تھا اور پھر بات کا آغاز کیا۔

"اوہ۔۔۔ ہاں۔۔۔ بالکل سلیکٹ کر لی ہے۔ مسز رضوی کے ریفرنس سے ایک لڑکی آئی تھی۔ خوش نصیب۔۔۔ میں نے اسے سلیکٹ کیا ہے۔ اچھی پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ مجبور بھی ہے۔ میں اس کی طرف سے بالکل مطمئن ہوں۔۔۔ مسز رضوی اس کی مکمل گارنٹی دے رہی ہیں اور پھر آپ بھی تو اسے جانتے ہیں۔ اس دن مال میں ملی تھی وہ ہمیں۔۔۔"

پرسکون انداز میں بات مکمل کرتے ہوئے منفرا، معاویہ کو بے چین کر گئی تھی۔

"آر یو سیریس منفرا؟" معاویہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور کافی کا مگ بھی سامنے میز پر رکھ دیا۔

"ہاں میں سیریس ہوں۔۔۔" منفرا نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

"میں نے تمہیں اس دن بتایا تھا کہ وہ لڑکی کرپٹ ہے۔۔۔ اس کے باوجود۔۔۔؟"

"ایک منٹ معاویہ۔۔۔ اس لڑکی نے مجھے سب سچ بتا دیا ہے۔" منفرا نے اس کی بات کاٹی تھی۔

معاویہ گہری سانس لے کر رہ گیا۔

معاویہ نے جھنجلا کر کہنا چاہا۔ "وہ لڑکی جھوٹ۔۔۔"

مگر منفرا نے پھر سے اس کی بات کاٹ دی۔ "نہیں معاویہ۔۔۔ یہ بات تم اچھی طرح سے جانتے ہو کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہی۔" منفرا کی آواز میں افسوس ہی افسوس تھا۔

"اور میں نے مسز رضوی سے خود بات کی ہے۔۔۔ انہوں نے بھی یہی بتایا کہ وہ لڑکی جو بتا رہی ہے سب سچ ہے۔۔۔" منفرا خاموش ہو گئی اور منہ موڑ کر سڑک کی طرف دیکھنے لگی۔

"میں سمجھ نہیں پا رہی ہوں معاویہ۔۔۔ کیوں؟ تم مجھ سے یہ سب کیوں چھپا رہے تھے؟ پلیز مجھے بتاؤ کہ کس چیز نے تمہیں سب چھپانے پر مجبور کیا ہے؟"

معاویہ نے ایک نظر اسے دیکھا پھر نظر چرا لی۔

"کیا بتا کر گئی ہے وہ تمہیں؟" معاویہ نے پوچھا۔

منفرا نے اسے وہ سب بتا دیا جو خوش نصیب نے اپنے بارے میں بتایا تھا۔

"مجھے بہت افسوس ہوا ہے کہ شامیر کی وجہ سے اسے کیا کچھ سہنا پڑا ہے۔ وہ گھر سے بے گھر ہو گئی، اس کے سب رشتے چھوٹ گئے اور اب وہ اس حال میں ہے کہ سر چھپانے کے لیے ٹھکانہ ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔ اللہ شامیر کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔" منفرا کی آواز بھرا گئی تھی۔

"تم نے اسے شامیر کے بارے میں بتایا؟"

"نہیں میری ہمت نہیں ہوئی۔۔۔"

"اب تم کیا چاہتی ہو؟" معاویہ نے اثبات میں سر ہلا کر پوچھا۔

"میں چاہتی ہوں کہ تم اس کی مدد کرو۔ اس کے گھر والوں کو جا کر سب بتا دو۔۔۔"

"یہ بات اس نے خود کہی ہے تم سے؟" وہ چڑ کر بولا۔

"نہیں، اسے یہاں آنے تک یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ تمہارے گھر جا رہی ہے۔ وہ بس جاب کی تلاش میں آئی تھی۔ یہ تو میں چاہتی ہوں کہ تم اس کی مدد کرو۔"

"یہ ممکن نہیں ہے۔" معاویہ نے زور دے کر حتمی انداز میں کہا۔

"کیوں ممکن نہیں ہے معاویہ۔۔۔ اگر ہم اتنی سی مدد کر۔۔۔"

معاویہ نے اس کی بات کاٹی تھی۔ "منفرا میری بات سنو میں اب کسی اور کے مسئلے میں پڑنا نہیں چاہتا۔ اس کے ساتھ جو بھی ہونا ہے ہو کر ہی رہے گا۔ میرے پاس اتنا فالتو ٹائم نہیں ہے کہ اسے اس طرح کے سوشل ورک کے لیے ضائع کروں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ میرے کہنے پر اس کے گھر والے اس بات پر یقین کر لیں گے؟ یہ بھی تو ممکن ہے کہ انہیں لگے کہ میری شکل میں وہ کسی سے جھوٹی گواہی دلوا رہی ہے۔ میرے پاس بھی کوئی ثبوت تو نہیں ہے ان کے داماد کو جھوٹا ثابت کرنے کے لیے۔۔۔ سو پلیز تم بھی بھول جاؤ یہ سب۔۔۔ مجھے بالکل پسند نہیں ہے کہ میں یا میری فیملی ایسے معاملات میں پڑیں۔"

معاویہ نے بے حد سنجیدگی سے بات مکمل کی اور اپنا مگ دوبارہ سے اٹھا لیا۔

اس کا انداز منفرا کو سمجھا گیا کہ کم از کم اس معاملے میں وہ خوش نصیب کی مدد کرنے سے قاصر ہے۔

خاموشی آئی اور اس نے ان دونوں کے درمیان جگہ بنا لی۔

کچھ دیر چپ رہنے کے بعد منفرا نے دل کڑا کر کے بات شروع کی۔ "ٹھیک ہے اگر تم اس کی مدد نہیں کرنا چاہتے تو تمہاری مرضی۔۔۔ کم از کم مجھے اتنی اجازت دو کہ میں اس کی مدد کر سکوں۔"

"اچھا۔۔۔ اور تم کیا کرو گی؟"

"ہم اسے جاب دے سکتے ہیں اور کچھ نہیں تو کم از کم اس کے فنانشل اور ریزیڈینشل ایشوز تو سولو ہو جائیں گے۔"

"منفرا۔۔۔ پلیز۔۔۔ لیو دس ٹاپک اینڈ سٹے اوے۔۔۔ اب اس بات کو ختم کرو اور اس سے دور رہو"

معاویہ نے کافی کا کپ ٹیبل پر پٹخا اور تیزی سے کمرے میں واپس چلا گیا۔

کچھ دیر بعد جب منفرا اسے منانے کی غرض سے کمرے میں آئی تو معاویہ سونے لیٹ چکا تھا۔ منفرا دل مسوس کر رہ گئی۔ اگلی صبح معاویہ کا موڈ حیران کن طور پر بالکل ٹھیک تھا اور منفرا کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب آفس جانے سے پہلے معاویہ نے اسے خوش نصیب کو جاب دینے کی اجازت دے دی۔

☆☆☆

رات دس بجے کا وقت تھا۔

رضوی ہاؤس میں اس وقت سناٹا چھایا ہوا تھا۔ مکین کھانا کھا کر اپنے کمرے میں جا چکے تھے۔

"میں نے خوش نصیب کو معاویہ اور منفرا کے پاس بھیج دیا ہے جاب کے لیے۔" مسٹر رضوی اپنا لیپ ٹاپ لیے بیڈ پر بیٹھے تھے جب مسز رضوی عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر ان کے پاس آ بیٹھیں۔ وہ شام کو ہی اسلام آباد واپس پہنچے تھے۔

"کیوں؟ جب ہم نے یہ ڈیسائیڈ کر لیا تھا کہ خوش نصیب کو معاویہ کے بارے میں نہیں بتانا تو پھر؟" مسٹر رضوی نے لیپ ٹاپ بند کر دیا اور حیرانی سے بولے۔

"وہ بے چاری بہت پریشان تھی۔ صبح میری بات ہوئی تو اسی بارے میں بات کرتی رہی۔ رضوی صاحب! مجھ سے تو اس بچی کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔"

"آپ تو ایسے کہہ رہی ہیں بیگم جیسے اب معاویہ مان جائے گا اس کے ساتھ چلنے کو۔ خوش نصیب سے ابھی تک بات چھپانے کا کیا فائدہ ہوا۔۔۔ آپ جانتی ہی ہیں، معاویہ نہیں مانے گا۔"

"مجھے پتا ہے وہ نہیں مانے گا مگر کم از کم وہ کوشش تو کر لے۔ پھر جو اللہ کو منظور۔۔۔"

"یہ بھی ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔۔۔ کیا بول کر بھیجا تھا اسے؟"

"کیئر ٹیکر کی جاب کا بتایا تھا اسے۔ یہ نہیں بتایا کہ وہ معاویہ کا گھر ہے۔ معاویہ نے مجھے بچوں کے لیے کیئر

ٹیکر ڈھونڈ کر دینے کو کہا تھا۔ منفرا کو کال کر دی تھی میں نے کہ اس کی مدد کریں۔ سب بتا بھی دیا ہے۔ خوش نصیب بھی اسے سب سچ بتا آئی ہے۔ وہ لوگ کم از کم اسے کام پر رکھ سکتے ہیں۔ اس کا رہائش کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ اتنا ہی کر سکتے ہیں ہم رضوی صاحب! باقی اس بچی کی قسمت۔"

"ٹھیک کیا آپ نے۔۔۔"

"آپ گئے تھے خوش نصیب کے گھر؟" انہوں نے پرامید لہجے میں پوچھا۔

"ہاں گیا تھا۔۔۔ مگر۔۔۔ اس کے تایا نے خوش نصیب کو واپس بلانے سے انکار کر دیا۔ ان کی بلا سے خوش نصیب جیے یا مرے۔۔۔" وہ سخت افسردہ تھے۔

بات مکمل کرتے ہوئے وہ اپنی جگہ پر لیٹ گئے تھے اور مسز رضوی افسردگی سے ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئیں۔

☆☆☆

عصر کا وقت تھا۔

وہ نماز پڑھ کر باہر لان میں آبیٹھی۔

آج تیسرا دن تھا اسے منفرا سے مل کر آئے ہوئے لیکن اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ اب تو وہ ہمت ہارنے لگی تھی۔ منفرا نے اس کہا تھا کہ وہ معاویہ سے بات کرے گی اور اسے راضی کرے گی کہ وہ خوش نصیب کی مدد کرے۔

خوش نصیب کے ساتھ کی جانے والی مدد تو ایک طرف۔۔۔ ان لوگوں نے تو اسے جاب کے لیے بھی منتخب نہیں کیا تھا۔ اس کی جمع پونجی ختم ہو رہی تھی۔ پریشانیوں میں ایک ایک کر کے اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔

چنانچہ آج بھی اخبار ہاتھ میں تھا۔ وہ نوکری کے اشتہار پڑھتی جا رہی تھی۔ ایک دو کو دائرہ بنا کر نشان زد بھی کر دیا تھا۔

موسم بدل رہا تھا۔ نومبر کا اختتام سر پر تھا۔ موسم کافی حد تک سرد ہو چکا تھا۔ اس سب کے باوجود اس وقت خوش نصیب کو لان میں بیٹھنا اچھا لگتا تھا۔ ہوا میں ٹھنڈک تھی۔ وہ یقیناً اس ٹھنڈک کا مزہ لیتی اگر اس وقت اپنی جاب کی پریشانی کا شکار نہ ہوتی۔

اس نے چائے کا مگ اٹھا کر ایک گھونٹ بھرا اور ایک اور اشتہار پڑھنا شروع کیا۔

یہی وقت تھا جب اس کے موبائل پر کال آنا شروع ہوئی تھی۔ وہ چونک کر موبائل کی جانب متوجہ ہوئی۔ اجنبی نمبر تھا جسے دیکھ کر وہ لمحہ بھر کے لیے تذبذب کا شکار ہوئی تھی لیکن پھر اس نے کال اٹینڈ کر لی تھی۔

"ہیلو۔۔۔ کون بات کر رہا ہے؟" اس نے سلام کرنے کی بھی زحمت نہیں کی۔ انداز سخت کہ اگر کوئی یہ کال تنگ کرنے کی نیت سے کر رہا ہے تو شروع میں ہی ہمت ہار دے۔

"السلام علیکم۔۔۔" بے حد شائستہ انداز میں کہا گیا تھا۔ زنانہ آواز تھی مگر خوش نصیب کو سوچنے کے باوجود یاد نہیں آیا کہ یہ کس کی آواز ہے۔

وہ خاموش رہی تھی۔ سلام کا جواب تک نہیں دیا تھا۔ تب ہی دوبارہ سے آواز گونجی۔

"خوش نصیب سے بات کروا دیں۔"

"آپ کون بات کر رہی ہیں؟" خوش نصیب نے پوچھ لینا مناسب سمجھا۔

"میں مسز معاویہ بات کر رہی ہوں۔"

خوش نصیب کو منفرا کا نام سن کر جھٹکا لگا۔

"جی السلام علیکم۔۔۔ میں خوش نصیب ہی بات کر رہی ہوں۔"

"اوہ وعلیکم السلام۔۔۔ کیسی ہو خوش نصیب؟"

"میں ٹھیک ہوں۔۔۔ آپ کیسی ہیں؟"

"میں ٹھیک ہوں۔ کل سے سوچ رہی ہوں، تمہیں کال کرنے کا مگر وقت نہیں مل سکا۔"

خوش نصیب کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ مزید کیا کہے۔۔۔ سو چپ ہی رہی۔

"اچھا خوش نصیب مجھے یہ بتاؤ۔۔۔ کل تم گھر آسکتی ہو؟" منفرا نے خود ہی بات آگے بڑھائی تھی۔

"جی آ تو میں جاؤں گی۔۔۔ مگر۔۔۔ سب خیریت ہے؟" خوش نصیب کا دل پوری شدت سے دھڑک رہا تھا۔

"ہاں سب خیریت ہے۔۔۔ دیکھو میں تم سے چھپاؤں گی نہیں۔۔۔ معاویہ تمہارے ساتھ لاہور جانے کے لیے تو راضی نہیں ہوئے ہیں لیکن میں نے انہیں اس بات پر راضی کر لیا ہے کہ تمہیں جاب دیں۔۔۔" منفرا اتنا بول کر خاموش ہو گئی۔

خوش نصیب کا دل ٹوٹ گیا۔ جانے کیوں اسے لگ رہا تھا کہ منفرا معاویہ کو منانے میں کامیاب ہو گئی ہو گی۔ لیکن۔۔۔

"دیکھو خوش نصیب! بات کو تھوڑا سا سمجھنے کی کوشش کرو۔ تم ابھی ہمارے پاس کام اسٹارٹ کرو۔۔۔ مجھے امید ہے معاویہ کبھی نہ کبھی اس بات پر ضرور راضی ہو جائیں گے کہ وہ تمہارے ساتھ جائیں اور تمہارے گھر والوں کو سب سچ بتائیں۔۔۔ اور جب تک ایسا نہیں ہوتا تب تک کے لیے تمہارے فنانشل اور ریزیڈینشل ایشوز تو سولو ہو جائیں گے ہمارے پاس کام کرنے سے۔"

خوش نصیب نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں منفرا۔۔۔ جاب اب میرا شوق نہیں ضرورت ہے۔۔۔ آپ بتائیں میں کل کس وقت آپ کے پاس آؤں۔"

"تم فکر مت کرو۔۔۔ اللہ بہتر کرے گا۔ تم کل بارہ بجے تک آجانا گھر۔۔۔ تمہارا کام اور سیلری وغیرہ ہم کل ڈسکس کر لیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔ میں کل آجاؤں گی۔" خوش نصیب نے کہا۔

"گڈ۔۔۔ پھر کل ملتے ہیں۔ اللہ حافظ۔"

منفرا نے کال بند کرنا چاہی مگر تب ہی اسے خوش نصیب کی آواز سنائی دی تھی۔

"آپ کا بہت شکریہ منفرا۔۔۔ میرے لیے آپ حقیقتاً فرشتہ ثابت ہوئی ہیں۔ خدا حافظ۔"

شام مسکرا دی۔ گھروں کے لوٹتے پرندوں نے اس مسکراہٹ کا راز جاننا چاہا لیکن شام نے کسی کو معلوم نہ ہونے دیا کہ خوش نصیب بالآخر دوسروں کے احسان ماننا سیکھ گئی ہے۔

بل کھاتے رستوں پر وہ جیپ بھاگتی چلی جا رہی تھی۔ وہ تعداد میں تین تھے۔ تینوں کے چہروں پر خوشی اور عزم صاف دکھائی دیتا تھا۔ انہیں اسلام آباد سے نکلے کافی وقت گزر چکا تھا۔ امید تھی کہ اگلے ایک گھنٹے میں وہ بشام کی حدود میں داخل ہو جائیں گے۔ ہنستے مسکراتے وہ آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ راستہ ختم ہونے کو تھا اور منزل قریب دکھائی دیتی تھی۔

ایسے میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے لڑکے نے کسی بات پر ہنستے ہوئے ایک خطرناک موڑ کاٹا تھا۔ اس سے پہلے کہ جیپ پوری طرح روڈ پر مڑ جاتی۔ اسٹیرنگ وہیل نے گھومنے سے انکار کر دیا۔۔۔ اس نے پوری طاقت لگا دی تھی وہیل موڑنے میں۔۔۔ لیکن ناکام رہا۔

صرف چند لمحوں کا کھیل تھا اور تیز رفتار جیپ کھائی میں گرتی چلی گئی۔۔۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

تہمینہ چوہدری



رات ہونے والی بارش اور تیز طوفان نے صحن کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔

جا بجا پھیلے شہتوت، پیپل، نیم اور جامن کے پتے اپنی چھب دکھلا رہے تھے۔ اپنے کمرے سے نکل کر اس نے کوفت بھری نگاہ پورے صحن پر ڈالی تھی۔ اس سہ منزلہ عمارت میں، کیونکہ نیچے والے پورشن میں رہنے کا شرف اسے حاصل تھا، اس لیے آندھی طوفان کی باقیات سمیٹنا بھی اسی کے ذمے ہوتا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی۔

یہ گھر اس کے بابا کی محنت کی کمائی سے بنا تھا۔ انہوں نے رشتوں کو جوڑ کر رکھنے کی عادت اپنے ابا سے پائی تھی اور ان کے ابا نے اپنے ابا سے، سو وہ اب تک سب ہی کو سینت سینت کر رکھے ہوئے تھے۔

دوسری منزل پر چھٹن چاچا اور بنو خالہ کا نواس تھا، جبکہ اس سے اوپر مشتری رہتی تھی، غلام ماموں کے ہمراہ۔ ایک پورے کا پورا جنجال پورہ تھا اس گھر میں، مانو گھر گھر نہ ہو، اچار کا ڈبا ہو، جس میں گاجر، مولی، ہری مرچیں، لیموں اور آم سب مکس کرکے ڈال دیا گیا ہو۔ مشتری تو رہتی تھی، ابھی چند دن پہلے ہی بنے میاں کا ٹرانسفر ہوا تھا، تو وہ بمعہ اپنے کنبے کے دوسرے شہر سدھارے تھے، وگرنہ تو ایسے لگتا تھا "نور منزل" کسی مچھلی منڈی کا نام ہو۔

"پہلے بابا جانی کے لیے سوپ بنا لیتی ہوں۔"

اس نے ہر چیز پر طائرانہ نگاہ ڈالی تھی۔ ہر چیز مٹی، مٹی، بابا جانی کی طبیعت اب کنٹرول میں ہی نہیں آتی تھی۔ کبھی شوگر بڑھ جاتی، تو کبھی بلڈ پریشر اپنے نقطہ عروج کو پہنچ جاتا۔ ان کی قلیل پنشن میں بڑا کھینچ تان کر گزارا ہو رہا تھا۔ کیونکہ نور منزل کے مکینوں کو کبھی اپنے کچن کے لیے راشن لانے کی توفیق رب نے عطا نہ کی تھی۔ جانے کب سے بابا جانی دو افراد کے لیے لانے والا مہینے بھر کا راشن، بیس لوگوں کے لیے لاتے تھے۔

سو بہانے تیار ملتے تھے۔

چھٹن چاچا کی ورکشاپ بند پڑی تھی۔

بنو خالہ کی مشین سارا سارا دن چلتی تھی، مگر آمدنی صفر۔

مشتری رشتے کراتی تھی، پر جانے کیسے رشتے کراتی تھی کہ ایک دھیلہ نہ ملتا تھا۔

غلام چاچا کا اپنا چلتا کاروبار تھا، جو جانے کدھر چلتا تھا کہ ایک روپیہ نہ نکلتا ان کی جیب سے، مجال ہے جو کبھی دیکھنے کو ملا ہو۔

اور غلام چاچی...... وہ تو استانی تھیں، پھر جانے تنخواہ کدھر جاتی تھی۔

وہ مستعدی سے سانچے باورچی خانے میں آئی تھی۔ ایک سلنڈر مشتری کے قبضے میں تھا، جبکہ دوسرا غلام چاچی سنبھالے بیٹھی تھیں۔

"ایک حصہ مجھے خالی کر دیں، مجھے بابا جانی کے لیے سوپ بنانا ہے۔" وہ منمنائی تھی۔ جسے قطعاً خاطر میں نہ لایا گیا تھا۔

"چھری تلے دم تو لو۔ ہم بھی کام ہی کر رہے ہیں۔" مشتری بولی تھی۔

"مجھے بابا کے لیے سوپ بنانا ہے۔" اس نے چبا کر اک اک لفظ پر زور دیا تھا۔

"مجھے میکرونی بنانی ہے اور دوسرے پر چنے ابل رہے ہیں، تھوڑا صبر کرو۔"



یعنی کسی کا کوئی ارادہ نہ تھا، اس کے بابا کے لیے سوپ بنانے دینے کا۔ حالانکہ زیادہ بھوکا رہنے سے ان کی طبیعت خراب ہو جاتی تھی۔ ڈھیر سارے آنسو اس کی آنکھوں میں امڈ آئے تھے۔ چپ چاپ باہر آکر وہ پھیلاوا سمیٹنے میں مگن ہو گئی تھی۔

صحن کو جھاڑو کی نہیں پانی کی ضرورت تھی، اس نے جلدی جلدی پائپ لگا کر دھونا شروع کر دیا تھا۔ اسے یاد آیا تھا۔ ابھی پرسوں کی ہی بات تھی۔ جب ابا کے ماہانہ چیک اپ کے لیے پیسے کم پڑ رہے تھے، تو وہ غلام چاچی سے مانگنے چلی گئی تھی۔ مگر انہوں نے تو منہ پر ہی صفا چٹ انکار کر دیا تھا، بلکہ الٹا اسے مفت مشورہ سے بھی نوازنے لگی تھیں۔

"پڑھی لکھی ہو، کہیں نوکری کیوں نہیں کرتیں۔

ہر وقت ہاتھ پھیلائے رکھنا اچھا لگتا ہے کیا۔" بے انتہا نخوت تھی ان کے لہجے میں۔

وہ چاہتی تھی کہ کرارا سا جواب دے۔ بابا کی اچھی خاصی پنشن، کچن، دودھ، بجلی، گیس اور اخبارات و رسائل کی مد میں نکل جاتی تھی، جو ان ہی لوگوں کی وجہ سے ہوتا تھا۔ مگر بابا کی تربیت آڑے آنے کی وجہ سے وہ خاموش ہی واپس آ گئی تھی۔ وہ اس نفانفسی کے دور میں بھی اپنے ابا کی نصیحت پر عمل پیرا تھے کہ ہمیشہ جوڑنا، صلہ رحمی کرنا، کبھی توڑنا مت۔

کچن میں بے ہنگم سا شور برپا ہوا تھا۔ اس نے تقریباً صحن دھو ہی لیا تھا۔ اس لیے پائپ سمیٹ کر کچن میں آ گئی۔ غلام چاچی کی میکرونی اور چنے والی ٹرے جانے کیسے زمین بوس ہو چکی تھی۔ چاچی تو ابھی صدمے کی حالت میں بت بنی کھڑی تھیں۔

"واللہ! میں نے ایسا کبھی نہیں چاہا تھا۔"

حالانکہ چاچی نے ہمیشہ اس کے معاملے میں سفاکی کا مظاہرہ کیا تھا، مگر اس نے کبھی ایسا نہ چاہا تھا۔ اس کی وجہ سے بلاوجہ کسی کا نقصان ہو جائے۔ غلام چاچی غصے سے اوپر چلی گئی تھیں۔ یعنی یہ پھیلاوا بھی اسے ہی سمیٹنا تھا۔ اس نے فرش صاف کیا، سوپ بنایا اور بابا کے کمرے میں آ گئی۔

"یہ لیں جی گرما گرم سوپ۔" وہ دنیا میں اس کی اکلوتی خوشی تھے۔ جینے کی وجہ، سکون کا سامان، آنکھوں کی ٹھنڈک، ان سے بات کرتے ہوئے لہجہ خود بخود ہی خوشگوار ہو جاتا تھا۔

"بابا ہمارے حالات کب ٹھیک ہوں گے؟"

"رطابہ بیٹا! ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔" وہ ٹھیک سے بول نہیں پاتے تھے۔ اس لیے مختصراً اسے تسلی دی تھی۔ وہ باہر نکل آئی تھی ان کے کمرے سے...... بابا جتنا حوصلہ اس میں نہیں تھا۔

بہت دن پہلے اسے بابا کو اسپتال لے کر جانا

تھا۔ ”چاچا! آپ ہمیں اسپتال لے جائیں گے؟“ اس نے بڑی آس سے غلام چاچا سے پوچھا تھا، جن کے پاس اپنی ذاتی گاڑی تھی۔

”بھئی مجھے تو اپنے بڑے ضروری کام ہیں، میں اسپتال کے چکر نہیں کاٹ سکتا۔ تمہارے بابا تمہاری ذمہ داری ہیں، تم ہی سنبھالو۔“

اور وہ یہ نہیں پوچھ پائی کہ آپ لوگ تو میرے بابا کی ذمہ داری نہیں، پھر کیوں بنا ماتھے پر شکن لائے سنبھال رہے تھے۔ اتنے سالوں سے...... بنا کچھ کہے...... کوئی احسان جتائے...... اس دن غلام چاچا کی گاڑی بمشکل چوری ہوتے ہوتے بچی تھی۔ جانے کیوں......

وہ بابا کو رکشے پر لے گئی تھی۔

وہ بے حد غمگین رہتی تھی۔ اسے لگتا تھا اللہ تعالیٰ اس سے خفا ہیں۔ اس لیے اس کی دعاؤں کا جواب نہیں دیتے تھے۔ اس کی نمازوں میں بددلی آگئی تھی۔ جیسے فرض سمجھ کر مارے باندھے پڑھ رہی ہو۔ کبھی کبھی اسے لگتا اس کے کسی عمل کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس سے سخت خفا ہیں۔ وہ گڑگڑا کر روتی اور اپنے ہر گناہ کی معافی مانگتی۔ وہ پہلے جیسی رطابہ جیسے رہی ہی نہ تھی۔ اپنے حالات سے شکوہ کناں...... اپنی تقدیر سے خفا خفا۔ اللہ تعالیٰ سے ڈھیر سارے شکوے اور بدگمانی لیے ہوئے۔ وہی کیوں....؟ اس کے ساتھ ہی کیوں... وہ منتظر تھی کہ اللہ تعالیٰ کچھ تو بہتر کریں گے۔ مگر ہر سو ایک گمبھیر چپ کا ڈیرہ تھا۔

اس کی نمازیں محض فرض پر مبنی ہوتی جارہی تھیں۔ مختصر سی تلاوت بغیر تشریح و ترجمے کے...... مگر جانے اس دن کیا ہوا وہ قرآن پڑھنے لگی تو دل کو اک سکون سا ملا اس سے آگے وہ پڑھ نہیں پائی تھی۔ جیسے سارے گمان کے بادل چھٹ گئے تھے۔ دل ہلکا پھلکا سا ہوگیا تھا۔ سارے اندیشے چھٹ گئے تھے۔ اس نے قرآن کو اپنے سینے سے لگایا تھا اور بابا کے کمرے میں چلی گئی تھی۔

”بابا۔“ اس نے آہستہ سے پکارا تھا۔

”اللہ کبھی ان کی حالت نہیں بدلتا جو اپنی حالت خود نہیں بدلتے۔ مومن ایک سوراخ سے بار بار نہیں ڈسا جاتا۔ اور مجھے پلیز معاف کیجیے گا بابا! صلہ رحمی اپنی جگہ، مگر آپ نے اپنی جیب میں کھوٹے سکے پال رکھے ہیں۔ وہ محض بوجھ ہیں رشتوں پر، جب ہم کسی کو بے لوث، بے ریا نوازتے رہتے ہیں تو وہ عادی ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہ ہی حال ان سب کا بھی ہے اور مجھے اب اپنے حساب سے انہیں ڈیل کرنا ہے۔

بابا! مدد کرنی چاہیے، مگر ایک حد تک مدد اور ان کی جنہیں واقعی ضرورت ہو۔“ اس کا لہجہ مضبوط اور انداز دوٹوک تھا۔

اسی رات اس نے سب کو بڑے عرصے بعد بڑی بیٹھک میں بلایا تھا جو ایمرجنسی میٹنگز کے لیے ہی مخصوص تھی۔

”جب تک ابا کی نوکری رہی گھر میں ہر چیز کی ریل پیل تھی، مگر اب ان کی پنشن میں گزارا مشکل سے مشکل ہو رہا ہے۔ میری آپ سب سے گزارش ہے کہ آپ اپنے اپنے پورشن کے باورچی خانے کھولیے جو جانے کب سے بند پڑے ہیں۔“ اس نے دبنگ انداز میں کہا تھا۔

”بھائی صاحب کے ہوتے ہوئے تم کب سے فیصلے کرنے لگیں؟“ چھٹن چاچا غصے سے گویا ہوئے تھے۔ باقی سب بھی قہر بار نگاہوں سے اسے گھور رہے تھے۔ مگر وہ گھبرائی یا ڈری نہیں۔

”آپ سب کو شاید علم نہیں کہ نور منزل میرے نام پر ہے اور مجھے اپنے گھر کے متعلق فیصلے کرنے کا پورا پورا اختیار ہے۔“ سب کو چپ لگ گئی تھی۔

”نیچے والا کچن صرف میرے اور ابا کے تصرف میں ہوگا۔“ اس نے کہا تھا۔

”چھٹن چاچا اور بنو خالہ! آپ دوسری منزل کا کچن اور غلام چاچا اور شرتی چاچی آپ تیسری منزل کا کچن استعمال کریں گے۔“ جانے کیا تھا اس کے لہجے میں کہ کوئی بول نہیں پایا تھا۔

”ہونا تو یہ چاہیے کہ آپ سے کرایہ طلب کیا جائے، مگر ابھی میرا اتنا خون سفید نہیں ہوا، نہ میں اس حد تک بے مروت ہوں۔“ اور وہ سب اک اک کر کے چپ چاپ باہر سے نکل گئے تھے۔ اگر گھر چھوڑ دیتے تو جو جیبیں بھر بھر کرائے آتے تھے ان کے گھروں کے وہ کیسے ملتے۔ اسی میں عافیت تھی کہ کچن الگ کرلیا جائے۔

”کھوٹے سکے۔“ وہ بڑبڑائی تھی۔ گہری اداسی نے اسے گھیر رکھا تھا۔ مگر اس نے اس مشکل میں بھی آسانی ڈھونڈ ہی لی تھی۔ بے شک ہر مشکل کے ساتھ آسانی اور ہر مشکل کا حل ہوتا ہے۔

کھوٹے سکے محض بوجھ ہوتے ہیں۔ صرف بوجھ۔

☆

راشدہ رفعت

اعتبار و بے اعتباری

پہلے بھابھی کمرے سے نکلی تھیں اور ان کے پیچھے بھیا اور اب کمرے میں عجیب تکلیف دہ سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ عرشیہ کی سسکیوں سے اس سناٹے کا خاتمہ ہوا تھا۔

"اُفوہ! ایک تو تمہیں رونا بہت جلد آتا ہے۔" احمر جو پہلے ہی پریشان تھا اس کے رونے سے سخت بدمزہ ہوا۔

"بھیا! کتنا بدل گئے ہیں۔ لگتا ہی نہیں ہمارے بڑے بھائی ہیں۔" عرشیہ نے ایک اور سسکی بھری تھی۔

"یہ سانحہ آج رونما نہیں ہوا ہے۔ بھیا کی شادی کو تین سال ہو گئے ہیں اور گزشتہ پونے تین سال سے بھیا بدلے ہوئے ہی ہیں۔" احمر بیزاری سے بولا تھا۔

"میرا اویس ایسا نہیں تھا۔ بہو کے انتخاب میں غلطی مجھ سے ہوئی ہے۔" اس بار رفیعہ رندھی ہوئی آواز میں بولی تھیں۔

"خود کو موردِ الزام ٹھہرانا بند کر دیں امی! آپ سے کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ عورتیں کم و بیش اسی فطرت کی مالک ہوتی ہیں۔ شادی کے بعد شوہر پر صرف اپنا

ناولٹ

ہی حق سمجھتی ہیں۔ یہ مرد کا کام ہے کہ وہ رشتوں میں توازن قائم رکھنا سیکھے اور بدقسمتی سے ہمارے اویس بھیا اپنی حمایت کا سارا وزن بھابھی کے پلڑے میں ڈال دیتے ہیں۔ بھابھی سے زیادہ بھیا کا قصور ہے امی!" احمر اس بار رسانیت بھرے لہجے میں گویا ہوا۔

"قصوروار کون ہے یہ فیصلہ بعد میں بھی کیا جاسکتا ہے، پہلے مسئلے کا حل سوچو۔" بہت دیر سے خاموش بیٹھے غزنی نے اکتا کر سب کو اصل مسئلے کی طرف متوجہ کیا اور کمرے میں چند لمحوں کے لیے پھر خاموشی چھا گئی تھی۔

مسئلہ کچھ اتنا بڑا بھی نہ تھا۔ احمر کی سمسٹر فیس جمع کروانے کی آخری تاریخ آن پہنچی تھی۔ احمر کئی دنوں سے امی کو یاددہانی کروا رہا تھا کہ وہ بھیا سے فیس کے پیسے لے دیں۔ امی نے اویس سے فیس



کا تذکرہ بھی کر دیا تھا۔ وہ امی کی بات سن کر خاموش رہے تھے۔ پہلے بھی کسی خرچے کے تذکرے پر وہ یونہی خاموش ہو جاتے تھے۔ نغمہ بھابھی کے چہرے کے زاویے بھی بگڑتے تھے مگر بہرکیف بھیا امی کی مطلوبہ رقم انہیں تھما دیتے تھے ساتھ ہی ساتھ امی کو جتا بھی دیتے۔

"دنیا جہان کے لڑکے چھوٹی موٹی نوکریاں کر کے اپنی پڑھائی کا خرچا اٹھاتے ہیں۔ ان دونوں کو بھی چاہیے کچھ ہاتھ پاؤں ہلا لیا کریں۔ میری لگی بندھی آمدنی ہے۔ یہ اضافی اخراجات کتنی مشکل سے برداشت کرتا ہوں، یہ میں ہی جانتا ہوں۔"

"غزنی تو ٹیوشنیں پڑھاتا ہے بیٹا! وہ تو اپنے چھوٹے موٹے خرچے بھی خود نکالتا ہے۔ بس احمر کے دو، تین سمسٹر رہ گئے پھر خیر سے وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے گا۔ تمہارا بوجھ خود بخود کم ہو جائے گا۔"

بڑے بیٹے سے بات کرتے ہوئے امی کا لہجہ خود بخود ہی ملتجیانہ اور مدافعانہ سا ہو جاتا۔ بھیا محض ہنکارا بھر کر خاموش ہو جاتے۔ اس بار بھی امی اور احمر کو قوی امید تھی کہ بھیا اپنے روٹین کے فقرے دہرا کر تھوڑا سا احسان جتاتے ہوئے مطلوبہ رقم امی کے ہاتھ میں تھما دیں گے لیکن ان دونوں کی امید بری طرح ٹوٹی تھی۔

"اس بار پیسوں کا بندوبست نہیں ہو پائے گا امی! احمر! یار تم اپنے دوستوں وغیرہ سے قرض لے کر کام چلا لو۔" انہوں نے امی کو مخاطب کر کے ساتھ ہی احمر کو بھی مفت مشورے سے نواز دیا تھا۔

"بھیا! میرے سب دوست میری طرح اسٹوڈنٹس ہیں۔ ہزاروں روپے کا قرضہ کون دے سکتا ہے۔" احمر اس مشورے پر ششدر ہی تو رہ گیا تھا۔

"یار! میں بھی مجبور ہوں۔ نغمہ کی بہن کی اسی ماہ شادی ہے، کپڑے لتوں کے خرچے کے ساتھ وہاں دینا دلانا بھی — پڑے گا اس بار تمہاری فیس بھرنے کی گنجائش واقعی نہیں ہے۔"

"بھیا! کچھ انتظام میں کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کچھ حصہ آپ ڈال دیجیے۔ اس کا سیکنڈ لاسٹ سمسٹر ہے۔ اب تو اس کی پڑھائی ختم ہونے میں بہت تھوڑا سا عرصہ رہ گیا ہے۔" غزنی نے بھی بھیا کے سامنے اپنے سے ڈیڑھ برس بڑے احمر کی وکالت کی۔

"یار! تم لوگ تو پیچھے ہی پڑ جاتے ہو۔ بات سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔ بتا رہا ہوں کہ تمہاری بھابھی کی بہن کی شادی ہے، ایل ای ڈی گفٹ کرنا ہے اسے۔ پھر شادی کے اور سینکڑوں خرچے، گنجائش ہوتی تو ضرور پیسے دے دیتا۔ کیا آج سے پہلے نہیں دیے؟" بھیا جھنجھلا سے گئے تھے۔

"تو یوں کہیں نا۔ آپ کی سالی کی شادی آپ کے بھائی کے کیریئر سے زیادہ اہم ہے۔" احمر طنز کیے بنا نہ رہ پایا اور اس بار جواب بھیا کے بجائے نغمہ بھابھی کی جانب سے آیا تھا۔

"تمہارے بھیا کے پیسوں پر صرف تم لوگوں کا حق نہیں ہے۔ میں بیوی ہوں ان کی' میرا حق کوئی جھٹلا نہیں سکتا اور شادی کے بعد آج تک تمہارے بھیا جان نے سسرال والوں سے لیا ہی لیا ہے' دینے کی نوبت کبھی نہیں آئی۔ سنی کی پیدائش پر ہی میرے ماں باپ نے کتنا دینا، دلانا کیا۔ اتنے قیمتی اور بڑھیا جوڑے تو تم لوگوں کو بھی دیے۔ چپ چاپ تم سب نے تحائف بٹور لیے۔ میری شادی کے بعد یہ میرے میکے کی پہلی خوشی ہے۔ کیا میں اپنی بہن کو من پسند تحفہ تک نہیں دے سکتی۔ اپنی ساری کمائی یہ تم لوگوں پر ہی لٹاتے رہیں' میرا کوئی حق نہیں۔" نغمہ بھابھی کا چہرہ غصے کی شدت سے سرخ ہو گیا تھا۔

"تم بلاوجہ کیوں اپنا بی پی بڑھا رہی ہو نغمہ۔ چلو کمرے میں جاؤ' ہمارے بیچ تمہیں بولنے کی کوئی ضرورت نہیں۔" بھیا نے بھابھی کو قدرے ڈپٹ کر مخاطب کیا۔ وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے چلی گئی تھیں۔

"نغمہ کی کنڈیشن کا ہی کچھ خیال کر لیا کریں

آپ لوگ۔ ڈاکٹر نے سختی سے تاکید کر رکھی ہے کہ بی پی شوٹ نہیں ہونا چاہیے اور اب یہ تذکرہ دوبارہ کر کے ٹینشن مت پھیلایئے گا۔ فی الحال کسی سے قرضہ لے کر کام چلا لیں۔ کچھ عرصے بعد اگر میری گنجائش بنی تو میں پیسے دے دوں گا۔" بھیا بھی بحث لپیٹتے بیوی کے پیچھے چل پڑے تھے۔ یہ تھا اس سناٹے کا پس منظر جوان کے جانے کے بعد کمرے میں پھیلا تھا اور عرشیہ کی سسکیوں سے ٹوٹا تھا۔

"کل صبح ہی تمہارے ماموں کے پاس جاتی ہوں۔ ان سے ادھار لے لوں گی۔ تم فکر نہ کرو۔ اپنی فیس بھرو اور پڑھائی پر دھیان دو۔"

رفیعہ نے آخر مسئلے کا حل نکال لیا تھا۔ احمر نے ٹھنڈی سانس بھر کر اثبات میں گردن ہلا دی۔ غزنی کے چہرے پر البتہ اب بھی خفگی جھلک رہی تھی۔

"بھیا اپنی محدود آمدنی کا طعنہ دیتے اس وقت اچھے لگتے اگر وہ اپنے بل بوتے پر حاصل کی گئی نوکری کر رہے ہوتے۔ ابا کا چلتا ہوا کاروبار سنبھالا ہے انہوں نے' وہ اکیلے ہی اس کاروبار کے وارث نہیں ہیں۔ پھر بھی اپنے جائز خرچوں کے لیے ہمیں بھک منگوں کی طرح ان کے آگے ہاتھ پھیلانے پڑتے ہیں اور ہر بار ہاتھ پھیلانے پر خیرات مل تو جاتی تھی۔ اس بار کسی اور کے در پر جا کر آواز لگانے پڑے گی۔" بھیا کے رویے سے اس کی انا کو سخت ٹھیس پہنچی تھی۔

"تمہارے ماموں بھی غیر نہیں بیٹا! ہر بار مجھ سے کہتے ہیں کہ اپنی کسی بھی ضرورت کے لیے بلا جھجک مجھ سے کہہ دیا کرو۔ ہم لوگ اویس اور بہو بیگم کا دنیا والوں کے سامنے جتنا بھی بھرم رکھ لیں۔ لوگوں کو سب اندازہ ہو جاتا ہے اور اب تو میں بھی خاندان والوں کے سامنے اپنے گھر کے حالات کی پردہ داری کرتے کرتے تھک گئی ہوں' اب مزید اپنے بیٹے کی سعادت مندی کے جھوٹے قصیدے نہیں پڑھوں گی۔" رفیعہ کی آنکھوں میں نمی چمکنے لگی تھی۔

"بس تھوڑے دن کی بات ہے امی! میری پڑھائی مکمل ہو جائے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" احمر نے ماں کے گرد اپنا ہاتھ پھیلا کہ انہیں ساتھ لگاتے ہوئے تسلی دی۔

"ہاں بیٹا! اب تو میری امیدوں کا مرکز تم دونوں ہی ہو۔" انہوں نے دونوں بیٹوں کو محبت سے دیکھا۔

"آپ نے روایتی ماں بن کر صرف بیٹوں سے امید لگا رکھی ہے۔ امی میں بھی آپ کو بیٹا بن کر دکھاؤں گی۔" عرشیہ نے ماں کو مخاطب کیا۔ "اب یہ چھٹنکی بھی ڈائیلاگ جھاڑنے لگی ہے؟" احمد نے مسکرا کر چھوٹی بہن کو چھیڑا' عرشیہ نے چھٹنکی کہنے پر منہ بسورا تھا جبکہ باقی لوگ ہنس پڑے تھے۔

☆☆☆

"یہ لیں پھوپھو! پانی پی لیں۔"

زنیرہ نے انہیں پانی کا گلاس تھمایا تھا۔ بھاوج کو سارا قصہ کہہ سناتے ہوئے ان کی آواز رندھ گئی تھی۔ جب زنیرہ نے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے انہیں پانی کا گلاس تھمایا۔

"ہاں پانی پیو رفیعہ! بلاوجہ خود کو ہلکان مت کرو۔ بس ساری بات مقدر کی ہے۔ اچھی بہو ملتی تو تمہارا بیٹا آج بھی تمہارا فرمانبردار ہوتا۔ ورنہ یہ ہی اویس تھا باپ کے مرنے کے بعد کیسے اپنے خاندان کو سمیٹا تھا اس نے۔ دنیا مثالیں دیتی تھی اس کی سعادت مندی اور فرمانبرداری کی۔" نگہت مامی نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے گزرا وقت یاد کیا تھا۔

"اب وہ ہی فرماں بردار بیٹا ایسا بدل گیا ہے بھابھی کہ مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ میرا ہی اویس ہے۔ بیوی کے کانوں سے سنتا ہے۔ اسی کی زبان بولتا ہے۔ ہمارے لیے تو بالکل پرایا ہو کر رہ گیا ہے۔"

"چلو ملال نہ کرو۔ خیر سے تین بیٹے ہیں تمہارے' پہلی بہو کا انتخاب صحیح نہیں ہوا اب احمر پڑھ لکھ کر اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے اس کے لیے لڑکی کا انتخاب چھان پھٹک کر کرنا۔" نگہت بھابھی نے مفت مشورے سے نوازا تھا۔

"ہاں بھابھی! اویس کے جوڑ کی تو خاندان میں کوئی لڑکی تھی نہیں' سب بچیاں چھوٹی تھیں۔ عمروں میں

بہت فرق تھا بس اسی لیے غیروں میں سے بہولائی پڑی لیکن اب یہ غلطی ہرگز نہیں دہراؤں گی۔ اپنے احمر کی شادی تو خاندان میں ہی کروں گی بس اللہ میرے بچے کو کسی قابل کرے تاکہ میں اس کے لیے اپنوں کے آگے ہاتھ تو پھیلا سکوں۔"

انہوں نے زنیرہ کو محبت پاش نگاہوں سے دیکھتے ہوئے ذومعنی سے انداز میں بات کی۔ نکہت بھابھی کے چہرے پر بھی مطمئن سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

"جاؤ زونی! اپنے پاپا کو دیکھو، ابھی تک مسجد سے آئے نہیں انہیں بتاؤ، پھوپھو ملنے آئی ہیں۔" نکہت نے بیٹی کو مخاطب کیا۔ زنیرہ چلی گئی تو دونوں نند بھاوج مزید تسلی کے ساتھ بچوں کے مستقبل پر بات چیت کرنے لگی تھیں۔

☆☆☆

وقت کا کام گزرنا ہے سو گزرتا گیا تھا۔ احمر کی پڑھائی کا سلسلہ اختتام پذیر ہوا تو اپنے شاندار اکیڈمک ریکارڈ کی وجہ سے اسے فوراً ہی بہت اچھی جاب بھی مل گئی تھی۔ گھر میں خوشیوں کی لہر دوڑ گئی۔ رفیعہ کو لگا کڑا وقت اب بیت چکا ہے۔ بڑے بیٹے کی زن مریدی سے وہ بہت دل برداشتہ ہو گئی تھیں۔ اب ان کی امیدوں کا مرکز احمر تھا۔ احمر شادی کے بعد بھائی کے بدلنے کا عینی شاہد تھا اور ان کا سخت ترین ناقد بھی۔ جب بھی رفیعہ بہو کے انتخاب میں غلطی کا دکھڑا روتیں تو وہ ماں کو ٹوک دیتا۔

"نہیں امی! اصل قصور بھیا کا ہے۔ وہ مرد ہی کیا جو کانوں کا اتنا کچا ہو کہ بیوی کی باتوں میں آ جائے۔ مرد کو رشتوں میں توازن قائم رکھنا آنا چاہیے اور بھیا اس معاملے میں قطعی ناکام ثابت ہوئے ہیں۔" وہ بھائی کو ہی موردالزام ٹھہراتا تھا۔

عرشیہ بھی جھٹ احمر کی تائید کرتی۔ وہ احمر کی لاڈلی تھی اور خود بھی احمر سے بہت پیار کرتی تھی۔ احمر کی ہر بات کی تائید کرنا اس پر لازم تھا۔ احمر کی شادی کا غلغلہ اٹھا تو سب سے زیادہ پرجوش بھی عرشیہ ہی تھی۔

ماموں زاد زنیرہ جو عرشیہ کی زونی آپی تھی احمر کی طرح وہ بھی عرشیہ کے بہت لاڈ اٹھاتی تھی۔ عرشیہ بھی ماموں کے گھر ملنے جاتی تو زونی اسے زبردستی دو، تین دن کے لیے اپنے گھر ٹھہرا لیتی۔ کبھی آؤٹنگ کے پروگرام بنتے تو کبھی عرشیہ کی پسند کے کھانے آرڈر کیے جاتے۔ عمروں میں فرق ہونے کے باوجود دونوں میں خوب دوستی تھی۔ پسند، ناپسند بھی ملتی جلتی تھی۔ رات گئے تک دونوں اپنی پسندیدہ موویز دیکھتیں اور دنیا جہان کی باتیں کرتیں۔

عرشیہ کی طرح زنیرہ بھی تین بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی اور برملا کہتی تھی کہ عرشیہ کی صورت میں مجھے میری چھوٹی بہن مل گئی ہے۔ ایسی لڑکی کو بھابھی بنا کر لاتے ہوئے عرشیہ کے پاؤں خوشی کے مارے زمین پر نہ ٹکتے تھے۔

نغمہ بھابھی کی وجہ سے زندگی جن کٹھنائیوں سے عبارت ہو گئی تھی اب اس کے خاتمے کا وقت آن پہنچا تھا۔ نغمہ نے اپنا کچن پہلے ہی علیحدہ کر لیا تھا۔ احمر کی شادی سے پہلے اویس بھائی فیملی کے ساتھ کرائے کا گھر لے کر وہاں شفٹ ہو گئے لیکن اب کسی کو ان سے سروکار بھی نہ تھا بلکہ ایک طرح سے سب نے شکر ہی منایا تھا۔

احمر کی شادی میں بھی وہ لوگ غیروں کی طرح شریک ہوئے۔ احمر خود دولہا تھا۔ ساری ذمہ داری غزنی کے کندھوں پر آن پڑی تھی اور اس نے تمام ذمہ داریاں بخوبی نبھائی تھیں۔ زنیرہ دلہن بن کر پھوپھی کے گھر آئی تو سب نے ہی اس کے خوب لاڈ اٹھائے تھے۔

پھوپھو، پھوپھو کہتے اس کا بھی منہ نہ سوکھتا تھا۔ رفیعہ اپنے انتخاب پر مسرور اور شاداں تھیں لیکن ہر گزرتے دن کے ساتھ ان کا اطمینان بڑھنے کے بجائے گھٹنے لگا تھا۔ معمولی، معمولی باتوں سے ہونے والی شروعات آہستہ آہستہ غیر معمولی رخ اختیار کرنے لگی تھیں۔

زنیرہ کو احمر کا عرشیہ سے لاڈ کھلنے لگا تھا حالانکہ اب لاڈ پیار کا مظاہرہ احمر کی طرف سے کم ہونے لگا تھا لیکن عرشیہ اپنے فطری بھولپن میں یہ بات محسوس

نہ کر پائی تھی اور اب بھی بلاجھجک احمر سے فرمائشیں کرلی تھی۔ وہ دونوں میاں بیوی آؤٹنگ کا پروگرام بناتے تو عرشیہ ازخود یہ فرض کر لیتی کہ جس طرح شادی کے اولین دنوں میں زونی آپی اصرار کر کے اسے ساتھ لے جاتی تھیں اب بھی ایسے کسی پروگرام میں اس کی شمولیت یقینی ہے آخر احمر کو ہی اسے ٹوکنا پڑا تھا۔

"تمہاری پڑھائی کا بہت حرج ہوتا ہے عرشی! گھر بیٹھ کر سکون سے پڑھو ہمیں جانے واپسی پر کتنی رات ہو جائے۔"

"ارے نہیں احمر بھائی۔ میں نے اپنا اسائنمنٹ کل ہی جمع کروا دیا ہے اب میں دو، تین دن تک بالکل فری ہوں۔" وہ بھائی کی تسلی کرواتی۔

"امی اب آپ ہی سمجھائیں اسے، یہ کوئی اتنی بچی بھی نہیں، بات سمجھنے کا نام نہیں لیتی۔ اب ہر جگہ اسے ساتھ لے کر جانا ضروری ہے کیا؟" احمر نے جھنجھلا کر ماں کو مخاطب کیا۔

رفیعہ تو پہلے ہی یہ سوچ رہی تھیں کہ احمر کے کمرے سے جانے کے بعد عرشیہ کو پیار سے صورت حال کی نزاکت سمجھانے کی کوشش کریں گی لیکن بیٹے کا اکھڑا، بگڑا لہجہ سن کر وہ ششدر رہی تو رہ گئی تھیں۔ گو اس کی بات غیر مناسب نہ تھی پر اس کا لہجہ اور انداز۔ دل ہی دل میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔ انہیں لگا ان کے گھر میں دوسرے اویس نے جنم لے لیا ہے لیکن اگلے ہی پل انہوں نے اس سوچ کو وہم قرار دے کر ذہن سے جھٹکا۔

"میں زیادہ ہی زودرنج اور حساس ہو گئی ہوں میرا احمر، اویس جیسا نہیں بن سکتا۔" انہوں نے خود کو تسلی دی لیکن آہستہ آہستہ احساس ہوا کہ یہ محض طفل تسلی تھی۔

"عرشی دروازے پر دستک دیتے کے ساتھ ہی دھڑام سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو جاتی ہے امی! اسے سمجھائیں کہ میاں، بیوی کی پرائیویسی بھی کوئی چیز ہوتی ہے کچھ تو عقل کے ناخن لیا کرے۔" وہ اکتاہٹ بھرے لہجے میں ماں کو مخاطب کرتا۔

"بے وقوف ہے وہ، میں سمجھاؤں گی اسے بیٹا۔" احمر کے سامنے بھی اب ان کا انداز مدافعانہ ہونے لگا تھا۔

عرشیہ واقعی اتنی بچی نہ تھی۔ زونی آپی اور احمر بھائی کے بدلتے تیور اب اس کی بھی سمجھ میں آنے لگے تھے۔ ماضی کی بے تکلفی قصہ پارینہ ہوئی اور عرشیہ آہستہ آہستہ اپنے خول میں سمٹنے لگی لیکن اب اعتراضات کی نوعیت بھی بدل گئی تھی۔

"عرشیہ سے کہیں امی اب تھوڑا بہت گھر کے کاموں میں وہ بھی حصہ لیا کرے۔ آپ نے اسے بالکل ہتھیلی کا چھالا بنا رکھا ہے۔ اب وہ بڑی ہو گئی ہے آہستہ آہستہ اسے گھرداری سکھائیں۔" احمر ان سے مخاطب تھا اور وہ حیران ہو کر بیٹے کی شکل دیکھ رہی تھیں۔

"ابھی عرشیہ کو ایف ایس سی کیے دو ماہ بھی نہیں ہوئے ہیں احمر! وہ کہاں سے اتنی بڑی ہو گئی کہ میں اس پر گھر کے کاموں کا بوجھ لاد دوں۔"

"عرشیہ کی طرح زنیرہ بھی اپنے گھر کی اکلوتی بیٹی تھی امی! اس نے میکے میں تنکا توڑ کر نہیں دیکھا۔ ماموں کے گھر کا لائف اسٹینڈرڈ بھی آپ جانتی ہیں۔ گھر میں دو، دو ملازم تھے۔ زونی کو کام کرنے کی بالکل عادت نہیں۔ وہ بری طرح تھک جاتی ہے۔ اگر عرشیہ گھر کے کاموں میں اس کا تھوڑا بہت ہاتھ بٹا دے گی تو کوئی قیامت تو نہیں آ جائے گی۔" وہ بیزار سے لہجے میں ماں سے مخاطب تھا۔

"بیٹا جی! صفائی، ستھرائی اور کپڑوں کی دھلائی کے لیے تو اپنے گھر بھی ماسی آتی ہے۔ صبح کا ناشتہ میں بنالی ہوں۔ برتن بھی ہاتھ کے ہاتھ دھو لیتی ہوں۔ زونی کو صرف دوپہر کی ہانڈی روٹی کرنی ہوتی ہے۔ آج سے وہ بھی میں پکالوں گی۔ ہاں تمہارے کپڑے پریس کرنا، جوتے پالش کرنا اور اس طرح کے چھوٹے موٹے کام کرنے سے وہ تھک جاتی ہے تو بہرحال یہ سب عرشیہ کی یا میری ذمہ داری نہیں۔

تمہاری جیب اجازت دے تو ان کاموں کے لیے بھی اسے نوکرانی لگوا دو۔" رفیعہ ٹھیک ٹھاک خفا ہو گئی تھیں۔

"آپ بات کو کہاں سے کہاں لے گئیں امی! یعنی آپ عرشیہ کو گھر کے کاموں سے بالکل بری الذمہ رکھنا چاہتی ہیں۔ زونی صحیح کہتی ہے کہ آپ کی شہ پر ہی عرشیہ اتنا بگڑ گئی ہے۔ کل کو اس نے بیاہ کر اگلے گھر بھی جانا ہے۔ عقلمند مائیں بیٹیوں کو چھوٹی عمر میں ہی گھر داری سکھا دیتی ہیں اور ایک آپ ہیں۔"

"اپنی ممانی کے متعلق کیا خیال ہے۔ انہوں نے تمہاری بیگم کو گھر داری کیوں نہیں سکھائی۔ ابھی خود اعتراف کر رہے تھے کہ زنیرہ اپنے گھر میں ہل کر پانی تک نہیں پیتی تھی اور اپنی چھوٹی بہن کو ساڑھے سترہ برس کی عمر میں ہی گھر داری میں طاق دیکھنا چاہتے ہو۔" غزنی بھی کمرے میں موجود تھا اور جانے کتنی دیر سے ضبط سے کام لے رہا تھا مگر اب امی کا دھواں دھواں ہوتا چہرہ دیکھ کر اس کا ضبط جواب دے گیا تو احمر سے الجھ پڑا تھا۔

"تم لوگوں سے تو بات کرنا ہی فضول ہے۔" اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا تو تن فن کرتا چلا گیا۔ بعد میں موقع پا کر غزنی نے اسے بہت تحمل اور رسانیت سے سمجھانا چاہا تھا۔

"احمر کیا ہو گیا ہے میرے بھائی! تم کیوں اویس بھائی کے نقش قدم پر چلنے لگے ہو۔ زنیرہ بھی گھر والوں سے اکھڑی اکھڑی رہنے لگی ہے۔ آخر اسے پرابلم کیا ہے۔" غزنی احمر سے مخاطب تھا۔

وہ احمر سے ڈیڑھ برس چھوٹا تھا لیکن دونوں میں بلا کی بے تکلفی اور دوستی تھی۔ ماموں زاد زنیرہ تو غزنی سے بھی چھ ماہ چھوٹی تھی اس لیے غزنی اسے بھابھی کہنے کا تکلف نہیں کرتا تھا بلکہ نام لے کر ہی مخاطب کرتا تھا۔ اب بھی وہ بہت تحمل سے زنیرہ کے بدلتے رویوں سے متعلق احمر سے استفسار کر رہا تھا۔

احمر کے پاس شکوے شکایتوں کی ایک لمبی لسٹ تھی اس کے مطابق زنیرہ کو گھر میں ایڈجسٹ ہونے میں شدید دشواری پیش آ رہی تھی۔ اسے زیادہ شکایت عرشیہ سے تھی جو گھر کے کاموں میں بالکل تعاون نہیں کرتی تھی۔ غزنی لب بھینچے اس کی باتیں سنتا رہا۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو۔ میں کوئی اتنی غلط بات تو نہیں کر رہا۔" احمر اس کے دیکھنے کے انداز پر چڑ کر بولا۔

"میں دیکھ رہا ہوں کہ اس لہجے میں بولتے ہوئے تم بالکل اویس بھیا جیسے لگ رہے ہو۔"

"مجھے بھیا سے مت ملاؤ۔ میں ان کی طرح زن مرید نہیں ہوں۔" احمر جھنجھلایا تھا۔

"زن مریدوں کے سر پر سینگ نہیں ہوتے میرے بھائی۔ تم بھی آہستہ آہستہ اویس بھیا والی کیٹگری میں شامل ہوتے جا رہے ہو۔" غزنی جتائے بنا نہ رہ پایا۔

"میں بھیا کی طرح امی سے پائی پائی کا حساب نہیں لیتا۔ اپنے اخراجات نکال کر ساری تنخواہ امی کے ہاتھ میں تھما دیتا ہوں پھر پلٹ کر پوچھتا تک نہیں۔ تم مجھے بھیا میں کس طرح ملا سکتے ہو۔" احمر خود کو بالکل حق بجانب سمجھ رہا تھا غزنی نے بحث بڑھانا مناسب خیال نہ کیا۔

"اچھا ٹھیک ہے میں عرشیہ کو بھی سمجھاتا ہوں۔ وہ زنیرہ کی ہیلپ کر دیا کرے گی۔ لیکن یار ابھی اس کی بی ایس کی نئی نئی کلاسز شروع ہوئی ہیں مشکل پڑھائی ہے اور وہ ہمیشہ سے ہی پڑھائی کو ضرورت سے زیادہ سر پر سوار رکھتی ہے۔ پھر عرشیہ کے بجائے امی بھی تو ہیں جو ہر وقت گھر کے کاموں میں مصروف رہتی ہیں۔ میرے خیال میں تو زونی پر گھر کے کاموں کا اتنا برڈن نہیں پھر بھی میں عرشیہ سے کہوں گا کہ وہ بھی اس کی ہیلپ کروا دیا کرے۔" غزنی نے بات سمیٹی تھی۔ احمر نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

غزنی کے سمجھانے پر عرشیہ نے حتی المقدور گھر کے کاموں میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا لیکن زنیرہ کو اس سے جانے کیسی چڑ ہو گئی تھی وہ بات بے بات اسے ٹوکنے لگی تھی۔ عرشیہ کے ضبط کا پیمانہ جب جواب

دے دیتا تو وہ بھی زنیرہ کی طرف کوئی طنزیہ فقرہ لڑھکا دیتی۔ ذرا سی بات کو زنیرہ بہت بڑھا چڑھا کر احمر کے سامنے پیش کرتی۔ وہ عرشیہ پر بگڑتا سو بگڑتا ساتھ ہی امی سے بھی الجھتا اس کے خیال میں امی کی شہ پر ہی عرشیہ اتنی زبان دراز ہوتی جا رہی ہے۔

رفیعہ چپ چاپ آنسو بہائے جاتیں۔ گھر کا ایسا مکدر ماحول تو اویس اور نغمہ کے ساتھ رہتے بھی نہ تھا۔ زنیرہ، مزاج کی تندی میں نغمہ سے بھی بڑھ کر ثابت ہوئی تھی۔ معمولی معمولی باتوں کو بھی ایسی رنگ آمیزی سے احمر کے سامنے پیش کرتی کہ سارا قصور گھر والوں کا ہی نکلتا۔ اب تو رفیعہ خاندان والوں کے سامنے بھی جلے دل کے پھپھولے نہ پھوڑ سکتی تھیں کہ بہو غیر نہیں ان کی سگی بھتیجی تھی بلکہ نگہت بھابھی ہی خاندان والوں کے سامنے اپنی بیٹی کی مظلومیت کے رونے روتیں۔

"بھئی اب پتہ چلا کہ گھر والوں سے الگ ہونے میں اویس اور نغمہ کا کوئی قصور نہیں۔ رفیعہ کو خود ہی بہوؤں سے بنانے کا ڈھنگ نہیں آتا۔"

"لوگ اتنے ڈھیٹ اور اتنے جھوٹے کیسے ہو سکتے ہیں امی! کسی پر بہتان باندھتے ہوئے انہیں خدا سے ڈر نہیں لگتا۔ آج میں شاکر ماموں کے گیا تھا وہاں عابدہ مامی سے پتہ چلا کہ نگہت مامی ہم لوگوں کے متعلق کیسی کیسی باتیں کرتی ہیں۔ آپ ان سے جواب طلبی تو کریں۔ وہ ایسی باتیں کیوں کر رہی ہیں جن کا کوئی سر پیر ہی نہیں۔" غزنی دکھ بھرے لہجے میں ماں سے مخاطب تھا۔

"زنیرہ جو ماں کو بتاتی ہے نگہت بھابھی اسی کو آگے نشر کرتی ہیں۔ ایک ماں، بیٹی کی باتوں پر کیوں یقین نہیں کرے گی۔ اصل دکھ مجھے احمر کے رویے پر ہے۔ وہ تو اسی گھر میں رہتا ہے کیا اسے سچ، جھوٹ کا فرق بالکل پتا نہیں چلتا۔ زنیرہ کے ہر الزام کو سچا سمجھ کر مجھ سے جواب طلبی کرنے آ جاتا ہے۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ میری کوکھ سے جنے بیٹے ہیں۔

پہلے اویس اور اب احمر۔ ایک وقت تھا کہ مجھے تین بیٹوں کی ماں ہونے پر فخر تھا لیکن آج سوچتی ہوں اللہ ان بیٹوں کے بجائے بیٹیاں ہی دے دیتا۔ ماں کے دل کو ایسے چرکے تو نہ لگاتیں۔" رفیعہ پھپھک پھپھک کر رونے لگی تھیں۔ اویس کے بعد احمر کے رویے سے وہ بالکل ہی دل برداشتہ ہو گئی تھیں۔

"ایسے مت کہیں امی۔ میں ہوں آپ کا بیٹا۔ کبھی آپ کا مان نہیں توڑوں گا۔ آپ کی ہر امید پر پورا اتروں گا۔" غزنی ماں کی حالت دیکھ کر جذباتی ہو گیا تھا۔

"بس رہنے دو بیٹا۔ یہ سب شادی سے پہلے کی باتیں ہیں ایسے دعوے احمر نے بھی بہت کیے تھے۔ اب مجھے کسی سے کوئی امید نہیں۔ جانے زندگی نے ابھی کیا کچھ اور دکھانا ہے۔" وہ آزردگی سے بولیں۔

غزنی ان کی دلی کیفیت سمجھ سکتا تھا۔ بس بے بسی سے ماں کو دیکھ کر رہ گیا۔

☆☆☆

احمر کے ٹرانسفر آرڈر آ گئے تھے۔ غزنی کو کسی ذریعے سے علم ہوا تھا کہ اس نے بھاگ دوڑ کر کے یہ ٹرانسفر خود کروایا ہے اس نے احمر سے تصدیق کرنا ضروری نہ سمجھا تھا۔ ایک طرح سے اچھا ہی تھا کہ وہ زنیرہ کو ساتھ لے کر یہاں سے جا رہا تھا۔ گھر میں پھیلی ہر وقت کی ٹینشن کا اسی طور خاتمہ ممکن تھا۔

"دوسرے شہر میں اخراجات بڑھ جائیں گے امی لیکن پھر بھی میں اپنے فرض سے غافل نہیں ہوں۔ آپ کو ایک معقول خرچا ہر ماہ بھجواتا رہوں گا۔" اس نے اپنی دانست میں فرماں بردار بیٹا ہونے کا ثبوت دیا تھا۔

"بس تھوڑے دنوں کی بات ہے احمر۔ میں نے جاب کے لیے بہت جگہ اپلائی کر رکھا ہے ان شاء اللہ کہیں نہ کہیں سے مثبت جواب مل جائے گا پھر تمہیں خرچا بھجوانے کی بھی ضرورت نہیں رہے گی۔ میں مینج کر لوں گا۔" غزنی نے سنجیدگی سے بھائی کو مخاطب کیا۔

"زیادہ فرماں بردار بیٹا بن کر دکھانے کی ضرورت نہیں ہے غزنی! زنیرہ صحیح کہتی ہے کہ تم ہمیشہ اس کوشش میں لگے رہتے ہو کہ امی کے سامنے صرف تمہارے نمبر بڑھیں۔ مجھے ڈی گریڈ کرنے کی کوششیں اب ترک کردو غزنی۔" احمر روکھے پن سے بولا۔

"زنیرہ ہمیشہ ہی صحیح کہتی ہے احمر۔ اللہ اس کی راست بازی کو قائم اور اس کی سچی باتوں پر تمہارے پختہ ایمان کو مزید مضبوط بنائے۔ میری نیک تمنائیں تم دونوں کے ساتھ ہیں۔"

وہ احمر کا شانہ تھپتھپا کر کمرے سے نکل گیا۔

احمر بس اس کی پشت کو گھور کر رہ گیا تھا۔

☆☆☆

احمر اور زنیرہ چلے گئے تھے۔ غزنی کو بھی جلد ہی من پسند نوکری مل گئی تھی لیکن اس کے کیریئر کے اس شاندار آغاز پر گھر میں ویسی خوشی نہیں منائی گئی جیسے کبھی احمر کی نوکری ملنے پر منائی گئی تھی۔

"مجھے اتنی اچھی جاب مل گئی آپ خوش نہیں ہیں امی۔" وہ بالآخر ماں سے پوچھ بیٹھا۔

"خوش ہوں بیٹا۔ اللہ نے تمہاری محنت کو ٹھکانے لگایا۔ اللہ ترقی کے مزید دروازے کھولے۔" انہوں نے صدق دل سے اسے دعا دی تھی۔

"کڑا وقت بیت گیا امی۔ اب ہمیں کسی کا دست نگر نہیں بننا پڑے گا۔" وہ سرشاری سے بولا۔

"وہ کسی اور بھی غیر نہیں غزنی بھائی! امی کے سگے بیٹے تھے۔ اللہ نے امی کو ساری اولاد ذہین فطین بخشی لیکن کوئی بھی امی کو لائق اور فرمانبردار بیٹا ہونے کا مان نہ بخش سکا۔ بیٹوں کے لیے امی کی محنت، ریاضت اور دعائیں سب رائیگاں گئیں۔ امی کے بیٹوں کی لیاقت اور ذہانت کا پھل ان کی بیویوں کے حصے میں آیا۔ ظاہری بات ہے میں اور امی آپ کی کامیابی پر بہت خوش ہیں۔ اتنا ہی خوش جتنا ہم اویس بھیا اور احمر بھائی کی کامیابیوں پر ہوتے تھے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اب ہم آپ کی ذات سے کوئی امید لگانے کی غلطی نہیں کریں گے کیونکہ جب امیدیں ٹوٹتی ہیں تو دکھ بھی زیادہ ہوتا ہے غزنی بھائی! اس سے اچھا یہ نہیں کہ نہ امید لگائی جائے نہ اس کے ٹوٹنے کا دکھ برداشت کیا جائے۔" غزنی کے سوال کا مدلل جواب دینے والی یہ عرشیہ تھی۔

غزنی نے حیرت سے بہن کو دیکھا۔ کل تک ہر بات پر سوں سوں کر کے رونے والی عرشیہ کتنی بڑی بڑی اور سمجھدار لگی تھی اس پل۔

"مجھے احمر سے کمپیئر مت کرو عرشی۔ میں امی اور تمہارے اعتماد کو کبھی ٹھیس نہیں پہنچاؤں گا۔" اس نے چھوٹی بہن کو محبت سے دیکھتے ہوئے یقین دلایا۔

"ایسے وعدے کبھی احمر بھائی نے بھی کیے تھے غزنی بھائی! ہم نے تو ان کی بات پر بھی اعتبار کیا تھا۔" عرشیہ کے لبوں پر معصوم سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

غزنی ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ یہ بے اعتباری اتنی آسانی سے ختم نہیں ہو پائے گی۔ وقت آنے پر ہی اسے عملی ثبوت دے کر ماں اور بہن کا اعتبار بحال کرنا تھا اور یہ وقت بہت جلد آ گیا تھا۔ جاب ملنے کے کچھ مہینے بعد ہی امی نے اپنے لیے تیسری بہو ڈھونڈنی شروع کر دی تھی۔

"آخر میری شادی کی آپ کو ایسی کیا جلدی ہے امی۔" وہ ماں کے ارادوں کی بھنک پا کر حیرت سے استفسار کر رہا تھا۔

"میں بھی امی کو یہ ہی سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ اتنے عرصے بعد تو زندگی میں کچھ سکون کا وقفہ آیا ہے اور امی اس سکون کو پھر درہم برہم کرنے جا رہی ہیں۔" عرشیہ شاکی لہجے میں مخاطب ہوئی تھی۔

"تم خیر سے برسر روزگار ہو گئے ہو۔ اب شادی میں دیر کا کوئی جواز نہیں۔ شادی کے لیے یہ ہی مناسب عمر ہوتی ہے۔" انہوں نے عرشیہ کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے رسانیت سے بیٹے کو جواب دیا تھا۔

"میں چاہتا ہوں کہ آپ میری شادی سے پہلے عرشیہ کی شادی کے بارے میں سوچیں۔ میں پہلے عرشیہ کے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتا ہوں۔" اس نے ماں کو اپنے نکتہ نظر سے آگاہ کیا۔

"ابھی عرشیہ کا بی ایس مکمل ہونے میں بھی کچھ عرصہ باقی ہے اس کے بعد یہ ایم ایس کرنے کا بھی ارادہ رکھتی ہے۔ میں اس کی پڑھائی مکمل ہوتے کے ساتھ ہی اسے بھی گھر بار کا کر دوں گی۔ اللہ کا شکر ہے اس کے لیے ابھی سے ہی پیام آنا شروع ہو گئے ہیں۔ مناسب وقت آنے پر چھان پھٹک کے بعد کوئی رشتہ منتخب کر کے اسے بھی وداع کر دوں گی لیکن اس کے انتظار میں تمہاری شادی میں تاخیر نہیں کرنا چاہتی۔

بیٹیوں کے ساتھ ساتھ مناسب عمر میں بیٹوں کی شادی کرنا بھی والدین کا فرض اور ذمہ داری ہے۔ اللہ تمہارے ابا کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے وہ معاشرے میں بڑھتے ہوئے اخلاقی زوال پر بہت کڑھتے تھے اور کہتے تھے کہ اس کا بڑا سبب بچوں کی شادیوں میں تاخیر ہے اور ہم اپنے بچوں کی مناسب عمر میں شادیاں کریں گے۔ مجھے تمہارے ابا کی خواہش کا پاس ہے جب میں نے اویس اور احمر کی شادیاں اتنی عمر میں کر دی ہیں تو تمہیں عرشیہ کے انتظار میں کیوں بٹھائے رکھوں۔" ان کا انداز دوٹوک تھا۔

"لیکن امی......" غزنی نے انہیں کچھ سمجھانا چاہا تھا۔

"کوئی لیکن ویکن نہیں غزنی۔ عرشیہ کے لیے فکر مت کرو۔ میرا زیور عرشیہ کے لیے محفوظ ہے۔ احمر کے بھیجے گئے پیسوں سے اس کی شادی کے لیے کمیٹی بھی ڈال دی ہے۔ باقی مجھے یقین ہے کہ جو کمی بیشی ہوئی تو بہن کی محبت میں نہ سہی دنیا دکھاوے کو ہی سہی تم تینوں بھائی شایان شان طریقے سے اکلوتی بہن کو وداع کرنے کے لیے اپنا، اپنا حصہ ضرور ڈالو گے۔" امی نے اسے کچھ بولنے کے قابل ہی نہ چھوڑا تھا۔ وہ خاموش ہو گیا۔

جان گیا تھا کہ ماں کو اس کی شادی کا خاص ارمان نہیں بلکہ اس کی با اصول ماں اپنے فرض سے سبکدوش ہونے کے ساتھ اپنے مرحوم شوہر کی خواہش پوری کرنا چاہ رہی ہے۔

"ٹھیک ہے کر دیں میری شادی لیکن خدا کے لیے میرا موازنہ بھیا اور احمر سے مت کیا کیجیے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ اپنے لیے بہو تو ڈھونڈ رہی ہیں لیکن آپ کے دل میں یہ خیال راسخ ہو چکا ہے کہ میں بھی شادی کے بعد بھیا اور احمر کی طرح بدل جاؤں گا۔ آپ مجھ سے محبت تو کرتی ہیں لیکن مجھ پر اعتبار کرنے کو تیار نہیں۔

اپنے بڑے بیٹوں کے کیے کی سزا مجھے تو مت دیں۔ مجھے آزمائے بغیر مجھ سے یوں بے رخی مت اپنائیں۔ آپ اور عرشیہ مجھے خود سے بہت فاصلے پر محسوس ہونے لگی ہیں۔" وہ بے بس سا ہو کر بولا تھا۔

"غزنی بھائی! بیوی کو تو آ لینے دیں۔ ابھی آپ کو نادیدہ فاصلے بھی نظر آ رہے ہیں پھر حقیقی فاصلے بھی محسوس نہیں ہوں گے۔" عرشیہ ہنسی۔

غزنی چپ رہا۔ جان گیا تھا کہ عملی ثبوت دیے بنا محض دعووں سے بات نہیں بننے والی۔

امی نے آخر اس کے لیے لڑکی ڈھونڈ ہی لی تھی۔ رشتہ بڑی خالہ نے بتایا تھا۔ وہ گرلز کالج میں لیکچرار تھیں اور ثمین کی امی بھی اسی کالج میں لائبریرین تھیں۔ ان کے شوہر کا عرصہ دراز پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ اللہ نے انہیں چار بیٹیوں سے ہی نوازا تھا۔ ثمین سے بڑی بہن کا رشتہ طے ہو چکا تھا اور ثمین کی والدہ کی خواہش تھی کہ اگر ثمین کا بھی کوئی مناسب رشتہ مل جائے تو وہ دونوں بیٹیوں کے فرض سے اکٹھے سبکدوش ہو جائیں۔ بڑی خالہ ثمین کی والدہ کی بہت تعریفیں کرتی تھیں۔ یہ رشتہ کروانے میں بنیادی کردار انہوں نے ہی ادا کیا تھا۔

"خالہ کی تعریفوں پر مت جائیں امی! یاد نہیں نغمہ بھابھی کا رشتہ چھوٹی چچی کی معرفت طے پایا تھا اور وہ بھی نغمہ بھابھی اور ان کے گھر والوں کی تعریف میں رطب اللسان رہتی تھیں۔" عرشیہ غزنی کی شادی سے نہ تو خود خوش تھی نہ ہی امی کو کسی قسم کی خوش گمانی

میں جتلا دیکھنا چاہتی تھی۔
''خیر ہے بیٹا، کہیں نہ کہیں تو غزنی کی شادی کرنی ہی ہے نا۔ اگر ثمین بھی تمہاری دونوں بھابھیوں جیسی نکلی تو اس سے پہلے کہ وہ غزنی کو لے کر الگ ہو، میں خود دونوں کا الگ ہونے کا کہہ دوں گی اب اس عمر میں چخ چخ برداشت کرنے کا مجھ میں تو حوصلہ نہیں۔'' وہ تھکے تھکے لہجے میں بولیں۔
''آپ پہلے سے ہی دفاعی محاذ پر مت کھڑی ہوں امی۔ یہ ہی آپ کی غلطی ہے۔ آپ بہوؤں کو شروع دن سے اتنی ڈھیل نہ دیتیں تو انہیں آپ کے بیٹوں پر قبضہ جمانے کی ہمت ہی نہ ہوتی۔
اویس بھیا اور احمر بھائی تو ہاتھ سے نکل گئے لیکن غزنی بھائی پر سے اپنا حق کبھی مت چھوڑیے گا۔ آنے والی کو اتنا موقع ہی کیوں ملے کہ وہ آپ کے بیٹے اور میرے بھائی پر اپنا حق جتا سکے۔'' عرشیہ نے ماں کو سمجھانا چاہا تھا۔
''اچھا بس کرو۔ اللہ سے بہتری کی امید رکھو۔ ضروری نہیں ثمین بھی نغمہ اور زونی جیسی نکلے۔ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔'' وہ رسانیت بھرے لہجے میں بیٹی سے مخاطب ہوئیں۔
عرشیہ چپ رہی۔ ماں کو سمجھانا فضول تھا لیکن اس نے سوچ لیا تھا کہ شادی کے بعد نئی بھابھی کو پر پرزے نکالنے کا موقع نہیں دے گی۔ اس سے پہلے غزنی بھائی اس کی سکھائی پڑھائی میں آئیں وہ اس نئی آنے والی کو دفاعی پوزیشن پر کھڑا ہونے پر مجبور کر دے گی۔
نغمہ بھابھی اور زنیرہ بھابھی نے کوئی وجہ نہ ہوتے ہوئے بھی اپنے شوہروں کو ان کے گھر والوں سے متنفر کر دیا تھا۔ عرشیہ کے نزدیک یہ گھر والوں کی ڈھیل تھی۔ پہلے تو وہ کم عمر اور ناسمجھ تھی بھابھیوں کی چالوں کو نہ سمجھ پائی لیکن اب اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ نئی بھابھی کو کوئی چال چلنے کا موقع ہی نہ دے گی۔ اچھی بات یہ تھی کہ فی الحال غزنی اور ثمین کے درمیان کوئی رابطہ قائم نہ ہوا تھا ورنہ اویس بھیا اور احمر شادیوں سے پہلے ہی اپنی منگیتروں کے ساتھ ٹیلی فونک رابطے میں تھے اور غزنی نے تو ثمین کی تصویر تک دیکھنے میں دلچسپی ظاہر نہ کی تھی۔ حالانکہ بات پکی ہونے کے بعد رفیعہ غزنی کو دکھانے کے لیے ثمین کے گھر والوں سے اس کی تصویر مانگ لائی تھیں۔
''آپ کی پسند ہے امی ٹھیک ہی ہو گی۔'' غزنی نے تصویر پر سرسری نگاہ ڈال کر واپس رفیعہ کو تھما دی۔
شادی کے دن قریب آ گئے تھے۔ رفیعہ کے جوڑوں میں درد تھا۔ شادی کی شاپنگ عرشیہ کو ہی کرنی پڑ رہی تھی۔ غزنی ساتھ جاتا تھا لیکن اسے لیڈیز شاپنگ کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ وہ نہ تو کوئی مشورہ دینے کا اہل تھا نہ ہی عرشیہ اس سے مشورہ مانگتی تھی۔ بری کے سب ملبوسات اس نے اپنی مرضی سے خریدے تھے۔ رفیعہ شاپنگ دیکھ کر چپ سی ہو گئی تھیں۔
''کیا ہوا امی! پسند نہیں آئے کپڑے۔'' عرشیہ نے بھولپن سے دریافت کیا۔
''ہوں، اچھے ہیں۔'' انہوں نے اس وقت تو گول مول سا جواب دیا لیکن جب غزنی اٹھ کر کمرے سے باہر گیا تو انہوں نے تیکھے تیوروں سے بیٹی کو دیکھا۔
''تمہاری چوائس کو کیا ہو گیا ہے عرشیہ۔ یہ کیسے کپڑے اٹھا لائی ہو۔'' وہ خفگی بھرے لہجے میں مخاطب ہوئیں۔
''کیا ہوا امی! اچھے بھلے تو ہیں۔'' عرشیہ لاپروائی سے بولی۔
''یہ لہنگا تو دیکھو۔ ایسے ڈل کلر کا لہنگا اوپر سے اتنا بھدا کام، باقی کپڑوں کی تو چلو خیر ہے۔ یہ لہنگا تو ثمین نے بارات والے روز پہننا ہے۔ ایک دنیا دیکھے گی اور لوگوں کو تو باتیں بنانے کا موقع ملنا چاہیے۔'' رفیعہ واقعی پریشان ہو گئی تھیں۔
''افوہ امی! لوگوں کی ٹینشن مت لیں۔ ظاہر ہے ہم نے اپنے بجٹ کے مطابق چلنا ہے۔''
عرشیہ کے کہنے پر انہوں نے بیٹی کو گھورا۔
''بہرحال میں نے کہہ دیا ہے ولیمے کے فنکشن کا جوڑا

میں خود لے کر آؤں گی اب تمہاری پسند پر اعتبار نہیں کروں گی۔" وہ ہنوز خفا تھیں۔

"ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی۔" عرشیہ لاپروائی سے کہہ کر ڈبے سمیٹنے لگی تھی۔

☆☆☆

شادی کا دن آن پہنچا تھا۔ اس بھدے کام والے لہنگے میں بھی ثمین خوب دمک رہی تھی۔ رفیعہ البتہ دل ہی دل میں شرمندہ ہو رہی تھیں۔ ثمین کی بہن بھی دلہن بنی اسٹیج پر موجود تھی۔ اس کی جیولری، جوڑا سب کچھ ہی بہترین تھا۔ لوگ دبی زبان میں دونوں بہنوں کی چیزوں کا موازنہ بھی کر رہے تھے۔ یہ باتیں عرشیہ کے کانوں میں بھی پڑ گئی تھیں۔ اس نے توقف کیے بنا غزنی کے موبائل پر میسج سینڈ کیا تھا۔

"غزنی بھائی! مجھے بہت آکورڈ فیل ہو رہا ہے۔ آپ کے سسرالی ہمارے لائے گئے سامان کا مذاق اڑا رہے ہیں جبکہ ان لوگوں کو ثمین بھابھی کی بہن کی ہر چیز پرفیکٹ لگ رہی ہے۔"

اور اس میسج کا ہی اثر تھا کہ جب سلامی کے لیے غزنی پنڈال میں آیا تو وہ بالکل سنجیدہ صورت بنائے ہوئے تھا۔ جوتا چھپائی اور دودھ پلائی جیسی رسموں میں بھی اس کے چہرے پر چھائے سرد سے تاثرات برقرار رہے تھے۔ ثمین کی چھوٹی بہنوں اور کزنز نے شروع میں تو چھیڑ چھاڑ کرنے کی خوب کوشش کی پھر اس وجیہہ مگر سڑیل مزاج والے دولہا کو اس کے حال پر چھوڑا اور ساری توجہ سبین کے دولہا کی جانب مبذول کرلی۔

ذیشان بلا کا ہنس مکھ اور خوش مزاج تھا پھر یہ تو موقع بھی ایسا تھا کہ اچھے بھلے خشک مزاج بندوں کے ہونٹوں پر تبسم بکھر جائے۔ غزنی کے برعکس اس نے خوب شگفتگی کا مظاہرہ کیا تھا۔

"دیکھ رہے ہیں نا غزنی بھائی! بھابھی کی بہنیں اور کزنز اپنے دوسرے بہنوئی کو کتنا پروٹوکول دے رہے ہیں۔ آپ کی تو لگتا ہے کوئی ویلیو ہی نہیں۔" عرشیہ نے موقع پاکر ایک اور سرگوشی غزنی کی سماعت میں انڈیلی تھی۔ اس کے لب مزید بھنچ گئے تھے۔

اللہ اللہ کر کے رخصتی عمل میں آئی۔ گھر پہنچ کر چھوٹی، بڑی خالہ نے دولہا، دلہن کے ساتھ روایتی رسمیں کرنے کی کوشش کی تھی لیکن عرشیہ نے نئی نویلی دلہن کے چاؤ، چونچلے اٹھانا قطعاً غیر ضروری خیال کیا تھا۔

"اف اللہ خالہ، تھکن سے جوڑ جوڑ دکھ رہا ہے۔ رہنے دیں ان رسموں کو کیا رکھا ہے ان میں۔" وہ بے زاری سے بولی تھی۔ جب دولہا کی اکلوتی بہن نے ہی کوئی دلچسپی ظاہر نہ کی تو باقی سب بھی ٹھنڈے پڑ گئے تھے۔ ثمین کو حجلہ عروسی میں پہنچا دیا گیا تھا۔

جب غزنی کمرے میں داخل ہوا تو ثمین کا معصوم حسن دیکھ کر ایک پل کو وہ مبہوت رہ گیا تھا مگر اگلے ہی پل اس نے خود کو ڈپٹا۔ اگر شادی کی اولین رات ہی اس نے اس۔۔۔ حسن کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے تو اس کا حشر بھی اس کے بھائیوں والا ہو گا۔ اپنے بھائیوں سے مختلف ہونے کا مصمم ارادہ تو اس نے کب سے اپنے دل میں باندھ رکھا تھا۔

پہلی رات اس نے بیوی کے حسن کے قصیدے پڑھنا قطعاً غیر ضروری خیال کیا تھا۔ محبت کے اظہار اور نئی زندگی کی حسین شروعات کے متعلق بھی کچھ کہنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ ہاں بیوی کو صاف اور واضح الفاظ میں جتا دیا تھا کہ وہ غزنی کا دل صرف اسی صورت جیت سکتی ہے اگر اس کی ماں اور بہن اس سے مطمئن اور خوش رہتی ہیں۔

"میری زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت میری امی اور پھر عرشیہ کی ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ تم کبھی انہیں کسی قسم کی شکایت کا موقع نہ دو گی۔" اس نے ثمین کو دوٹوک انداز میں باور کروایا تھا۔

ثمین کی پڑھی لکھی اور باشعور ماں نے بھی اسی نوعیت کی نصیحتیں اس کے پلو میں باندھ کر سسرال بھیجا تھا۔ وہ خود اپنی خدمت اور فرمانبرداری کے بل پر سسرال والوں کے دل پر راج کرنے کے منصوبے

باندھتی آئی تھی۔ لیکن سہاگ رات اپنے شوہر کے لبوں سے کچھ اور سننے کی بھی متمنی تھی۔ پیار بھری کوئی سرگوشی، ستائش کا کوئی فقرہ، اس کی شرگیں مسکراہٹ کی تعریف، حنائی ہاتھوں کی لرزش پر مسکراتا ہوا استفسار لیکن غزنی کا لیکچر صرف اپنی ماں، بہن کا خیال رکھنے تک محدود رہا تھا۔

"میں پوری کوشش کروں گی کہ آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہ ملے۔" جب بہت بار غزنی گھما پھرا کر یہی بات کہہ چکا تو آخر ثمین کو دھیرے سے کہتے ہوئے اس کی تشفی کروانی پڑی تھی۔

"کوشش نہیں ثمین۔ مجھے تمہارا وعدہ چاہیے۔ زندگی میں کبھی تمہاری وجہ سے مجھے میرے گھر والوں کے سامنے شرمندہ ہونے کا موقع نہیں ملنا چاہیے۔" وہ اپنی ہتھیلی پھیلائے اس سے وعدہ مانگ رہا تھا۔

ثمین نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ اپنا ہاتھ اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا تھا۔ یہ وعدہ کرنے کے بعد ہی اس کے حنائی ہاتھ کی انگلی کو منہ دکھائی کی انگوٹھی پہننا نصیب ہوئی تھی۔

☆☆☆

وہ اپنے بھائیوں کی طرح زن مرید یا جورو کا غلام بننے کا کوئی ارادہ نہ رکھتا تھا لیکن یہ بھی سچ تھا کہ وہ اپنی نئی زندگی کی شروعات پر مطمئن اور خوش تھا۔ ماں نے اس کے لیے لاجواب انتخاب کیا تھا۔ وہ ثمین سے محبت کے اظہار کو اب بھی غیر ضروری خیال کرتا تھا لیکن یہ بھی سچ تھا کہ وہ ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کا عادی بھی ہوتا جا رہا تھا اور اس کی محبت میں گرفتار بھی۔

بھائی کے چہرے پر ہمہ وقت پھیلی رہنے والی مسکراہٹ عرشیہ کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہ سکی تھی وہ اویس بھیا اور احمر بھائی کی طرح اپنی بیوی کے واری صدقے تو نہ جاتا تھا۔ لیکن پھر بھی مطمئن اور مسرور سا تھا اور غزنی کا یہ اطمینان عرشیہ کو بے اطمینانی میں مبتلا کر رہا تھا۔

نئے شادی شدہ جوڑے کے اعزاز میں دی جانے والی ضیافتوں کا آغاز ہو گیا تھا۔ غزنی نے پہلے اپنے خاندان والوں کی دعوتیں قبول کی تھیں۔

"ماموں کا بار بار فون آ رہا ہے ہماری وجہ سے سبین اور ذیشان بھائی کی دعوت بھی لیٹ ہو رہی ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو کل ڈنر ان کی طرف کرنے کی حامی بھر لوں۔" ثمین نے ڈرتے ڈرتے غزنی سے پوچھا۔

یہ ڈر شادی کے اولین دن سے ہی اس کے دل میں بیٹھ چکا تھا۔ غزنی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ثمین نے اسی وقت اپنے ماموں کو فون کر کے اگلے دن کے ڈنر کا پروگرام کنفرم کر دیا تھا۔

"بیٹا! غزنی کی والدہ اور بہن کو بھی ہماری طرف سے مدعو کر لینا ہم نے ذیشان کے گھر والوں کو بھی انوائیٹ کیا ہے۔" ماموں بہت بامروت اور وضعدار شخص تھے انہوں نے بھانجیوں کے سسرالیوں کو بلانا بھی ضروری خیال تھا۔ ثمین نے ماموں کا پیغام غزنی کو دے دیا تھا۔ وہ اس وقت لاؤنج میں لیپ ٹاپ کھولے بیٹھا تھا۔ عرشیہ بھی وہاں سے گزر رہی تھی اس نے بھائی کی مختصر گفتگو سن لی۔

"مجھے کیا بتا رہی ہو۔ اپنے ماموں کا پیغام امی کو دے دینا۔" غزنی نے مصروف سے انداز میں جواب دیا۔

ثمین سر ہلاتے ہوئے پلٹ گئی۔ اس نے ساس کے کمرے میں جا کر انہیں ماموں کی دعوت کے بارے میں بتا دیا تھا۔

"بیٹا تمہارے سامنے کی بات ہے۔ میں تو آج کل پرہیزی کھانا کھا رہی ہوں۔ یورک ایسڈ کی زیادتی کی وجہ سے گھٹنوں کے درد نے عاجز کر رکھا ہے۔ ڈاکٹر نے سختی سے پرہیز کی تاکید کی ہے اور عرشیہ بھی اپنی پڑھائی میں بری طرح مصروف ہے۔ شادی کی وجہ سے اس کی پڑھائی کا بہت حرج ہو گیا ہے۔ پرسوں ویسے بھی اس کا پیپر ہے۔ وہ تو گھر میں اٹھ کر کھانے کی میز تک آجائے سو غنیمت۔ اپنے ماموں کا ہماری طرف سے بہت شکریہ ادا

کر دینا اور یہ سبب بتا کر ہمارے نہ آنے کی معذرت بھی۔ خیر سے تم اور غزنی جاؤ۔" رفیعہ نے شفقت بھرے انداز میں بہو کو مخاطب کیا۔

اس تفصیلی جواب کے بعد اصرار کی نوبت ہی نہ بچی تھی۔ وہ مؤدبانہ انداز میں "ٹھیک ہے آنٹی۔" کہہ کر واپس پلٹ گئی تھی۔

"غزنی بھائی برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں۔" بعد میں غزنی کو تنہا پا کر عرشیہ نے موقع سے فائدہ اٹھانا چاہا تھا۔

"اب مجھ سے بات کرنے سے پہلے بھی تمہیں اجازت لینی پڑے گی۔" غزنی نے پیار بھری خفگی سے بہن کو ٹوکا۔

"اب خیر سے آپ کی شادی ہو گئی ہے اور جب بھائی شادی شدہ ہو جائے تو بات کرنے سے پہلے سوچنا ہی پڑتا ہے۔" عرشیہ پھیکے سے انداز میں مسکرائی تھی۔

"کیوں، کیا ہوا عرشی؟" اس کے لہجے اور انداز پر غزنی کے کان کھڑے ہوئے۔ عرشیہ نے کچھ دیر متذبذب سا انداز اپنائے رکھا جیسے بات کرتے ہوئے ہچکچا رہی ہو۔

"بولو عرشی کیا بات ہے۔" غزنی نے مزید سنجیدگی سے استفسار کیا۔

"غزنی بھائی! اگر بھابھی کے ماموں نے مجھے اور امی کو بھی انوائیٹ کر ہی لیا تھا تو آپ کو بھابھی سے یہ نہیں کہنا چاہیے تھا کہ وہ خود جا کر امی کو اپنے ماموں کا انویٹیشن پہنچائیں۔" عرشیہ آہستگی سے بولی تھی۔

"کیوں؟ اس میں کون سی ایسی غلط بات تھی؟" غزنی نے اچنبھے کا مظاہرہ کیا۔

"آپ کو تو صورت حال کی نزاکت کا احساس ہی نہیں غزنی بھائی! آپ لوگوں کی نئی نئی شادی ہوئی ہے ظاہر ہے بھابھی کا دل کرتا ہے آپ کے ساتھ اکیلے گھومنے پھرنے نکلیں۔ انہیں اپنی پرائیویسی عزیز ہے۔ انہوں نے کتنے سرسری سے انداز میں آپ کو اپنے ماموں کے پیغام کے متعلق بتایا تھا ان کا خیال تھا کہ آپ ہی امی کی طرف سے معذرت کر لیں گے، آپ نے جھٹ انہیں امی کے پاس بھیج دیا۔

آپ تو اپنے لیپ ٹاپ کے ساتھ مصروف تھے۔ بھابھی کا آف موڈ محسوس ہی نہ کر پائے لیکن وہاں امی کے پاس جا کر بھابھی نے اتنے لٹھ مار انداز میں امی کو مخاطب کر کے دعوت دی کہ امی بے چاری چپ کی چپ رہ گئیں ظاہر ہے ایسے انداز کے بعد دعوت کون قبول کرتا امی کو تو انکار ہی کرنا تھا۔" عرشیہ دھیمے سے آزردہ لہجے میں بولی۔ غزنی کی بھنویں تن گئی تھیں۔

"میں پوچھتا ہوں ثمین سے۔ ہم اس کے ماموں کے ہاں کھانا کھانے کے لیے مرے جا رہے ہیں کیا۔" عرشیہ کے عین مطابق تیر نشانے پر لگا تھا۔

"نہیں بھائی پلیز، میرا یہ مقصد نہیں تھا۔ آپ بھابھی سے کچھ مت پوچھیے گا اور پوچھنے والی بات ہے بھی نہیں' بظاہر تو انہوں نے کچھ نہیں کہا یہ تو ان کا روڈلی بیہیویئر تھا جو مجھے محسوس ہوا۔ وہ تو اپنے لہجے اور انداز کے متعلق کبھی نہ مانیں گی۔ یہ ہی کہیں گی کہ میں نے تو ایسا کچھ بھی نہیں کہا ہے اور شاید بھابھی کا واقعی کوئی قصور نہ ہو۔ شاید میں ہی زیادہ حساس ہو گئی ہوں۔" عرشیہ نے آخر میں فراخدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سارا قصور اپنے کھاتے میں ڈال لیا۔

"تم بلاوجہ کچھ محسوس نہیں کرتیں۔ اس کے انداز میں کچھ ایسا ہو گا تب ہی تو تم نے محسوس کیا۔" اسے بہن پر پختہ یقین تھا۔ بھائی کی محبت پر عرشیہ کی پلکیں بھیگ گئی تھیں۔

اور وہ رات ثمین پر بہت بھاری گزری تھی۔ اسے اپنے ناکردہ جرم کی بنا پر شوہر کی خفگی سہنی پڑی تھی۔

"میری بہن بہت حساس ہے ثمین، آئندہ تمہارے کسی رویے سے وہ ہرٹ نہ ہو ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔" غزنی نے اسے سخت انداز میں تنبیہ کی تھی۔

"بلیوی غزنی! میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔ آپ کو میری بات پر یقین نہیں تو آپ رفیعہ آنٹی سے پوچھ لیں۔" وہ روہانسی ہو کر یہ ہی بات دہرائے جا رہی تھی۔

"امی سے تصدیق کا مطلب ہے کہ مجھے عرشیہ کی بات پر بے اعتباری ہے۔ تم چاہتی ہو کہ میں امی سے عرشیہ کی شکایت لگاؤں۔" اس نے عجیب انداز میں اس کی بات پکڑی۔

ثمین کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کون سے الفاظ میں اپنی صفائی پیش کرے۔ وہ بے بسی سے لب کاٹتی رہی۔

"اور خبردار جو تم نے اس بارے میں امی سے کوئی بات کی' اس قصے کو اب ختم سمجھو۔ میں مزید کوئی بدمزگی نہیں چاہتا۔" غزنی جانے کیسے اس کے دل کی بات پا گیا تھا۔

وہ جو واقعی یہ سوچ رہی تھی کہ رفیعہ آنٹی سے کہہ کر اپنی بے گناہی کا ثبوت پیش کرے گی غزنی کے تیوروں پر سہم کر چپ ہو گئی تھی۔

"تم نے کل کی دعوت قبول کر لی ہے۔ میں تمہاری کمٹمنٹ توڑنا نہیں چاہتا لیکن اب براہ مہربانی کوئی اور دعوت قبول نہ کرنا۔ میں دعوتیں اٹینڈ کر کر کے تھک گیا ہوں۔" غزنی نے سپاٹ سے انداز میں باور کروایا تھا۔

ثمین پلکیں جھپک کر آنسو روکنے کی کوشش کرتی فقط اثبات میں گردن ہلا کر رہ گئی۔

☆☆☆

میکے کی طرف کی پہلی دعوت اٹینڈ کرتے ہوئے ثمین بہت بجھی بجھی سی تھی۔ گھر والوں سے ملنے کی ساری خوشی غزنی کے رویے سے غارت ہو چکی تھی۔ اپنے سسرال والوں سے ملتے ہوئے غزنی کا انداز بھی بہت لیا دیا سا تھا۔ ثمین کے ماموں نے جب اس سے اس کی والدہ کے ساتھ نہ آنے پر استفسار کیا تو اس نے بہت رکھائی سے جواب دیا تھا۔

"اگر آپ واقعی میری امی وغیرہ کو بلانا چاہتے تھے تو آپ کو انہیں خود انوائیٹ کرنا چاہیے تھا۔"

دسترخوان کے گرد بیٹھے سب نفوس اس کے اس سرد و سپاٹ سے انداز پر چپ سے ہو گئے' خود ثمین کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ آخر ماموں جان نے اس بدتہذیبی کا جواب خوش دلی سے دے کر ماحول پر چھائی کثافت کم کرنا چاہی۔

"ہاں برخوردار کہہ تو تم صحیح رہے ہو۔ چلو آئندہ خیال رکھیں گے ثمین بیٹا غزنی کی پلیٹ میں کباب ڈالو نا۔ تمہاری مامی نے آج بہت مزے کے کباب بنائے ہیں۔" انہوں نے فوراً ہی بات بھی پلٹ دی۔

"واقعی انکل، آنٹی کے ہاتھ میں بہت ذائقہ ہے' میں خود یہ تیسرا کباب اٹھا رہا ہوں۔" سبین کا شوہر ذیشان مسکرا کر بولا۔

"اس سے پہلے آپ تین عدد زگسی کوفتے بھی کھا چکے ہیں ذیشان۔" سبین نے اپنے دولہا کو شرارت سے چھیڑا۔

سبین نے خود بہت ہنسوڑ طبیعت پائی تھی اور شوہر بھی ہم مزاج ملا تھا۔ بیوی کے شرارتی انداز پر وہ کھل کر ہنس پڑا۔ ثمین نے رشک سے بہن کو دیکھا۔ اتنی بے تکلفی سے غزنی سے بات کرنے کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

ڈنر کے فوراً بعد غزنی نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈال کر اٹھنے کا اشارہ کر دیا تھا۔ وہ دل مسوس کر رہ گئی۔

ابھی وہ وہاں کچھ وقت مزید گزارنا چاہتی تھی۔ سبین بھی تو تھی جو کتنے مطمئن انداز میں بیٹھی تھی گویا ابھی واپسی کا کوئی ارادہ نہ ہو۔

"تم غزنی بھائی سے ہلکا پھلکا شکوہ تو کر سکتی ہو ثمین۔ تمہارے ساتھ ایسا برتاؤ کرتے ہیں جیسے تم ان کی رعایا ہو اور وہ کہیں کے وائسرائے۔" سبین نے بہن کے گلے لگتے ہوئے مفت مشورہ سے بھی نواز دیا اور واپسی کے سفر میں اس نے اس مشورے پر عمل بھی کر ڈالا۔

"ماموں، ممانی رکنے پر کتنا اصرار کر رہے تھے۔

ذرا سی دیر کو اور رک جاتے تو کیا مضائقہ تھا۔ سبین اور ذیشان بھائی بھی تو تھے ابھی سکون سے بیٹھ کر سب کے ساتھ گپ شپ لگا رہے تھے۔" اس نے دھیرے سے کہا۔ ڈرائیونگ کرتے غزنی کے ہونٹ بھنچ گئے تھے۔

"میں ذیشان کی طرح زن مرید نہیں ہوں۔ وہ تو اپنی بیوی کے اشارے پر ہی وہاں سے اٹھے گا۔" دو چار سیکنڈ کے توقف کے بعد اس نے چبھتے ہوئے انداز میں تبصرہ کیا تھا۔

"ویسے تم بہنوں کا مزاج ایک سا ہی ہے۔ تمہارے ماموں نے تو ذیشان کے گھر والوں کو بھی مدعو کیا تھا لیکن انہوں نے گھر والوں کو ساتھ لانا ضروری خیال نہ کیا۔" ثمین کے جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے اگلا تبصرہ کیا۔

ثمین اسے بتانا چاہتی تھی کہ سبین کے سسرال والے آج اپنی کسی خاندانی تقریب میں شریک تھے پھر بھی انہوں نے خوشدلی سے بیٹا بہو کو دعوت اٹینڈ کرنے کی اجازت دے دی تھی اور اپنے قریبی عزیزوں کے ہاں منعقد ہونے والے فنکشن میں ان کی شمولیت پر اصرار نہ کیا تھا۔ لیکن وہ یہ جواب غزنی کو نہ دے پائی۔ آنسوؤں کا پھندا اس کے حلق میں اٹکا ہوا تھا اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے بھرائے ہوئے لہجے سے اس کے آنسوؤں کا سراغ پا کر غزنی مزید کسی طنز کا نشانہ بنائے۔

اس نے چپ کو غنیمت جانا تھا صد شکر کہ غزنی نے بھی مزید کسی تبصرے سے گریز کیا تھا۔

☆☆☆

ابھی رفیعہ نئی نویلی بہو پر گھر کی ذمہ داریاں ڈالنے کے حق میں نہ تھیں۔ جب انہوں نے بڑی دونوں بہوؤں کے خوب چاؤ چونچلے اٹھائے تھے تو ثمین کا بھی حق تھا کہ وہ اپنے دلہناپے کے شروع کے دن انجوائے کرے لیکن ثمین نے ان کے منع کرنے کے باوجود شادی کے پانچویں روز سے ہی گھر کے کاموں میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔

"آپ کے جوڑوں میں درد ہے آنٹی اور عرشیہ کی پڑھائی کا شیڈول اتنا ٹف ہے پلیز مجھے کام سے منع مت کریں مجھے فارغ بیٹھنے کی عادت نہیں اور پھر اپنے گھر میں کام ہے ہی کتنا۔ گنتی کے چار لوگ تو ہیں ہم۔" اس نے ساس کو مسکرا کر مخاطب کیا۔

"پھر بھی بیٹا اچھا نہیں لگتا آخر تم ہی کو یہ ذمہ داری سنبھالنی ہے لیکن ابھی تمہاری شادی کو دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔" رفیعہ اس سے اتنا جلد کام شروع کروانے پر متذبذب تھیں۔

ثمین نے محبت سے اپنی مہربان چہرے والی ساس کو دیکھا۔ اس گھر میں اگر وہ کسی سے مطمئن انداز میں بات کر سکتی تھی تو وہ رفیعہ ہی تھیں۔ عرشیہ کے تو جانے کیوں تیور بگڑے ہی رہتے تھے اور وہ اپنی اکلوتی نند کی بلاوجہ کی خفگی کی وجہ جاننے سے قاصر تھی۔

اب بھی اس نے بہت اصرار کے بعد رفیعہ سے کام کی اجازت مانگی تو عرشیہ کا دبی زبان میں کیا جانے والا تبصرہ بھی کان میں پڑ گیا تھا۔

"چار دن کا شوق ہے پھر دیکھیں گے ہم، کیسا کام اور کہاں کا کام۔" اس نے دھیمے مگر استہزائیہ لہجے میں خود کلامی سی کی تھی۔

ثمین کا سارا جوش و خروش ماند پڑ گیا۔ کتنے شوق سے اس نے آج لنچ کا مینیو ترتیب دے کر کھانا پکانے کا آغاز کیا تھا مگر عرشیہ نے بھاوج کی حوصلہ افزائی کرنے کے بجائے حوصلہ شکنی کرنے کو ترجیح دی تھی۔

آہستہ آہستہ ثمین نے سارے گھر کے کاموں کی ذمہ داری اپنے سر لے لی تھی۔ وہ ذمہ داریوں سے گھبرانے والی کام چور لڑکی نہ تھی۔ گھبراہٹ اسے عرشیہ کے تیور دیکھ کر ہوتی تھی۔ عرشیہ اس کی معمول کی باتوں کو بھی کسی اور ہی پیرائے میں غزنی کے سامنے بیان کرتی۔

غزنی جواب طلبی تو کرتا مگر ثمین کا جواب سننے کا روادار بھی نہ ہوتا۔ وہ روہانسی ہو کر خاموش ہو جاتی۔

اس صبح غزنی کا موڈ خوشگوار دیکھ کر اس نے اپنے میکے جانے کی بات کی تھی۔ "بہت دن ہو گئے امی کی طرف کا چکر نہیں لگا اگر آپ آج آفس کے بعد جلد فری ہو جائیں تو مجھے امی سے ملوانے لے چلیں گے۔" اس نے بہت آس سے پوچھا تھا۔

"ٹھیک ہے تیار ہو جانا لیکن ڈنر تک نہیں رکوں گا۔ جلد واپس آئیں گے۔" غزنی نے پیشگی بتا دیا۔ ثمین نے جھٹ اثبات میں گردن ہلا دی۔

اتنے دنوں بعد ماں بہنوں سے ملنے کی خوشی ہی اور تھی۔ دوپہر کے کاموں سے فراغت کے بعد اس نے اپنے اور غزنی کے کپڑے پریس کرنے کا سوچا پھر خیال آیا رفیعہ آنٹی کے کمرے میں جھانک کر تو دیکھے آج صبح سے ہی اپنے کمرے میں تھیں۔ دوپہر کے کھانے کی ٹرے بھی عرشیہ ہی ان کے کمرے میں لے کر گئی تھی۔ آنٹی کے بیڈروم کا رخ کرنے ہی والی تھی کہ عرشیہ ان کے کمرے سے نکلتی دکھائی دی۔

"خیر ہے عرشیہ کیا آنٹی کے جوڑوں میں زیادہ درد ہو رہا ہے۔ آنٹی کب سے کمرے میں ہی ہیں۔" اس نے استفسار کیا۔

"اب تو سو رہی ہیں امی۔" عرشیہ نے مبہم سا جواب دیا اسی لمحے لائٹ چلی گئی تھی۔

"اوہ! ابھی میں کپڑے پریس کرنے کا سوچ رہی تھی اور لائٹ چلی گئی۔" ثمین نے منہ بنایا۔

"اس وقت کپڑے پریس، کہیں جانا ہے کیا۔" عرشیہ نے اندازہ لگایا۔

"ہاں غزنی آفس سے آئیں گے تو امی کے ہاں جانے کا پروگرام ہے۔" ثمین نے سادگی سے بتایا تھا۔

عرشیہ بنا کوئی تبصرہ کیے آگے بڑھ گئی۔ ثمین بھی واپس بیڈروم میں چلی آئی اگر رفیعہ آنٹی جاگ رہی ہوتیں تو وہ انہیں بھی شام کے پروگرام سے آگاہ کر دیتی۔ کمرے میں آئی تو بیڈ پر دھرا موبائل بج رہا تھا۔ اس نے جلدی سے کال ریسیو کی۔ غزنی کا فون تھا۔

"میں آفس سے جلد آنے کی کوشش کروں گا بس تم ریڈی رہنا تاکہ میرے آتے ہی نکل جائیں ورنہ واپسی پر بہت دیر ہو جائے گی۔" غزنی نے ایک بار پھر تاکید کی تھی۔

اور جب غزنی گھر لوٹا تو وہ اس کے کہے کے مطابق بالکل تیار تھی۔ وہ عادت کے مطابق پہلے ماں کو سلام کرنے ان کے کمرے میں گیا۔ رفیعہ نیم غنودگی میں تھیں اور عرشیہ ان کے سرہانے بیٹھی ان کا سر دبا رہی تھی۔

"کیا ہوا امی کو۔" اس نے پریشانی سے استفسار کیا۔

"امی کو تو صبح سے ہی بہت تیز بخار ہے بھائی۔ دوپہر کو تو اتنا تیز بخار چڑھ گیا تھا کہ پٹیاں کرنی پڑیں۔ میں نے دوپہر کو گھر میں پڑی میڈیسن تو دے دی۔ بخار کا زور ٹوٹا ہے تو امی کو اونگھ آئی ہے لیکن پھر بھی ڈاکٹر کو چیک کروانا تو ضروری ہے نا اگر رکشہ یا ٹیکسی لا دیں میں امی کو ڈاکٹر زمان کے کلینک لے جاتی ہوں۔" وہ ماں کی نیند کا خیال کرتے ہوئے آہستہ سے بولی تھی۔

"رکشہ یا ٹیکسی کیوں۔ میں مر گیا ہوں کیا۔" حسب توقع غزنی کا پارہ چڑھا تھا۔

"آپ تو شاید بھابھی کو ساتھ لے کر اپنے سسرال جا رہے ہیں۔ بھابھی کب سے اپنی تیاریوں میں لگی ہیں حالانکہ انہیں امی کی طبیعت خرابی کا اچھی طرح پتا ہے۔ آپ ان کا پروگرام خراب مت کریں۔" عرشیہ دھیرے سے بولی۔

"امی کو اٹھاؤ چادر وغیرہ اڑھاؤ۔ میں گاڑی نکال رہا ہوں۔" وہ سنجیدگی سے کہتا واپس اپنے کمرے میں گیا تھا۔

ثمین عبایا پہن چکی تھی۔ "چلیں جناب میں بالکل ریڈی ہوں۔ ویسے تو آپ کو بھی چینج کرنے کی ضرورت تو نہیں۔ ایسے ہی اچھے لگ رہے ہیں لیکن اگر چینج کرنے کا موڈ ہے تو آپ کے کپڑے بھی تیار ہیں۔" اس نے بشاشت سے شوہر کو مخاطب کیا۔

گھر جانے کی خوشی اس کے وجود سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ کتنے دنوں کے بعد تو ماں، بہنوں سے گھنٹے، ڈیڑھ گھنٹے کی ملاقات کا موقع ملتا تھا۔

”اپنی ماں سے ملنے کو تو بہت بے چین ہو رہی ہو اور وہ جو اپنے کمرے میں بخار میں بے سدھ پڑی ہے وہ شاید تمہارے شوہر کی ماں ہے۔ تمہیں ان کی تکلیف کا ذرا احساس نہیں۔ بجائے اس کے کہ مجھے فون کر کے ان کی طبیعت سے آگاہ کرتیں جب میں نے تمہیں کال کی جب بھی تم نے مجھے امی کی طبیعت کے بارے میں بتانے کی زحمت نہ کی اور تمہارا خیال تھا کہ میں امی سے ملے بغیر فوراً تمہارے ساتھ نکل پڑوں گا۔“ مجھے ان کی طبیعت کے بارے میں پتا ہی نہیں چلے گا۔ غزنی کڑے تیوروں سے استفسار کر رہا تھا۔

”آنٹی کو بخار ہو رہا ہے؟“ ثمین نے بوکھلائے ہوئے انداز میں پوچھا۔ غزنی کے یہ تیور دیکھ کر ہمیشہ ہی اس کے ہاتھ، پاؤں بے جان سے ہونے لگتے تھے۔

”بہت خوب بیگم صاحبہ، امی صبح سے بخار میں پھنک رہی ہیں اور تمہیں اس بات کا علم تک نہیں اور تمہیں علم ہوتا بھی کیسے۔ اپنے کمرے سے باہر قدم رنجہ فرماؤ تو کچھ پتا چلے۔“ وہ زہرخند لہجے میں بولا۔

”صبح دیر تک آنٹی لاؤنج میں بیٹھی اخبار وغیرہ پڑھ رہی تھیں جب تو ان کی طبیعت ٹھیک تھی۔ پھر میں دوپہر کا کھانا بنانے میں مصروف ہو گئی تب سے آنٹی واقعی اپنے کمرے میں تھیں لیکن میں نے عرشیہ سے پوچھا تھا۔ اس نے مجھے آنٹی کی طبیعت کے بارے میں بتایا تک نہیں۔ بس یہ ہی کہا کہ آنٹی سو رہی ہیں۔

اس کے بعد میں دوبارہ اپنے کام نمٹانے لگی تھی اور عصر کے بعد تو آنٹی ویسے بھی دیر تک اپنے کمرے میں بیٹھی تسبیح وغیرہ پڑھتی ہیں تو......“ ثمین کی بات ادھوری رہ گئی۔ غزنی زہرخند مسکراہٹ چہرے پر سجائے اس کی بات سن رہا تھا انداز سے صاف ظاہر تھا کہ اسے اس کی کسی بات پر یقین نہیں آیا ہے۔

”مجھے واقعی آنٹی کی طبیعت خرابی کا نہیں پتا تھا غزنی۔“ وہ اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے روہانسی ہو گئی۔

”ثمین اب تک تمہیں اندازہ ہو جانا چاہیے کہ میں ان مردوں میں سے نہیں جو ان جھوٹے آنسوؤں پر یقین کر لیتے ہیں۔ میرے سامنے جھوٹے عذر مت تراشا کرو ورنہ میری نگاہوں میں تمہاری وقعت بالکل ختم ہو جائے گی۔“ وہ بیزاری سے بولا تھا۔

”یہ ہی عرشیہ کا مقصد ہے وہ آپ کی نظروں میں مجھے ذلیل کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی بلکہ میں تو کہوں گی وہ ایسے مواقع خود پیدا کرتی ہے۔“ ثمین کا ضبط بھی جواب دے گیا تھا۔ وہ کب تک اپنے ناکردہ گناہوں کی صفائیاں پیش کرتی رہتی۔

”میں عرشیہ کے خلاف ایک لفظ نہیں سنوں گا۔ اس بھول میں مت رہنا کہ تمہاری باتوں میں آ کر میں اپنی بہن سے بدگمان ہو جاؤں گا۔“ غزنی نے اسے تیکھے تیوروں سے گھورتے ہوئے باور کروایا۔

”آپ مانیں نہ مانیں لیکن سچ یہ ہی ہے کہ عرشیہ......“ اس کا جملہ ادھورا رہ گیا تھا۔ غزنی کا ہاتھ گھوما تھا اور اگلے ہی پل ثمین اپنے گال پر ہاتھ رکھے بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ دکھ کی شدت سے اس کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا اسے یقین ہی نہ آ رہا تھا کہ وہ ان عورتوں کی صف میں شامل ہو گئی ہے جن کے شوہر ان پر ہاتھ اٹھاتے ہیں۔

”تمہیں اتنا احساس تک نہیں کہ میری ماں بخار میں بے سدھ ہوئی پڑی ہے اپنی جھوٹی بے گناہی کا رونا کسی اور وقت بھی رو سکتی تھیں تم۔“ وہ غصے میں پھنکارتا کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔ ثمین فرش پر بیٹھتی چلی گئی۔

گھٹنوں میں منہ دیے وہ زاروقطار رونے لگی تھی۔

☆☆☆

ثمین کے معمولات زندگی میں کوئی فرق نہ پڑا تھا وہ اب بھی تندہی سے گھر کے کام نمٹاتی تھی۔ جی جان سے رفیعہ کی خدمت بھی کرتی۔ رفیعہ آنٹی سے تو ویسے بھی اسے کوئی شکایت نہ تھی انہوں نے آج تک روایتی ساسوں والا برتاؤ نہ کیا تھا۔ ثمین ان کی دل سے خدمت کرتی تھی ہاں اب وہ عرشیہ سے بات کرتے ہوئے خاصی محتاط ہو گئی تھی۔

رہا غزنی تو اس دن سے۔ دونوں اجنبیوں کی طرح ایک چھت تلے زندگی گزار رہے تھے۔ غزنی نے اس سے معذرت کرنے کی ضرورت نہ سمجھی تھی تو اس نے بھی غزنی سے کوئی شکوہ کرنے یا اپنی مزید صفائی پیش کرنے کی کوشش نہ کی۔ اس نے بھی لاتعلقی کی چادر اوڑھ لی تھی۔

وہ غزنی کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی اس کے سارے کام پہلے کی طرح مستعدی سے انجام دیتی لیکن کسی کام سے غزنی کو مخاطب بھی کرنا پڑتا تو سپاٹ سے انداز میں بات کرتی۔ نمازیں وہ پہلے بھی باقاعدگی سے پڑھتی تھی اب نماز کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتی تو کتنی دیر تک بھیگی پلکوں کے ساتھ اپنے رب کے حضور اپنی مناجاتیں پیش کرتی رہتی۔

غزنی کو اب اس کی لاتعلقی کھلنے لگی تھی لیکن خود سے صلح کے لیے ہاتھ بڑھانا اس کی مردانگی کی توہین کے مترادف تھا جب کہ اس کی نگاہوں میں سارا قصور ثمین کا ہی تھا۔

اس روز موسمی فلو کے باعث غزنی نے آفس سے چھٹی کر لی۔ ہلکا پھلکا ناشتہ کر کے وہ پھر سے سونے کے ارادے سے اپنے بیڈ روم میں چلا گیا۔ کچھ دیر کے لیے تو واقعی آنکھ لگی تھی لیکن پھر نیند اچاٹ ہو گئی۔ طبیعت پر ابھی بھی کسلمندی چھائی ہوئی تھی۔ وہ بستر میں ہی لیپ ٹاپ کھول کر بیٹھ گیا پھر باہر سے آنے والی آوازوں نے توجہ اپنی جانب مبذول کروالی۔ وہ رفیعہ تھیں جو آج لنچ خود بنانے کا اعلان کر رہی تھیں۔

”ارے بھئی گوشت، قیمے کا بہت دن کا پرہیز کر لیا۔ آج میرا قیمہ کریلے کھانے کو دل کر رہا ہے اور کھانا بھی میں خود ہی پکاؤں گی۔“

”ٹھیک ہے آنٹی کبھی کبھار کی بدپرہیزی میں تو کوئی حرج نہیں لیکن آپ کے گھٹنوں سے کچن میں اتنی دیر کھڑا نہیں ہوا جائے گا۔ آپ کی فیورٹ ڈش میں بنا دوں گی۔“ ثمین نے ساس کو ان کے ارادے سے باز رکھنا چاہا۔

”ثمین بیٹی اس میں کوئی شک نہیں کہ تم کھانا لاجواب پکاتی ہو۔ لیکن آج میرا اپنے ہاتھ کے پکے قیمہ کریلے کھانے کو جی کر رہا ہے۔ بلکہ تمہیں بھی تو پتا چلے کہ تمہاری ساس کے ہاتھ میں بھی کم ذائقہ نہیں۔ آج تم میرے ہاتھ کا پکا کھانا کھانا۔“ وہ بشاشت سے مسکراتے ہوئے بولیں۔

”میں آپ سے پوچھ، پوچھ کر بالکل آپ والے طریقے سے پکالوں گی آنٹی! آپ ریسٹ کریں۔ ابھی تو بیماری سے اٹھی ہیں۔“ ثمین نے ملائم لہجے میں ساس کو مخاطب کیا۔

”ارے چھوڑو بھئی لیٹ، لیٹ کر اور بیٹھ بیٹھ کر میرے گھٹنے زیادہ جڑ گئے۔ تم مجھے سبزی کی ٹوکری لا دو اور پچھلے صحن میں جا کر دیکھو صغریٰ نے مشین لگائی ہوئی ہے ایک چکر پورا نہیں ہوتا اور وہ کپڑے نکال لیتی ہے تم ذرا اس کے سر پر کھڑے ہو کر کپڑے دھلوالو۔ دھلائی کے بعد کپڑے اجلے اجلے تو لگیں۔“ رفیعہ نے زبردستی ثمین کو وہاں سے بھیجا تھا اور خود کریلے چھیلنے بیٹھ گئی تھیں۔

کافی دیر تک لیپ ٹاپ پر کام کرنے کے بعد غزنی باہر نکلا تو رفیعہ کچن میں تھیں۔ ثمین جانے اب کس کام میں مصروف تھی ہاں عرشیہ کتابیں کھولے لاؤنج میں ہی بیٹھی تھی۔

”ثمین کہاں ہے؟“ ثمین کی تلاش میں ادھر، ادھر نگاہیں دوڑا کر اس نے عرشیہ سے ہی پوچھ لیا۔

”کسی فالتو کام میں خود کو زبردستی مصروف کر رکھا ہوگا۔ آج ذرا محنت طلب ڈش بننی تھی نا۔ ثمین بھابھی تو کچن میں پھٹکیں تک نہیں۔ انتظار کر کے، مجبوراً امی کو ہی کچن میں گھسنا پڑا ہے پھر رات تک گھٹنوں کے درد سے عاجز آ کر ہائے، ہائے کرتی رہیں گی۔ مجھے اپنی اسائمنٹ مکمل نہ کرنی ہوتی تو امی

کی ہیلپ ہی کروا دیتی۔" عرشیہ نے کتابوں کے صفحے الٹتے پلٹتے خود کلامی کے سے انداز میں بھائی کو جواب دیا تھا۔

اگر وہ کتابوں پر جھکا سر اٹھا کر بھائی کو دیکھ لیتی تو ضرور اس کی بے یقینی بھری نگاہیں بھانپ لیتی۔ لیکن عرشیہ کو مطلوبہ ٹاپک مل گیا تھا۔ وہ تندہی سے اپنی اسائنمنٹ مکمل کرنے لگی تھی۔

☆☆☆

"یہ لیں آنٹی چائے۔" وہ فجر کی نماز کے بعد تسبیح پڑھ کر فارغ ہی ہوئی تھیں کہ معمول کے مطابق ثمین ان کے لیے چائے لے آئی۔

انہوں نے محبت سے بہو کو دیکھا، ثمین بھی ان کی طرح سحر خیز تھی، وہ خود چائے کی اتنی شوقین نہ تھی لیکن جب اس نے دیکھا فجر کی نماز پڑھ کر رفیعہ کچن میں جا کر اپنے لیے چائے بناتی ہیں تو اس نے یہ ڈیوٹی بھی اپنے سر لے لی، حالانکہ رفیعہ نے اسے بہت بار منع کرنا چاہا۔

"فجر کی نماز کے لیے تو اٹھتی ہی ہوں آنٹی۔ ایک کپ چائے بنانے میں کتنی دیر لگتی ہے۔" وہ مسکرا کر ساس کو جواب دیتی۔

"میں اللہ کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے، اللہ نے ثمین جیسی بہو دے کر میری ساری کلفتوں کا ازالہ کر دیا ورنہ غزنی کی شادی سے پہلے میں بہت تحفظات میں مبتلا تھی۔" اس روز سونے سے پہلے رفیعہ نے بیٹی کو مخاطب کیا۔

"بس رہنے دیں امی۔ ابھی بھابھی کی شادی کو دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ شروع شروع میں ایفی شینسی جھاڑ کر نمبر بنانا چاہتی ہیں، کچھ دن اور گزریں گے تو ان کی قلعی بھی کھل جائے گی۔" عرشیہ نے ماں کی خوش گمانی ختم کرنا چاہی۔

"اُفوہ عرشی اللہ جانے تمہارے دماغ سے یہ خناس کب نکلے گا۔ مان لو کہ ثمین تمہاری بڑی دونوں بھاوجوں جیسی نہیں، وہ مختلف مزاج کی بچی ہے۔ نیک اطوار اور فرماں بردار۔ دنیا میں سب انسان ایک دوسرے کا پرتو نہیں ہوتے بیٹے اگر ایسا ہوتا تو دنیا کا نظام کیسے چلتا اگر یہاں برے لوگ پائے جاتے ہیں تو اچھوں کی بھی کمی نہیں اور ثمین واقعی بہت اچھی لڑکی ہے۔

تمہاری بڑی خالہ جب بتاتی تھیں کہ ثمین کی والدہ نے اپنی بچیوں کی بہترین تربیت کی ہے تب مجھے بھی تمہاری خالہ کی بات پر اتنا یقین نہ آتا تھا۔ میرے تلخ تجربے مجھے یقین کرنے ہی نہ دیتے تھے لیکن اب مجھے شمسہ آپا کی بات کی صداقت پر یقین آ گیا ہے اور میں تو آپا کو دعائیں دیتی نہیں تھکتی جو انہوں نے ایسے سلجھے ہوئے گھرانے میں غزنی کا رشتہ کروا دیا۔" رفیعہ سرشاری سے بولیں۔

"کیا واقعی ثمین بھابھی ویسی ہی ہیں جیسا وہ خود کو ظاہر کرتی ہیں، وہ بالکل نہ بدلیں گی۔" عرشیہ نے کھوئے کھوئے سے لہجے میں استفسار کیا۔

"ہاں بھئی کہہ تو دیا کہ نہیں بدلے گی۔" رفیعہ تیقن بھرے لہجے میں بولیں۔

عرشیہ خاموش ہو گئی تھی۔

اس پل تو انہوں نے سوچا کہ عرشیہ قائل ہو کر چپ ہوئی ہے، ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ بیٹی کی خاموشی کا پس منظر کیا ہے۔ یہ عقدہ دو دن بعد کھلا تھا۔

رفیعہ اس روز پڑوس میں کسی شناسا کی عیادت کرنے گئی تھیں، گھر لوٹیں تو صغریٰ (ملازمہ) نے بتایا کہ ثمین باجی کی امی ان سے ملنے آئی ہیں اور وہ باجی کے ساتھ ان کے کمرے میں ہی بیٹھی ہیں۔ رفیعہ نے کچھ دیر ثمین یا اس کی والدہ کے باہر نکلنے کا انتظار کیا پھر خود ہی ثمین کے کمرے میں جا کر سمدھن سے ملنے کا سوچا۔ اس سے پیشتر کہ وہ پردہ اٹھا کر ثمین کے بیڈ روم میں داخل ہوتیں، ثمین کی رندھی ہوئی آواز نے ان کے قدم جکڑ لیے۔

"یہ ہی سچ ہے امی! نہ میں غزنی کے دل میں اپنی جگہ بنا پائی ہوں نہ ان کی نگاہوں میں اپنا اعتبار برقرار رکھنے کے قابل ہوئی ہوں۔ ان کی نگاہوں میں، میں انتہائی تیز طرار، جھوٹی اور فسادن ٹائپ لڑکی ہوں۔ اتنے دنوں میں وہ مجھے جان ہی نہ پائے ہیں۔ وہ مجھے عرشیہ کی لگائی عینک سے دیکھتے ہیں۔ میں چاہنے کے باوجود اپنی صفائی پیش ہی نہیں کر پائی۔" ثمین روہانسے انداز میں ماں کو عرشیہ کی چالاکیوں اور غزنی کی بے اعتباریوں سے آگاہ کرنے لگی تھیں۔

"تم نے کبھی رفیعہ باجی کو یہ سب بتانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ بہت سمجھدار خاتون ہیں، تم ان کے علم میں یہ معاملہ لاتیں تو وہ ضرور اسے سلجھانے کی کوشش کرتیں۔" عائشہ بیگم نے رسانیت سے بیٹی کو مخاطب کیا۔

"سوچتی ہوں امی، بہت بار سوچتی ہوں۔ لیکن پھر ڈر کر رک جاتی ہوں۔ اس گھر میں مجھے صرف رفیعہ آنٹی کے مہربان وجود سے ڈھارس ملتی ہے۔ مجھے ڈر لگتا ہے کہ اگر میں نے انہیں عرشیہ کی حرکتوں کے متعلق بتایا تو وہ بھی مجھ سے برگشتہ نہ ہو جائیں۔ آخر عرشیہ ان کی بیٹی ہے۔ جیسے غزنی کو اپنی بہن کے مقابلے میں میں اعتبار کے قابل نہیں لگتی تو ہو سکتا ہے آنٹی بھی مجھے ہی جھوٹا سمجھیں۔" ثمین نے معصوم سے انداز میں ماں کے سامنے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

عائشہ بیگم گہری سانس کھینچ کر رہ گئی تھیں۔

"اچھا تم پریشان مت ہو۔ وقت گزرنے کے ساتھ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ عرشیہ ابھی بچی ہے، ناسمجھ اور امیچور اور جہاں تک میں اندازہ لگا پائی ہوں وہ بچی عدم تحفظ میں مبتلا ہے۔

تمہاری شمسہ آنٹی بتاتی ہیں کہ تمہاری بڑی دونوں جٹھانیوں نے رفیعہ بہن اور عرشیہ کے ساتھ بہت ناروا سلوک اختیار کیا تھا۔ شاید عرشیہ تمہیں بھی اپنی بڑی بھاوجوں کے تناظر میں دیکھتی ہو، تم اپنے حسن سلوک سے ہی اس کے دل میں جگہ بنا سکتی ہو۔ آئندہ غزنی کے سامنے عرشیہ کی برائی مت کرنا ورنہ ہو سکتا ہے وہ اس طرح تم سے مزید متنفر ہو جائے۔ بس تم اپنی ساس کی خدمت کرو۔ انہوں نے بہت کٹھن وقت گزارا ہے۔ کوشش کرو کہ عرشیہ سے بھی دوستانہ برتاؤ اختیار کرو اور اللہ سے بہتری کی امید رکھو۔

غزنی بہت اچھا لڑکا ہے شریف اور سلجھا ہوا۔ وہ آہستہ آہستہ تمہیں سمجھ جائے گا۔ مرد بہت کمزور ہوتے ہیں بیٹا۔ گھر والوں کی سکھائی پڑھائی میں آ کر بیویوں کو دھنک کر رکھ دیتے ہیں کم از کم غزنی ایسا تو نہیں۔ عورتوں کو تو جانے گھر کی خاطر کیا کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔" عائشہ بیٹی کو سمجھا رہی تھیں۔

ثمین کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ دائیں گال پر غزنی کے تھپڑ کا لمس پھر سے تازہ ہو گیا تھا لیکن اس نے ماں کو اس بابت نہیں بتایا تھا۔ عائشہ اسے مستقل یہ ہی تلقین کیے جا رہی تھیں کہ وہ اپنی خدمت گزاری اور فرمانبرداری کے بل پر شوہر اور سسرال والوں کے دل میں اپنی جگہ بنائے۔

رفیعہ چاپ چاپ وہاں سے پلٹ آئیں۔ شرمندگی سے ان کا برا حال تھا، وہ خود میں عائشہ بیگم سے سامنے کی ہمت نہ پاتی تھیں۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ان کی بیٹی کیا کارنامے سرانجام دے چکی ہے۔ وہ ثمین پر عرشیہ کی بے اعتباری سے تو آگاہ تھیں لیکن یہ سوچ بھی نہ سکتی تھیں کہ عرشیہ غزنی کو ثمین سے متنفر کرنے کی اتنی کوششیں کر چکی ہے۔

عائشہ بیگم واقعی بہترین ماں تھیں۔ بیٹی کے حالات جاننے کے باوجود بھی اسے سسرال والوں سے حسن سلوک کی ہی تلقین کرتی رہی تھیں۔ ایک پڑھی لکھی اور باشعور ماں کی تربیت کا عکس ان کی اولاد میں بھی جھلک رہا تھا۔ ثمین نے اب تک اپنی ماں کی تربیت کی لاج رکھی تھی لیکن رفیعہ کو لگا اولاد کی تربیت کے معاملے میں وہ قطعاً ناکام ثابت ہوئی ہیں۔ ان کا کوئی بچہ بھی ان کی تربیت کی لاج نہ رکھ پایا تھا۔

وہ بوجھل دل کے ساتھ اپنے کمرے میں چلی آئیں، ملازمہ کو بھی منع کر دیا کہ وہ ثمین کو ان کی آمد کے متعلق نہ بتائے۔ جانے ثمین کی والدہ کب واپس

لوٹیں' رفیعہ کمرے سے نہ نکلی تھیں۔ ثمین نے جھانک کر دیکھا تب بھی وہ سوتی بن گئیں۔ عرشیہ یونیورسٹی سے لوٹی تو بھی وہ آنکھیں موندے لیٹی ہی رہیں۔

''طبیعت تو ٹھیک ہے نا امی۔'' عرشیہ نے فکرمندی سے استفسار کیا۔ انہوں نے محض ہنکارا بھرنے پر اکتفا کیا۔ شام کو غزنی آفس سے لوٹا تو عرشیہ نے بھائی سے ماں کی طبیعت کے متعلق فکرمندی کا اظہار کیا۔ ''پتا نہیں بھائی امی کو کیا ہو گیا ہے۔ کھانا بھی نہیں کھایا نہ کسی سے بات کر رہی ہیں کب سے چپ چاپ لیٹی ہیں۔''

غزنی بھی پریشان ہوتا ہوا ماں کے کمرے میں داخل ہوا۔ ''عرشیہ بتا رہی ہے کہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ کیا ہوا امی خیر تو ہے۔''

''شکر ہے عرشیہ نے میری طبیعت کے بارے میں ہی بتایا ہے۔ ثمین کے بارے میں کچھ جھوٹا سچا لگا کر تمہارے کان بھرنے کی کوشش نہیں کی۔'' انہوں نے بیٹی کو طنزیہ انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب امی۔'' عرشیہ ان کے انداز پر سٹپٹا سی گئی تھی۔

''مطلب تو خود میری بھی سمجھ میں نہیں آ رہا عرشیہ۔ آخر تمہاری حرکتوں کا مقصد کیا ہے۔ بھائی، بھاوج کی زندگی میں کیوں زہر گھول رہی ہو۔ ان کے درمیان غلط فہمیاں کیوں پروان چڑھا رہی ہو۔'' رفیعہ نے بیٹی کو آڑے ہاتھوں لیا۔ عرشیہ سے ایک لمحے کو کوئی جواب نہ بن پڑا۔

''آپ سے ثمین نے کچھ کہا ہے؟'' غزنی کے دل میں بھی چور تھا اس لیے اس نے دھیرے سے استفسار کیا۔

''وہ غریب کیا کہے گی اس نے تو تم سے بھی کہنے کی کوشش کی تھی۔ جواب میں بے اعتباری ہی ملی۔ آج اپنی ماں کو اپنے دکھے دل کی فریاد سنا رہی تھی تو اتفاق سے میں نے ان کی باتیں سن لیں اور آفرین ہے ثمین کی ماں پر۔ یہ سب سن کر بھی بیٹی کو سب درگزر کرنے اور سسرال والوں سے عمدہ برتاؤ کرنے کی ہی تلقین کرتی رہی۔'' رفیعہ دکھ بھرے لہجے میں بولیں۔

عرشیہ سر جھکا کر رہ گئی' مقابل ماں تھیں جن کے سامنے اس کا کوئی جھوٹ نہ چل سکتا تھا۔

''نغمہ اور زونیرہ نے تمہاری محبت کا جواب سرد مہری سے دیا تو اس کا یہ مطلب تو نہ تھا عرشیہ کہ تم ان کے کیے کا بدلہ ثمین سے لو' اگر تمہاری حرکتوں سے زچ آ کر وہ بھی ہم سے اپنا برتاؤ بدل لے تو بتاؤ کیا کر لیں گے ہم۔ قسمت سے ایک بہو اچھی ملی اور تم نے اپنی حرکتوں سے اسے بھی خود سے متنفر کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔'' رفیعہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنی بیٹی کی کم عقلی کا کن الفاظ میں ماتم کریں۔

''میں نہیں چاہتی تھی امی کہ غزنی بھائی بھی بھیا اور احمر بھائی کی طرح بدل جائیں۔ اپنے آخری بھائی کو کھونے کا حوصلہ نہیں تھا مجھ میں۔'' عرشیہ نے روہانسے انداز میں اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

''غزنی کی شادی سے پہلے میں بھی ان ہی خدشات کا شکار تھی۔ شروع میں میں نے بھی ثمین کو کڑے معیار پر پرکھا تھا لیکن اس کے اخلاق اور برتاؤ سے میرے سارے خدشات دم توڑ گئے۔ میں سوچتی تھی تم بچی ہو اپنے سابقہ تجربوں سے خوفزدہ ہو اس لیے ابھی ثمین پر اعتبار کرنے سے ہچکچاتی ہو۔ مجھے کب پتا تھا کہ تم نے تو ضد لگالی ہے کہ اسے بھی اپنی بڑی بھاوجوں کی صف میں کھڑا کر کے دم لو گی۔ مجھے تم سے ایسی کم عقلی کی امید نہ تھی عرشیہ! ذرا خود سوچو اگر تمہیں اگلے گھر جا کر تمہارے جیسی ہی کسی نند سے پالا پڑ گیا تو کیا کر لو گی تم۔ وہ تو میں نے روایتی ساس بن کر نہیں سوچا ورنہ تمہارا کردار کھل جانے کے بعد بھی نظر انداز کر دیتی چاہے بہو کی زندگی اجیرن ہو کر رہ جاتی۔'' رفیعہ بول رہی تھیں اور عرشیہ کا سر جھکتا جا رہا تھا۔

''اور غزنی! مجھے تم پر بڑا مان تھا بیٹے! میں سمجھتی تھی تم اپنے دونوں بھائیوں سے مختلف ہو' ان کی طرح کانوں کے کچے نہیں ہو۔ لیکن تم میں اور ان میں کوئی فرق نہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ اپنی بیویوں کی سکھائی پڑھائی میں آتے تھے اور تم اپنی بہن کی لگائی بجھائی میں۔ شاید میری تربیت میں ہی کوئی کمی رہ گئی ہے۔ میں ایک ناکام ماں ثابت ہوئی ہوں۔ میرے کسی بھی بیٹے کو رشتوں میں توازن رکھنا نہ آیا۔ حالانکہ یہ کوئی بہت ناممکن کام تو نہیں۔ تمہارے ابا بھی تو تھے۔ فرمانبردار بیٹے، محبت کرنے والے بھائی اور بیوی بچوں پر جان چھڑکنے والے شوہر اور باپ۔ پھر ان کی اولاد کس پر چلی گئی۔ قصور تو میری تربیت کا ہی نکلتا ہے نا۔'' رفیعہ حد سے زیادہ دل گرفتہ تھیں۔

''خود کو دوش مت دیں امی۔ سارا قصور میری کم عقلی کا ہے۔ لیکن میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں اپنی غلطیاں سدھار لوں گی۔ آئندہ آپ کو کسی شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔ ثمین بھابھی سے بھی معافی مانگ لوں گی۔'' عرشیہ سوں سوں کر کے رونے لگی تھی۔

''معافی تو ثمین سے مجھے مانگنی ہے عرشیہ! تمہاری باتوں میں آ کر میں اس پر ہاتھ بھی اٹھا چکا ہوں۔'' غزنی تھکے ہارے لہجے میں دھیرے سے بولا تھا۔

''غزنی!'' رفیعہ نے حیرت اور صدمے سے گنگ ہو کر بیٹے کو دیکھا تھا۔

وہ نگاہیں چرا کر رہ گیا تھا۔

☆☆☆

ثمین بے چین ہو کر کمرے میں ٹہل رہی تھی۔ کئی گھنٹوں سے رفیعہ آنٹی اپنے کمرے میں ہی تھیں۔ عرشیہ بھی یونیورسٹی سے واپسی پر ان ہی کے پاس تھی اور اب غزنی آفس سے لوٹا تو اتنی دیر سے وہ بھی وہیں موجود تھا۔ عرشیہ نے آج تک اس کے خلاف صرف غزنی کے ہی کان بھرنے کی کوشش کی تھی لیکن آج ثمین کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ وہ ماں اور بھائی دونوں کو اس سے برگشتہ کرنے کی کوشش کر رہی ہو گی' وہ چاہنے کے باوجود رفیعہ آنٹی کے کمرے میں جانے کی ہمت نہ کر سکی تھی۔ کافی دیر بعد تھکے تھکے انداز میں غزنی کمرے میں داخل ہوا۔

''آج تو میں نے بہت بار آنٹی کے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ آنٹی واقعی سو رہی تھیں۔ ان کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔'' اس نے ڈرتے ڈرتے غزنی سے استفسار کیا۔

غزنی نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اس کی آنکھوں سے ہراس جھلک رہا تھا۔ وہ نگاہیں چرا کر آستینیں موڑنے لگا۔ اپنی حماقتوں کی معافی مانگنا اتنا آسان کام بھی نہ تھا۔ کیا یہ کامنی سی لڑکی ایسے سلوک اور رویے کی حقدار تھی۔

شادی کے بعد سے لے کر آج تک وہ اس کی بے اعتنائی ہی سہتی آئی تھی۔ وہ بیوی سے محبت کے دو بول تک بولنے کا روادار نہ ہوا تھا۔ ثمین اور ذیشان ہنی مون منانے ناردرن ایریاز گئے تھے' وہ تو اسے اپنی گلی کے نکڑ والے آئسکریم پارلر تک نہ لے کر گیا تھا۔ وہ اس کی ماں کی خدمت کتنی تندہی سے کرتی تھی اور غزنی خود سسرال جاتا تو ان لوگوں سے سلام دعا کے علاوہ فالتو بات نہ کرتا تھا۔ چھوٹی سالیاں اس سے ڈرتے جھجکتے ملتی تھیں جبکہ ذیشان سے وہ بے تکلفی سے کوئی فرمائش بھی کر لیتی تھیں۔

وہ استہزائیہ انداز میں دل ہی دل میں ذیشان کو زن مرید کا خطاب دیتا تھا' اسے یاد تھا بہت دن پہلے جب وہ اپنی دوست کی بھانجی کی مائیگریشن کا مسئلہ حل کروانے دوست کے ساتھ مقامی گرلز کالج گیا تو ذیشان وہاں ثمین کی چھوٹی بہن کی داخلہ فیس جمع کروانے آیا ہوا تھا۔

''غزنی بھائی' آنٹی کا تو کوئی بیٹا ہے نہیں' اب ہم ہی ان کے بیٹے ہیں۔'' ذیشان کے اپنائیت بھرے انداز پر طنزیہ مسکراہٹ اس کے چہرے پر بکھر گئی۔

زن مرید ایسے ہی تو ہوتے ہیں جیسے اویس بھیا بڑھ چڑھ کر اپنے سسرال والوں کے کام آتے تھے۔ اس نے ذیشان کو بھی اسی صف میں کھڑا کیا تھا جبکہ وہ خود اپنی نگاہوں میں سرخرو تھا' شادی کے بعد بھی اپنے گھر والوں کا ہی مطیع و فرمانبردار۔ لیکن آج اس کی

اپنی ماں نے ہی اسے ضمیر کے کٹہرے میں کھڑا کیا تھا اور وہ اپنے عکس سے ہی نگاہیں ملانے کے قابل نہ رہا تھا۔

رشتوں میں توازن نہ رکھنے والا ایک ناکام مرد۔ ماضی کی سب کوتاہیاں ایک ایک کر کے یاد آ رہی تھیں۔ شادی شدہ زندگی کا حسین آغاز اس کی سرد مہری کی نذر ہو گیا تھا۔ اس کی سنگت میں ثمین نے پریشان ہونے کے سوا کیا پایا تھا۔ اب بھی ثمین کی پریشان شکل دیکھ کر اس کی شرمندگی بڑھتی جا رہی تھی۔ اللہ نے اسے ایک نیک، حسین اور فرماں بردار بیوی دی تھی' وہ اس نعمت کی قدر ہی نہ کر پایا۔

''آپ تھکے ہوئے لگ رہے ہیں' آپ کا سر دبادوں۔'' وہ پوچھ رہی تھی۔ حالانکہ تھپڑ کھانے کے بعد ثمین نے بھی اس سے قدرے لاتعلقی اختیار کر لی تھی لیکن آج غزنی کے عجیب سے تیور دیکھ کر وہ اپنی ساری لاتعلقی بھول بھال گئی۔ وہ کسی انہونی کے خوف سے سہم رہی تھی اور انہونی ہو کر رہی تھی۔ غزنی نے اس کے سوال کا جواب دیے بنا اسے بانہوں میں بھر لیا تھا۔

''میں بہت برا ہوں۔ تمہیں بہت ستایا۔ معافی کے قابل بھی نہیں اس لیے معافی مانگوں گا بھی نہیں' بس تمہیں یہ یقین دلاتا ہوں کہ اب تم مجھے ایک بدلے ہوئے روپ میں پاؤ گی۔ میں سچ میں تم سے محبت کرنے لگا تھا ثمین لیکن یہ اعتراف خود سے کرتے ہوئے بھی جھجکتا تھا۔

اب مجھے اس اعتراف محبت میں کوئی عار نہیں۔ اب میں اچھے بیٹے اور بھائی کے ساتھ تمہیں اچھا شوہر بھی بن کر دکھاؤں گا' تم سے وابستہ رشتوں کو بھی اتنی ہی اہمیت دوں گا جتنی تم مجھ سے وابستہ رشتوں کو دیتی ہو۔ مجھے معافی کے قابل سمجھو نہ سمجھو، چاہے معاف بھی مت کرو بس اتنا یقین دلا دو کہ محبت کی رہ گزر پر میرے ہم قدم رہو گی۔'' وہ والہانہ انداز میں اپنی محبت کا یقین دلاتے ہوئے اس سے بھی محبت کا اعتراف سننا چاہ رہا تھا۔

ثمین اس کایا پلٹ پر حیران تھی لیکن اس نے کیوں اور کیسے کی بحث میں پڑنا غیر ضروری خیال کیا۔ جس بارگاہ میں اس نے اپنا مقدمہ پیش کر رکھا تھا وہاں سے کیسا خوب صورت فیصلہ آیا تھا۔ اپنے رب کے لطف و کرم پر اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

''آپ نے مجھ سے اظہار محبت کرتے ہوئے لو یو نہیں کہا لیکن آئی لو یو ٹو غزنی۔'' سارے شکوے پل بھر میں بھلا کر اس نے شرمگیں مسکراہٹ کے ساتھ جوابی اظہار محبت کر دیا تھا۔

غزنی اس کی اعلا ظرفی پر حیران تھا۔ کس آسانی سے وہ سب کچھ بھلا بیٹھی تھی۔

''امی نے میری اور عرشیہ کی بہت کلاس لی ہے۔ عرشیہ بھی تم سے بہت شرمندہ ہے۔ میں اپنی یا اس کی طرف سے صفائی پیش نہیں کر رہا لیکن سچ یہ ہے کہ ہم اپنے ماضی کے تجربوں سے خائف ہو کر ایسا طرز عمل اپنائے ہوئے تھے۔'' وہ شرمندہ سے انداز میں وضاحت دینے لگا تھا۔

''مجھے آپ کی کسی وضاحت کی ضرورت نہیں غزنی۔ میں بہت خوش قسمت ہوں جو مجھے رفیعہ آنٹی جیسی ساس ملیں۔ ایسی ساسیں قسمت والیوں کو ہی ملتی ہیں۔'' وہ مطمئن انداز میں گویا ہوئی۔

''اور ایسی بیویاں بھی قسمت والوں کو ملتی ہیں۔ میں بھی بہت خوش قسمت ہوں۔'' غزنی نے اس پر محبت پاش نگاہ ڈالی تھی۔ ثمین طمانیت سے مسکرا دی۔

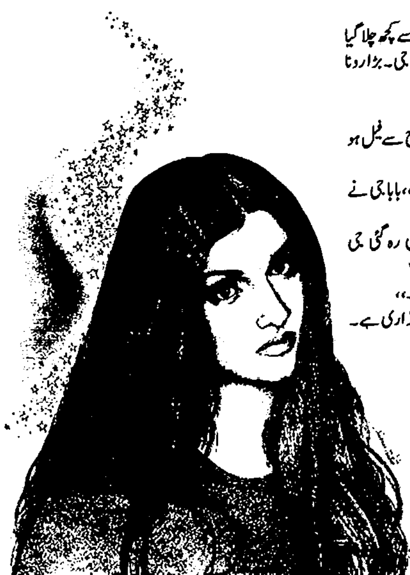
شوہر کی وارفتگی بھری محبت وصول کرنے کے بعد اسے اپنے رب کے حضور سر بسجود ہونا تھا۔ شکر گزاری کا اظہار لازم تھا' بے شک وہ ہی ہے جو مشکل کے بعد زندگی میں آسانیاں نصیب کرتا ہے۔



ایمل رضا



بیٹوں کی ماں



وہ بڑی خاموشی سے کافی دیر تک بیٹھی رہی تھیں۔ یہ کوئی تعویذ گنڈے دینے والے کا ڈیرہ نہیں تھا۔ سنا تھا یہاں کچھ دین کی باتیں ہوتی ہیں۔ درس ہوتا ہے۔ جو چاہے آ کر بیٹھ جائے۔ سنے، سمجھے اور اگر کوئی سوال ہو تو پوچھ لے۔ وہ بھی کافی دیر تک سنتی رہی تھیں۔ پھر وہ چند ان لوگوں میں جا کر بیٹھ گئی تھیں جن کے کچھ سوال تھے، اور جو بابا جی کے فارغ ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔

''میرا کوئی سوال تو نہیں بابا جی! بس یہ کہنا تھا کہ لگتا ہے جیسے کچھ رکھ کر بھول گئی ہوں۔ کھو بیٹھی ہوں۔''، اپنی باری پر انہوں نے بڑی اداسی سے کہا۔ وہاں اب وہ دونوں اکیلے ہی تھے۔ باقی سب اپنا اپنا سوال پوچھ کر جا چکے تھے۔

''کوئی چیز؟''، انہوں نے بڑے اطمینان سے پوچھا۔

''چیز نہیں...... بس میرے اندر سے کچھ چلا گیا ہے جیسے...... بڑی دوری پر آ گئی ہوں جی۔ بڑا رونا آتا ہے۔ دل کٹتا ہے۔''

''دکھی ہیں......؟''

''پتا نہیں...... میں بڑی بری طرح سے فیل ہو گئی ہوں۔''

''فیل ہونے کا احساس ہوتا ہے؟''، بابا جی نے غور سے ان کی آنکھوں میں دیکھا۔

''ہاں جی...... بہت پیچھے بھی رہ گئی جی میں۔ بڑا فاصلہ آ گیا ہے۔ کیا کروں؟''

''بولتی رہیں...... میں سن رہا ہوں۔''

''میں نے بڑی خوش حال زندگی گزاری ہے۔ جوانی میں بڑی خوبصورت تھی۔ بیس سال کی تھی جب بڑے اچھے گھرانے میں شادی ہوئی۔ سسرال میں بھی راج کیا۔ دنیا جہاں کی نعمتیں ملتی رہیں۔ اوپر تلے چار بیٹوں کی ماں بن گئی۔ خاندان بھر میں میری خوش قسمتی کی مثالیں دی جاتی تھیں۔ جیسا چاہا، پہنا، جہاں چاہا خرچ کیا۔ ایک بیٹا ڈاکٹر بن گیا۔ ایک نے اپنا بزنس کر لیا۔ ایک پڑھنے کے

لیے باہر چلا گیا اور ایک سرکاری ملازم ہو گیا۔"

"اللہ تعالیٰ بہت مہربان رہا ہے۔ آپ پر...... ماشاء اللہ۔"

"میری نند کی بیٹی تھی، نکاح کے بعد گھر بیٹھے ہی طلاق ہو گئی تھی۔ رخصتی نہیں ہوئی تھی۔ بچی بڑی خوب صورت، سلیقہ مند، پانچ وقت کی نمازی تھی۔ جس سے نکاح ہوا تھا وہ ذرا ماڈرن تھا۔ ایک دو بار بچی سے ملا تو انکار کر دیا کہ یہ تو بہت مذہبی ہے۔ طلاق ہوئی تو اس کے مذہبی ہونے کی بات کچھ ایسے پھیلی کہ جیسے مذہب سے لگاؤ کوئی برائی ہو، جیسے وہ نفسیاتی مریضہ ہو۔ میری نند بڑا روتی تھی۔ ایک دن آئی میرے پاس۔ اپنا آنچل میرے قدموں میں ڈال دیا۔ کہا گھر کی بچی ہے، واصف کے لیے لے لو۔ بڑا احسان رہے گا بھابھی آپ کا۔ میں نے انکار کر دیا۔ کہا، بیٹا کہتا ہے ڈاکٹرنی سے ہی شادی کروں گا۔"

"واصف کو سمجھائیں گی تو وہ سمجھ جائے گا...... آپ کی بہت سنتے ہیں سب بچے۔"

"تم جانتی ہو زبیدہ! آج کل کے بچوں کو، ماں باپ کی ایک نہیں چلنے دیتے۔"

"آپ بات تو کریں واصف سے۔"

واصف سے میں بات کیوں کرتی، جب شادی ہی میری پسند سے ہونا تھی۔ میں نے واصف کو کانوں کان خبر نہیں ہونے دی اور ہفتے کے اندر اندر ایک ڈاکٹر لڑکی سے اس کا نکاح پڑھوا دیا۔ نند سے کہہ دیا کہ لڑکی واصف کی کلاس فیلو تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔"

"آپ کو اپنی نند پسند نہیں تھیں یا ان کی بیٹی؟"

"ڈاکٹر بیٹے کی ماں تھی۔ میں بابا جی! بی اے پاس، طلاق یافتہ لڑکی کو کیسے اپنے ہونہار بیٹے کے لیے بہو بنا کر لے آتی۔ بیٹا میرا چاند کا ٹکڑا، اس کی پیشانی پر گرہن کیسے لگا دیتی۔"

"بچی شریف تھی، نمازی تھی، یہ نہیں سوچا آپ نے؟"

"تب نہیں سوچا...... بعد میں بڑا سوچا۔ سوچا کہ نند کیسے بلک بلک کر روتی تھی۔ گھر بیٹھے بیٹھے پاک باز بیٹی کو داغ لگ گیا تھا۔ اگر میرے پاس ہاتھ جوڑ کر آ ہی گئی تھی تو کچھ لاج ہی رکھ لیتی......"

"ہاں رکھنی چاہیے تھی لاج......"

"سر میں تکبر اور بڑائی کا بھوت سوار ہو تو شریف اور نیک لوگ اچھے ہی کہاں لگتے ہیں۔ نمازیں پڑھنا، پردے میں رہنا۔ دین کا لحاظ کرنا اور دنیا کو ہاتھ سے جانے دینا۔ یہ باتیں اب کہاں اچھی لگتی ہیں بابا جی۔ بیٹا میرا شیر جوان، اونچا لمبا، اپنی کلاس کا سب سے لائق اسٹوڈنٹ۔ میری ناک پر نند کی بیٹی کہاں چڑھتی تھی۔ اللہ سے ڈرنے والے لوگ کیسے اچھے لگتے ہیں بابا جی۔ مجھے بھی کیوں اچھے لگتے۔ میں نے تو اپنے ڈاکٹر بیٹے کے لیے اُونچے خاندان کی ڈاکٹر لڑکی ہی ڈھونڈ لی تھی۔ میرے بیٹے کے ساتھ چلتی تو دنیا دیکھتی تھی۔"

وہ رکیں۔ نہ جانے سانس لینے کے لیے یا گیلی آنکھیں پونچھنے کے لیے۔

"دو چار سال رشتوں کے لیے میری نند بڑا خوار ہوئی، پھر ایک بڑی عمر کے آدمی سے بچی کی شادی کر دی۔ بچی کی کم نصیبی کا روگ اس نے کچھ ایسا دل سے لگایا کہ دل کی مریضہ بن گئی۔ سال بعد ہی فوت ہو گئی...... خیر مجھے اس سے کیا......

دوسرا بیٹا جو اپنا بزنس کرتا تھا، اس کے لیے میرے شوہر جمیل کے ایک دوست نے اشارتاً اپنی بیٹی کا کہا تھا۔ پانچ بیٹیوں کے باپ تھے فیاض صاحب۔ معمولی جاب کرتے تھے۔ گھر بھی کسی گندے سے علاقے میں تھا۔ میرے شوہر کا بڑا پیار تھا ان سے۔ گھر میں کوئی تقریب ہوتی، تو بس یہی کہتے رہتے کہ کھانا پیک کر دو، ان کے گھر دے آؤں۔ مجھے بڑی چڑ تھی فیاض صاحب سے۔ جس دن جمیل نے ان کی بیٹی کا ذکر کیا تو میں اور چڑ گئی۔ ایسے ہی ٹھیکرے ہیں میرے بیٹے کہ کوئی بھی منہ اٹھا کر رشتے کے لیے کہہ دے۔ مجھے پتا تھا ایسے تو واصف کے ابا باز آنے والے نہیں، اس لیے خود ہی کچھ کرنا ہوگا۔ میں راضی باضی ہو کر چلی گئی بچیاں دیکھنے۔ بیوی بڑی اللہ لوک تھی ان کی۔ گھر چھوٹا تھا، پر سکون بہت تھا وہاں۔ کوئی افراتفری نہیں تھی، لیکن مجھے بڑی نفرت سی محسوس ہوئی۔ گھر کے ناکارہ فرنیچر، پلستر اکھڑی دیواروں، پرانے زمانے کے پردوں اور پلاسٹک کے دس بارہ سال پرانے ڈیزائن کے برتنوں سے۔ میرے بیٹے قاسم کی اپنی کار تھی، اور یہاں ان کے گھر کے باہر کار کھڑی کرنے تک کی جگہ نہیں تھی۔ کوئی پچاس گلیاں گھما کر تو مجھے گھر لائے تھے۔

"بچیاں کیسی تھیں؟" بابا جی نے بڑی نرمی سے پوچھا۔

"فیاض صاحب جیسے سفید پوش، شریف، حلال کمائی کمانے والے کی بچیاں کیسی ہوں گی بابا جی۔ ویسی ہی تھیں۔ سروں پر دوپٹے۔ ہاتھ پیر باوضو سے دنیا جہاں کے کام جانتی تھیں۔ ہر طرح کا کھانا پکا لیتی تھیں۔ لیکن میری طرف سے دنیا بھر کا ہنر سیکھ لیتیں، رہتی تو ڈھائی مرلے کے گھر میں تھیں یا وہ سب۔ ویسے بھی کھانا میں کام والی سے پکواتی تھی، کپڑے میرے ٹیلر کے پاس جاتے تھے۔ کروشیے، سلائی کڑھائی کے زمانے گئے اب۔ اور شرافت کا میں نے اچار ڈالنا تھا۔"

"آپ تھوڑی دیر کے لیے ان کی حیثیت کو ایک طرف رکھ کر سوچتیں۔"

"کیوں سوچتی؟ کوئی سوچتا ہے جو میں سوچتی۔ میرا بزنس مین بیٹا، اس ڈھائی مرلے کے گھر میں داماد بن کر جاتا۔ بیٹھتا کہاں وہ۔ موڑھوں پر؟ گندے سندے برتنوں میں کھاتا۔ کیا کہتا ماں نے کس گھر کا داماد بنا دیا۔"

"بیٹوں کی تربیت بھی تو آپ نے ہی کی تھی۔ آپ اگر انہیں سمجھاتیں تو وہ سمجھ جاتے۔ پھر بچوں کے ابا بھی تو اسی گھر میں آتے جاتے رہتے تھے۔ فیاض صاحب دوست تھے ان کے۔"

"وہ تو پاگل تھے۔ کہتے تھے، ایسی شریف بچیاں آج کے زمانے میں ملنا مشکل ہے۔ ایک بچی تو حافظ قرآن تھی۔ ٹھیک ہے، دین دار ہونا اچھا ہے۔ لیکن اب کوئی زبردستی تو نہیں ہے ناں......"

"ہاں زبردستی ہی تو نہیں ہے......"

"دو گھنٹے وہاں بیٹھ کر میں نے کچھ ایسی باتیں کیں کہ بڑی شرمندہ شرمندہ نظر آنے لگی تھیں فیاض صاحب کی بیوی اور بچیاں۔ ایک بچی تو شرم سے آنکھیں ہی نہیں اٹھا پا رہی تھی۔ ایک اٹھ کر ہی چلی گئی۔ جو سموسے، چاٹ بسکٹ میرے سامنے بڑے فخر سے رکھے تھے ناں اب وہ خود ہی انہیں چور نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ پھر نہیں اصرار کیا کہ بھابھی جی کھائیں نا۔ یہ کباب لیں۔ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے آپ کی، لیں نا......"

"اچھا کیا انہوں نے۔"

"بہت اچھا کیا انہوں نے......" وہ گہری سانس لے کر رہ گئیں۔

"قاسم کی شادی میں نے اپنی پسند کے لوگوں میں کر دی کہ جمیل صاحب پھر کسی دوست کی بیٹی کا رشتہ نہ لے آئیں۔ آج کل قاسم اپنے بنگلے میں اپنے تین بچوں کے ساتھ بڑی خوش حال زندگی گزار رہا ہے۔ اس کی بیوی ایک بہت بڑے چینل میں نیوز کاسٹر ہے۔ بہت پڑھی لکھی ہے۔ بچے بھی بڑے ٹپ ٹاپ ہیں دونوں کے۔ ہاں پر ایک بار میں نے قاسم کو سائیکاٹرسٹ کے کلینک میں دیکھا تھا۔ بہت پوچھنے پر بس اتنا ہی کہا "پتا نہیں اماں! سکون نہیں۔ سب کچھ ہے لیکن ڈیپریشن ہے کہ جان ہی نہیں چھوڑتا۔"

"بیٹا گھر میں رہا کرو۔ کبھی نماز کی طرف بھی توجہ دو۔ قرآن پڑھ کر بچوں پر بھی پھونکا کرو اور اپنے شوہر پر بھی۔" میں نے اس کی بیوی کو پکڑ کر سمجھایا۔

"اماں! آپ پھونکیں مارتی تو ہیں۔"

”میں اپنی جگہ، کچھ تمہارا بھی فرض ہے۔“
”پھوپھیں یار نا کہاں کا فرض ہو گیا۔“
”وہ ہنسنے لگی۔ پڑھی لکھی ہے نا بہت۔ دلیلیں بہت دیتی ہے۔ ویسے میرا بہت احترام کرتی ہے بابا جی! گھر چلی جاؤں تو چھٹی لے لیتی ہے آفس سے۔ بچوں کو بھی کہتی ہے، دادی سے ملو۔ دادی کے پاس بیٹھو۔“
”یہ تو بہت اچھا ہے.....آیا جایا کریں وہاں۔“
”ہاں وہ.....وہ.....میں چلی تو جاؤں لیکن بابا جی! وہ فیاض صاحب کی بیٹیاں مجھے وہاں جا کر بڑا یاد آتی ہیں۔ میرا دل بڑا گھبراتا ہے جی۔ جی چاہتا ہے قاسم کے گھر سے بھاگ جاؤں۔ اے سی لگا ہے، بڑا پیارا پھولوں سے بھرا ہوا لان ہے، دنیا جہاں کی سہولتیں ہیں اس کے گھر میں۔ لیکن مجھے ہر چیز بڑا کاٹتی ہے۔ بہو مجھے مدرز ڈے پر بڑا مہنگا گفٹ دیتی ہے۔ میں نے اسے تو نہیں بتایا لیکن ہر بار میں وہ گفٹ کسی اور کو دے دیتی ہوں۔ ایک بار تو کام والی کو دے دیا تھا۔ اسے پتا چلا تو وہ برا تو مانی لیکن وہ میری بات بھی نہیں مانے گی کہ اس کی دی ہوئی چیزیں مجھے کاٹتی ہیں۔ ہولاتی ہیں۔ مجھے بڑا رونا آتا ہے قاسم کے گھر جا کر۔“
”فیاض صاحب سے مل لیں......“
”پانچ بچیوں کو چھوڑ کر وہ مر گئے تھے جی۔ جمیل نے ان کی کفالت کرنی چاہی پر جو جو کچھ میں ان کے گھر کہہ آئی تھی نا، تو انہوں نے کہا مر جائیں گے امداد نہیں لیں گے۔ جمیل نے میرے آگے ہاتھ جوڑ دیے کہ جاؤ، کچھ کہہ سن لیا ہے تو معافی مانگ لو۔ چھوٹے شجاعت کے لیے کسی بچی کا ہاتھ مانگ لو۔ مرنے والے کی روح کو قرار آجائے گا۔ لیکن میں کیوں کسی مرے ہوئے کی روح کے قرار کا انتظام کرتی بابا جی.....لوگ کیا کہتے......بیٹا پڑھنے باہر گیا ہے اور ماں نے پکڑ کر چوڑے چماروں میں رشتہ کر دیا۔“
”شجاعت سے بات کی ہے میں نے کنیز! وہ کہتا ہے کہ اگر لڑکی اچھی ہے تو حیثیت کو نہ دیکھیں۔“
جمیل کو جیسے کسی پل چین نہیں تھا، انہوں نے فون پر شجاعت سے بات کر لی تھی اور اب مجھے منا رہے تھے۔ میں نے کسی کی نہیں سنی، اور اپنی ایک سہیلی کی بیٹی سے شجاعت کا رشتہ پکا کر دیا۔ یہ جاتے رہے تھے ان کے گھر، ان کی خبر گیری کر لیتے تھے۔ امداد تو انہیں گوارا نہیں تھی لیکن ان کی عزت بڑی کرتے تھے۔ سو بار کہتے کہ کوئی کام ہو تو بتائیں لیکن وہ جوان جہان بچیاں بجلی، پانی کے بلوں کے لیے اکیلی دھکے کھاتی رہتیں لیکن انکل جمیل کو زحمت نہ دیتیں۔ اپنے لیے نوکری ڈھونڈتیں۔ سلائی مشینیں چلاتیں لیکن ان سے نہ کہتیں کہ دو مہینے کا بل نہیں جمع کروایا، کچھ پیسے ادھار دے دیں۔ گیس والے گیس کاٹ گئے ہیں۔ ماں بیمار ہو گئی ہے۔ اسے دمہ ہو گیا ہے، اتنے اتنے ٹیسٹ کروانے ہیں۔ وہ اپنی گاڑی میں بٹھا کر لے جانا چاہتے تو کہتیں کہ ”اماں کا گاڑی میں دم گھٹتا ہے، بس میں ہی ٹھیک رہتی ہیں۔“
”ان کا اللہ مالک ہے۔ آپ تو خوش ہیں نا؟“
”جی۔ میں بہت خوش ہوں۔ شجاعت کے سسرال والوں کی تو جیسے لاٹری نکل آئی تھی۔ شجاعت میرے چاروں بیٹوں میں سب سے زیادہ پیارا اور اسمارٹ ہے۔ پورا انگریز لگتا ہے۔ لوگ فلم کا ہیرو سمجھتے ہیں اسے۔ اس کی تو تصویر دکھانے کی دیر تھی کہ ساس کا بس نہیں چلتا تھا کہ فوراً بیٹی کا نکاح پڑھوا دے۔ اکلوتی تھی ماں باپ کی۔ بہت جہیز لائی تھی۔ اب لندن میں بوتیک چلاتی ہے۔ سوئمنگ پول والا گھر ہے وہاں ان کا۔ سال میں دو بار آتے ہیں مجھ سے ملنے۔ ورنہ مجھے ٹکٹ بھیج کر بلوا لیتے ہیں۔“
”ماشاء اللہ! اللہ انہیں خوش رکھے۔“
”آمین......میں نے بڑی جدوجہد کی اپنے بیٹوں کی ترقی کے لیے۔ ان کی بڑے سے بڑے گھرانوں میں شادیاں کیں تاکہ سسرال والے انہیں آگے بڑھنے میں مدد دے سکیں۔ ان کے لیے ایک سے ایک پڑھی لکھی، خوب صورت لڑکیاں ڈھونڈیں۔ معاشرے میں بڑا مقام ہے میرے بیٹوں کا۔ لوگ جھک جھک کر سلام کرتے ہیں۔“

”واقعی آپ نے جدوجہد تو بہت کی......بیٹوں کی ماں تھیں نا آپ......“
”اب جمیل صاحب تو میرے کاموں میں بالکل نہیں بولتے تھے۔ نعمان کے لیے بھی ایک لڑکی پسند کر لی تھی۔ حیثیت ہمارے برابر تو نہیں تھی لیکن چلیں بس گزارا تھا۔ یتیم تھی، ماں نے دوبارہ شادی نہیں کی تھی۔ ماموں کے پاس رہتی تھی۔ میں نے بات پکی کر دی۔ تین چار ملاقاتیں ہوئیں تو میں نے غور کیا کہ لڑکی اپنا بایاں ہاتھ نہیں ہلاتی۔ تھوڑی تحقیق کی تو پتا چلا کہ لڑکی کا ہاتھ بچپن سے ہی ایسا ہے۔ کچھ پکڑ وکڑ نہیں سکتی تھی اس سے۔ وہ غیر محسوس ایک طرف لٹکا رہتا تھا۔ مجھے بڑا غصہ آیا کہ ایک تو مجھے لولی لنگڑی بیٹی دے دی پھر یہ بات مجھ سے چھپائی بھی۔ اس کی ماں بڑا روئی پیٹی جاری۔ کہنے لگی کہ بچی نے باپ کے مرنے کا بڑا غم کیا تھا، فالج ہو گیا تھا، ہاتھ بے کار ہو گیا۔ جو آتا ہے ہاتھ کی وجہ سے انکار کر دیتا ہے۔ میں بھائی کے گھر پڑی ہوئی ہوں، جلد سے جلد بچی کے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتی ہوں۔
اب وہ کیا چاہتی ہے مجھے کیا مطلب بابا جی! جہاں تین بڑی بہوویں نگینہ تھیں وہاں ایسی ویسی لڑکی کیسے لے آتی۔ پھر حیثیت میں بھی کم تھے وہ لوگ۔ ماں مر جاتی تو لڑکی کو کون پوچھتا۔ میرا نعمان ذرا مذہبی سا ہے۔ بڑی سختی سے کہا تھا اس نے کہ میری لیے بھابیوں جیسی ماڈرن بیوی مت لایئے گا۔ بس اسی چکر میں، میں پھنس گئی اس گھرانے میں۔ جو امیر تھے، ان کی بچیاں بڑی ماڈرن تھیں۔ جہاں شرافت تھی، وہاں حیثیت نہیں تھی۔ پھر یہ ہاتھ کا مسئلہ۔
جس وقت میں انکار کر کے، ڈرائنگ روم سے نکل رہی تھی، اس وقت آنسو پونچھتے ہوئے اس لڑکی نے بڑی بے بسی سے کہا تھا۔
”میرا تو ایک ہاتھ بے کار ہے آنٹی! آپ کا تو پورا دل ہی بے کار ہے۔ جو اپنے دل میں رحم نہیں رکھتا، وہ اللہ کی محبت پر حق بھی نہیں رکھتا۔“
”بچی نے ٹھیک کہا تھا۔ اللہ کو رحم کرنے والے بہت پسند ہیں۔“
”غلط تو میں نے بھی نہیں کیا تھا بابا جی! لوگ کیا کہتے، کیسی لڑکی بہو بنا کر لے آئی میں۔ کیا کمی تھی میرے نعمان میں۔ اتنا بڑا آفیسر۔ میرے چار بیٹے، میں کوٹھی میں رہنے والی، میرے گھر چار ملازم، میرے اکاؤنٹ میں پیسوں کی بھرمار۔ کیا کرتی میں۔ کیسے ایسے ویسوں میں اپنے بیٹوں کی شادیاں کر دیتی۔“
”ٹھیک کیا آپ نے.....اب کیا چاہتی ہیں آپ؟“
”واصف نے اپنی بڑی بیٹی کی منگنی کر دی ہے۔ اتنی عمر ہو گئی ہے میری۔ اس عمر میں کیا چاہوں گی میں۔ جب چاہتی ہوں لندن پہنچ جاتی ہوں۔ ہر سال ایک عمرہ کرتی ہوں۔ تین حج کر چکی ہوں۔ ہر سال لاکھوں روپیہ زکوٰۃ نکالتی ہوں۔ سردی، گرمی، ملازموں کو کپڑے بنا کر دیتی ہوں۔ ریل پیل ہے پیسے کی.....بڑا نام ہے میرے بیٹوں کا۔“
”ماشاء اللہ.....یہی تو چاہتی تھیں آپ......“
”یہی چاہتی تھی بابا جی! اور جو چاہتی تھی وہ مل بھی گیا......“
”پھر کیا کھو گیا ہے آپ کا؟“
وہ بچوں کی طرح دونوں ہاتھوں کو مسلنے لگیں۔ گال آنسوؤں سے تر ہو چکے تھے۔
”کیا کھو گیا ہے آپ کا؟“، انہوں نے نرمی سے دوبارہ پوچھا۔
”اللہ“......میرا رب کھو گیا ہے.....اب وہ نہیں ملتا کہیں تہجد بھی پڑھتی ہوں جی۔ ہر وقت

تسبیح پڑھتی رہتی ہوں۔ دو سپارے روز پڑھتی ہوں۔ اور جی یہ جو میرا بایاں ہاتھ ہے نا، یہ کام نہیں کرتا۔ کچھ ہوا بھی نہیں۔ واصف نے وہاں لندن بلا کر ٹیسٹ کروائے تھے۔ سب کہتے ہیں مجھے وہم ہے، میں خود ہی ہاتھ کو ہلاتی جلاتی نہیں ہوں۔ ڈاکٹر بھی حیران ہے کہ ٹیسٹوں میں کچھ ایسا ویسا آتا بھی نہیں اور ہاتھ بھی کام نہیں کرتا۔،،

”دعا کے لیے اٹھائیں، اٹھ جائے گا۔،،

”سب بچے کامیاب ہیں۔ خوش باش ہیں۔ صحت مند ہیں۔ ان کی سلامتی کی دعا کے علاوہ کیا دعا کروں۔،، ”مغفرت کی دعا......،،

”کیا لوں اللہ سے......وہ مجھے معاف کر دے......وہ مجھے معاف نہ کر چکا ہوتا تو میرے پاس دنیا جہاں کی نعمتیں کیوں ہوتیں۔ بچے میرا اتنا احترام کیوں کرتے۔ نعمان کی بیوی میری اتنی خدمت کیوں کرتی۔ میرا گھر، پوتے پوتیوں سے کیسے بھرا رہتا۔ وہ مجھ سے ناراض تو نہیں......وہ ناراض نہیں ...... پر وہ دُور ہے...... میں اس کے قریب نہیں ہو سکی بابا جی!،،

بابا جی نے گہری سانس لی۔ ”بی بی! جو جو آپ نے چاہا، اللہ نے آپ کو دے دیا۔ جیسا چاہا ویسا دیا بلکہ اس سے بڑھ کر دیا۔،،

”آپ مجھ سے صاف بات کریں بابا جی! بتائیں یہ کھویا ہوا رب کیسے ملے گا۔،،

”دیکھو بی بی! اللہ کا بھی مان ہوتا ہے اپنے بندے پر۔ وہ بھی یہ دیکھتا ہو گا کہ دیکھو! یہ میرا بندہ ہے، میں نے اسے اتنی نعمتوں سے نوازا ہے۔ میں نے اس پر اتنا کرم اور اتنا رحم کیا ہے، اب یہ میرے بندوں پر بھی رحم کرے گا۔ اس کے گناہوں کو معاف کر کے میں اس پر مہربان رہا ہوں، اب یہ بھی میرے بندوں پر مہربان ہو گا۔

اللہ کے قریب ہونے کا سب سے آسان راستہ رحم ہے۔ اس کے بندوں پر رحم۔ بس۔ لیکن آپ نے دنیاوی چیزوں، رتبے کو فوقیت دی۔ اللہ نے ایک بار نہیں دو بار نہیں چار بار آپ کو اپنے قریب لانا چاہا۔ آپ نے چار بار خود کو اس کے قریب ہو جانے سے دُور کر لیا۔ اس نے تو سب سے آسان راستہ دیا تھا آپ کو۔ آپ کو جہاد نہیں کرنا تھا۔ نفس کشی نہیں کرنی تھی۔ چلے نہیں کاٹنے تھے۔ آپ کو خود پر جبر نہیں کرنا تھا، بس ایک دل بڑا کرنا تھا......ذرا سا رحم پیدا کرنا تھا۔

وہ ناراض نہیں۔ وہ دُور بھی نہیں، پر آپ کو وہ قرب بھی نصیب نہیں جو رحم کرنے والوں کو نصیب ہوتا ہے۔ وہ آپ کی دعائیں بھی سنتا ہے، قبول بھی کرتا ہے، نمازیں بھی اہم ہیں لیکن آپ اپنا رتبہ نہیں بڑھا سکیں۔

جو رزق اللہ دیتا ہے اس میں سے چند دانے نکال کر دے دینا، کوئی بڑی بات نہیں۔ کچھ آزمائشیں خود کو پیش کر کے دینی پڑتی ہیں۔ اللہ کے بندوں کے عیب نظر انداز کر کے۔ مخلوق کے عیب چھپا کے۔ مخلوق کے درد کی دوا بن کر۔ اللہ سب سے زیادہ اس بندے سے راضی ہوتا ہے، جو اس کی مخلوق کے زخموں کی دوا کرتا ہے۔ آنسو پونچھتا ہے۔ دل پر مرہم رکھتا ہے۔ اپنے لائق فائق بیٹوں سے آپ کتنی آسانی سے اللہ کو راضی کر سکتی تھیں۔ جو جو چیزیں آپ کو عزیز تھیں وہ وہ آپ کو دے دی گئیں۔ آپ کو اللہ کی محبت عزیز نہیں تھی، تو آپ کو یہ محبت دی بھی نہیں گئی۔ انسان وہی حاصل کرتا ہے، جس کے لیے وہ جدوجہد کرتا ہے۔ آپ کو بھی وہ سب دے دیا گیا، جس کے لیے آپ نے کوشش کی۔ اللہ ہاتھ پکڑ پکڑ کر آپ کو وہاں وہاں لے کر گیا اور——
—— لیکن آپ وہاں وہاں سے ہاتھ چھڑا چھڑا کر بھاگتی رہیں۔،،

”اب میں کیا کروں بابا جی! چاروں بیٹے ہر مہینے میرے اکاؤنٹ میں پیسے ڈال دیتے ہیں۔ روز فون کر کر کے پوچھتے ہیں......بہوویں عزت کرتی ہیں۔ پوتے پوتیاں لاڈ کرتے ہیں۔ ایک بس وہی......میرا رب، جو مجھ سے کھو گیا۔ بس وہ ہی اب کہیں نہیں ملتا۔ بیٹوں کی ماں نے، مخلوق کے خدا کو کھو دیا بابا جی! میں کیا کروں بابا جی......،،

☆

افشین نعیم

کہہ ڈالو جو کہنا ہے

ناولٹ

"حسان بیگ بمشکل موضوع کا چناؤ کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ ابھی لکھنے کے لیے پر تول ہی رہے تھے کہ عارفہ کمرے میں داخل ہوئیں۔

"سنیے۔"

"جی سنائیے۔" انہوں نے بغیر نظر اٹھائے جواب دیا۔

"میری بات سنیں نا۔" عارفہ کو یہ بے توجہی سخت ناگوار گزری۔

"عارفہ! میں کانوں سے سنتا ہوں۔" نظریں ہنوز کاغذ پر جمی تھیں جو لکھے جانے کے لیے ان کی توجہ کا منتظر تھا۔

"مجھے ساتھ والے محلے میں درس سننے جانا ہے۔ کل برابر والی پروین بھابھی بڑے اصرار سے بلا کر گئی ہیں۔ بس گھنٹے دو گھنٹے کی بات ہے۔ محلے کی سب ہی خواتین جارہی ہیں۔" اس سارے قصے میں گھنٹہ، دو گھنٹہ نے حسان کی توجہ اپنی جانب مبذول کروائی۔

"عارفہ! آپ کے پانچ، دس منٹ کم سے کم ڈیڑھ، دو گھنٹے کے ہوتے ہیں، یہاں آپ گھنٹے، دو گھنٹے کی بات کررہی ہیں۔ مطلب چار، پانچ گھنٹے تو کہیں نہیں گئے۔"

"اللہ! آپ بھی نا، ہر وقت مذاق ہی شروع کردیا کریں۔" عارفہ نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔

"اس میں مذاق کہاں سے آگیا۔" حسان حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولے۔

"اچھا چھوڑیں ان باتوں کو۔ آپ سے میں یہ کہنے آئی تھی کہ ذرا باہر بچوں کے پاس آکر بیٹھ جائیں۔ وہ اپنا ہوم ورک کرتے رہیں گے، آپ یہ اپنا لکھنا وکھنا کرتے رہیے گا۔" ہاتھ سے کاغذ قلم کی جانب اشارہ کیا۔

اب حسان کو معاملے کی سنگینی کا احساس ہوا۔

"عارفہ پلیز، مجھے یہ آرٹیکل ہر صورت مکمل کرنا ہے۔ بچوں کے ساتھ بیٹھ کر لکھنے لکھانے کا کام ہرگز نہیں ہوسکتا۔ میری طرف سے معذرت۔" ساتھ ہی رخ موڑ کر دوبارہ لکھنے کی جانب متوجہ ہوگئے۔

"اچھا، پھر میں بچوں کو ادھر ہی بھیج دیتی



ہوں۔" عارفہ یہ کہتے ہوئے جانے کو مڑیں۔

"عارفہ! پلیز کبھی بات سمجھنے کی بھی کوشش کرلیا کرو۔ مجھے لکھنے کے لیے مکمل یکسوئی اور تنہائی چاہیے۔ بچوں کی موجودگی میں یہ ممکن نہیں ہے۔"

"تو آپ رات کو لکھ لیجیے گا نا۔ میرا جانا ضروری ہے۔ کبھی آپ بھی بات سمجھنے کی کوشش کرلیا کریں۔" انہوں نے کہہ کر باہر کی جانب قدم بڑھائے۔

"سرمد، ارمغان، بابا کے پاس آجاؤ آپ لوگ۔" باہر سے عارفہ کی آواز سنائی دی۔

"رکو، باہر ہی آرہا ہوں۔" حسان نے تلملاتے ہوئے اپنی چیزیں سمیٹیں اور باہر کی جانب قدم بڑھائے۔

دونوں صاحب زادے ڈائننگ ٹیبل پر اپنی اپنی کتابیں پھیلائے ہوم ورک کررہے تھے۔ عارفہ چادر اوڑھے جانے کو تیار کھڑی تھیں۔

"میرا ان کے سروں پر سوار ہونا کیا ضروری تھا۔ کرتے رہتے دونوں اپنا اپنا کام۔" حسان کا موڈ سخت آف تھا۔

"ضروری ہوتا ہے ان کے سروں پر کسی کا سوار ہونا۔ ورنہ ادھر میں باہر نکلی ادھر انہوں نے کتابیں یوں ہی چھوڑ کر باہر کی راہ لی۔"

عارفہ کی بات پر سرمد اور ارمغان نے مسکرا کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ یہ ہی تو کرتے وہ۔ حسان اپنا مال و اسباب لے کر صوفے پر ٹک گئے۔ نئے سرے سے سوچنا تھا۔ کہاں سے لکھنا شروع کریں۔

"اچھا، وہ سنیں!" عارفہ دروازے تک پہنچ کر واپس پلٹیں۔ "چولہے پر ہانڈی رکھی ہوئی ہے۔ پندرہ منٹ بعد چولہا بند کردیجیے گا اور ہاں موٹر چلا کر جارہی ہوں۔ صبح بھی پانی نہیں بھرا تھا۔ بیس منٹ بعد بند کردیجیے گا یاد سے۔"

"اور کچھ......" حسان نے طنزاً انہیں گھورا۔

"اور......" عارفہ نے ذہن پر زور ڈالا۔ "بچے کام کرلیں تو انہیں کہیے گا، اپنے اپنے جوتے پالش کرلیں۔ صبح اتنا وقت نہیں ہوتا۔"

اب حسان بالکل خاموش ہوگئے' بولتے تو مزید دو چار کام پیچھے لگ جاتے۔ عارفہ کے نکلتے ہی حسان دوبارہ اپنے آرٹیکل کی طرف متوجہ ہوئے۔ ابھی پہلی سطر لکھی تھی کہ چھوٹے صاحب زادے کی زبان میں کھجلی ہوئی۔

"پاپا! پاکستان کا قومی ترانہ کون سی زبان میں ہے؟"

"فارسی میں۔" بغیر سر اٹھائے جواب دیا۔

"مگر پاپا، پاکستان کی قومی زبان تو اردو ہے نا، تو پھر قومی ترانہ قومی زبان میں کیوں نہیں ہے۔"

اب کے حسان سخت جھنجلائے۔ "بھئی اردو اور فارسی میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ اردو خود بھی فارسی اور کچھ اور زبانوں سے مل کر بنی ہے۔"

"پاپا، تو پاکستان کی قومی زبان فارسی کرلیتے نا، اردو کی جگہ۔"

"ارمغان!" حسان نے تنبیہ کی۔ "بہتر ہوگا آپ فالتو باتوں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے اپنا ہوم ورک مکمل کریں۔"

ارمغان منہ بنا کر کام کی جانب متوجہ ہوا۔ حالانکہ بالکل دل نہیں کررہا تھا کام کرنے کو۔ انتہائی کامیابی کے ساتھ حسان ایک پیراگراف مکمل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔

"پاپا! کچھ جل رہا ہے۔" سرمد نے فضا میں سونگھتے ہوئے کہا۔

"اوہ!" حسان سر پر ہاتھ مارتے کچن کی طرف بھاگے۔ کچن میں بہت زیادہ جلنے کی بو آرہی تھی۔ فٹافٹ چولہا بند کیا۔ دیگچی کا ڈھکن اٹھا کر دیکھا، سالن ٹھیک ٹھاک جل چکا تھا۔

واپس ٹی وی لاؤنج میں آئے۔ کاغذ قلم سنبھالا۔ نئے سرے سے آرٹیکل کی طرف متوجہ ہوئے۔ جانے کیا لکھ رہا تھا۔ سب ہی کچھ ذہن سے نکل گیا۔ پہلا پیراگراف دوبارہ پڑھا۔ کچھ خیالات ذہن میں آئے، انہیں صفحہ قرطاس پر بکھیرنا شروع کیا۔ اب کے بڑے صاحب زادے نے موڈ غارت

کیا۔

"پاپا! یہ ایک غزل کی تشریح سمجھادیں۔"

"اف۔" انہوں نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"کلاس میں توجہ سے کیوں نہیں سنتے۔"

"پلیز پاپا! کل ٹیسٹ ہے۔"

حسان نے بے دلی سے قلم، کاغذ پر پٹخا۔ "آؤ، سمجھاؤں۔" تشریح سمجھا کر فارغ ہوئے۔ توجہ ایک مرتبہ پھر کاغذ، قلم کی طرف مبذول کی، اچانک بارش شروع ہوگئی۔

"بے وقت بارش۔" وہ بڑے حیران ہوئے۔

"پاپا! موٹر بند کریں، پانی گر رہا ہے۔" ارمغان اونچی آواز میں چلایا۔ حسان باہر کو بھاگے۔ جا کر موٹر کا سوئچ بند کیا۔ پانی مسلسل بہتا آرہا تھا۔ مطلب کہ پوری چھت پانی سے بھر چکی ہوگی۔ افسوس سے سوچتے اندر آئے۔ بے دلی سے کاغذ، قلم کو دیکھا۔ عجیب سی بے زاری چھا گئی طبیعت پر۔ خیالات کی رو بھٹکتے بھٹکتے دور کہیں ان کی نوجوانی تک جا پہنچی۔

اپنے دور کے بہت لائق فائق طالب علم تھے۔ کالج کی ادبی سوسائٹی کے صدر بھی تھے۔ ادبی پرچوں میں لکھنے لکھانے کا آغاز دوران تعلیم ہی ہوگیا تھا۔ پھر یہ سلسلہ تعلیم مکمل ہونے کے بعد بھی جاری رہا۔ وہ لکھتے، ان کا لکھا پڑھا جاتا، سراہا جاتا، معاوضہ بھی ملتا۔ بہت خوش رہتے تھے اس دور میں۔ پر یہ تب کی بات ہے جب آتش جوان تھا۔ آہ......وہ زمانہ......

ایک کراہ کی صورت ٹھنڈی سانس خارج کی۔

شادی کے بعد تو جیسے دل فرصت کو ترس سا گیا تھا۔ ہمارا معاشرہ بھی عجیب ہے۔ شادی سے جڑی عورتوں کی مصروفیات تو ساری دنیا کو نظر آتی ہیں۔ مرد کا دکھ کوئی محسوس نہیں کرتا۔ انہیں اس بے حس معاشرے پر جی بھر کر غصہ آیا۔

اب تو لکھنا، لکھانا تقریباً چھوٹ ہی چکا تھا۔ نو سے پانچ کی نوکری کرتے تھے اور ایک ہفت روزہ کے لیے کالم لکھتے تھے۔ یہ سلسلہ بھی یوں باقی رہ گیا کہ عباس صاحب جو اس ہفت روزہ کے مالک تھے۔ انہوں نے حسان بیگ کو لکھنا چھوڑنے نہیں دیا۔ لاکھ انہوں نے وقت کی کمی کا رونا رویا۔ منت ترلے کیے۔ پر عباس صاحب مان کر نہ دیے۔

"منع مت کیجیے حسان صاحب، لاکھوں چاہنے والے ہیں آپ کے۔ کسی ہفتے آپ کا کالم مس ہوجائے تو پورا ہفتہ صفائیاں دیتے دیتے گزر جاتا ہے۔ ٹیلی فون کالوں کا تانتا بندھ جاتا ہے۔ ایسا ظلم نہ کیجیے۔" اب ہر ہفتے مطلوبہ دن ان کا فون آتا اور ایسے لجاجت سے بات کرتے گویا کالم کے لیے نہیں قرض مانگنے کے لیے فون کیا ہو۔

لکھنا تو حسان بیگ خود بھی چاہتے تھے، سراہا جانا کسے ناپسند ہوتا ہے۔ پر مصیبت یہ تھی کہ ہفتے میں یہ چھ صفحات لکھنا ان کے لیے جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ یہ ہی کالم وہ شادی سے پہلے دو گھنٹے لگاتار بیٹھ کر مکمل تحریر کرلیا کرتے تھے۔ کہاں سے کہاں نکل گئے تھے۔ سوچتے سوچتے۔ ہوش تب آیا جب سرمد اور ارمغان دائیں بائیں آکر کھڑے ہوگئے۔ سرمد بیگ میٹرک اور ارمغان بیگ ساتویں جماعت کے طالب علم تھے۔

"پاپا! کام ہوگیا، ہم باہر جا کر کھیل لیں۔" تھوڑی سی دیر لگی ان کو بات سمجھنے میں۔

"نہیں بھئی نہیں، آپ کی ماما آکر ناراض ہوں گی۔ کوئی ضرورت نہیں باہر جانے کی۔"

"پلیز پاپا! سارا کام ہوگیا ہے۔" دونوں پیچھے پڑ گئے۔ آخر ان کو اجازت دیتے ہی بنی۔ دونوں خوشی سے نعرے لگاتے باہر کو بھاگے۔

اف! اس قدر سکون کے لمحات، نہ بیگم گھر پر نہ بچے۔ وہ نئے سرے سے پُرجوش ہوگئے۔ لکھنے کے لیے۔ پہلے چائے پینی چاہیے۔ انہوں نے اس فراغت کو اچھی طرح سیلبریٹ کرنے کا سوچا۔

کچن میں گئے، چائے بنا کر لائے، چائے کی چسکیاں لیتے وہ آرٹیکل کھول کر بیٹھے۔ لکھنا شروع کیا۔ دماغ اور قلم دونوں ہی تیزی سے چل رہے

تھے۔ آج برسوں بعد امید بندھی تھی کہ آرٹیکل ایک ہی نشست میں مکمل ہو جائے گا۔ عجب سرشاری کے عالم میں لکھے چلے جا رہے تھے۔ آدھے سے زیادہ کام مکمل ہو چکا تھا۔ جب عارفہ بہ آواز بلند بولتی گھر میں داخل ہوئیں۔

''ارے یہ گیٹ کیوں پورا کھلا ہوا ہے۔'' عارفہ کی سریلی آواز کا ثمر تھا کہ لکھنے کا سارا جوش و جذبہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ (کیا تھا جو دس والی آپا ایک آدھ گھنٹہ اور لگا لیتیں۔ آرٹیکل مکمل ہو جاتا۔)

''ارے بھئی یہ کار پورچ میں اتنا پانی کہاں سے آ گیا۔ یقیناً آپ موٹر بند کرنا بھول گئے ہوں گے۔'' عارفہ بولتے ہوئے ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوئیں۔ جواب سننے سے ان کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

''سالن بھی جلا ڈالا۔'' وہ فضا میں کچھ سونگھتی کچن کی جانب بڑھیں۔ ''ہائے ہائے ستیاناس کر دیا سالن کا۔'' (کیا ہی اچھا ہوتا جو ٹی وی کی طرح بیوی کا بھی ریموٹ ہوتا۔ جب دل چاہتا آواز بند کر دیتے۔) حسان بس سوچ کر رہ گئے اس وقت بولنا بہت برا ثابت ہو سکتا تھا ان کے حق میں۔

وہ کچن سے واپس ٹی وی لاؤنج میں آ گئیں۔

''بچے کہاں ہیں؟'' ان کو نئی پریشانی نے آ گھیرا۔

''کام ختم کر لیا تھا انہوں نے، باہر گئے ہیں کھیلنے۔''

'کام ختم کر لیا تھا؟ کام تو ان کا رات تک ختم نہیں ہوتا۔ انہوں نے کہا اور آپ نے یقین کر لیا۔ ذرا پوچھتے تو، کیا، کیا کام کیا ہے۔ جوتے پالش کروائے ان سے یا نہیں؟'' حسان خاموشی سے چیزیں سمیٹنے لگے۔ جواب دینے کی صورت میں نقص امن کا خدشہ تھا۔

''اوہ خدایا! آپ بس یہ اپنا لکھنا، لکھانا کرتے رہا کیجیے ہر وقت، چاہے دنیا میں کچھ بھی ہوتا رہے آپ کی بلا سے۔'' عارفہ بولتی رہیں۔ حسان نے کان لپیٹ کر کھسکنے میں ہی عافیت جانی۔

☆☆☆

''مس جی! میڈم جی، تو انوں یاد کر رہے نے۔ (مس جی! میڈم جی آپ کو یاد کر رہی ہیں۔) سعیعہ تین لگاتار پیریڈ اور پھر بریک ڈیوٹی کے بعد ابھی آ کر بیٹھی ہی تھی کہ فضیلت بی، میڈم کا پیغام لے کر آ گئیں۔

''کیا مصیبت ہے۔'' وہ سخت بے مزہ ہوئی اس بے وقت کے حکم نامے پر۔ حسرت بھری نظر، خوش گپیوں میں مصروف ساتھیوں پر ڈالتی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ پرنسپل آفس کے سامنے جا کر بے زاری کو ڈانٹ کر بھگایا، چہرے پر بشاشت طاری کی۔ ایک دھیمی سی مسکان لبوں پر سجائی۔ تصور کی آنکھ سے خود کو دیکھا۔ شاباش دی اور اندر داخل ہو گئی۔

''میم! آپ نے یاد کیا تھا۔''

''جی بیٹھیے۔'' انہوں نے کام چھوڑ کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''مس سعیعہ! ریجنل اسپیچ کمپیٹشن کے لیے فائنل ڈیٹ آ گئی ہے۔ آپ نے بچی سلیکٹ کر کے تقریر کی تیاری کروانی ہے۔ یہ فائل دیکھ لیجیے، اس میں تقریر کا موضوع اور دیگر ہدایات دی گئی ہیں۔'' انہوں نے فائل بڑھائی، جسے سعیعہ نے مستعدی سے تھام لیا۔

''مس سعیعہ! دھیان رہے اس مصروفیت کا اثر آپ کی کلاسز پر نہیں پڑنا چاہیے۔''

''نہیں پڑے گا میم، میں فری پیریڈز میں مینج کر لوں گی۔'' (فالتو تنخواہ ملتی ہے نا، جو فالتو کام بھی میں کروں۔ یہ نکموں کا اتنا بڑا ٹولہ بس تالیاں پیٹنے کے لیے ہے۔) چہرے کے تاثرات نارمل رکھنے کی اپنی سی کوشش کی۔

''اگر آپ کو ضرورت ہو تو میں کسی اور کی ڈیوٹی بھی لگا دیتی ہوں آپ کے ساتھ......'' انہوں نے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ (محنت ساری میری، نام مفت میں کسی اور کا ساتھ لگ جائے گا۔)

''نو میم، اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں کر لوں گی مینج۔''

''گڈ، پوری کوشش کیجیے گا کہ اس بار ٹرافی ہمارے ہی اسکول میں آئے۔''

''جی میم، ان شاء اللہ۔'' (اتنا آسان سمجھ رکھا ہے، ذرا خود تیاری کروائیں تو پتا چلے۔)

''ٹھیک ہے، اب آپ جا سکتی ہیں۔ کسی مدد کی ضرورت ہو تو بتایئے گا۔'' وہ دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئیں۔

☆☆☆

سعیعہ تھکے تھکے قدموں سے اسٹاف روم میں داخل ہوئی اور دھپ کر کے اپنی نشست پر گر سی گئی۔

''مس سعیعہ! میڈم نے خیریت سے بلایا تھا؟'' مسز احمد نے بے نیاز سے لہجے میں سعیعہ سے پوچھا۔ ان کی بات پر باقی سب بھی سعیعہ کی طرف دیکھنے لگیں۔

''ریجنل اسپیچ کمپیٹشن کی فائنل ڈیٹ آ گئی ہے۔ اس کی تیاری کروانی ہے۔ اسی سلسلے میں بلایا تھا۔'' سعیعہ نے فخر سے گردن اکڑاتے ہوئے کہا۔ (یوں جیسے، ہے کوئی میرے جیسا قابل جسے میم بلائیں۔) پر مسز احمد کی اگلی بات نے ایک دم ہی جیسے غبارے سے ہوا نکال دی۔

''مس سعیعہ' اس بار ذرا ٹھیک سے تیاری کروایئے گا۔ یاد ہے پچھلے سال آپ کی بچی اسٹیج پر تقریر بھول گئی تھی۔'' (اف کم بخت کی یادداشت، سعیعہ کلس کر رہ گئی۔)

''مسز احمد!'' وہ جی جان سے ان کی جانب متوجہ ہوئی۔ ''میڈم نے مجھے کہا ہے کہ اگر مجھے ضرورت ہو تو وہ کسی اور کی بھی ڈیوٹی لگا دیں گی میرے ساتھ۔ تو میرا خیال ہے، میں آپ کا نام لے دیتی ہوں۔ ہم دونوں مل کر تیاری کروائیں گے تو پچھلی بار کی طرح نہیں ہوگا۔'' سعیعہ نے سرد نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے سرد ہی لہجے میں کہا۔

مسز احمد کو اچانک ہی کچھ ضروری پیپرز نکالنے یاد آ گئے اور وہ ایسے مصروف ہو گئیں گویا کچھ سنا ہی نہیں۔ سعیعہ نے دل ہی دل میں اپنی نظر اتاری اور اپنی حاضر جوابی کو خراج تحسین پیش کیا۔ امید تھی کہ اب کم از کم مقابلہ ہو جانے تک ان کی بولتی بند ہی رہے گی۔

☆☆☆

''مس سعیعہ! آپ نے چودھواں اور پندرھواں سپارہ پڑھنا ہے کل تک۔'' سعیعہ کاپیوں کے ڈھیر میں منہ دیے چیکنگ میں مصروف تھی جب مس تمنا ایک پرچی اسے پکڑاتے ہوئے بولیں۔ مس تمنا اسکول کی سینئر ترین جبکہ سعیعہ جونیئر ترین ٹیچرز میں سے ایک تھی۔ اکثر و بیشتر ان کے نظریات آپس میں ٹکرا جایا کرتے تھے۔

سعیعہ نے جھنجلا کر انہیں دیکھا۔ ''یہ سپاروں کی تقسیم کس لیے ہو رہی ہے؟''

''مسز احمد کی والدہ کی کل برسی ہے۔ سب دو، دو سپارے پڑھیں گے، کل تک قرآن ختم ہو جائے گا۔''

''مس تمنا! مسز احمد کی والدہ کی برسی ہے تو سپارے مسز احمد پڑھیں نا۔ سارے اسٹاف کو کیوں بانٹ رہی ہیں آپ سپارے؟ ویسے بھی ان کی والدہ کو فائدہ اسی کلام سے ہوگا جو وہ خود پڑھیں گی۔ ہمارے سپارے پڑھنے کا ثواب ہمارے والدین کو پہنچے گا۔ اس کا ان کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔''

''اے لڑکی! کیا کفر بک رہی ہو۔ تم دعا کرو گی، قرآن پڑھ کر تو کیوں ان کو ثواب نہ پہنچے گا۔'' مس تمنا نے سخت قہر بار نظروں سے اسے گھورا۔

''دعا، میں نماز پڑھ کر کر لوں گی۔ سپاروں کے لیے معذرت۔''

''توبہ توبہ، استغفار، میرے اللہ! قرآن پڑھنے سے انکار۔ یہ دیکھ لیجیے آپ لوگ، یہ حال ہے ہماری نوجوان نسل کا۔ اس ڈھٹائی اور بے شرمی سے اللہ کے کلام کو انکار کر دیتی ہے۔'' جملہ حاضرین اپنے اپنے کام چھوڑ کر افسوس بھری نظروں سے سعیعہ کو دیکھنے لگے۔ کئی ایک نے دل ہی دل میں استغفار بھی

پڑھی۔

نیکوکاروں کی اس محفل میں گویا فقط سدیعہ ہی تھی جو سنگسار کیے جانے کے قابل تھی۔ (صفائی دینی ضروری ہوگئی۔)

"مس تمنا! آپ بات کو غلط سمت لے جارہی ہیں۔ میں صرف وقت کی کمی کا تذکرہ کررہی ہوں۔ میرے دو چھوٹے چھوٹے بچے ہیں جن کو گھر میں میری توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں تو فرض نماز کے لیے بھی بہت مشکل سے وقت نکال پاتی ہوں۔ ایسے میں سپارے پڑھنے کے لیے وقت کہاں سے لاؤں۔"

"اے لو، پھر وہی بات۔ ارے بی بی، بچوں کے پوتڑے دھونے ان کو کھلانے پلانے کے لیے بھی تو وقت نکالتی ہی ہوگی نا؟ تو ایک ڈیڑھ گھنٹہ اپنے رب کے لیے نہیں نکال سکتیں۔" سدیعہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ مس تمنا کو بھی بنا کر کسی دیوار سے چپکا دے۔

"مس تمنا! آپ کے خیال میں اگر مجھے اپنے بچے کا گندا پیمپر تبدیل کرنا ہے یا اس کو بھوک کے وقت کچھ کھانے کو دینا ہے تو یہ کام چھوڑ کر قرآن پاک کھول کر بیٹھ جاؤں؟" اس نے سخت زچ ہوکر جوابی حملہ کیا۔

"ارے بھئی، نہیں ہوتا گھر میں وقت تو یہاں وقت نکال لو۔" اب کے وہ کچھ نرم پڑ کر بولیں۔

"ہم تو پورے کا پورا قرآن پڑھ ڈالتے ہیں۔ اسکول ہی میں ٹائم نکال کر۔ بس انسان کے اندر جذبہ ہونا چاہیے۔" انہوں نے فخریہ لہجے میں حاضرین و سامعین کو اپنی کارکردگی سے آگاہ کیا۔ (جس سے سب پہلے ہی سے واقف تھے۔)

"اور اس کام کا کیا ہوگا؟" سدیعہ نے کاپیوں کے ڈھیر کی جانب اشارہ کیا۔

"بی بی! ایک بات اچھی طرح جان لو۔ یہ سب کام نہیں آئے گا۔" انگلی اٹھا کر کاپیوں کی جانب اشارہ کیا۔ "آخر میں یہی کام آئے گا۔" انگلی وہیں سے گھما کر قرآن کی سمت کرلی۔ (انداز ایسا تھا گویا کہہ رہی ہوں۔ گناہ گار عورت، اب بھی راہ راست پرنہ آئی تو کب آئے گی۔)

"ایکسکیوزمی میم! ہم اسکول کے اوقات میں قرآن پاک پڑھنے کی نہیں کام کرنے کی تنخواہ لیتے ہیں۔" یہ وار بہت سخت تھا، مس تمنا تلملا کر رہ گئیں۔

"معاف کردیجیے مس سدیعہ! معاف کردیجیے۔" انہوں نے سدیعہ کے سامنے ہاتھ جوڑے۔ "ہم سے غلطی ہوگئی جو آپ کو سپارے پڑھنے کو کہہ دیا۔ ہم خود پڑھ لیں گے۔ آپ رہنے دیجیے۔" ساتھ ہی اس کے ہاتھ سے پرچی جھپٹ، یہ جا وہ جا۔ تمام خواتین غصے اور افسوس سے سدیعہ کو دیکھ رہی تھیں۔ (گویا وہ مرتد ہی ہوگئی ہو، نعوذ باللہ) وہ سر جھٹک کر کام کی طرف متوجہ ہوگئی۔ روز کا تماشا تھا یہ تو یہاں۔

☆☆☆

عباس صاحب صبح سے تین مرتبہ کال کرکے آرٹیکل کی بابت دریافت کرچکے تھے۔ حسان دل ہی دل میں شرمندہ ہوتے رہے اور ہر بار کی طرح پکا عہد کرتے رہے کہ اگلی بار ان کے پوچھنے سے پہلے ہی آرٹیکل پہنچا دوں گا اور ہر بار کی طرح کوئی اندر ہی اندر ان پر ہنستا رہا۔

وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہوگیا۔

مسئلہ یہ تھا کہ اگلی بار کی نوبت تو بعد میں آتی تھی، ابھی تو اس بار والا ہی نامکمل تھا۔ گھر پہنچ کر جم کر بیٹھنا اور آرٹیکل مکمل کرنا ناگزیر ہوچکا تھا۔ ایک مصیبت جو کہ سب سے بڑی مصیبت تھی، وہ یہ کہ ان کا چھٹی کا دن کسی کام کا نہیں رہتا تھا۔ ہر اتوار کو ان کی بیگم کے آدھ درجن بہن بھائیوں میں سے کوئی نہ کوئی آدھمکتا تھا اور پورا دن برباد کرکے ہی ٹلتا تھا۔ انہیں خواہ مخواہ ہی غصہ آنے لگا سسرال والوں پر۔ ان کی اپنی ایک ہی بہن تھی۔ بے چاری ملازمت پیشہ تھی۔ ہفتوں بعد شکل دکھاتی، اس پر بھی اسے آتے ہی جانے کی جلدی ہوتی۔ بہن کا سوچ کر موڈ کچھ بہتر ہوا۔

یا اللہ! آج تو جیسے تیسے کام مکمل کروا ہی دے۔ وہ دعائیں مانگتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔ اندر داخل ہوتے ہی حیرت کا ایک خوش گوار جھٹکا لگا۔

دعائیں قبول ہوتی محسوس ہوئیں۔ بیگم نک سک سے تیار کھڑی نظر آئیں۔ گویا کہیں جارہی ہوں۔ بچوں کو کھیلنے بھیج دوں گا اور خود تسلی سے کام کروں گا۔ جلدی سے منصوبہ بندی کرلی۔

"بہت دیر کردی آج۔" بیگم مسکراتے ہوئے بولیں۔

"ہاں رش بہت تھا۔" (خیال آیا پہلے پوچھنا چاہیے کہاں کی تیاری ہے؟ ساتھ ہی دوسرا خیال آیا، کہیں چھوڑنے ہی نہ جانا پڑ جائے۔ فوراً پوچھنے کا ارادہ ملتوی کردیا۔)

باتھ روم سے فریش ہوکر نکلے تو امید تھی، بیگم جاچکی ہوں گی۔ انگڑائی لیتے ہوئے کاغذ، قلم سنبھالا اور تیار ہوگئے۔ مضمون کو انجام تک پہنچانے کو بیٹھے ہی تھے کہ بیگم ہنستی مسکراتی کمرے میں داخل ہوئیں۔ ہاتھ میں چائے کی پیالی تھی۔ (گئیں نہیں اب تک، محض سوچ کر رہ گئے۔ مسکرا بھی ضرورت سے زیادہ رہی ہیں۔ کہیں پیسے ہی نہ مانگ لیں)

"ناحق زحمت کی، میں بنالیتا۔" (تم، اب چلی جاؤ، جہاں جارہی ہو۔) مسکراتے ہوئے پیالی پکڑی۔

"زحمت؟ کیسی غیروں والی باتیں کرتے ہیں۔" اٹھلا کر کہا۔ حسان تو ان کے ناز و انداز دیکھ کر حیران رہ گئے۔ (ضرور پیسے مانگیں گی۔) چائے پیش کرنے کے بعد وہاں سے جانے کے بجائے وہیں ٹک گئیں۔ "اور سنائیے آفس میں سب ٹھیک جارہا ہے۔"

حسان کو زبردست قسم کا اچھو لگ گیا ان کی بات سن کر۔ (یاد نہیں پڑتا تھا کہ کبھی اس قسم کی گفتگو بیگم نے اس سے پہلے بھی فرمائی ہو۔)

"ہاں، ہاں سب ٹھیک ہے۔" (اللہ کا واسطہ ہے، جان چھوڑ دو، کام کرنا ہے۔) انہوں نے ادھورا نامکمل مضمون نکال کر سامنے رکھا۔ قلم کھولا۔ دوسرے ہاتھ سے چائے کا کپ تھامے چسکیاں لے رہے تھے جب بیگم بولیں۔

"موسم کتنا اچھا ہورہا ہے نا؟" انداز سوالیہ تھا اور جواب سننے کی چاہ چہرے پر نظر نہیں آرہی تھی۔

"موسم اچھا ہورہا ہے۔" انہوں نے حیرت سے یہ جملہ دہرایا۔

سارا دن سورج آگ اگلتا رہا تھا۔ ابھی بھی ہوا بالکل بند تھی۔ حبس تھا کہ جان لے کر ہی ٹلنے والا لگتا تھا۔ ایسے میں یہ جملہ۔ انہیں بیگم کی دماغی حالت پر کچھ شبہ محسوس ہوا، اوپر سے آج ان کا انداز بھی کچھ عجیب سا تھا۔

"کب تک نکلو گی؟" بے ساختہ ہی سوال زبان سے پھسل گیا۔

"کیا کہا آپ نے؟" عارفہ کے چہرے کے تاثرات انتہائی تیزی سے تبدیل ہوئے۔ مسکراہٹ کی جگہ غیظ و غضب نے لے لی۔

"مجھے نکلنے کا کہہ رہے ہیں۔" وہ سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ کھڑی ہوگئیں۔

"ارے میرا مطلب تھا، کب تک جاؤ گی؟" انہوں نے گڑبڑا کر سوال کو ذرا بہتر انداز سے پوچھنے کی کوشش کی۔ یہ کوشش انہیں خاصی مہنگی پڑ گئی۔

"ہاں، میرا ہی دماغ خراب تھا۔ جو درس والی آپا کی باتوں میں آگئی۔ میاں کے آنے پر سارے کام چھوڑ چھاڑ تیار ہوکر بیٹھ گئی۔" (اوہ تو یہ کہیں نہیں جارہیں۔ دھڑ، دھڑ، دھڑ، کوئی عمارت سی سر پر آ کر گری۔)

"اس سڑے بسے آدمی سے ہنس ہنس کر لگاوٹ کی باتیں شروع کردیں۔" (لگاوٹ کی باتیں؟ ان باتوں میں لگاوٹ کہاں تھی؟ سوچا پر ڈھونڈے سے بھی نہ ملی۔) میاں کو وقت دینا چاہا اپنے دسیوں کام چھوڑ کر۔ (میاں کا اتنا قیمتی وقت برباد کرکے۔) ارے ان کو (یقیناً درس والی آپا کو) کیا معلوم۔ یہ نہیں ہیں ان مردوں میں سے جنہیں بیویوں کا وقت درکار ہوتا ہے۔ ان کا سارا وقت تو اس سوتن (ہاتھ سے کاغذ کے پلندوں کی جانب اشارہ کیا۔) کے لیے ہے۔ ارے میں ہی پاگل تھی۔ وہ زور زور سے بولتی کمرے سے باہر جانے کو لپکیں۔

"ارے تو درس والی آپا سے پوچھ کر مجھے بھی بتا

دیتیں کہ جواباً میاں کو کیا کرنا ہوتا ہے۔" وہ تو اس صورت حال پر حیران کم پریشان تھے۔ صدمہ ہی کم نہ ہو رہا تھا۔ یعنی کہ یہ واقعی کہیں نہیں جارہیں، اف!!

اس بار بھی آرٹیکل عین وقت پر بہ مشکل مکمل کر کے حوالے کیا۔ پر اب وہ خاصے سنجیدہ تھے اس مسئلے کے حل کے لیے۔ اتوار سسرالی میلے کی نذر ہو جاتا تھا، اس دن کا وہ بھرپور فائدہ اٹھا سکتے تھے جو کبھی یہ سسرالی موقع عنایت کر دیتے۔ آج تک ایسا مبارک چھٹی کا دن انہیں میسر نہ آسکا تھا۔ اب وقت آگیا تھا، بیگم سے دوٹوک بات کرنے کا کہ کبھی تم بھی اپنے بہن، بھائیوں کے ہاں چلی جایا کرو، ہر وقت وہی سر پر مسلط رہتے ہیں۔ عید، بقرعید کے علاوہ شاید ہی کوئی موقع ہوتا ہو جب وہ اپنے گھر بلانے کو تیار ہوں۔

"عارفہ! اس ویک اینڈ پر بچوں کو لے کر سکندر بھائی کی طرف چلیں گے۔"

"زہے نصیب، آج سورج کہاں سے نکلا ہے، جو آپ کو میرے بھائی کے گھر جانے کا خیال آگیا۔"

"خیال تو اکثر ہی آجاتا ہے، پر وہ لوگ کبھی موقع بھی تو دیں۔" حسان جل کر بولے۔ بات چونکہ سچی تھی لہٰذا عارفہ دفاع میں کچھ کہہ نہ پائیں۔

"اس ویک اینڈ پر نہیں جاسکتے۔ سلمیٰ آپا (بڑی بہن) اور نمرہ (چھوٹی بہن) آرہی ہیں۔"

حسان کو غصہ آیا۔ "ان کو فون کر کے بتادو کہ ہم سکندر بھائی کی طرف جارہے ہیں۔ وہ بھی ادھر ہی آجائیں، وہیں ملاقات ہو جائے گی۔"

"ایسے برا لگتا ہے منع کرنا، میں نہیں کر رہی کوئی فون وون۔" (بہن، بھائیوں کو منع کرنا برا لگتا ہے، میاں کو چاہے منع کر دیں، وہ برا نہیں لگ رہا۔) حسان سخت بھنّائے ان کے کورے جواب پر۔ اچھا خاصا منصوبہ بنایا تھا بچوں اور بیگم کو ان کی طرف چھوڑ کر خود تھوڑی دیر بیٹھ کر کھسک آئیں گے، آرام سے آرٹیکل مکمل کریں گے۔ پر عارفہ کے جواب نے سارا پلان چوپٹ کر دیا۔ حسان کا موڈ سخت آف ہوا۔

"میری بہن تو نہیں آتی ہر ہفتے منہ اٹھا کر۔" حسان بڑبڑائے۔ "ایک تمہارے ہی بہن بھائی ہیں زمانے بھر کے فارغ لوگ۔" سیدھا سیدھا طبل جنگ بجادیا۔

"یہ میرے بہن، بھائی کیوں کھٹکنے لگے اچانک۔ آپ کی بہن اپنی مصروفیت کی وجہ سے نہیں آتی، آنا چاہے تو بھلے ہر ہفتے آئے۔ مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے بھلا۔ اب اگر کوئی گھر آیا ہو تو اس کو منع تو نہیں کیا جاسکتا نا۔" عارفہ بولتی ہوئی باہر نکل گئیں۔

"اب کوئی گھر آرہا ہو تو اس کو منع تو نہیں کیا جاسکتا نا۔" حسان نے منہ ٹیڑھا کر کے نقل اتاری۔ (کرتا ہوں کچھ نہ کچھ بندوبست۔ انہوں نے سر جھٹکا۔) کاغذ، قلم سنبھالا، لکھنا شروع کیا۔ اس بار ہر صورت آرٹیکل وقت سے پہلے مکمل کر کے دینا ہے، مصمم ارادہ کرلیا۔ ابھی بمشکل دس منٹ گزرے ہوں گے۔ عارفہ نے دروازے سے جھانکا۔

"سنیں! لکھ رہے ہیں؟"

"نہیں تیراکی کر رہا ہوں۔" (کبھی جو سیدھا جواب دے دیں۔)

"اچھا، وہ ٹماٹر ختم ہو گئے ہیں۔"

"مبارک ہو۔"

"اللہ! آپ بھی نا۔ ذرا جلدی سے ٹماٹر لا دیں، مجھے ہانڈی بنانی ہے۔" (الٰہی، کبھی تو یہ عورت سکون سے کام کرنے دے۔)

"کوئی ایسی چیز پکالو جو بغیر ٹماٹر بن جائے۔"

"آلو کی بھجیا بنالوں۔"

"بنالو۔" بغیر نظر اٹھائے بولے۔

"تو پھر آلو لادیں۔ گھر میں نہیں ہیں۔"

"اووف۔" حسان کا دل چاہا، زور سے اپنا سر کسی دیوار میں دے ماریں۔ قلم، کاغذ پر پٹخا، "ہٹو، ٹماٹر ہی لادیتا ہوں۔" ٹماٹر لا کر دیے۔ دوبارہ لکھنے بیٹھے۔ پندرہ منٹ گزرے ہوں گے، پیاس محسوس ہوئی۔

"سرمد، ارمغان! ذرا پانی دینا ایک گلاس۔" دو چار آوازیں دیں۔ جواب ندارد۔ مجبوراً خود اٹھے۔ ٹی وی

لاؤنج میں آئے۔ بیگم جاء نماز بچھائے نماز پڑھ رہی تھیں۔ ان کی موجودگی کا احساس ہوتے ہی اونچی اونچی آواز میں نماز پڑھنا شروع کر دیا۔ حسان نے پانی نکال کر پیا، ان کی اونچی آواز کی وجہ جاننے کو ادھر ادھر دیکھا۔ باہر گیٹ کھلا ہوا تھا۔

"اوہ، اچھا۔" جا کر گیٹ بند کیا۔ واپس آکر اطلاع فراہم کی۔ "بند کر دیا ہے گیٹ۔" پر آواز بدستور اونچی ہوتی جارہی تھی۔

"کیا ہے بھئی۔" (پیاسا ہی بیٹھا رہتا تو اچھا تھا۔) پانی کا نل دیکھا بند تھا۔ بھاگ کر کچن میں گئے، چولہا بھی بند تھا۔ عارفہ کی آواز تھی کہ بجائے کم ہونے کے بلند ہوتی جارہی تھی۔ سخت جھنجلائے۔ موٹر کا سوئچ دیکھا، وہ بھی بند تھا۔

"اف او..... بالکل سمجھ میں نہیں آرہا۔ ایسا کرو سلام پھیرلو، دوبارہ نیت باندھ لینا۔" اب کے عارفہ نے انتہائی غصے بھری ڈانٹ کے سے لہجے میں نماز مکمل کرنی شروع کی۔ آواز بدستور اونچی رکھی۔

"اف اللہ! کیا کروں۔ بچے بھی نظر نہیں آرہے، ورنہ وہی کچھ مدد کروا دیتے۔" عارفہ اب التحیات پڑھ رہی تھیں۔ زور، زور سے ہل ہل کر آواز کبھی تیز اور کبھی بہت تیز ہوتی جارہی تھی۔ (خدایا، اس عورت کو ہر چیز نماز کے دوران ہی کیوں یاد آتی ہے۔) اتنی دیر میں عارفہ نے سلام پھیر لیا۔ ساتھ ہی شروع ہوگئیں۔ "ایک تو آپ کو کبھی سمجھ میں نہیں آتا۔"

"کیا سمجھ میں نہیں آتا؟ ہر چیز اپنی جگہ درست ہے۔ سب دیکھ لیا ہے میں نے۔"

"ارے بھئی، بچے باہر نکل گئے۔" انہوں نے افسوس سے میاں کو دیکھا۔

"تو پھر کیا ہو گیا؟ وہ تو باہر ہی رہتے ہیں زیادہ تر۔" حسان نے سمجھ میں نہ آنے والے انداز میں ہا۔

"ہاں..... لیکن اس وقت میں نے پڑھنے بٹھایا ہوا تھا۔ ادھر میں نے نیت باندھی، ادھر کتابیں بند کر یہ جا وہ جا۔ اوپر سے آپ کو کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔"

"ارے تو مجھے کیا پتا تھا کہ تم نے بچوں کو پڑھنے بٹھایا ہوا ہے۔"

"تو میں اتنی اونچی آواز میں نماز پڑھ تو رہی تھی۔ آپ کو پتا چل جانا چاہیے تھا۔" وہ اپنی بات کہہ کر دعا میں مشغول ہو گئیں۔ حسان من ہی من کرتے رہ گئے۔ (الٹی کھوپڑی ہے اس عورت کی۔)

☆☆☆

"مس ماریہ! آپ کا سوٹ بہت خوب صورت ہے۔ یہ رنگ بہت جچ رہا ہے آپ پر۔" فائقہ نے ماریہ کے نئے سوٹ کی تعریف کی۔ دردانہ نے کن انکھیوں سے ماریہ کو دیکھا، دل ہی دل میں تلملائی۔ دانت پیسے اور ساری توجہ کاپیوں کی جانب مبذول کر دی، جیسے اس سے ضروری کام اس دنیا میں اس وقت کوئی ہے ہی نہیں۔

ماریہ نے مسکرا کر تعریف وصول کی۔ ایک طائرانہ نظر اسٹاف روم میں موجود نفوس پر ڈالی۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ کون کون ان کی طرف متوجہ ہے۔ تھوڑی مایوسی ہوئی، کوئی بھی ان کی طرف متوجہ نہیں تھا سوائے فائقہ کے۔ بدمزگی کو چہرے پر ظاہر ہونے سے روکا اور گویا ہوئیں۔

"اصل میں نا، کمرشل پر سیل لگی ہوئی تھی۔ محسن نے شاپنگ کی آفر کر دی۔ میں نے بھی موقع سے فائدہ اٹھایا اور چار، پانچ سوٹ خرید لیے۔" آواز دانستہ اونچی رکھی۔

ان کی بات کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ اسٹاف روم میں موجود سب ہی نفوس (سوائے دردانہ کے) ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ سیل کے نام پر سب کے کان کھڑے ہوئے۔

آصفہ بولیں۔ "سیل سے لیے ہیں۔ کب لگی سیل؟ کب تک رہے گی؟"

"کس طرح ملے؟" نورین نے حصہ ڈالا۔ ایک واحد دردانہ تھیں جن کی سوئی ایک ہی جملے پر اٹکی ہوئی تھی۔

"محسن نے شاپنگ کی آفر کی۔" یہ جملہ دماغ

پر ہتھوڑے کی طرح برس رہا تھا۔ ایسے ہی آدمی ہوتے ہیں جو ان بد دماغ عورتوں کا دماغ مزید خراب کرتے ہیں۔ دردانہ نے کلس کر سوچا، بظاہر بے نیازی کا پیاں چیک کرتی رہیں۔

ماریہ نے ایک ادائے بے نیازی سے کہنا شروع کیا۔ ''پانچ، پانچ ہزار والے سوٹ تھے۔ سیزن جارہا تھا تو تین، تین ہزار میں سیل میں لگا دیے۔ پچھلے سال خریدے تھے۔''

''اونہہ، پچھلے سال۔'' سب کی دلچسپی ایک دم ہی ختم ہوئی۔ ماریہ نے دزدیدہ نگاہوں سے دردانہ کا چہرہ دیکھا۔ دل میں ٹھنڈک سی اُتر ی۔ دردانہ کے تاثرات دیکھ کر گویا مقصد پورا ہوا۔ اب ماریہ، فائقہ کی طرف متوجہ ہوچکی تھی۔ کپڑوں کے ڈیزائن اور کوالٹی پر تبصرہ ہو رہا تھا۔

سنیعہ نے اسٹاف روم کے دروازے سے اندر جھانکا۔ ''سکس اے (ششم الف) میں کس کی کلاس ہے؟ آدھے سے زیادہ پیریڈ گزر چکا ہے۔ بچوں نے آسمان سر پر اٹھایا ہوا ہے۔'' وہ سکس اے کے سامنے والے روم میں کلاس لے رہی تھی۔ شور کی وجہ سے اس کی اپنی کلاس بہت ڈسٹرب ہو رہی تھی۔ دو، چار افراد نے کندھے اچکا کر لاعلمی کا اظہار کیا۔ ''نیچے آفس سے معلوم کروائیں۔''

''آفس سے معلوم کروانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں آرہی ہوں، بس ایک رکوع رہ گیا ہے۔'' اسٹاف روم کے کونے سے آواز آئی۔ یہ مس تمنا تھیں۔ دنیا سے بے نیاز، ایک طرف کو بیٹھی سپارہ پڑھ رہی تھیں۔ ابھی بھی جو بات آفس تک پہنچنے کا خطرہ نہ ہوتا تو خاموشی سے سپارہ پڑھے جاتیں۔

''آپ کمال کرتی ہیں میم! آدھے سے زیادہ وقت گزر چکا ہے کلاس کا۔ بچے کلاس میں شور کر رہے ہیں اور آپ یہاں بیٹھی سپارہ پڑھ رہی ہیں۔'' سنیعہ کو سخت تاؤ چڑھا۔

مس تمنا نے انگلی درمیان میں رکھ کر سپارہ بند کیا اور خفگی سے سنیعہ کو گھورتے ہوئے بولیں۔ ''بی بی! آپ کی بھی کلاس کا حرج ہو رہا ہے، جا کر اس کی خبر لیں۔'' ناک پر سے گویا مکھی اڑائی۔ دوبارہ سپارے کی طرف متوجہ ہوگئیں۔ سنیعہ الٹے قدموں واپس ہوئی۔ (یہ عورت نہیں سدھرے گی۔)

آج سنیعہ کی کلاس کی اسمبلی کی باری تھی۔ وہ بچوں کو لے کر پہنچی تو (پریزنٹیشن) کے کوئی آثار نظر نہ آئے۔ نہ مائیک موجود تھا، نہ ہی ڈرم۔ ''اوہو، کیا مصیبت ہے بھئی۔'' وہ سخت جھنجلائی۔ ایک بچی کو اسٹاف روم کی سمت دوڑایا، پتا کروانے کے لیے کہ آج کس کی ڈیوٹی ہے۔ دو منٹ بعد بچی بھاگتی ہوئی واپس آئی۔

''میم! مس تمنا کی ڈیوٹی ہے۔'' اس نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان بتایا۔

''تو وہ آ کیوں نہیں رہیں؟''

''میم، وہ نماز پڑھ رہی ہیں۔ مس دردانہ کہہ رہی تھیں آپ خود انتظام کرلیں۔''

''صبح ہی صبح موڈ غارت کردیا۔''

یہ ایک دن کی بات نہیں تھی۔ مس تمنا اپنی ہر ڈیوٹی کے وقت یا تو نوافل کی ادائیگی میں مشغول پائی جاتیں یا قرآن میں۔ اور اگر یہ دونوں کام نہ بھی کر رہی ہوتیں تو ڈیوٹی دینا ہمیشہ بھول جایا کرتیں۔ کوئی یاد کرواتا تو ناراض ہوجاتیں۔

''ارے بھئی کبھی تو تم لوگ بھی بھول جایا کرو میری ڈیوٹی۔'' ساتھ ہی ساتھ بڑبڑائے بھی جاتیں۔ ''ایک تو دنیا کو بھی اپنے کام سے زیادہ دوسروں کی فکر رہتی ہے۔'' ان کی حرکتوں پر سب سے زیادہ سنیعہ کڑھتی تھی۔

''میں تمہیں بتا رہی ہوں فائقہ، اب کسی دن کوئی بڑی جھڑپ ہونے والی ہے میری اور مس تمنا کی۔'' سنیعہ لنچ بریک میں فائقہ سے کہہ رہی تھی۔

''تو تمہارے خیال میں اب تک جو جھڑپیں ہوچکی ہیں وہ چھوٹی موٹی تھیں۔''

''جی، یہ ہی خیال ہے میرا اور مستقبل قریب میں ہونے والی جھڑپ کے بعد تمہارا بلکہ باقی سب کا

بھی یہ ہی خیال ہوگا۔"

"مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ امید ہے مستقبل قریب کی اس جنگ کے بعد یہ اسکول اور ہم لوگ تمہارے لیے ماضی بعید ہوجائیں گے اور تمہیں بوریا بستر گول کرکے رخت سفر باندھنا پڑ جائے گا۔"

سعیدہ نے خفگی سے اسے دیکھا۔ "تم مجھے ڈرا رہی ہو؟"

"حقیقت بتا رہی ہوں۔ تمہیں پرائے پھڈوں میں ٹانگ اڑانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ وہ جو کر رہی ہیں انہیں کرنے دو، تم اپنا کام کرو۔"

"پرایا پھڈا نہیں ہے یہ فائقہ۔ وہ ہمارے بچوں کے مستقبل سے کھیل رہی ہیں اور وہ بھی مذہب کی آڑ لے کر۔ انہیں یہ احساس تو دلانا چاہیے تاکہ وہ غلط کر رہی ہیں۔"

"تمہارے خیال میں وہ مان جائیں گی۔" فائقہ نے جواباً سوال کیا۔

"نہ مانیں، ہم اپنے حصے کا کام تو کریں نا۔"

"ٹھیک ہے، پھر کرو تم یہ جہاد۔" فائقہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

آج ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے آخر سعیدہ نے دو، دو ہاتھ کرنے کی ہمت کر ہی لی۔ وقت بھی وہ چنا جب زیادہ تر ٹیچرز اسٹاف روم میں موجود تھیں۔

"ایکسکیوزمی، مس تمنا!" سعیدہ نے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالا۔ مس تمنا ابھی سپارہ مکمل کرکے فارغ ہوئی تھیں۔

"جی!" وہ متوجہ ہوئیں۔

"کل آپ غیر حاضر تھیں تو میں آپ کی جگہ دو کلاسز میں گئی تھی۔"

"کوئی احسان نہیں کیا میری ذات پر جب کوئی غیر حاضر ہوتا ہے تو حاضر لوگوں کو ہی جانا ہوتا ہے اس کی جگہ۔ (مس تمنا کو لگا شاید سعیدہ احسان جتانا چاہ رہی ہے۔) سعیدہ نے بات جاری رکھی۔ "بچے بتا رہے تھے آپ انہیں تشریح، نثر، گرامر، متضاد، مترادف کچھ بھی نہیں کرواتیں۔ کلاس میں ایک بچے سے ریڈنگ (پڑھائی) کرواتی ہیں اور باقی کام گھر سے کرنے کے لیے دے دیتی ہیں۔ بچوں کو نثر اور تشریح کا فرق نہیں معلوم، انہیں یہ تک نہیں پتا متضاد، الٹ الفاظ کو کہتے ہیں یا ہم معنی الفاظ کو۔" اب تمام لوگ ان کی طرف متوجہ ہونا شروع ہوئے۔ مس تمنا سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ سن رہی تھیں۔ آخر درمیان میں ہی ٹوک دیا۔

"سعیدہ بچے! آپ اپنے کام سے کام......"

بات ابھی ان کے منہ میں ہی تھی، سعیدہ کی آواز مزید بلند ہوئی۔

"آپ بچوں سے کہتی ہیں کہ اس دنیا کی تعلیم کا کوئی فائدہ نہیں، ہمیں نماز اور قرآن پر ہی مکمل تکیہ کرنا چاہیے، باقی سب بالکل بے کار ہے۔" سعیدہ سانس لینے کو رکی۔

"ہاں تو ٹھیک ہی کہتی ہوں نا۔ آگے جا کر یہ سب تو کام نہیں آئے گا۔ جو نماز، روزہ کیا ہوگا، وہی کام آئے گا۔" اپنے اس موقف سے تو وہ ایک انچ ہٹنے کو تیار نہیں تھیں۔

"مس تمنا! آپ کے دو بیٹے ہیں نا؟ اور دونوں ہی ڈاکٹر ہیں، بلکہ ایک تو ہارٹ سرجن ہے، ہے نا؟" مس تمنا نے گردن اکڑا کر ذرا فخر سے سامعین کو دیکھا۔ یہ بیٹے تو ان کا فخر تھے۔

"الحمدللہ۔ دونوں ڈاکٹر ہیں۔ دکھی انسانیت کی خدمت کرتے ہیں۔" انہوں نے متانت سے کہا۔

"جی، ایک سعودی عرب میں دکھی انسانیت کی خدمت کرتا ہے، دوسرا امریکہ میں، مجھے معلوم ہے۔ میں صرف یہ عرض کر رہی ہوں، آپ کے وہ خیالات جن کا پرچار آپ کلاس میں جا کر بچوں کے سامنے کرتی ہیں، اس کے حساب سے تو آپ کے دونوں بیٹوں کو کسی مسجد کا پیش امام ہونا چاہیے تھا۔ کیونکہ بقول آپ کے دنیا کی تعلیم کا تو کوئی فائدہ ہی نہیں ہے۔ آخر میں تو نماز، روزہ ہی کام آتا ہے، تو اپنے بیٹوں کو آپ نے اس قدر مشکل اور مہنگی دنیاوی تعلیم

کیوں دلائی۔" اسٹاف روم میں آہستہ آہستہ چہ مگوئیاں ہونا شروع ہوئیں۔

"مس تمنا!" سعیدہ نے بات جاری رکھی۔ "یہ دنیا فانی ہے۔ اس کی چیزوں میں دل لگانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ آپ نے خواہ مخواہ ہی پچاس، ساٹھ ہزار والا موبائل لے رکھا ہے۔ ایسا کیجیے یہ مجھ جیسے کسی دنیادار کو دے دیجیے۔" دبی، دبی ہنسی کی آوازیں سنائی دیں۔

"اور دنیاوی تعلیم کا چونکہ کوئی فائدہ نہیں ہے تو میرا خیال ہے وہ تمام آسائشیں جو کہ آپ کے پاس دنیاوی تعلیم کی بدولت ہیں۔ مثلاً فریج، استری، ٹی وی، واشنگ مشین، گاڑی وغیرہ وہ بھی آپ صدقہ کر دیجیے۔ آپ سے زیادہ کس کو معلوم ہوگا صدقے کا اجر۔" مس تمنا غصے سے لال پیلی ہو رہی تھیں۔

"اور میرا خیال ہے یہ جو ساٹھ ہزار ہر ماہ آپ یہاں سے وصول کر رہی ہیں، اس کا بھی کوئی فائدہ نہیں، یہ جگہ کسی دنیادار ضرورت مند کے لیے خالی کر دیجیے۔ آپ کسی مدرسے سے منسلک ہو جائیے۔" مس تمنا کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا، وہ پاؤں پٹختی منہ سے جھاگ اڑاتی وہاں سے نکلیں، رخ پرنسپل آفس کی طرف تھا۔

مس سعیدہ، یہ آپ نے کیا کر دیا۔ اب وہ پرنسپل سے شکایت کریں گی آپ کی۔" ماریہ بولی۔

"یہ ہی تو چاہتی ہوں میں، وہ خود سے پرنسپل تک جائیں، بات کھلے اور دور تک جائے۔" سعیدہ نے ہاتھ جھاڑے۔ وہ اگلے معرکے کے لیے تیار تھی۔

☆☆☆

سعیدہ بچوں کو سلا کر کچن میں جا رہی تھی کہ موبائل بجنے لگا۔ بھائی کی کال آ رہی تھی، دل خوش ہو گیا۔

"جی بھائی جان! السلام علیکم، کیسے ہیں آپ۔" وہ بات کرتے کرتے کچن میں آ گئی۔

"مجھ سے کام ہے؟" دوسری طرف کی بات سن کر اس نے کہا۔ "حکم کیجیے بھائی جان۔"

"اتنا مشکل ٹاسک، یہ نہیں ہوگا مجھ سے۔" دوسری طرف کسی بات کے لیے اصرار کیا جا رہا تھا۔

"ایسا نہ کریں نا بھائی۔" وہ روہانسی ہوئی۔

"بھائی جان! مجھے لگ رہا ہے آپ نے آرٹیکل چھوڑ کر فلمیں لکھنا شروع کر دی ہیں۔ تب ہی ایسی ڈرامائی باتیں کر رہے ہیں۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔" اس نے بے دلی سے رضامندی ظاہر کی۔

"اف بھائی، آپ بھی نا؟" اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر موبائل کو دیکھا۔

☆☆☆

حسان اور بچے ابھی جمعہ پڑھ کر آئے تھے۔ عارفہ کچن میں کھانا نکالنے کی تیاری کر رہی تھیں۔ جب اطلاعی گھنٹی بجی۔ ارمغان دروازہ کھولنے گیا اور وہیں سے خوشی سے بھرپور نعرہ بلند کیا۔

سعیدہ پھوپھو......

"سعیدہ پھپھو!" عارفہ نے حیرت سے دہرایا۔ اس وقت بغیر اطلاع کے خاصی حیرانی کی بات تھی۔ چھوٹی کو سعیدہ نے گود میں اٹھایا ہوا تھا، بڑے کو ارمغان لے کر آ رہا تھا۔ دونوں نند بھاوج بڑے جوش و خروش سے ایک دوسرے سے ملیں۔

"السلام علیکم بھائی جان!" سعیدہ نے سر آگے کیا۔ حسان نے سر پر ہاتھ پھیر کر دعا دی۔

"اکیلی آئی ہو؟"

"نہیں، عدیل چھوڑ کر گئے ہیں۔ انہیں واپس آفس پہنچنا تھا، اس لیے رکے نہیں۔" بھائی، بھابھی، بچوں سے ملنے ملانے کے بعد اسے کچھ خیال آیا۔ "سرمد بیٹا! گیٹ کے ساتھ میرا بیگ رکھا ہوا ہے۔ وہ لے آؤ۔"

سرمد جا کر ایک ہینڈ کیری اٹھا کر اندر لے آیا۔

(ہائے اللہ، کہیں میاں سے لڑ کر تو نہیں آ گئی۔ عارفہ کو نئی پریشانی نے آ گھیرا۔)

"پھپھو، رہنے کے لیے آئی ہیں۔" وہ سوال جس کو کرتے ہوئے عارفہ جھجک رہی تھیں۔ سرمد نے کر ڈالا۔

''ہاں، پرسوں واپس جاؤں گی۔'' اس کی بات پر دونوں بچے خوشی سے نہال ہوگئے۔ یہ پھپھو انہیں کم کم ہی دستیاب ہوتی تھیں اور رہنے کے لیے تو شاید ہی کبھی آئی ہوں۔

''اچھا کیا نا کہ تم نے بھی وقت نکالا، ورنہ تو ہم تمہاری صورت ہی دیکھنے کو ترس جاتے ہیں۔'' عارفہ خوش دلی سے بولیں۔

''یہ ہی تو بھابھی، یہ ہی تو سوچا میں نے۔ اس مصروفیت نے تو اپنوں سے دور ہی کر دیا ہے۔ کتنے کتنے عرصے تک ایک دوسرے سے مل ہی نہیں پاتے۔ اسی لیے میں نے سوچ لیا ہے، اب لاکھ مصروفیت ہو، ہر ویک اینڈ بھائی جان کے ہاں گزارنا ہے۔ آخر ایک ہی تو بھائی ہے میرا۔'' (اسکرپٹ کو حسان کا ہی تیار کردہ تھا، پر وہ دل ہی دل میں سدیعہ کی ایکٹنگ کی داد دیے بنا نہ رہ سکے۔)

عارفہ کے چہرے کی بتی ایک دم فیوز ہوئی۔

(ہر ویک اینڈ رہنے کے لیے یعنی جمعہ سے اتوار...... یا اللہ) بظاہر مسکرا کر بولیں۔ ''تم پہلے سے بتا کر آتیں تو میں کھانے پر کچھ اہتمام کر لیتی۔''

''ارے نہیں بھابھی، گھر کی بات ہے۔ اہتمام کی کیا ضرورت ہے اور پھر اب تو میں ہر ویک اینڈ پر آیا کروں گی۔ جب آپ کا دل چاہے اہتمام کر لیجیے گا۔'' سدیعہ نے ان کے رہے سہے اوسان بھی خطا کیے۔

(یعنی کہ واقعی ہر ویک اینڈ پر آئے گی۔) ''میں ذرا کھانا دیکھ لوں۔'' وہ چہرے کے تاثرات چھپاتی اٹھیں۔ سرمد اور ارمغان سدیعہ کے بچوں کو لے کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ اب ڈرائنگ روم میں صرف سدیعہ اور حسان تھے۔

''کیا ضرورت تھی اس ڈرامے کی؟'' خفگی سے بھائی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''اصل میں، میں چیک کرنا چاہ رہا تھا کہ تمہاری حق گوئی و بے باک فطرت کے باعث اگر کبھی تمہیں اسکول سے جواب مل جائے تو کون سا پروفیشن تمہارے لیے بہتر رہے گا۔ میرے خیال میں ایکٹنگ میں چل جاؤ گی۔'' حسان کی بذلہ سنجی عروج پر تھی۔

''اچھا طریقہ نکالا ہے بیگم سے بدلہ لینے کا۔'' (بہن، بھائیوں سے زیادہ کون سمجھ سکتا ہے ایک دوسرے کو۔)

دونوں ہنسنے لگے۔ ''بھائی جان، میں بتا رہی ہوں، سارا ٹائم ٹیبل اپ سیٹ ہوگیا ہے آپ کے اس ڈرامے کی وجہ سے۔ بہت مشکل سے وقت نکالا ہے میں نے۔''

''اگلے ہفتے نہیں آسکوں گی۔''

''امید ہے ضرورت بھی نہیں پڑے گی۔'' حسان مسکراتے ہوئے بولے۔

☆☆☆

''سدیعہ کو آپ نے کہا ہے نا، ہر ویک اینڈ یہاں گزارنے کے لیے۔'' عارفہ رات کو میاں سے جواب طلبی کر رہی تھیں۔

''خاصی سمجھ دار ہوگئی ہو۔'' (حسان نے تردید کی ضرورت محسوس نہیں کی۔)

''بس، میرے، بہن بھائیوں کی ضد میں۔''

''ضد، ارے نہیں بھئی ضد کیسی۔ بس وہ جیسے فلموں میں یا کہانیوں میں نہیں ہوتا کہ اچانک محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگتا ہے۔ بس بالکل ویسے ہی میری بہن کے لیے میری محبت کا سمندر جوش مارنے لگا اور میں نے فون کر کے اسے اپنی حالت زار کا بتایا تو اس کی سوئی ہوئی محبت بھی انگڑائی لے کر بے دار ہوگئی۔ تمہیں یقیناً برا لگ رہا ہوگا نا، ہم بہن بھائی کا یوں شیر و شکر ہونا۔'' حسان نے مزید تپایا۔

''لو بھلا، مجھے کیوں برا لگے گا۔'' (وہ حسب توقع برا مان گئیں۔) پر اگر آپ مجھے اعتماد میں لے کر اسے بلواتے تو زیادہ اچھا ہو جاتا۔''

''کیوں، تم نے کالا بکرا منگوا کر صدقہ کرنا تھا یا دیگیں پکوا کر بانٹنی تھیں۔'' (بڑے موڈ میں ہیں جناب، عارفہ کو تو پتنگے لگ گئے۔)

''ڈھنگ کی کوئی چیز پکا لیتی، کیا سوچے گی، کیا

خاطر ہوئی ہے بھائی کے گھر۔'' کچھ تپ کر بولیں۔

(اپنے بھائی، بہنوں اور میاں کے بھائی بہنوں میں کچھ تو فرق ہوتا ہی ہے نا آخر۔)

''ابھی، دو دن ادھر ہی ہے وہ، پکا کر کھلاتی رہنا ڈھنگ کی چیزیں۔'' اپنی بات کہہ کر بیگم کے تاثرات ملاحظہ کیے۔

'میرے بہن، بھائیوں کے آنے سے آپ کے لکھنے لکھانے کا حرج ہوتا ہے۔ بہت ڈسٹرب ہو جاتے ہیں آپ۔ اب تو کوئی ڈسٹربنس نہیں ہو گی نا۔'' عارفہ نے تاک کر وار کیا۔

حسان ہنسنے لگا۔ ''صاف کیوں نہیں کہتیں، تمہیں سدیعہ کا آنا کھل رہا ہے۔''

''اس کا آنا نہیں، آپ کا بلانا۔''

''آپ کو معلوم تھا کہ میں نے اس ویک اینڈ پر سلمٰی آپا اور نمرہ کو بلایا ہے، پھر بھی آپ نے سدیعہ کو آنے کے لیے کہہ دیا۔''

''ہوں......'' انہوں نے ہوں کو کھینچ کر کچھ لمبا کیا۔ ''اگر ناگوار نہ گزرے تو کچھ عرض کروں۔''

(ہاں پہلے تو جیسے بڑی خوشگوار باتیں کر رہے ہیں نا) عارفہ خاموش رہیں۔ گویا، خاموشی نیم رضامندی۔

''اگر آپ ذرا سا اپنے دماغ کو زحمت دے لیں نا اور یاد کرنے کی کوشش کریں تو آپ کو یاد آجائے گا کہ آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ میری بہن اپنی مصروفیت کی وجہ سے نہیں آپاتی اور اگر وہ آنا چاہے تو آپ کو کیوں ہوگا اعتراض۔'' کہہ کر لمحے بھر کو توقف کیا۔ ''تو پھر اب اعتراض کس بات کا؟''

''میں نے کب کیا ہے اعتراض۔'' عارفہ ایک دم ہی تنک کر بولیں۔

''تو یہ آپ اتنی دیر سے اور کیا کر رہی ہیں؟''

''آپ ہمیشہ میری' ہر بات کا الٹا مطلب لیتے ہیں۔ جتنی آپ کو اپنی بہن پیاری ہے نا، مجھے اس سے کہیں زیادہ پیاری ہے وہ۔''

''اللہ اکبر۔'' بے ساختہ ہی حسان کے منہ سے نکلا۔

''دیکھیے بیگم، ایسی باتیں یوں اچانک نہیں کہہ دیتے، ابھی جو مجھے دل کا دورہ پڑ جاتا۔ تو؟ میری بہن سے آپ کی محبت واللہ واللہ قربان۔ جس وقت سے وہ آئی ہے نا آپ کے چہرے سے نور بن کر چھلکی پڑ رہی ہے۔''

''آپ مصنف ہیں، میں نہیں ہوں۔ مجھ سے آسان زبان میں بات کیا کریں۔''

''لیجیے، آسان زبان میں بات کر لیتے ہیں۔ جو آپ کہہ رہی ہیں اور جو مجھے محسوس ہو رہا ہے ان دونوں میں اچھا خاصا تضاد ہے۔''

''کیا مطلب......؟'' ابرو چڑھا کر پوچھا۔

''بھئی مطلب صاف، بقول آپ کے، آپ کو میری بہن، مجھ سے بھی کہیں زیادہ پیاری ہے۔ اس حساب سے تو، اس کی آمد پر آپ کو خوشی سے بے حال ہو جانا چاہیے تھا۔ جب کہ آپ کی تو تفتیش ہی ختم نہیں ہو رہی اس وقت سے۔ اب اس بات کا کیا سوال رہ جاتا ہے کہ میں نے بلایا یا خود آ گئی۔ آ گئی تو آ گئی کیجیے خاطر داری۔''

''کر تو رہی ہوں، خاطر داری، آپ کو تو کچھ کا کچھ ہی نظر آتا ہے۔''

''اچھا، چلو جانے دو' ان سب باتوں کو۔ ایسا کرو اچھی سی چائے بنا کر لاؤ۔''

عارفہ چائے بنانے کچن میں آ گئیں۔ بچوں کے کمرے میں خوب رونق لگی ہوئی تھی۔ سدیعہ اور بچوں کے ہنسنے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کیسی رونق ہوگئی ہے اس کے آنے سے۔ بہن تو بہن ہی ہوتی ہے نا' کیا فرق پڑتا ہے میری ہو یا حسان کی۔

دل میں آنے والے الٹے سیدھے خیالات (جن کی یلغار اس وقت سے ہو رہی تھی جب سے وہ آئی تھی) کو جھٹکا۔ اپنی سوچوں پر خود کو سرزنش کی اور بچوں کے کمرے میں جھانکا۔

سدیعہ اور بچے لڈو کھیل رہے تھے' ساتھ ساتھ خوب شور بھی مچا رہے تھے۔

''ارے بھئی سنیعہ' تمہارے بچے کہاں ہیں؟'' سنیعہ نے ہاتھ سے اشارہ کیا، سرمد کے بیڈ پر دونوں سو رہے تھے۔

''اس قدر شور میں کیسے سو رہے ہیں یہ......؟'' وہ حیران ہوتی ہوئی اندر آ گئیں۔

''اصل میں بھابھی آج دن میں نہیں سوئے نا تو اسی لیے رات میں جلدی سو گئے ہیں اور تھکاوٹ اتنی تھی کہ شور بھی ان کی نیند پر اثر انداز نہیں ہو رہا۔''

''ماما! مجھے لگ رہا ہے پھپھو اپنے بچوں کو سلانے کے لیے نا عدیل انکل کے ساتھ مل کر ٹھیک ٹھاک شور شرابا کرتی ہوں گی، جیسے پہلے زمانے میں مائیں لوری دیتی تھیں اور بچے سوتے تھے نا اسی طرح ان کے بچے اس رولے گولے میں سونے کے عادی ہیں۔'' ارمغان نے تجزیہ کیا۔

''ارمغان ......'' عارفہ نے اسے گھورا ''بری بات' اچھا سنیعہ تم بتاؤ، چائے پیو گی......؟ تمہارے بھائی جان کے لیے بنا رہی ہوں سوچا تم سے بھی پوچھ لوں۔

''ضرور بھابھی ضرور بنائیں۔ مجھے خود بھی سخت طلب محسوس ہو رہی تھی۔''

''ٹھیک ہے۔'' عارفہ واپس کچن میں چلی گئیں۔

ارمغان دوبارہ شروع ہو گیا۔ ''سچ بتائیں نا پھپھو، آپ عدیل انکل سے خوب لڑائی کرتی ہوں گی اور پھر غصہ جا کر اپنے معصوم معصوم اسٹوڈنٹس پر نکالتی ہوں گی۔ ایسا ہی کرتی ہیں۔ ساری ٹیچرز، اپنے اپنے میاؤں (میاں کو اپنے تئیں جمع کر کے بولا) کا غصہ ہم بے چاروں پر نکالتی ہیں۔''

''ارمغان کے بچے'' سنیعہ نے پاس پڑا کشن کھینچ کر مارا۔ جسے ارمغان نے بڑی مہارت سے کیچ کیا۔

''میرے پاس کوئی وقت نہیں ہوتا تمہارے انکل سے لڑنے کا اور یہ اپنی غلط فہمی بھی دور کر لو اور جا کر اپنے دوستوں کی غلط فہمی بھی دور کر دینا۔ ہم ٹیچرز گھروں کا غصہ نہیں نکالتیں تم معصوموں پر، تمہارا ہی غصہ ہوتا ہے جو تم لوگوں پر نکلتا ہے۔ کم تنگ کرتے ہو تم لوگ ٹیچرز کو۔''

''ویسے پھپھو، آپ ٹیچرز بھی نا ویسے ہی تنگ ہوتی رہتی ہیں۔'' سرمد نے مداخلت کی۔

''کیا ہے اگر بچے کلاس میں بکرے کی یا بلے کی آواز نکال لیں، اس قدر بے ضرر سی شرارتوں کی اجازت تو ہونی چاہیے نا۔ فوراً لے کر دوڑ پڑتی ہیں بچوں کو پرنسپل آفس۔ اور ہمیشہ غلط بچہ لے جاتی ہیں۔ آواز کوئی اور نکالتا ہے۔ پکڑا وہ معصوم جاتا ہے جو بے چارہ محض ہنس رہا ہوتا ہے۔'' (سرمد بہت دکھی تھا، معصوم ہمیشہ ہی دوسروں کی شرارتیں انجوائے کرتا ہوا پکڑا جاتا تھا۔)

''اچھا تو یہ بات ہے۔'' سنیعہ نے غور سے دونوں معصوموں کو دیکھا۔

''تو یہ قابلیت میرے بھتیجوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ کلاس میں بیٹھ کر بکرے اور بلے کی آوازیں ......ہوں......'' سنیعہ نے بہ آواز بلند ایک پر سوچ و غور و فکر سے بھرپور ہنکارا ابھرا۔

''پھپھو! مجھے تو صرف مینڈک کی آواز نکالنا آتی ہے۔ بس......'' یہ ارمغان تھا۔

''ہاں پھپھو، ایسی فٹ آواز نکالتا ہے کہ مینڈک بھی سن لے تو سمجھے میرا اپنا یار مجھ سے باتیں کرنے کو بے تاب ہے۔'' سرمد نے بھائی کی خوبی کی تعریف کی۔

''ٹھہر جاؤ تم دونوں، کرتی ہوں تم لوگوں کا بندوبست میں۔ کہتی ہوں بھابھی سے ہر ہفتے جا کر ان دونوں کے ٹیچرز سے ملیں تاکہ پتہ چلے کہ یہ معصوم صاحب زادگان آخر کرتے کیا ہیں اسکول میں۔''

''ارے نہیں پھپھو، یہ غضب نہ کیجیے گا۔'' (بڑی غلطی کی پھپھو کو راز کی باتیں بتا کر۔)

''سنیعہ!'' عارفہ نے آواز دی۔ ''ہمارے کمرے میں ہی آ جاؤ، وہیں پیتے ہیں چائے۔''

''تم دونوں سے تو واپس آ کر نمٹتی ہوں میں۔'' سنیعہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''بھئی سنیعہ، عدیل کو فون کر کے کہہ دینا کہ اتوار کو دن کا کھانا ہمارے ساتھ ہی کھائے۔'' عارفہ نے سنیعہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''کیوں تکلفات میں پڑتی ہیں بھابھی۔ رہنے دیں گھر کی بات ہے۔''

''ارے بھئی میکہ ہے تمہارا، تمہارے میاں کی عزت کرنا ہمارا فرض ہے بلکہ تم رہنے دو، میں خود کہہ دوں گی۔''

چائے پی کر عارفہ اٹھیں۔ ''اچھا آپ دونوں بیٹھیں، میں ذرا کچن سمیٹ کر آتی ہوں۔''

''بھائی جان! آپ کا پلان ناکام ہو گیا۔ بھابھی میرے ساتھ ساتھ میرے میاں کی ناز برداریوں کے لیے بھی تیار ہیں۔''

''میرے پاس پلان بی ہے۔ ایسا کرنا تم......''

''بس بس، بس مجھے لگتا ہے بھائی، یہ جو آپ الٹے سیدھے پلان بنا رہے ہیں نا اس کی وجہ سے بہت جلد پکڑے جائیں گے۔ ایسا کریں اپنا سامان پیک کرنا شروع کر دیں۔''

''کیوں......؟''

''کیوں کہ آپ کے ان سازشی منصوبوں کی وجہ سے کسی دن آپ کو دیس نکالا مل جانا ہے۔ پھر اگر سامان پہلے سے پیک ہو گا تو اٹھانے میں آسانی رہے گی۔ بس اٹھانا اور میرے گھر آ جانا، وہ بھی آپ ہی کا گھر ہے۔'' سنیعہ نے مستقبل کی بھیانک منظر کشی کی۔

''ویسے بھائی جان! آپس کی بات ہے۔ آپ کو آخر مسئلہ کیا ہے بھابھی کے بہن بھائیوں سے؟''

''یار، ہماری اپنی بھی کوئی زندگی ہے، مصروفیات ہیں۔ ایک ہفتے دو نازل ہوتے ہیں۔ اس سے اگلے ہفتے، اگلے دو، اس سے اگلے ہفتے اگلے دو۔ اس کے بعد پھر سے پہلے دو کا نمبر آ جاتا ہے۔'' حسان سخت تنگ تھے۔

''تو آپ بھابھی سے ڈسکس کریں نا یہ مسئلہ۔''

''اس کی سمجھ میں نہیں آتی کوئی بات۔''

''ایک تو ہمارے معاشرے کے نوے فی صد مردوں کا یہی خیال ہے کہ ان کی بیویوں کو ان کی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ جب کہ آپ لوگ بیوی کو اعتماد میں لیتے ہی نہیں ہیں۔'' حسان نے کچھ سوچتے ہوئے سر ہلایا۔

☆☆☆

''تم نے خواہ مخواہ ہی عدیل کو کھانے کا کہہ دیا، نمرہ اور سلمٰی آپا بھی آ رہی ہیں۔ تم پر اضافی کام کا بوجھ پڑ جائے گا۔'' رات، احسان نے بات کرنے کے لیے تمہید باندھی۔

''وہ تو ہے، پر ایسے برا لگتا ہے کہ وہ سنیعہ کو لینے آئے اور بغیر کھائے واپس جائے۔''

''تم بہت مصروف رہتی ہو ہر ویک اینڈ پر، اپنی تفریح پر بھی توجہ دیا کرو۔''

''ہاں دل تو میرا بھی کرتا ہے کہ میں بھی کہیں جاؤں، فراغت کا کچھ وقت' میرا بھی تو حق ہے پر موقع ہی نہیں ملتا۔ اب بات بھی اپنے بھائی بہنوں کی ہے۔ انسان کسی سے کیا شکوہ کرے۔'' عارفہ کچھ کچھ نظر آ ئیں۔

حسان کو لوہا گرم محسوس ہوا تو چوٹ لگانے میں دیر نہیں کی۔ ''دیکھو عارفہ! رواداری، لحاظ مروت، یہ سب بہت اچھی صفات ہیں لیکن کوئی بھی چیز جب حد سے بڑھ جاتی ہے نا تو اس سے بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ یہ کائنات توازن کے اصول پر قائم ہے۔ ہم اپنے بھائی بہنوں کو سمجھا سکتے ہیں کہ ہماری بھی مصروفیات ہیں، ہمیں اپنے لیے بھی وقت چاہیے (بولتے اچھا ہیں، پہلے کبھی سنا ہی نہیں، یقیناً لکھتے بھی اچھا ہوں گے)

''کیا یہ بات آپ اپنی بہن کو سمجھا سکتے ہیں......؟'' عارفہ نے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

''بالکل سمجھا سکتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے پھر۔ نیکسٹ ویک اینڈ ہم سکندر بھائی کی طرف چلیں گے۔'' توازن بہرحال انہیں ہی قائم رکھنا تھا۔ دوسری طرف حسان سوچ رہے تھے۔

''ٹھیک کہتی ہے سنیعہ، بات کرنی چاہیے کہہ دینا اچھا ہوتا ہے۔''

☆



شازیہ الطاف ہاشمی



''رخسانہ آرہی ہے اگلے مہینے کی بارہ کو۔''
ماموں جان نے خط افضل سے لے کر بیوی کو اطلاع دی اور خود کگر کا انتظام کرنے چل دیے۔
خالہ کا خط کبھی ہمارے پتے پر آتا تو کبھی اجمل ماموں کی طرف' بہر حال رہتی وہ ماموں کے ہاں ہی تھیں۔ آنا جانا کہیں بھی ہو' بیک ان کا اور دوسرے معنوں میں بسیرا ان کا ماموں کا گھر میں ہی ہوتا۔
افضل بھائی، کوثر باجی کی منگنیاں رخسانہ خالہ

کے گھر ہوئی تھیں اور صدیقہ آٹھویں میں تھی اور سب سے چھوٹی تھی۔ تعلقات بڑے گرمجوش تھے اور اس میں دوسری برادری کے ساتھ ہم بھی شامل تھے۔ امی اور رخسانہ خالہ کا وٹہ سٹہ ہوا تھا اور خالو میرے تایا بھی تھے۔

''کیا لکھا ہے؟'' ابو کو اب ٹھیک طرح سے لفظ سجھائی نہیں دیتے تھے سو خط پڑھنے اور جواب لکھنے کی ذمہ داری میری ہوئی۔ آٹھویں کلاس میں ہی میرا خط بہت اچھا تھا سب سراہتے تھے تو خط لکھنے کا سہرا میرے سر بندھا تو گویا چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ ندیا اور خاور جو چھٹی اور ساتویں میں تھے ان میں سے مجھے اہمیت مل گئی تھی۔

''چھ تاریخ کو گرمی کی چھٹیاں ہو رہی ہیں۔ بچوں کے کپڑے بنا لیے ہیں اور اگلے دن کی تیاری ہے۔ وغیرہ وغیرہ سب گھر والوں کو سلام۔''
میں نے خط پڑھ کر گویا کوئی دریا پار کر لیا تھا۔
ابو نے عینک ایک طرف رکھ دی تھی۔
''اچھا پیاز وغیرہ لے لیے میراں؟''
امی من بھر پیاز خریدا کرتیں جو ساری گرمی سے ذرا کم عرصے میں چارپائی کے نیچے مٹی کے صاف فرش پر پڑی رہتی' پلاؤ بنانے کے لیے چاول اکٹھے صاف کر کے مٹی کے گھڑوں میں اور آٹا پسوانا سب کام ایک ساتھ ہو جاتے تھے۔ گرمی کی دوپہر میں جب کسی کو بے وقت بھوک لگتی۔
''امی! روٹی ہے کھارے کے نیچے' پر سالن نہیں۔'' کوئی آواز لگاتا۔

''ہاں تو ایک پیاز توڑ لے۔''
اور پھر چارپائی کے پائے سے پیاز توڑ کر روٹی کے اوپر اور تھوڑا سا نمک چھڑک کے بھوک مٹالی جاتی۔

☆☆☆

گرمی کی چھٹیوں میں میرا دل بھی بڑا خوش ہوتا تھا۔ چھٹیوں کا کام کون کرے بھلا؟ ایک ہی بار مار کھالیں گے اور پھر سلیبس سارا سردیوں میں ختم کر لیں گے۔ اتنی گرمی میں پڑھائی میرا تو دل ہی نہیں مانتا تھا۔ سارا سارا دن ٹیوب ویل پر نہانے کے سوا مجھے کہیں چین نہ پڑتا۔ خاور البتہ ماسٹر جی سے ڈرتا تھا۔ وہ پھر پھرا کر آ کے کتابوں پہ جھک ہی جاتا تھا اور کبھی کبھار ندیا بھی گھر میں نہانا نہیں چھوڑتا تھا۔
صبح ہی صبح امی سارا کام کر کے دھریک تلے چارپائیاں ڈال دیتیں۔ اباجی زمینوں پہ اور میں امی کے ساتھ تھوڑا بہت ہاتھ بٹا کے گھر کے اندر ہی وسیع صحن میں لگے ٹیوب ویل پہ' جو مزا ایسے کھلے پانی میں نہانے میں ہے اور اور کہاں' یہ تو مجھے ہی پتا ہے بس۔
''پیاز لے آیا ہوں اور چاول صاف ہو گئے کہ نہیں؟''

ابو نے بوری صحن میں ہی رکھ دی تھی' پچھلے سال ماسی الو سے پیاز خریدی تھی' ان کی پیاز تو اس دفعہ سیدھا منڈی پہنچ گئی تھی اور اب دوسرے گاؤں چک بارہ سے پیاز لائے تھے۔
''سارا ہی ہو گیا ہے ماہا کے ابا!''
''پر تیرا بھرا اللہ جانے اتنے دن یہاں رہے بھی کہ ناں۔ جتنا اجمل اسے کھلا سکتا ہے ناں' اتنا تو شاید ہم سے نہ ہو سکے اور وہ زیادہ ٹکیں گے بھی ادھر ہی۔''

امی اداس ہی تھیں' امی کا بڑا دل کرتا تھا کہ بہن سے کوئی دکھ سکھ کرتیں۔ نانی کے مرنے کے بعد امی کا دل بڑا ٹوٹ گیا تھا۔ سب سے چھوٹی تھیں اور سب سے زیادہ تنہائی بھی ان کے حصے میں آئی تھی۔ نانی سے ان کا بڑا گہرا رشتہ تھا۔
اجمل ماموں کی امی سے کم ہی بنتی تھی۔ وجہ عمر کا فرق اور زمینوں کا بھی فرق تھا ماموں کی زمینیں تھیں اور افضل بھائی کی کھاد کھلی کی دکان الگ' ماموں کے اندر غرور بہت تھا۔ ان کی لمبی سیاہ گردن میں گویا سریا فٹ تھا خود کو کوئی اونچی شے سمجھتے تھے۔ مجھے تو ان سے بڑی چڑ ہو گئی تھی۔ بھئی جو کترائے اسے منہ نہ لگاؤ مگر امی کو کون سمجھائے۔

☆☆☆

کھلے' چاندنی نہاتے صحن میں ہلکی ہلکی ہوا چل رہی

تھی‘ خاور اور ندیا پہلے لڑتے بھاگتے پھر رہے تھے۔ اب سو چکے تھے‘ ہوا تھی ہی اتنی نجلی اور کھلی اور اور اوپر سے بدلتی رت۔

امی اور ابا کے دکھ سکھ جاری تھے میں نے ہلکا والا کھیس ندیا کے اوپر ڈالا اور چھت پر چلی آئی۔ دور تک اندھیرا پھیلا تھا اور اونچی چھت سے تاحد نظر فصلیں ہی فصلیں تھیں۔ جوار‘ باجرہ اور کپاس کے کھیت‘ ہاں کپاس کی تو کل چنائی بھی تھی جو اذان کے فوراً بعد شروع ہوئی اور پھر صفائی اور ونڈائی۔ (تقسیم) ٹھنڈی ہوا کے جھونکے میں پانی کی خوشبو بھی تھی‘ شاید چاچا اللہ داد کے کھیتوں کو پانی لگ رہا تھا آج ان ہی کی باری تھی۔

پچھواڑے والا ٹیوب ویل چل رہا تھا اور سارا دن بھی چلتا رہا تھا۔

”ماہی بی ماہی!“ امی کی آواز تھی‘ میں سیڑھیاں اترتی نیچے آئی۔ ”جی امی!

اب سو جا رات بہت ہو گئی ہے۔“ امی اور ابو بھی لیٹ چکے تھے۔ میں بھی لیٹ گئی تھی۔ تین دن بعد اتنے سارے مہمان حسن‘ احسن اور مبشرہ‘ ایصال آپی اور رخسانہ خالہ‘ میں خوش تھی۔ خوب ہلا گلا رہے گا انہیں پانی میں چھلانگیں مار کے دکھائیں گے اور ہاں نہر پر تو ضرور ہی لے جائیں گے۔ خاور‘ ندیا اور میں مل کے انہیں چھوٹی مچھلیاں بھی پکڑ کے دکھائیں گے۔ چھوٹی سی نہر کے مٹیالے پانے میں مچھلیاں بھی ہوتی تھیں جنہیں بچے پکڑتے تھے اور کبھی کبھار کوئی ذرا بڑی مچھلی بھی۔

میرے دل میں بہت سارے منصوبے تھے اور پھر نیند نے میرے گرد بھی گھیرا تنگ کر دیا تھا۔

صبح ہی صبح کا وقت تھا امی اپلوں کی راکھ اکٹھی کر رہی تھیں اور خاور اپنے کنچے بوتل میں گن کے ڈال رہا تھا۔ نیلے پیلے‘ ہرے سنہری وہ کانچ کی بڑی ساری بوتل بہت سنبھال کے رکھا کرتا تھا اور ندیا اپنی گڑیوں اور ان کے کپڑوں کو چھپا چھپا کے رکھتی تھی۔

”کیا ہو رہا ہے؟“ بڑے سارے کچے کمرے میں پلنگوں کی قطار تھی اور صندوق اوپر اینٹوں پہ دھرے تھے۔

”دو غائب ہیں تم نے چرائے ہوں گے۔“ خاور کی گول موٹی آنکھوں میں شکوہ اور اداسی دونوں تھے‘ ندیا کو تو مار بھی لیتا تھا‘ اس کے پیچھے حسب استطاعت دوڑ کر جایا کرتا تھا اور میں چونکہ خط لکھتی اور پڑھتی تھی اور ویسے بھی بڑی تھی تو خاور بے چارہ کیا کرتا۔

کوئی اور وقت ہوتا تو میں بوتل اس سے لے لیتی مگر اب مجھے ذرا ترس سا آ گیا تھا۔

”ادھر آؤ۔“ میں نے اسے اٹھا لیا تھا۔ ”آؤ مل کے کنچے ڈھونڈتے ہیں‘ یہیں کہیں گر گئے ہوں گے، اور پھر دیکھو پلنگ کے نیچے‘ صندوق کے ساتھ والے پلنگ کے ساتھ ہاں یہ ایک مل گیا اب دوسرا بھی ڈھونڈ لیتے ہیں۔“ نیچے ندیا کی گڑیوں والا شاپر بھی مل گیا تھا۔

”یہ ہے بتو!“ خاور نے مجھے سنہری گوٹے والی قمیص پہنے گڑیا دکھائی۔

”اچھا تو یہ ہے وہ جس کے دوپٹے پر گوٹا لگ رہا تھا۔“ پرسوں میں نے ندیا کو اسی پلنگ پہ سوئی دھاگا اور گوٹے کا ٹکڑا لیے بیٹھے دیکھا تھا۔ وہ سوئی دھاگے سے گڑیوں کے کپڑے سیتی تھی۔

”اٹھا نہ لیں ایک یہ والی۔“ ندیا سہیلیوں کے ساتھ باہر کھیلنے گئی تھی یا پھر چھت پر ہوگی۔ اسی لیے خاور کی اتنی جرأت ہوئی تھی کہ اس نے ندیا کی گڑیوں میں سے ایک کو منتخب کر لیا تھا اب کے اس کی آنکھوں میں شرارت تھی اور بغل میں بوتل۔

”چلو رکھو واپس۔“

میں اپنی جون میں واپس آ چکی تھی اور وہ پلنگ کے نیچے شاپر رکھ رہا تھا۔

☆☆☆

تایا کے یہاں ہی رخسانہ خالہ کی پہلے آمد ہوئی تھی خالہ ان ہی کے گھر زیادہ رہتی تھیں پھر باقی برادری کے یہاں ملنا ملانا ہوتا تھا۔

”امی‘ خالہ آ گئی ہیں۔ بخشو چاچا نے بتایا ہے۔ ابھی گنے لے کے جا رہے تھے گاؤں چک بارہ۔“ بخشو چاچا نے ریڑھی پر بیٹھے بیٹھے ہی مجھے اطلاع دی تھی جب میں ککڑیاں لے کے کھیت سے آ رہی تھی۔

”دیکھ آ گئی ہے تیری ماسی‘ سویرے سویرے اسٹیشن تک سالم تانگا کروایا ہے تیرے تائے اجمل نے۔“

چاچا خوش ہو کے بتا رہا تھا اور میں بھی بڑی خوشی خوشی بھاگی آئی تھی۔ امی کے پاس۔

”چل شام کو چلتے ہیں تیرے ابا کے ساتھ۔“

”ماسی آ گئی۔ ماسی آ گئی۔“ خاور سارے صحن میں گھومتا پھر رہا تھا۔ خوشی انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔

”تمہاری شادی نہیں ہو رہی جس میں شرکت کرنے آ رہی ہیں۔“

”پہلے تو تمہاری ہوگی آپی! سچ آپی‘ کب جاؤ گی یہاں سے۔“ وہ بھاگ کر صحن عبور کر گیا تھا۔

☆☆☆

”باجی ایصال باجی میری باجی ہیں بس باقیوں میں سے کوئی تم لے لو۔“

خاور‘ ایصال باجی کی گود میں تھا اور ندیا‘ احسن بھائی کے ساتھ لگی کھڑی تھی اور میں مبشرہ باجی سے چمٹی کھڑی تھی۔ امی خالہ سے مل رہی تھیں۔

”رخسانہ‘ امی کے بعد تو میں.....“ امی نانی کے انتقال کے دو سال بعد بھی سنبھل نہیں پائی تھیں‘ اب بھی پھوٹ پھوٹ کے رو پڑیں۔

”اب بس بھی کر دے‘ کیا ہر وقت رونا دھونا مچائے رکھتی ہے۔“ یہ اجمل ماموں تھے جنہیں نجانے کس بات پر غصہ آ گیا تھا اچانک ہی۔

”اسے تو اللہ جانے کیا ہے‘ یاد ہی نہیں کرتا اماں کو۔“

امی‘ رخسانہ خالہ سے الگ ہو کے آنسو پونچھ رہی تھیں۔ یہ دونوں بہنوں کا میکہ تھا۔ نانی تھیں تو امی کا بھی گھر تھا کیونکہ ماموں تو ایسے ہی تھے اور اب نانی کے بعد وہ صرف رخسانہ خالہ کا میکہ رہ گیا تھا شاید امی کا نہیں۔ مگر امی کو یہ سمجھاتا کون!

ممانی اپنے ہونے والے داماد کے لیے بوٹیوں اور تری والا سالن نکال کر رکھ رہی تھیں۔ افضل‘ مبشرہ باجی کو دیکھ رہا تھا اور نہال ہوئے جا رہا تھا جبکہ احسن بھائی کوثر باجی کے لیے بے چین تھے وہ اکثر ہی یہاں پائے جاتے تھے انہیں گاؤں کی آب و ہوا بھا گئی تھی یا شاید کوثر باجی کی نظر نے انہیں جکڑا تھا۔ دوسری وجہ زیادہ بھاری بھر کم تھی‘ ان کی محبت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی اور نہ ہی والہانہ پن مخفی تھا۔

صدیقہ‘ حسن بھائی کے ساتھ لگی تھی‘ حسن ہماری ہی عمر کا تھا لیکن مجھ سے اور صدیقہ سے ذرا بڑا تھا جو ان دنوں سال اول میں تھا۔

”حسن بھائی! میں آپ کو امرود توڑ کے کھلاؤں گی۔“ صدیقہ نے اسے بازو سے تھام رکھا تھا۔

”ہاں ضرور اور سیر کو بھی چلیں گے لیکن پہلے میں نہا لوں۔ بہت تھک گیا ہوں۔ مامی صابن دے دیں مجھے۔“

اور مامی جلدی سے صابن لانے دوڑیں۔ مرغیاں ذبح ہو گئی تھیں اور روٹیاں نائن لگا رہی تھی۔

”لے بی بی صابراں‘ روٹیاں ہو گئیں۔ اب تنور ڈھانک رہی ہوں۔ کسی دوسرے نے روٹیاں لگانی ہوں تو سینک (تپش) ابھی بہت ہے۔“ وہ تنور کو گھڑے سے ڈھک کر جا رہی تھی۔ ظاہر ہے ہم آئے ہوئے مہمان زیادہ تھے تو کھانا بھی زیادہ تھا۔ ہمارا واپس جانے کا ارادہ تھا‘ شام ہو رہی تھی اور واپسی پر جاتے جاتے اندھیرا زیادہ ہو جاتا۔

ابا گھر پر اکیلے تھے‘ تایا جی سے وہ کل ملنے آتے۔

”سارا سوٹ تباہ کر دیا تو نے۔“ ماموں دہاڑ اٹھے تھے۔ امی پانی سے ہاتھ دھو کر پیچھے ہٹیں تو ذرا سا پانی ان پر بھی گر گیا تھا اور وہ غضب ناک ہو گئے تھے۔ بات اتنی تھی نہیں جتنا اسے بڑھا دیا گیا تھا۔

امی دکھی ہو گئی تھیں وہ لمبی پکی سڑک پر ہمیں

لیے باہر نکل آئی تھیں۔ اچھا تو مجھے بھی نہیں لگا تھا مگر کیا کر سکتی تھی۔ سورج دور کھیتوں میں تانبے کے بڑے گولے کی طرح غروب ہو رہا تھا امی اور ماموں کے تعلقات بھی ایسے ہی غائب ہو جاتے تو کتنا اچھا تھا۔

''یہ تو میرا بھائی ہے مگر۔'' امی رو پڑی تھیں۔

''ایسے ہوتے ہیں بھائی!'' میں بڑبڑائی ضرور مگر بولی نہیں۔

''رخسانہ خالہ شاید کل ہماری طرف بھی آئیں۔'' خاور بستر پر لیٹے لیٹے پوچھ رہا تھا یا بتا رہا تھا۔

''تم نے سونا ہے یا نہیں۔'' امی کی گھرکی پر دبک گیا تھا اور ندیا وہ تو یوں بھی جلدی سو جاتی تھی۔

''مہمان تو ماموں کے تھے اور ہم نے یونہی اناج کے ڈھیر جمع کر لیے ہیں۔ اب پتا نہیں ہمارے گھر ماموں انہیں آنے دیں گے یا نہیں۔''

میں نے انہیں جو جو دلیریاں دکھائی تھیں سارے خواب مجھ سے پہلے لم لیٹ ہونا شروع ہو گئے تھے۔

پنجیری کی بڑی لبالب بھری پلیٹ چاچا اللہ داد کے ہاں سے آئی تھی۔ گرم پنجیری میں سے دیسی گھی کی مہک اٹھ رہی تھی۔ خاور دس بار انگلی ڈبو ڈبو کر کھا رہا تھا اور ندیا بے چاری جب بھی انگلی قریب لاتی، جلنے کا ڈر اس کے گرد گھیرا ڈال لیتا اب وہ چمچ کی تلاش میں بھاگی پھر رہی تھی جبکہ خاور جلدی جلدی ہڑپ کرنے کے چکر میں تھا۔

''امی! یہ حلوہ کس خوشی میں تھا؟'' میں نے امی سے پوچھا تھا۔

''جہاں داد خیر سے وڈا افسر ہو گیا ہے نہروں کے محکمے میں، اسی خوشی میں سب کا منہ میٹھا کروایا ہے بھرا اللہ داد نے۔'' امی نے کہا۔

''اچھا اچھا جہاں داد!'' میری نظر میں جہاں داد کا سراپا گھوم گیا تھا۔ وہ شہر میں پڑھتا تھا اور اکثر ہی گاؤں آتے جاتے اسے دیکھا تھا۔ چھوٹے سے لیے بیگ کو کندھے سے لٹکائے وہ کھیتوں میں سے آتے ہوئے وہ شہری ہی لگتا۔ گاؤں کا باسی نہیں۔ وہ سب کو سلام کرتا تھا گھروں میں آتا جاتا بھی تھا اور پھر وہ موٹی موٹی کتابیں پڑھنے والا بابو ایک عجیب کام کرتا تھا۔ وہ درانتی پکڑ کے پٹھے (چارہ) کاٹتا تھا اور پھر مشین میں باریک کر کے بھینسوں کے آگے ڈالتا اسے اس میں بھی مہارت حاصل تھی۔

''خالہ آ گئیں۔''

میں اور ندیا چاچا اللہ داد کے گھر بیٹھے تھے۔ فرزانہ سے میری اچھی دوستی تھی، وہ دوپٹے پہ بیل کاڑھنے میں مصروف تھی، قمیص کے بیل بوٹوں پر کڑھائی مکمل تھی، صرف دوپٹہ باقی بچا تھا۔

''ماہا میں تمہیں بھی ایسا ہی دوپٹہ کاڑھ دوں گی۔'' وہ سبز دھاگے میں ابھی الجھی بولی تھی کہ خاور بھاگتا بلکہ چوکڑیاں بھرتا چلا آیا تھا۔

''احسن بھائی، حسن اور خالہ اور آپیاں بھی آئی ہیں۔''

اب جب میں مایوس ہو گئی تھی تو وہ آ گئے تھے۔ ابا، تایا جی سے ملنے کے بعد لکڑیاں کاٹ رہے تھے۔ اور امی پلاؤ کے لیے پیاز کاٹ رہی تھیں۔

''السلام علیکم احسن بھائی!'' میں نے احسن بھائی کو سلام کیا تھا پھر حسن بھائی کو۔ مبشرہ آپی اور ایصال آپی نے مجھے گلے لگایا تھا۔

''ماہا! چاچا رحمت علی کے گھر میں مرغیوں کا کہہ آئی ہوں۔ تیری خالہ سے پکڑی نہیں جا رہی، تو اور خاور مل کے پکڑ لاؤ اور جلدی آنا۔'' میں اور خاور اٹھ کے چل دیے تھے پیچھے پیچھے ندیا بھی۔

''خالہ! میں بھی ان کے ساتھ جاؤں۔'' اور حسن بھی ہمارے ساتھ چل پڑے تھے۔

''تمہارا گاؤں بہت خوب صورت ہے۔'' بہتی ندی کے شفاف پانی میں حسن نے جھانک کر کہا تھا۔

''ہمیں تو گاؤں میں ہی ہونا چاہیے تھا یہ حسین مناظر شہر میں کہاں؟'' حسن نے خواہش کی۔

''تو ان مناظر کو نگاہوں میں بھر لے جایئے اور

تازہ دم رہے۔'' میں مسکرا اٹھی اور خاور نے چلو بھر کر ٹھنڈا پانی ان پر پھینک دیا۔

''واہ بھئی تم تو بڑے اچھے لفظ استعمال کرتی ہو۔'' وہ ہنس کر بولے۔

''یہ صدیقہ کون سی کلاس میں ہے بھلا؟'' وہ ذہن پر زور دے کر بولے۔

''آٹھویں۔'' خاور پھر بول پڑا تھا۔ ''خیر تم تو اس کے برعکس سنجیدہ اور ذمہ دار ہو گئی ہو، وہ تو جیسی پچھلے برس چھٹیوں میں تھی اب بھی ویسی ہی ہے۔'' مرغیاں پکڑ کے ہانپتا ہوا خاور بھی مرغا ہی لگ رہا تھا۔

''اب کرتا ہوں تیرا بندوبست۔'' وہ بڑی چونچ والے غصیلے مرغے کو گھور کر بولا۔

''بہت غصے میں ہے یہ مرغا۔'' حسن نے خاور کو بتایا تھا کیونکہ وہ تیز چونچ کھولے اسے چٹکی بھرنے کا ارادہ باندھ رہا تھا۔ بڑے چولہے پر امی پلاؤ کا دیگچہ دھرے خالہ سے محو گفتگو تھیں۔

''اب تم خود ہی سوچو، بھائی شمس کا (ماموں جان) رویہ میرے ساتھ ٹھیک ہے۔ میرا بھی میکہ ہے۔ کبھی جاؤں تو ایسے ہی بہانے بنانے شروع ہو جاتا ہے جب سے اماں گئی ہے، مجھے تو وہ گھر اپنا گھر لگتا ہی نہیں۔''

خالہ مرغے کی ٹانگ سے نبرد آزما تھیں جو امی نے انہیں بھنائی کے وقت نکال دی تھی۔

''ایک ہی بھائی ہے ہمارا، پتا نہیں میں اسے اتنی بری کیوں لگتی ہوں۔ مجھے تو دیکھ کر ہی اس کے تیور بگڑ جاتے ہیں، تو بھی تو بہن ہی ہے ناں، چلو تیرے گھر رشتے کر رکھے ہیں، میں بھی بس تیری وجہ سے آئی تھی۔''

''ایصال آپی اور مبشرہ آپی پلاؤ پکنے کا انتظار کر رہی تھیں۔

''یہ پودینہ کس نے لگایا ہے؟'' حسن بھائی نے پودینے کی خوشبو اپنے اندر اتارتے ہوئے مجھ سے پوچھا تھا۔

''میں نے لگایا ہے، جب بھی دل چاہا، چٹنی بنالی۔ رائتہ بنا لیا اور پھر خوشبو سارے گھر میں پھیلی رہتی ہے۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے بلکہ تم تو ساری کی ساری اچھی ہو ماہا!'' وہ مسکرا کر بولا۔

پھر چھٹیاں ختم ہوئیں اور وہ واپس لاہور کے ہنگاموں میں کھو گئے تھے اب اگلی چھٹیوں میں پھر ملنا تھا۔

حسن بھائی کی تعریف پر میں بہت خوش بھی تھی اور حیران بھی، انہوں نے میری تعریف ہی کی تھی یا ان نظروں میں پسندیدگی بھی کنڈلی مارے بیٹھی تھی، سردی کی راتیں ستاروں ـــــ سے بھری تھیں اور میں یہ سوچ بھگانے کے چکر میں تھی کہ وہ مجھے پسند کر بیٹھے تھے۔

ـــــ شمس ماموں لاہور گئے تھے اور اپنے ساتھ خوشبودار باسمتی چاول گڑ مکھن دیسی گھی اور میوے بھرا حلوہ بنوا کر لے گئے تھے اور بڑی بات اس دفعہ صدیقہ بھی ان کے ساتھ گئی تھی اور ہمیں کانوں کان خبر بھی نہ ہو سکی تھی۔

صدیقہ مہینے بھر کے لیے وہاں رک گئی تھی۔ اس بات کی خبر ہمیں یوں ہوئی کہ اس دفعہ سردیوں کے کپڑے ہم نے لاہور کے انارکلی بازار سے لینے کا فیصلہ کیا تھا۔ سنا تھا کہ وہاں اعلیٰ سے اعلیٰ کپڑا جوتے اور بھی خوب صورت چیزیں کلپ، سوئیاں، چوڑیاں وغیرہ مل جاتی ہیں۔ اس بازار کی تو دھوم تھی۔ ہمارے چک میں۔ اس بار میں ندیا اور خاور ابا کے ساتھ لاہور جا رہے تھے اور پھر ٹھوکر نیاز بیگ سے ہوتے ہوئے ہم خالہ جان کی طرف آ گئے تھے۔ میں اور ندیا صدیقہ کو دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔ وہ وہاں اٹھلائی پھر رہی تھی۔

ماموں نے احسن بھائی کے لیے تو کوثر باجی کا رشتہ دیا ہی تھا اور اب وہ صدیقہ کے لیے حسن کو پسند کرنے لگے تھے کیونکہ ان کی آمد و رفت بھی بتاتی تھی، خیر بڑے برآمدے میں بیٹھی خالہ جان سے مل ملا کر وہ کولڈ ڈرنک بمشکل حلق سے اتار رہے تھے۔

''اور سناؤ جمیل بھائی۔'' خالہ جان ابو سے

باتیں کرنے لگی تھیں، ابو منہ ہاتھ دھو کر پنکھے تلے بہتر محسوس کر رہے تھے۔

''آہا،ہا،آ گئی ہیں!'' حسن خوش نظر آ رہے تھے اور صدیقہ کے منہ پر بارہ بج چکے تھے۔ اس کے ایسے استحقاق پر مجھے حیرت ہوئی تھی، وہ حسن کے لیے اتنی ہے مگر کس رشتے سے اور ماموں جو اسے خالہ جان کے ہاں چھوڑ گئے تھے اور پھر کسی کو خبر نہ ہونے دی تھی۔

خالہ جان کے چھوٹے سے گھر کے دروازے سے لگی بغیر خوشبو پھولوں والی بیل کی طرح صدیقہ بھی ان کے برآمدے میں لگ جانا چاہتی تھی۔

پھر یوں ہوا کہ ماموں جیت گئے، ان کی پلاننگ کامیاب رہی۔ خالہ جان کی بہوئیں، ان کی دونوں بیٹیاں صدیقہ اور کوثر بنیں۔ ہمیں ایک طرف کر دیا گیا۔ تایا جان نے تو ہمیشہ سے بے کار زندگی گزاری تھی۔ انہیں خالہ جان کے فیصلوں کا علم نہ ہو سکا۔

ماموں جان افضل بھائی کو ان کے گھر کا داماد بنانے کے ساتھ ساتھ ان کے بیٹوں کو اپنا داماد بنا بیٹھے۔

☆☆☆

''آپی! بالآخر تم یہاں سے جا رہی ہو۔'' خاور میرے کان میں خوش ہوا تھا البتہ ندیا اداس سی تھی۔

''جا رہی ہوں مگر اسی گاؤں کی دوسری گلی میں۔ اچھا زیادہ خوش نہ ہو۔''

میں بھی منمنائی کیونکہ گھونگھٹ میں زیادہ بولنا کوئی سن لیتا تو اسی وجہ سے میں چپکے چپکے خاور کو جواب دے رہی تھی۔

''تم میری محبت ہو۔'' جہاں داد ایسا بھی بول سکتا تھا، ایسے بھی سوچ سکتا تھا، میں حیران تھی۔ ''جب جب میں گاؤں کی رسیلی ہواؤں اور گنگناتی ندیوں کو چھوڑ کے گیا، وہاں ماہی تم میرے ساتھ رہیں۔ میں نے صرف تمہیں چاہا۔''

جہاں داد کی نگاہیں ہمیشہ نیچی رہی تھیں تو پھر اس نے مجھے دیکھا کب تھا؟ سوال جو دل میں چھپا بیٹھا تھا۔ لبوں تک نہیں آیا، چوڑیوں کی چھن چھن جیسے پوری کائنات میں بکھر گئی۔ میرا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا۔

''میں اتنا خوش نصیب ہوں کہ مجھے تم مل گئیں۔'' وہ بولتا اور میں سنتی تھی۔

''کیا تم مجھ سے میرے جتنی محبت کرو گی ماہی؟''

وہ میری چپ جو حیرت کی، اسے توڑنا چاہتا تھا۔

''جی!'' میں یہی کہہ سکتی تھی کیونکہ دل اور زبان میرا اتنا ہی ساتھ دے پائے تھے۔

جہاں داد نے مجھے بتایا کہ محبت کیا ہے، ہمت کیا ہے اور حسن، اس سے تو میں نے کچھ نہیں سیکھا مگر شاید سیکھنا باقی تھا جو میں اپنے تایازاد سے ملنے چل پڑی تھی۔

''تباہ کر دی ہے تم نے میری زندگی اور تمہارا باپ وہ (گالی)۔'' گھر جو چھوٹی سی کھولی میں بدل چکا تھا۔ بٹوارے کے بعد اور اچانک ہی چوکھٹ پر پڑے قدم نے سمجھا دیا تھا کہ اللہ کے ہر کام میں مصلحت ہے۔ ماموں جان کھلا کر کتا کہلائے تھے اور میں نے راستے سے ہٹ کر اپنا مقام بنا لیا تھا۔

حسن کے بال اڑ چکے تھے اور صدیقہ کی حالت مجھے دیکھ کر اور بگڑ گئی تھی۔ وہ مجھے دیکھ رہی تھی اور خالہ جان بے بسی کی تصویر۔

میں ذرا سی دیر بیٹھ کر اٹھ گئی تھی۔ صدیقہ پیچھے برآمدے کے ستون سے لگی تھی۔

تمہیں تو خیر میرے
غم کدے سے جانا تھا

کہاں گئیں میری نیندیں
کدھر گئے میرے خواب

امی اور ابو کو کسی سے کوئی شکایت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ہمیشہ سے نواز رکھا تھا اور آج بھی۔

ماموں نے خود اپنے لیے جو راستہ چنا تھا اس کی کوئی منزل نہیں، وہ بازی جیت کر بھی ہار گئے تھے۔

☆

"انسانوں کی وہ اکثریت جو انسانوں سے محبت کرتی ہے۔ وہ ان کو نسل، زبان، مسلک اور علاقوں میں نہیں بانٹتی۔"

وہ دونوں کہنیاں اسٹڈی پہ ٹکائے کتنی ہی دیر سے جون ایلیا کی اس بات کے زیر اثر تھی۔ پھر اس نے ان سطور سے نگاہیں ہٹا کر کمرے کے وسط میں کھڑی بہن کو دیکھا۔ برہم مزاج کے ساتھ ہی کمرے میں آئی تھی۔ یسریٰ چونکہ شام تک گھر سے غائب رہی تھی۔ سو بہن کے بگڑے موڈ کی بابت بس انداز ہ لگا سکتی تھی۔

وہی اقصیٰ کی شادی کا متنازعہ موضوع، بابا کی دھمکیاں اور دادی کا بیٹی کی حمایت میں بڑھ چڑھ کے بولنا۔

یسریٰ کے لیے تمام صورت حال معمولات زندگی کی ہی ایک کڑی تھی۔ ویسے تو پروفیسر برہان کی گفتگو علم سے شروع ہو کر ادب اور پھر عقل و دانش سے لے کر اسلام تک...... مجال ہے جو کہیں کوئی جھول ہو یا پھر کسی بھی جملے کے اول و آخر میں جو بھی انہیں لحہ بھر کو بھی سوچنا پڑا ہو۔ پھر انہیں اس بات پہ یقین کیوں نہیں کہ سنجوگ کا دن بھی مقرر ہوتا ہے۔

یسریٰ نے سوچا ضرور تھا، مگر بولنے سے احتراز کیا۔ وہ خفیف سا مسکرا کے بہن کی جانب مڑی اور ہلکا سا کھنکھار کے جون ایلیا کے ان ہی جملوں کو بہ آواز بلند پڑھا۔

"کیا تم ان صاحب سے اتفاق کرتی ہو؟" کہتے ہوئے اس کے ہونٹوں پہ اک شرارتی سی مسکراہٹ تھی۔

"یہ سب آپ کی ایما پہ ایک غلط فیصلے کے نتیجے کی صورت سامنے ہے، ورنہ میں کیا اس جنگجو قبیلے

فرزانہ کھرل

تھم گیا طوفانِ جنوں



سے یہ رشتہ جوڑتا۔" اس کے دماغ میں باپ کی تنفر آواز گونجی۔

"معاف کرنا پروفیسر صاحب میں (دادی ناراضی کی صورت بیٹے سے یوں ہی مخاطب ہوتی تھیں۔) اس قبیلے میں بیٹی بیاہنا تمہارے باپ کی خواہش تھی۔ (دادی کا اشارہ پھوپھو کی طرف ہوتا۔)

اور اس بنیادی جواز پہ پروفیسر صاحب کی بولتی...... بھڑک کر بجھ جاتی۔

اقصیٰ نے چھوٹی بہن کو شاکی نگاہوں سے گھورا۔

"مجھے اپنی رائے محفوظ رکھنے کی اب عادت ہو چکی ہے۔" آرام سے کہہ کر وہ بیڈ پہ آ بیٹھی۔

"یعنی تمہارا شمار اب ان لوگوں میں کیا جا سکتا ہے۔ جو جیسا بھی ہے، ٹھیک ہے کی بنیاد پہ زندگی گزارنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ویری سیڈ۔" یسریٰ نے تاسف سے سر دائیں بائیں ہلایا۔ پھر اس کا خوش رنگ چہرہ ٹکٹکی باندھ کے دیکھنے لگی۔ جس نے ٹیبل سے ہینڈ لوشن اٹھا کر ہتھیلی پہ ذرا سا انڈیلا...... پھر بہن کا اس قدر محویت سے تکنا، محسوس کر کے، اک ذرا ابرو چڑھا کر استفسار کیا۔

"کیوں بھئی؟"

"جب اسے رات کے دوسرے پہر دیکھو تو پلک تک نہ جھپکنا، آپ کے ابوبکر صاحب اپنی فرمائش کے پورا ہونے پہ ہمیں اچھی خاصی اجرت سے نوازتے ہیں۔"

وہ لب دبا کے مسکرائی تو اقصیٰ سچ مچ جھینپ سی گئی۔ جیسے واقعی ابوبکر اس کے سامنے بیٹھا ہو...... اور یسریٰ اس کا سرخ پڑتا چہرہ دیکھ کے اپنا قہقہہ کنٹرول نہیں کر سکی۔ تب ہی گیٹ پہ برہان کی گاڑی کا مخصوص ہارن بجا۔

"آج بابا...... کیا کسی دوست کے ہاں مدعو تھے۔" وہ اسٹڈی چیئر چھوڑ کے بیڈ پہ چلی آئی۔

"شاید......؟" اقصیٰ نے گم صم سی کیفیت میں ہی جواب دیا۔ پھر جیسے تذبذب کے عالم سے باہر نکلتے ہوئے پورا گھوم کے یسریٰ کی طرف متوجہ ہوئی۔

"تمہیں سفینہ آنٹی یاد ہیں؟" گوکہ اقصیٰ کی آواز نہایت دھیمی تھی۔ پھر سننے والی کے اندر اک طوفان سا کیوں اٹھا تھا۔

"وہی جو دادی کی بھانجی ہوتی تھیں اور جنہوں نے دوسری شادی ہمارے پڑوسی رہبر انکل سے کرلی تھی۔" بڑی بہن کی بات پر جیسے۔ برسوں بعد یاد کی اک گرہ دل نے آہستہ سے کھولی تھی۔ وہ خاموشی سے اقصیٰ کا چہرہ دیکھنے لگی۔ سفینہ آنٹی سے منسلک تمام ہنگامے بھلا دینے والی چیز نہیں تھے۔ ان کی ادھوری کہانی کے چند کردار بھی اس پہ واضح نہیں تھے۔ اسے بدستور خاموش پا کر اقصیٰ کچھ مایوس ہوئی۔

"وہ جن کے لمبوسے بیٹے کو تم اپنے ہر کھیل میں زبردستی گھسیٹ لیا کرتی تھیں۔" اس نے اک اور حوالے سے یاد کروانے کی آخری کوشش کی...... اور سننے والی کا دل معمول کی رفتار سے ہٹ کر دھڑکا۔

"خیر چھوڑو...... حیرت کی بات یہ ہے کہ آج ان کا وہی لمبو بیٹا انیب شعیب آیا تھا۔" اقصیٰ کی آواز میں حیرت تھی۔

"جیسا تمہارا حال یہ سن کر ہو رہا ہے بالکل ایسا ہی میرا حال اسے دیکھ کر ہوا تھا۔" یسریٰ کی سماعت میں بے یقینی جیسے جم سی گئی تھی۔

"کیا کہا تم نے، دوبارہ کہو...... یا پھر یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟" وہ اس ایک جملے کو ہزار طریقوں سے — بولنا چاہتی تھی، جیسے اس کی بڑی بہن مذاق کر رہی ہو۔

اقصیٰ اور بھی بہت کچھ کہہ رہی تھی۔ کبھی سنجیدگی سے کبھی مسکرا کر۔ بقول چوکیدار کے جب گیٹ کے باہر انیب اور بابا کی گاڑیوں کا ٹکراؤ ہوا۔ ان صاحب نے اپنی گاڑی سے باہر آکر بابا سے مصافحہ بھی کیا۔ یہ صورت حال سن کر میری اور دادی جان کی اس ملاقات کی خوشی کہیں ہوا میں اڑ گئی کہ پروفیسر برہان صاحب گھر آنے کے بجائے جانے کہاں گئے، اب تشریف لائے ہیں۔"

وہ ہنستے ہوئے خاموش ہوئی، پھر لیٹ کر دوسری جانب کروٹ بدلی اور ٹیبل لیمپ بند کر دیا۔

موسم بدل رہا تھا۔ کھڑکیاں کھلی اور پردے ہٹے ہوئے تھے۔ کمرے میں نیلگوں سی روشنی تھی۔ یہ بات خاص نہیں تھی کہ وہ کس کا بیٹا تھا۔ یہ مسئلہ بھی اہم نہیں تھا کہ پروفیسر صاحب اسے دیکھ کر پریشان ہوئے تھے یا پھر حواس باختہ، دنیا کا ادھر سے ادھر ہوجانا بھی بڑی بات نہیں تھا، جتنا کہ اس شخص کا سالوں بعد یہاں آنا، اس کی چلتی سانسوں کو صحرائے گوبی سے آنے والی ہوا نے چھوا۔ ترکمانوں کے گھوڑے بھی ان ہی کی طرح بے رحم ہوتے ہیں۔ سامنے نصب قدِ آدم آئینے میں کوئی جنگل سا نظر آنے لگا، جہاں گھوڑے کے سموں کی اڑتی ہوئی گرد...... اور وہ گھڑ سوار...... مگر میں تو کچھ دیر پہلے جون ایلیا کو پڑھ رہی تھی، جن کے لیے انسان اور انسانیت اہم ہے۔ یہ درمیان میں ترکمان قبیلہ کہاں سے آگیا۔ دل حکم کا غلام نہیں ہوتا...... کہ اس بات پہ اتنا دھڑکنا ہے، اتنا بے چین ہونا ہے، وہ چت لیٹی بس سانس لے رہی تھی، بنا کسی جنبش کے...... جہاں انتظار دم توڑنے لگتا ہے، وہیں سے کبھی معجزوں کا آغاز بھی ہوجایا کرتا ہے۔

دنیا کی بھیڑ میں گمشدہ وہ شخص زمانوں پہلے کہیں رہ گیا تھا۔ وہ آج گھر پہ کیوں نہیں تھی؟ وہ آج رات اس احساس زیاں کے ساتھ کیا سو سکتی تھی؟۔

☆☆☆

آج عرصے بعد اس کا دل پھر بوجھل تھا۔ اس نے کھڑکی کا پٹ وا کیا اور گھور تاریکی میں بے کل سانس لیے، بہادری کی بھی کوئی حد ہوتی ہوگی آخر...... اس کی ماں سچ کہتی تھی کہ ان کا شجرہ نسب ترکمانوں سے ملتا ہے۔ وہ اگر ان کے جتنا بہادر نہیں تھا تو کمزور بھی نہیں تھا۔ وہ ایوان دل سے اس کی محبت کا پرچم اتار چکا تھا، مگر وہ ثاقب ولا کے بھاری گیٹ پہ پہرے داری فراموش کر چکا تھا۔ تب ہی تو وہ شخص اس بے چاند کی شام تعلقات کی مشعلیں لے کر ہموار قدموں کے ساتھ اس کے گھر میں آگیا تھا۔ اس کی روشن آنکھوں میں اس ملگجی شام کا شائبہ تک نہیں تھا۔ جس میں ہار چکے، برہان کی ٹھہری ہوئی آواز گونجی تھی۔

"اماں! ان باپ، بیٹے سے کہہ دیجیے کہ میں آئندہ انہیں اپنے گھر میں دوبارہ نہیں دیکھنا چاہتا۔"

وہ کھڑکی کا پٹ کھلا چھوڑ کر بیڈ پہ ڈھیر ہوا۔ وہ آج بھی پسپائی اختیار کرنے پہ آمادہ نہیں تھا، مگر آج بھی چند مصلحتوں نے اس کے دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے باندھ رکھے تھے۔

☆☆☆

آج ناشتے کی میز پہ معمول کی ہلچل سے ہٹ کر ایک سکون اور ٹھہراؤ سا تھا۔ دادی کا اپنے دلیے کے علاوہ ہر چیز کو چکھنا، آج ان کا معمول بدل گیا تھا اور یہ ہی بات زین کو کھٹکا چکی تھی۔

"بھئی آج آپ تینوں خواتین اناڑی سیاست دانوں کی طرح لگ رہی ہیں۔ خواہ مخواہ حب الوطنی کا بخار چڑھا رکھا ہے۔"

اسے محسوس ہوا کہ وہ افسردگی کے عالم میں نواز شریف کی پریس کانفرنس نشر مکرر میں دیکھ رہی تھیں۔ ساتھ ہی اس نے اقصیٰ سے نظر بچا کر اپنے پراٹھے کا کچھ حصہ دادی کی پلیٹ میں رکھا۔ آج دادی کی ٹھنڈی آہیں بلا خیز تھیں۔

"اب اس صدمے سے نکل آئیں دادی! یہ چاند چہرہ ابھی اسکرین کی جان نہیں چھوڑنے والا۔" زین کو سچ مچ غصہ آگیا۔

"کچھ خدا کا خوف کرو زین!" دادی نے اسے خوف ناک گھوری سے نوازا۔

"آج دوپہر کے بعد تمہارا کیا پروگرام ہے؟" اقصیٰ اس موقع پر بھی غافل نہیں تھی، بات کرتے ہوئے دادی کی پلیٹ سے پراٹھا اٹھالیا۔ پلیٹ کی مالکن کے چہرے سے دو گھڑیوں کی مہمان رونق رخصت ہوئی۔

"میں آج کہیں بھی تم دونوں کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ کل بھی سمجھو میرا پورا دن ضائع ہوا ہے۔" اس نے برا سا منہ بنایا، اس سے پہلے کہ کوئی اسے جواب سے نوازتا، برہان صاحب ڈائننگ روم میں تشریف لائے۔

سب ہی اپنی اپنی نشستوں پہ مؤدب ہوئے۔

آنے والے نے بیٹھنے سے قبل ہی سب کو معمول کے مطابق پرتکلف انداز میں صبح بخیر کہا۔ دادی جیسے ان ہی کی منتظر تھیں۔ "کیا ہوا۔ آج پارک میں کوئی دوست مل گیا تھا؟" وہ بیٹے کے دیر سے آنے پہ متفکر سی تھیں۔ سو اس کے بیٹھتے ہی سوال داغا، کہ اکلوتا بیٹا آج مزاج سے سوا سنجیدہ تھا۔ (حالانکہ ماں وجہ جانتی تھی۔) پھر بھی سوال کرنے کے بعد بھی انداز میں بردباری دیکھنے لائق تھی۔

"دوست اب کہاں ملتے ہیں اماں!" ہلکا سا ہنس کے ماں کی آنکھوں میں جھانکا۔ "آپ تو ماں ہیں۔ دعا کرتی رہا کیجیے کہ کبھی دشمنوں سے سامنا نہ ہو۔" وہ استہزائیہ انداز میں جیسے زیر لب بولے تھے کہ وہ دادی، پوتیاں جیسے سناٹے میں رہ گئیں۔

"بہر حال ذرا میڈیکل اسٹور تک جانا پڑا۔" وہ اب ناشتے کی جانب متوجہ ہوئے۔ پھر بچوں پہ اک نظر ڈالی جو ہمیشہ کی طرح یسریٰ پہ ٹک سی گئی، کہ وہ باقی دونوں کی نسبت دل کے قریب محسوس ہوتی تھی۔

"رات کو جلدی سویا کریں۔" وہ اپنے مخصوص لیے دیے انداز میں گویا ہوئے۔ یسریٰ کی آنکھیں تھکی سی اور پپوٹے سوجے ہوئے تھے۔

"جی بابا!" وہ دو لفظ کہہ کر ناشتے کی پلیٹ پہ جھک گئی۔

"زین صاحب، بہن کے ساتھ کہیں جانے کو وقت کا زیاں سمجھتے ہیں۔" بیٹے کو بغور دیکھا۔ جس نے دادی کی آغوش میں پرورش پائی تھی۔

"بن ماں کا بچہ ہے، کوئی بات نہیں۔" ان ہی جملوں کی بدولت وہ کچھ زیادہ ہی بگڑ چکا تھا۔ اب بھی باپ کی ذرا سی پوچھ گچھ پہ پہلو بدل کر دادی کی جانب دیکھنے لگا۔ جو اپنے ہی کسی دھیان میں تھیں۔

"کل یسریٰ بی بی کی دوست کی شادی پہ میں خواہ مخواہ بور ہوتا رہا۔" اس کے پسپا لہجے سے اب بھی کوفت ٹپک رہی تھی۔

باپ نے بھاپ اڑاتی چائے سے نظر ہٹا کر پل بھر اسے دیکھا۔ "جو وقت آپ اپنے سیل فون کے ساتھ گزارتے ہیں، اس میں یقیناً پھل پھول

لگتے ہوں گے۔"

باپ کے اس قدر طنزیہ لہجے پہ وہ اک ذرا شرمندہ ہوا۔ اقصیٰ نے آنکھوں ہی آنکھوں میں چھوٹے بھائی کو چڑایا اور وہ چڑ بھی گیا۔

"آصفہ! فریج میں سے کیک لے کر آؤ۔" خود پر سے توجہ ہٹانے کا اسے فوری بہانہ سوجھا۔ دادی جیسے حالت مراقبہ سے چونکی تھیں۔ لمحہ بھر بیٹے کو دیکھا۔

"کل انیب آیا تھا۔" دادی کی ہلکی آواز ہموار تھی، پھر بھی یسریٰ کا دل پگڈنڈی پہ چلتے قدموں کی طرح ڈولا۔

"رات کو تم خاصی دیر سے آئے تھے۔ میں تو تب تک سو چکی تھی۔" وہ ہنوز بیٹے کے پتھریلے چہرے پہ نگاہ جما کر بولیں۔ جو اس وقت ہر قسم کے تاثرات سے عاری تھا، مگر آنکھوں میں تیرتی ہلکی بے قراری ماں بھانپ چکی تھیں۔

"کیوں آیا تھا؟" اک طویل توقف کے بعد وہ سہ حرفی سوال وہاں موجود خواتین پہ دوبارہ کسی بم کی طرح گرا تھا۔

سلطنت آرا کے ہاتھ میں دلیے کا پیالہ لرز کے رہ گیا۔ انہوں نے زمانے کے سرد و گرم حالات بھگت رکھے تھے۔ واقف تھیں کہ نرمی برتنے کا مقام کون سا ہے اور تنی گردن کے ساتھ کس مقام پہ بات کرنی ہے۔

"جب تک میں اس گھر میں ہوں تو میرے رشتے دار یہیں آئیں گے اور اطمینان رکھو کہ جب میرا ٹھکانا قبرستان ہوگا، تو وہ تم سے یا تمہارے بچوں سے ملنے یہاں نہیں آئیں گے۔" ان کا لہجہ موقع محل کے مطابق دوٹوک تھا کہ برہان کی جانب سے مزید پوچھ گچھ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ سر جھکائے چائے پی رہے تھے۔

یسریٰ نے کیک پہ اک چور نگاہ ڈالی، اس کا دل پھیکا پڑا۔ یہ اس کا ناپسندیدہ کریمی کیک تھا۔ وہ جانتا تھا کہ مجھے یہ کیک زہر لگتا ہے۔

"وہ اس شہر میں ٹرانسفر ہوا ہے۔ جب تک یہاں ہے تو آتا جاتا رہے گا۔ میں امید رکھوں کہ ہر بار مجھ سے یہ باز پرس نہیں ہوگی؟"

اللہ......رے......دادی نے کیسے بھرے پانی کو اپنی مٹھی میں لیا تھا۔ اقصیٰ نے بمشکل مسکراہٹ دبائی۔

"حد کرتی ہیں اماں!" برہان کا چہرہ ضبط اور شرمندگی سے سرخ ہوا۔ "مجھے آج شام کی فلائٹ سے اسلام آباد جانا ہوگا۔ واپسی پہ میرے ساتھ ہو سکتا ہے کہ نادر کی فیملی بھی ہو۔" وہ اپنی کرسی چھوڑتے ہوئے دوبارہ ماں سے مخاطب ہوئے۔ وہاں چھائے مختصر سکوت میں وہ الفاظ کسی بھاری بم سے کم نہیں تھے۔

"آپ اپنے حساب سے پیکنگ کر رکھنا۔" وہ اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ اقصیٰ سے مخاطب ہوئے۔ جس کا سر جھٹ سے اثبات میں ہلا تھا۔ وہ اپنی متوازن چال کے ساتھ نگاہوں سے اوجھل ہوئے۔ تو زین دبی آواز میں چیخا۔

"آخر قصہ کیا ہے، کوئی مجھے کیوں نہیں بتاتا۔"

"قصہ کچھ بھی نہیں میرے بھائی! سمجھو کہ تمہارے سامنے خالی رجسٹر کھلا ہے، جہاں سے چاہو پڑھ لو۔" حواسوں میں لوٹتے ہوئے اقصیٰ شگفتگی سے گویا ہوئی۔ زین نے اسے تیز، تلوار نگاہوں سے گھورا۔

"کیا مجھے پاگل سمجھ رکھا ہے۔" اس نے کیک کھانے کا سلسلہ دوبارہ سے شروع کرتے ہوئے کہا۔

اقصیٰ کو خود باپ کی کتاب زندگی پہ خالی پن کے علاوہ کبھی کچھ لکھا نظر نہ آیا، تو وہ بھائی یا بہن کو کیا بتاتی۔ اس نے دادی پہ اچٹتی سی نگاہ ڈالی جو شاید کنویں میں بانس ڈال کے بیٹھی تھیں، جبکہ یسریٰ اس کے پہلو سے اٹھ کر باپ کے پیچھے ہی جا چکی تھی۔

☆☆☆

اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ پھر دروازے کے ساتھ لگا سوئچ آن کیا، تو وہاں ہلکی نیلی روشنی پھیل گئی۔

"اوہ......!" نگاہ سامنے اٹھتے ہی اس نے بے اختیار ایک گہرا سانس لیا۔

"کہا تھا نا...... میرا انتظار کیے بنا پرسکون ہو کر سو جانا۔" وہ آگے بڑھی اور تھکے ہوئے انداز میں خود کو صوفے پر گرا دیا۔

"آپ جانتی ہیں، میں ایسا نہیں کر سکتا۔" وہ پہلو بدل کر پورا اس کی جانب مڑا۔ ہلکی روشنی میں بھی اس عورت کے چہرے پہ اداسی ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ تھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھے دماغی طور پہ غائب تھی۔

وہ چند ثانیے اسے تکتا رہا۔

"کافی پیو گی؟" مرد نے آہستہ سے پوچھا۔

"نہیں۔" اس نے مدھم سا جواب دیا۔

"مومنہ کے ہاں دو بار پی چکی ہوں۔"

اس کے ہر، ہر انداز میں بے چینی نمایاں تھی، جیسے مومنہ نہیں فیصلے کے دوراہے پہ خود وہ کھڑی ہو۔ یہ بھی جانتی تھی کہ اس کا شوہر کوئی بھی سوال نہیں کرے گا۔ ٹوہ، یا کرید، اس شخص کے مزاج کا حصہ نہیں تھی۔

رہبر نے اس کا ٹھنڈا ہاتھ ملائمت سے پکڑا۔

"زندگی ہر انسان کے لیے تجربہ گاہ ہے۔ ہم اس نسل کو اس تجربہ گاہ میں داخل ہونے سے نہیں روک سکتے۔" اس شخص کا لہجہ آج بھی اثر پذیر تھا، آج بھی وہ اس کا بکھرا وجود اپنی نرم مٹھی میں سمیٹ لیتا تھا۔

"اب تک اس نے اپنے لیے راستوں کا انتخاب خود کیا ہے اور کبھی بھٹکا بھی نہیں، پھر اب تمہیں کون سے خدشات ہولا رہے ہیں۔" اگر وہ سوال مشکل نہیں تھا۔ تو جواب بھی سہل نہیں تھا۔

"مومنہ نے فیصلہ کر لیا ہے۔" خاصے بوجھل توقف کے بعد وہ نرمی سے گویا ہوئی۔ جیسے کہ غنودگی میں اتر رہی ہو۔ پھر آہستہ سے وہ اس مہربان شانے پہ اپنا سر ٹکا چکی تھی۔ رہبر اس کے ڈھیلے انداز سے جان چکا تھا کہ مومنہ کا فیصلہ اس کی بیوی کے حسب خواہش ہوا ہے، سو اس نے پرسکون ہو کر صوفے کی پشت سے سر ٹکا دیا۔ گر وہ انیب کے ذکر سے دانستہ گریز برت گئی تھی تو وہ بھی اس موضوع کو چھیڑنا نہیں چاہتا تھا۔

☆☆☆

انتہائی جدید ترین طرز کے بنگلوں کے بیچ، قدیم و جدید امتزاج سے مزین ثاقب ولا کی خوب صورتی کچھ وقت کے لیے راہ گیروں کو رک جانے پہ مجبور کر دیتی تھی۔ وہ ایک پوش اور سرسبز علاقہ تھا، وہاں کی کشادہ چمکیلی سڑکوں پہ اب نئے ماڈلز کی گاڑیاں نظر آتی تھیں۔ وہاں ہمہ وقت فضا میں مہنگے اور غیر ملکی پیڑ، پودوں کی مہک رچی رہتی تھی۔

اس بنگلے کی بالکونیوں پہ گرے باریک نیلے پردے عمارت کی خوب صورتی میں خصوصی اضافہ تھے۔ اگر اس کے بلند و بالا گیٹ کے باہر باوردی دربان، گھوڑا گاڑیاں، اور بگھیاں بھی موجود ہوتیں تو ثاقب ولا پہ کسی چھوٹے سے شاہی محل کا گمان ہوتا۔

اندر لاؤنج سے گزر کر ایک چھ فٹ چوڑی گلی عقبی لان میں جانے کا واحد راستہ تھی، جہاں چوڑی دہلیز کے بیرونی سروں پہ سنہری زنجیروں سے بندھے کانسی کے گول تھال جس میں مٹی کے آبخورے رکھے ہوئے تھے۔ آج بھی زنجیر کھینچنے پہ کسی ترازو کی صورت ایک تھال اوپر چلا جاتا، تو دوسرا نیچے ہاتھ کی پہنچ تک آ جاتا۔

اس گھر کے پیڑ، پودوں پہ بسیرا کیے پرندے ہمہ وقت ان آبخوروں میں منہ مارتے تھے۔ ایک وقت میں وہاں سے گزرتے ہوئے سنہری زنجیر کو کھینچ کر بچوں کا آگے بڑھ جانا ممکن نہیں تھا۔ وقت گزرتا گیا۔ سالوں پہلے بچوں نے بچپن چھوڑ دیا۔ مگر زنجیر کھینچ کے وہاں سے گزرنا، زین اور یسریٰ نے اب بھی نہیں چھوڑا تھا۔ اس چمکتے گول تھال کے کناروں پہ ٹکے پرندوں کو دیکھ کر آج بھی یسریٰ کا دل چڑیا بننے کو ہمکتا تھا۔

زین اسے کھینچ کر آگے بڑھ جاتا تھا اور یسریٰ کو اس چوڑی گلی میں اترنے والی ماضی کی اک شام آج بھی اس آبخورے کے پاس روک لیا کرتی تھی۔ پندرہ سال پہلے ان کے گھر آئے کسی مہمان کی آنکھوں سے ہر رشتہ ٹوٹ کر...... آنسوؤں کی صورت مٹی کے اک آبخورے میں گھل گیا تھا۔ وہ بچھڑ گئے۔ اس شخص کے تمام حوالے آج بھی چپکے چپکے ان کانسی کے تھالوں میں ڈھونڈتی تھی جن کو آج تک دھوپ نہیں چھو سکی تھی ______ آبخوروں کا پانی بدلتا رہتا تھا۔ مگر ان کے پیندے سے لپٹی آنسوؤں کی مہک وہاں قیام زدہ چھاؤں سے پھوٹتی تھی۔

☆☆☆

اس آفس کی آرائش تو قابل ستائش تھی ہی......

مگر اپنی بڑی سی پرتکلف آفس ٹیبل کے پیچھے گھومنے والی چیئر پہ بیٹھا وہ شخص بھی کم شان دار نہیں تھا۔ تھائی لینڈ کے ساحلی شہر تاپایا میں اس وقت اتری صبح اس شخص کے چہرے کی طرح روشن اور خوش گوار تھی۔

اس نے اپنا لیپ ٹاپ میز پہ سیٹ کیا اور سامنے کمپیوٹر کی جانب متوجہ ہوا ہی تھا کہ اس کا سیل فون گنگنایا۔ فون کی روشن اسکرین پر نگاہ ڈالتے ہی وہ مسکرایا اور نشست کی پشت سے ٹیک لگا کر کسی خوب صورت احساس میں گھر کے کال ریسیو کی۔

"رشوت کی بھی ایک حد ہوتی ہے ابوبکر!" چند رسمی کلمات کے بعد...... وہ دھیمے سروں سے ہمکلام ہوئی اور کھلی کھڑکی سے سمندر کی لہروں کو تکتا وہ ذرا سا چونکا۔

"ہماری کالونی کے تمام نکموں، نالائقوں کے حالات محض مجھے ٹکٹکی باندھ کے دیکھنے کی عوض اس قدر تیزی سے بدل رہے ہیں کہ کالونی کے سادہ لوح رہائشی حیرت زدہ ہیں۔"

وہ مصنوعی سنجیدگی کے ساتھ لب کشا تھی، مگر لہجے کی شوخی میں اک نیاپن سا تھا کہ ابوبکر کے تروتازہ قہقہے نے تاپایا۔ شہر کے کملائے پھولوں میں جان سی ڈال دی۔

"اگر دن رات کے پہر مختلف افراد میں بانٹ کر اجرت دیتے رہو گے تو یہ فراخ دلی تمہیں کنگال بھی کر سکتی ہے۔" اس نے گہرے خوب صورت لہجے میں ذو معنی بات کی تھی۔ وہ بہت دور سے، بہت دور کی بات کر رہی تھی۔ ابوبکر کی جیسے سانس تک تھم گئی۔

"اگر ترکمان قبیلہ اپنی بگھیاں سجا سکتا ہے تو ذرا جلدی...... ورنہ برہان ثاقب نے اجنبی گھڑ سواروں کے لیے خیمے لگوانے کا بندوبست کر لیا ہے۔"

اقصیٰ کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ کی ہلکی سی رمق تھی مگر تاپایا میں اپنی آفس چیئر پہ براجمان شخص کی ہر رگ میں جیسے خون رک چکا تھا کہ ساحلی ہوا نے کوئی اسم پھونک کے اسے پتھر میں ڈھال دیا تھا۔ تب ہی اس کے آفس کا دروازہ کھلا۔ اندر آنے والے شخص کے ہاتھ میں ایک فائل تھی۔ وہ کرسی گھسیٹ کر میز کے قریب ہوا۔ اس نے ذرا عجلت کا مظاہرہ کرتے ہوئے فائل کھولی۔

"اسے ذرا چیک کرو۔" اس نے تھوڑی کھجاتے ہوئے ابوبکر پہ نگاہ ڈالی۔ اس کا پریشان ہونا فطری تھا۔

"تمہیں کیا ہوا ہے؟" توفیق احمد نے اس کا زرد متوحش سا چہرہ دیکھ کر بے تابی سے پوچھا۔

☆☆☆

اقصیٰ کے ایک ہاتھ میں چائے کا کپ اور دوسرے میں اس کا سیل فون تھا۔ وہ اس وقت ابوبکر سے بات کر رہی تھی۔ اس کے چہرے کے گلابی پن سے یسریٰ کو اندازہ ہو چکا تھا۔ پھر اس کے کان میں اس کا آخری جملہ پڑا۔ وہ جیسے سن سی ہو گئی۔ اقصیٰ اب سیل فون گود میں دھرے مزے سے چائے پی رہی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر یسریٰ کے حواس منتشر ہوئے۔

"پردیس میں اک پیارے سے انسان کو بے حال کر کے تم اتنے سکون سے چائے کیسے پی سکتی ہو۔"

وہ غصے سے تلملاتی ہوئی اس کے سر پہ آن دھمکی۔ وہ چھوٹی بہن کو کچھ دیر تک دیکھتے رہنے کے بعد صوفے سے اٹھی۔

"اوکے۔" پھر وہ ٹہل ٹہل کے چائے پینے لگی۔ ساتھ ہی اضطرابی کیفیت میں دوسرا ہاتھ کبھی بالوں میں پھنساتی، کبھی چہرے کو چھوتی۔ "اب آپ اور وہ پیارا انسان خوش ہو جائے کہ میں پرسکون نہیں ہوں۔" وہ تپ کر اور سلگ کر بولی تھی۔ (وہ بھی اپنے مزاج کے برعکس) وہاں چند لمحوں کو مہیب سناٹا چھا گیا۔

یسریٰ کے چہرے کا رنگ بدلا۔ اس نے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے۔

"میرے ساتھ یہ ظلم ہوا کہ ہوش سنبھالتے ہی اپنا نام منگنی شدہ افراد میں پایا ہے۔ اب میں تیس سال کی ہو چکی ہوں۔ ٹھیک ہے، بابا بہت سی چیزوں میں غلط ہوں گے۔ مگر یہاں میں ان کی ہم خیال ہوں کہ ابوبکر کو اب فیصلہ کر لینا چاہیے۔ ذرا یاد کرو، اسے پاکستان آئے چار سال تو گزر چکے ہوں گے۔"

وہ ذرا دیر کو خاموش ہوئی۔

یسریٰ نے بھی نگاہ جھکا کر اک تھکا تھکا سا سانس لیا۔

"اب یہاں اور انتظار نہیں ہو گا۔"

یسریٰ کی آنکھوں میں بے یقینی ابھری۔ اقصیٰ نے آنکھوں میں آئی نمی صاف کی۔

"تم...... تم ابوبکر کو چھوڑ دو گی؟" وہ بے یقینی کی کیفیت میں ہی بولی۔

"میری شادی ہونے تک بابا تمہارا رشتہ کہیں نہیں کریں گے۔ اب تک تمہارے لیے آیا ہوا ہر پروپوزل میری وجہ سے رد کر چکے ہیں۔" اس کی خاموشی ٹوٹنے میں تھوڑی دیر لگی تھی۔

"بابا بھی تو توفیق انکل سے سیدھے منہ بات نہیں کرتے۔" یسریٰ کے کمزور لہجے میں ہلکی سی جرح اب بھی تھی۔ سو اس نے مختصر سا سچ بہن کے گوش گزار کیا کہ شاید دل کچھ نرم پڑ جائے۔

"تو...... انکل کون سا بابا کو سر آنکھوں پہ بٹھاتے ہیں۔" وہ استہزائیہ ہنسی۔

"ہو سکتا ہے، کبھی ماضی میں یہ لوگ جب آپس میں ملتے ہوں تو محبت اور عزت سے پیش آتے ہوں۔ مگر اب تو پچھلے کئی برسوں سے میرا اور ابوبکر کا رشتہ انہیں ساتھ گھسیٹنے پر مجبور کر رہا ہے۔" اس کی آواز ہلکی کپکپاہٹ کا شکار ہوئی۔

یسریٰ کا دل اداس ہوا۔ اس نے بہن کا کندھا محبت سے چھوا۔

"مگر میں انیب سے مل کر حیران ہوئی۔" ذرا توقف کے بعد وہ دوبارہ بولی تو آواز میں تازگی تھی۔ "یوں لگ رہا تھا جیسے کل ہی یہاں سے اٹھ کر گیا ہو۔"

یسریٰ کی دھڑکنیں بے ربط ہوئیں۔

"تم دونوں یہاں کھڑی کون سی گتھیاں سلجھا رہی ہو۔" وہ جو کہنے والی تھی وہ اٹھ کر گیا تھا یا حلق پہ گیا تھا۔ دادی کی آمد کے ساتھ بات ہونٹوں میں ہی دبا لی جو ابھی نہا کر آئی تھیں۔ "لگتا ہے کانوں میں روئی ٹھونس رکھی ہے۔" اس نے ان دونوں پہ اچٹتی نگاہ ڈال کے اپنا تخت پوش سنبھالا۔

"ہم ابوبکر کی باتیں کر رہے تھے۔" یسریٰ نے ان کے پہلو میں بیٹھتے ہوئے سچ بولا۔

"ہمارے زمانے میں اپنے منگیتروں کا نام مجال ہے جو زبان پر آتا ہو۔ انہوں نے اقصیٰ کو گھورا...... اسی وقت تکیے کے پاس پڑا ان کا سیل فون بج اٹھا۔

"منورہ! ذرا کمرے سے میری عینک لانا۔" کام والی کو آواز دینے کے ساتھ ہی فون اقصیٰ کو تھمایا۔

"پوچھو تو سہی کون ہے۔" اسکرین پہ جگمگاتا نمبر نیا تھا مگر اقصیٰ نے کال ریسیو کر لی۔ رابطہ قائم ہو جانے کے بعد اس کے ہونٹوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ رینگی۔

"جی، میں اقصیٰ ہوں۔"

"کچھ خیال آ گیا، ہمارا بھی۔" رسمی حال احوال کے بعد اس نے ہلکا سا شکوہ بھی کر ڈالا۔

"جی دادی قریب ہی ہیں۔ انیب کا فون ہے۔" اس نے دادی کو فون پکڑاتے ہوئے سرگوشی کی۔

یسریٰ نے خواہ مخواہ کان ساتھ لگایا۔ دادی گلال بھرے چہرے کے ساتھ ہم کلام تھیں۔

"ہاں...... ہاں کیوں نہیں، تمہارا اپنا گھر ہے...... اوہو، پیچھے تو ہٹو۔" یسریٰ کو گھرکا۔

"ارے نہیں، یسریٰ کو کہہ رہی ہوں، کان میں گھسی جا رہی ہے۔"

"اف دادی!" وہ خجل سی ہو کے پرے ہوئی۔ پھر دل کو سختی سے ڈانٹا۔ اٹھنے میں دیر نہیں لگائی، پھر دھیمی چال سے آبخوروں کی جانب بڑھی۔

یسریٰ کی وہ عمر کسی کو محسوس کرنے یا محبت کرنے کی نہیں تھی، جب انیب ان کے گھر آتا جاتا تھا۔ اس کے کراچی آنے پر وہ اپنے ہر کھیل میں اس کو ضرور شامل کرتی تھی۔ وہ سنسان دوپہروں میں چڑیا پکڑنے کے لیے گھات لگا کے دم سادھ کے بیٹھتے تھے۔ انیب چڑیا پکڑ لیتا تھا اور وہ منہ بسورتی رہ جاتی۔ وہ آبخوروں کی زنجیریں کھینچ کر پیاسے پرندے اڑایا کرتے تھے۔

''بیڑا غرق ہو اس دوپہ کا۔'' آج بھی اکثر سناٹوں میں سفینہ آنٹی کی پرجوش آواز دل میں ادھم مچایا کرتی تھی۔

''خالہ اماں ایسریٰ کو میں اپنے انیب کی دلہن بناؤں گی۔'' تیرہ سالہ یسریٰ مہندی کا پیالہ سامنے رکھے کسی میگزین سے ڈیزائن دیکھ کے منورہ بوا کی بڑی بیٹی نجو کے ہاتھ پہ مہندی لگا رہی تھی۔ جس کی بارات دو دن بعد تھی۔ اس نے ٹھٹک کے، مڑ کے سفینہ آنٹی کو دیکھا۔ پھر بغور نجو کو، جو بہت خوش تھی۔ وہ مہندی کا پیالہ وہی چھوڑ چھاڑ ان دونوں کی طرف بھاگی۔

''میں نے تو ابھی میٹرک بھی نہیں کیا۔ پھر میری شادی کیسے ہو سکتی ہے۔'' اس نے آنکھیں پٹپٹا کر معصومیت سے کہتے ہوئے ان دونوں خواتین کے حواسوں پہ بم گرائے۔ دونوں نے اپنے اپنے انداز میں منہ پہ ہاتھ رکھا۔

''ہائیں...... یہ تجھ سے کس نے کہا ہے۔''

دادی نے زور کا دھمو کا جڑا۔

''ابھی سفینہ آنٹی کہہ رہی تھیں کہ یسریٰ کو میں انیب کی دلہن بناؤں گی۔'' وہ کچھ ناراضی سے ٹھنک کر بولی تو سفینہ کو اتنی پیاری لگی کہ بے ساختہ ساتھ لپٹا لیا، جبکہ دادی کی آنکھوں میں غصے کا وہی عالم تھا۔

''ابھی تو میری گڑیا چھوٹی ہے۔ انیب کی دلہن تو بارہ سال بعد بنے گی۔'' وہ ہنس کر محتاط سے انداز میں بولیں۔ ''ان باتوں سے بچوں کے کچے ذہن بندھ جاتے ہیں سفینہ۔'' سلطنت آرا کا لہجہ از حد سنجیدہ تھا۔

''ہم تو آپس میں بات کر رہے تھے، مگر اس پریوں کی نانی کے کان بہت تیز ہیں۔'' سفینہ کی چہکتی آواز نے اس کی آنکھیں بھی کچھ تیز کی تھیں کہ پلنگ پہ ان دونوں خالہ بھانجی کے پیچھے لیٹا انیب یقیناً جاگ رہا تھا۔ وہ روشنی سے اندر آئی تھی، تو ہال کے ملگجے اندھیرے میں کچھ واضح نہیں ہوا۔ دادی نے اچانک اسے سخت نظروں سے تنبیہ کی۔

''خبردار جو یہ بات آگے پھیلائی۔'' انیب کی مسکراتی نگاہوں سے اس کی نگاہ یکلخت ہٹ کر دادی کی کرخت نگاہوں سے ٹکرائی۔ اس نے سہم کر اثبات میں سر ہلایا۔

''ورنہ کالی چڑیل کھا جائے گی۔'' دادی نے سرگوشی کی تو وہ الٹے قدموں سرپٹ وہاں سے بھاگی۔

نجو کی بارات اینکسی میں ہی آئی تھی، اس کے سسرال والے دلہن کے لیے ڈھیر ساری رنگ برنگی لش پش چیزیں لے کر آئے تھے کہ یسریٰ کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ رات سونے تک سفینہ آنٹی سے اکیلے میں ملاقات نہیں ہو سکی تو دوسرے دن اسکول جانے سے پہلے وہ ان کے بیڈروم میں آ گئی۔

''آپ نے نجو کی سسرال سے آئی ہوئی چیزیں دیکھی تھیں نا۔ ان میں سے ایک چیز بھی کم نہیں ہونی چاہیے۔ ہر چیز بالکل ویسی ہو۔'' وہ انگلی اٹھا کے ان سے تائید چاہ رہی تھی اور وہ واش روم کے دروازے کے پاس تولیے سے سر رگڑتا ماں کی مسکراہٹ پہ کھسیانا سا ہو کر ہنسا تھا۔

''مما! آپ بھی نا...... وہ کاسمیٹکس، وہ جیولری وغیرہ اس بلا کو جلدی گفٹ کر دیں۔''

انیب کی آواز نے دروازہ پھلانگتی یسریٰ کے پاؤں جکڑ لیے تھے۔ وہ اسے پلٹ کر جواب دینا چاہتی تھی۔

''جلدی آئیں چھوٹی بی بی! آپ لیٹ ہو رہی ہیں۔'' ان کا ڈرائیور فضل اسے ڈھونڈتے ہوئے کمرے کے دروازے تک آ چکا تھا، پھر آنے والے سال ڈیڑھ سال بعد، سفینہ آنٹی ثاقب ولا کے تمام مکینوں کو حیران پریشان چھوڑ کر رہبر انکل کے ساتھ رخصت ہو گئیں اور ایسی گئیں کہ محض خیال بن کر رہ گئیں۔

''میں اب اس گھر میں سفینہ کا نام نہ سنوں۔'' بابا کی وحشت زدہ آواز اس قدر پر تحکم تھی کہ دادی سمیت سب نے انہیں اپنی یادداشت سے نکال پھینکا...... مگر اسے اپنے کھیل تماشوں کے دوران اکثر انیب یاد آ تا۔

عمر کے ساتھ ساتھ یاد کی نوعیت بدلنے لگی۔ وہ

یاد آتا تو دل بے ربطی سے دھڑک اٹھتا۔ وہ یاد آتا تو اک ٹیس کے ساتھ حسرت کے ساتھ، وہ یاد آتا تو اسے وہ ستم زدہ رات بھی یاد آ جاتی جو زلزلہ نما تھی، جس میں ہر رشتہ نیست و نابود ہوا تھا۔ وہ اس رات ٹوٹ کے رویا تھا اور یسریٰ اس رات دادی اور سفینہ کے ساتھ تمام شب چھپ چھپ کے جاگی تھی۔

☆☆☆

نسیم حجازی کا ''آخری معرکہ'' پڑھتے ہوئے سلطنت آرا نے گھر میں بپا ہونے والا شور سنا، تو وہ کھلی کتاب بیڈ پہ پٹخ کر ننگے پاؤں باہر لپکی تھیں۔ لحاف میں دبکی اپنی پوتی کو انہوں نے اپنے پیچھے آتے نہیں دیکھا تھا ورنہ وہ اسے سختی سے ڈانٹ دیتیں کہ بستر میں واپس جاؤ۔ ان دنوں انیب بے حد پریشان رہتا تھا۔ دادی اور منورہ بوا بھی چپکے چپکے آنسو پونچھتی تھیں۔

''شعیب انکل نے سفینہ آنٹی کو طلاق دے دی ہے۔'' ایک دن اقصیٰ نے اسے بتایا تھا۔

سفینہ آنٹی اب ان ہی کے گھر رہ رہی تھیں۔ انیب ہر ویک اینڈ پہ ماں سے ملنے آ جاتا تھا۔ الجھا ہوا، گم صم سا، وہ ہر کسی کی طرف اپنی سرخ آنکھوں سے متوحش سا ہو کے دیکھتا تھا۔ تو اس رات دادی کے پیچھے باہر آ کر وہ فوراً دروازے کے پیچھے پردے کی اوٹ میں چھپ گئی تھی۔

لاؤنج میں قدم رکھتے ہی سلطنت آرا کی رنگت متغیر ہوئی۔

''کیا اعلا خاندان، معزز گھرانوں میں رات گئے اس قدر بلند آواز کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں۔'' ان کا وجود غصے سے لرز کر رہ گیا۔ اور ایسا کہتے ہوئے ان کی مٹھیاں بھینچ گئیں۔

''اپنی بھانجی سے پوچھیں کہ یہ ابھی کس کے ساتھ آئی ہے۔'' شعیب کی آنکھوں میں تحقیر اور لہجے میں طنز تھا۔ انیب کے چہرے کا رنگ اڑا۔

''انیب! آپ میرے کمرے میں جائیں۔'' اس کی حالت دیکھ کر سلطنت نے خود کو جلد ہی سنبھال لیا۔ وہ خالی نگاہوں سے ماں اور باپ دونوں کو گھور رہا تھا۔ پھر اس نے نانی کا حکم ماننے میں پل کی تاخیر نہیں کی۔ وہ اتنا تو باخبر تھی کہ انکل نے دوسری شادی بھی کر لی ہے۔ پھر وہ یہاں آ کر کیوں جھگڑا کر رہے تھے۔ انیب کو اندر بڑھتا دیکھ کر اس نے خود کو مزید پردے میں چھپا لیا تھا۔

''جس عورت سے تمہاری علیحدگی کو بھی چھ ماہ گزر چکے ہیں۔ تم اب تک اس کا پیچھا کیوں کرتے ہو۔'' دادی نے انہیں برف جیسی نگاہوں سے گھورا۔

''بڑی اماں! یہ محض اتفاق تھا کہ سگنل پہ ہماری گاڑیاں ایک ساتھ رکیں۔'' وہ متبسم آواز کے ساتھ جیسے صورت حال کا مزا لے بولا۔

''رہبر اور میری کلاس فیلو عشرت کے بیٹے کی آج انگیجمنٹ تھی۔ واپسی پہ رہبر نے مجھے آفر کی تو میں اس کے ساتھ ہی آ گئی۔ مگر اس کو کیا تکلیف ہے۔'' سفینہ نے غصے سے لال پیلی ہو کے اس بدکردار شخص کو گھورا۔

''رہبر کوئی لچا، لفنگا، راہ چلتا یا آوارہ نہیں ہے۔ وہ ہمارے ساتھ پلا بڑھا ہے۔ کیا غضب ہو گیا کہ سفینہ اکیلے آنے کے بجائے اس کے ساتھ آ گئی۔'' سیڑھیاں اترتے ہوئے برہان نے یہ بات کچھ یوں مشتعل ہو کے کی کہ اگلے پل شعیب سمیت سب سناٹے میں رہ گئے۔ ''اور آئندہ اس طرح منہ اٹھا کر میرے گھر آنے کی جرأت بھی مت کرنا۔''

باپ کی کرخت اور بے مہر آواز پہ یسریٰ کا دل چڑیا کی طرح کانپا۔ اس نے بے ساختہ انیب پہ نگاہ ڈالی، جو بیڈ پہ اوندھے منہ پڑا تھا۔

''برہان! تم اپنے کمرے میں جاؤ، مجھے بات کرنے دو۔'' جو بھی تھا، شعیب سلطنت آرا کے میکے سے تھا۔ وہ اسے یوں بے عزت کر کے گھر سے نہیں نکال سکتی تھیں۔

''جب تک میرا بیٹا یہاں ہے، مجھے یہاں آنے سے کوئی بھی نہیں روک سکتا۔'' شعیب کی اس بات نے جیسے بھڑکتے شعلوں کو ہوا دی تھی۔

''تو کس نے روکا ہے۔'' برہان تمسخرانہ ہنسے۔
''اپنے اعلا قبیلے کا چشم چراغ بھی ساتھ لے جاؤ۔''
باپ کے اس حکم پہ وہ شل سی کھڑی رہ گئی۔ اس نے کن انکھیوں سے انیب کو دیکھا۔ جو کتاب کے صفحات پر سر رکھے بے آواز آنسو بہا رہا تھا۔ یسریٰ کا دھیان اب لاؤنج سے آنے والی آوازوں پہ نہیں تھا۔ وہ جیسے پردے میں چھپی بے ہوش ہونے کے قریب ہو چکی تھی۔

دوسرے دن شام ڈھلے وہ اپنے تمام سامان سمیت اس گھر سے چلا گیا تھا۔

☆☆☆

''بوا جی! یہ سویرے سویرے اس قدر اہتمام کیوں ہو رہا ہے؟'' وہ کچن میں اپنے لیے چائے بنانے آئی تھی۔ منورہ بوا پوریاں تل رہی تھیں۔
''ذرا ٹائم دیکھو، دس سے اوپر جا رہا ہے۔'' شاہی ٹکڑوں پہ خشک میوہ جات سجاتی اقصیٰ نے اس کا موڈ بھانپتے ہوئے اسے چھیڑنا چاہا۔ کل اقصیٰ کا فیصلہ جان کر وہ بہن سے بول چال بند کر چکی تھی۔ اس کا خفا، خفا سا چہرہ دیکھ کر اقصیٰ دھیرے سے مسکرائی۔
''آج تمہاری دادی کا لاڈلا نواسا آ رہا ہے۔''
اندر کہیں اک خوشبو سی پھیلی۔ اس نے اپنے حلیے پہ اک اچٹتی سی نظر ڈالی۔ وہ فجر پڑھ کر دوبارہ سو گئی تھی۔ چائے بن چکی سو خاموشی برقرار رکھے باہر آ گئی۔ پھر قدم جیسے زمین سے بندھ گئے اور نگاہ پتھر ہو گئی۔
تخت کے دائیں جانب سنگل صوفے پہ بیٹھا وہ شخص کیا واقعی انیب تھا۔ وہ وہاں سے آدھے رخ سے نظر آ رہا تھا۔ لمبا سا دبلا پتلا وہ لڑکا اب ایک مکمل مرد میں ڈھل چکا تھا۔ وہ نگاہیں جھکائے دادی کی کسی بات پہ مسکرا رہا تھا۔ وہ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے ایک بازو صوفے کے ہتھے پہ رکھے، مخاطب کی بات انہماک سے سن رہا تھا۔ وہ گنگ سی کھڑی اسے کسی خواب کی طرح دیکھے گئی کہ دفعتاً دادی کی نگاہ اس پہ پڑی۔ وہ اگر کچن میں پلٹ کر جاتی تو یہ ایک عجیب حرکت ہوتی۔
''یسریٰ ادھر آؤ۔'' وہ پکار حسب معمول بارعب تھی، سو آگے بڑھنا لازمی تھا۔ وہ چونک کے سیدھا ہوا اور حیرت انگیز طور پر پورے رخ سے اس کی سمت مڑا، اسے یوں یک ٹک اپنی جانب دیکھتا پا کر وہ قدرے جھینپ کر لجا گئی۔
''اگر میں اسے نام سے نہ پکارتی تو کیا تم اسے پہچان لیتے؟'' سلطنت آرا کی آواز میں مسکراہٹ کی آمیزش تھی۔ وہ اک عجب سی امتحان میں ڈالنے جیسی بات تھی۔ اگر جواب ہاں میں ہوتا تو وہ یاد میں رہ جانے والوں میں شمار ہوتی۔
وہ سر جھٹک کے مبہم سا مسکرایا۔ یہ مرحلہ اچانک نانی کے سوال نے مشکل بنا دیا تھا۔ اس نے پیشانی کے ایک آڑے ترچھے بل کے ساتھ دونوں ابرو چڑھاتے ہوئے۔ ''اوں...... ہنہ'' سرنفی میں ہلا دیا۔ سامنے بیٹھی اس نروس ہوتی لڑکی کی بھیگی مٹھیوں سے کسی اور آشنائی کا موسم اڑ کے گم ہوا۔
''میرے خیال میں یسریٰ نے بھی تمہیں نہیں پہچانا۔ اسی لیے تو جھجک کے رک گئی تھی کہ دادی کے پاس بلند قامت کا شخص کون بیٹھا ہے۔'' اب کے وہ لب گول کر کے گردن جھکا کے مسکرا پڑا۔ پھر اچانک سر اٹھا کے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔
''کیا واقعی؟'' فوراً پوچھا، بے یقین لہجہ......
یسریٰ کو دادی کی انصاف پسندی پہ ٹوٹ کے پیار آ رہا تھا۔ اس نے ''جی'' کہتے ہوئے دادی کے اس جملے کی تائید میں زور، زور سے گردن اثبات میں ہلائی۔ وہ بھی نظر ملا کے جو کہ فوراً جھکانا پڑی۔ مسکراتی آنکھوں کی ہر پلک کی جڑ سے سورج طلوع تھا۔ اس چہرے پہ صبح کسی گہرے تعلق کی دھوپ سے تمتما رہی تھی۔
''خیر، تم پہچانتے بھی کیسے، بچپن میں اس کی ناک اس قدر پھینی ہوتی تھی۔ مجھے تو ہول اٹھتے تھے کہ کہیں یہ اپنی نانی پر نہ پڑ جائے۔'' اپنا یہ نادر خیال ظاہر کرنے کے ساتھ ہی دادی نے اپنے ملازم فضل کی جھلک دیکھ کر اسے آواز دے ڈالی۔ یسریٰ نے بری طرح سٹپٹا کے اسے دیکھا، جس نے تابعداری سے ''جی'' کہا تھا۔ اس کے بند ہونٹوں سے مسکراہٹ

چھن چھن کر پھوٹ رہی تھی۔ اس نے دادی پہ شاکی نظر ڈالی۔
''اور یہ کیا، ناشتے سے پہلے چائے؟'' انہوں نے پوتی کے ہاتھ میں چائے کا بھرا مگ دیکھ کے فوراً ٹوکا۔ ''چائے کی زیادتی اور نیند کی کمی نے ذرا جو لڑکیوں کے چہروں پہ رونق چھوڑی ہو۔'' سلطنت آرا کی لمبی آہ پہ وہ دل مسوس کر رہ گئی۔ اب کے فرماں بردار نواسے کی جانب سے جی کچھ زیادہ ہی ——— جی داری سے کہا گیا تھا۔
''ہنہ...... خود کو بھول چکا ہے۔ لمبا بانس ہوتا تھا۔'' اس نے جل بھن کر سوچا کہ اس کی یادداشت سے محو ہو جانے کا غصہ ابھی اترا نہیں تھا جو اس کے بل کھا کے پہلو بدلنے سے بھی عیاں ہو رہا تھا۔ دادی ابھی کچھ اور کہنے کا ارادہ باندھ رہی تھیں، جو فضل کو سامنے پا کر گھڑی بھر کو ملتوی کر دیا۔
''ہاں فضل! بتاؤ اب اصغری کا کیا حال ہے؟'' وہ فکر مند ہو کر پوچھنے لگیں۔
''جی، اب بہتر ہے۔'' مؤدب کھڑا فضل سنجیدگی سے گویا ہوا۔
''اسے چند دن اور اکبری سے دور رکھنا۔ نگوڑ ماری بیمار بہن کا دانہ دنکا بھی چگ جاتی ہے۔''
''جی اماں صاحب!'' فضل اب جیسے اگلے حکم کا منتظر تھا۔
انیب پہلے تو سمجھا کہ یہ فضل کی پوتیاں ہوں گی، مگر دانہ دنکا اسے سمجھا گئے کہ ضرور یہ مرغیوں کا جوڑا ہو گا۔
''نانی! یاد ہے آپ کی دو کبوتریاں رادھا اور میرا ہوا کرتی تھیں۔'' معزز مہمان کی مسکراہٹ اچھے حافظے کی چغلی کھا رہی تھی۔ وہ ششدر ہوئی۔ اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ یعنی باقی سب کچھ یاد ہے۔ وہ خود بھی اپنے مگ میں بچی چائے کی طرح ٹھنڈی ہوئی اور اپنی خفا آنکھوں کے ساتھ چند لمحے اسے دیکھا۔ جو تنی گردن کے ساتھ اجنبیت کا رنگ اوڑھ کے بیٹھا تھا۔
''سب جلدی سے تشریف لائیں۔ ناشتا لگ چکا ہے۔'' اقصیٰ نے ڈائننگ روم سے صدا لگائی۔
''تم نے بلایا اور ہم چلے آئے۔'' زین لاؤنج میں انٹری مارتے ہی گنگنایا۔ وہ زین کی بروقت آمد پہ خوش ہوئی۔ وہ یقیناً انیب سے پہلے مل چکا تھا۔ شاید اس کے گھر میں یا پھر آفس میں، اس کا ناشتے کا موڈ بالکل بھی نہیں تھا۔ سو وہ چپکے سے وہاں سے کھسک گئی۔
''تو کیا وہ یہ سمجھ کے بیٹھی تھی کہ وہ دیوداس کی طرح ملتے ہی وقت کا حساب کتاب اس کے سامنے رکھ دے گا۔'' کمرے میں آ کر ٹھنڈے دل سے سوچا تو اپنے پاگل پن پہ ہنسی آ گئی۔ وہ آگے بڑھ گیا تھا، وہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے تھی۔ اب وقت ثابت کرتا کہ وہ رکے گا یا چند دن آنے جانے کے بعد دوبارہ اپنی دنیا میں لوٹ جائے گا۔

☆☆☆

اس نے تیرہ سالوں بعد انیب شعیب کو دیکھا تھا اور فوراً پہچان لیا تھا، اس کے وجود سے پھوٹنے والی مہک میں آشنائی تھی۔
اس شام کے بعد برہان نے اسے آج دیکھا تھا۔ وہ ان کی ماں کے پہلو میں پورے استحقاق کے ساتھ براجمان تھا۔ وہ برہان کو دیکھ کر احتراماً کھڑا ہوا۔
''میں فلاں شخص یا فلاں خاندان سے قطع تعلق کرتا ہوں۔'' اگر دنیا کی کسی منڈی میں ایسی بولیاں لگتیں تو پروفیسر صاحب کی بولی سب سے بھاری ہوتی۔ کم از کم اس ایک خاندان سے لاتعلقی اختیار کرنے کو وہ اپنی تمام جمع پونجی لٹا دیتے۔ انیب کے سلام کا جواب بھی انہوں نے سر کے خفیف اشارے سے دیا تھا۔
حسب معمول یسریٰ نے باپ کے گھر آتے ہی انہیں پانی کا گلاس پیش کیا اور اب گلاس خالی ہونے تک اسے وہیں کھڑے رہنا تھا۔ پانی کو گھونٹ گھونٹ پینے والا شخص آج بنا سانس لیے گلاس خالی کر چکا تھا، مگر تلخی جیسے حلق کے بیچ ہی تھی۔ یسریٰ کے لیے باپ کا یہ عمل حیران کن تھا۔
ماں سے کچھ رسمی بات چیت کے بعد وہ اٹھنے

کے لیے پر تولنے لگے۔ ابھی دائیں ہتھیلی پہ وزن ڈال کر ذرا سا اٹھے ہی تھے۔

"سر! میں نے آپ کی بک "روئے زمین" چھ بار تو ضرور ہی پڑھی ہوگی۔" انیب کی آواز میں سنجیدگی تو تھی ہی اور بھی بہت کچھ تھا جو کتاب کے مصنف نے محسوس کیا۔ انہیں زندگی میں پہلی بار اپنے باسماعت ہونے پہ دکھ ہوا۔ کاش وہ کہہ سکتے مجھے تو کچھ سنائی نہیں دیتا۔

"میں آپ کی پہلی کتاب "قافلہ انساں" یاد نہیں پڑتا کہ کتنی بار پڑھ چکا ہوں۔" اس کے لہجے سے ہی ان کتابوں کی پسندیدگی کا اندازہ بخوبی ہو رہا تھا۔ وہ اٹھنے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے صوفے پہ ٹک سے گئے۔

"صفحہ نمبر اکتیس پر آپ نے کیا خوب صورت بات کی ہے۔ اس روئے زمین پر دل سے مسکرانا ایک آزاد سانس لینا اور پھر سے مسکرانا، ہر انسان کا حق ہے۔ اس مسکراتے ہوئے انسان کو کسی ایسے شخص کا مل جانا جو اسے ناپسند ہو یا وہ مقابل کو ناگوار گزرتا ہو ان کے درمیان دعاؤں کا تبادلہ ہی اصل انسانیت ہے۔ انسانیت کی بقا کی پہلی سیڑھی یہ ہی عمل ہو سکتا ہے۔"

انیب کے سنجیدہ چہرے پہ مسکراہٹ گہری ہوئی اور برہان کا ضبط پانی ہوا تھا۔ اگلے پل انیب نے انہیں وہاں سے اٹھتے دیکھا۔

"مجھے ایک ضروری کال کرنی ہے۔" انہوں نے پھر سے اجنبیت کا لبادہ اوڑھ لیا۔

"جی ضرور۔" وہ بھی اٹھتے ہوئے سر کو ذرا خم دے کر بولا۔ پروفیسر صاحب کے نظر آنے تک وہاں خاموشی کا راج رہا۔

"انیب! آپ اس قدر مشکل کتابیں بھی پڑھتے ہیں؟" اقصیٰ نے اسے استعجاب سے دیکھا۔ وہ جواباً مسکراتا رہا۔

"زین نظر نہیں آ رہا۔" اس نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی کہ جیسے واقعی زین کو ڈھونڈ رہا ہو اور نانی وہ آپ کا طوطا درویش صفت کب اڑا تھا؟" اس نے داخلی دروازے سے اندر آتی یسریٰ کے ہاتھ میں پنجرہ دیکھ کر یوں ہی چٹکلہ چھوڑا۔

"ارے کیا یاد دلا دیا بچے۔" نانی نے صدمے سے چور آہ بھری۔ "اڑا کب تھا۔ یسریٰ نے اڑا دیا تھا۔"

وہ جو ان کے قریب سے گزر رہی تھی، بوکھلا کے نانی کو دیکھا۔ "اب یہ انہیں پوری کہانی سنائیں گی۔" پیر پٹختی آگے بڑھ گئی۔

"دوسرے دن اک موٹا تازہ چڑا پنجرے میں بھر کے کہنے لگی، دیکھیے دادی! جانے یہ چڑا کیسے بن گیا۔"

اقصیٰ اور انیب کا مشترکہ قہقہہ آبخورے کے پاس کھڑی یسریٰ کا دل جلا گیا۔ وہ تیزی سے مڑی۔

"انہیں یہ بھی بتائیں نا، اک دن خود ہی درویش صفت واپس آ گیا تھا۔" وہ خفا انداز میں چڑ کر بولی اور خالی پنجرہ دوسرے ہاتھ میں لیا۔

وہ ہاتھوں کی قینچی بنا کر سر اس پہ ٹکائے ڈھیلے سے انداز میں ٹیک لگائے ہوئے تھا اس کی واپسی پہ سیدھا ہوا۔

"یہ جو آپ خالی پنجرہ ساتھ میں لیے پھرتی ہیں اوپر سے جادو ٹونے الگ تو پھر اڑنے والوں نے واپس تو آنا ہوتا ہے۔" شرارت سے بھرا لہجہ اوپر سے وہ اخروٹی رنگ آنکھیں بھی شرارت سی مسکرا رہی تھیں۔ وہ گڑبڑا کر نگاہ چرا گئی۔ سلطنت آرا فضل سے کسی بات پہ الجھ رہی تھیں خالی پنجرے کا راز نہ جان سکیں کہ یسریٰ نے پھر تیتری اڑا دی تھی۔

☆☆☆

وہ سرخ روش پہ تھکے تھکے قدم اٹھاتی برآمدے کی ایک سیڑھی پہ بیٹھ چکی تھی اور نظریں موڑ کر کسی سوچ میں ڈوبی چھوٹی بہن کو دیکھا جس نے اسے اپنے ساتھ بیٹھا دیکھ کر گھٹنوں پہ پڑی بھاری کتاب کو کھولنا چاہا جو اس کے ارادوں پہ پانی پھیرتے ہوئے اقصیٰ نے اس کے ہاتھ سے جھپٹ لی۔

"تم نے اپنی فیصد شوق بابا کے چرائے ہیں، مگر مزاج رتی برابر بھی نہیں اور یہی بات مجھے حیرت سے پاگل کرنے لگتی ہے۔"

وہ ہنسی اور اس نے یسریٰ کا کپکپاتا چہرہ دلچسپی سے دیکھا جو باپ سے ناراض تھی۔ بہن سے بھی ناراض تھی۔ رات کو پروفیسر صاحب نے اعلان کر دیا تھا کہ اگلے ہفتے ان کے دوست کی فیملی اقصیٰ کو دیکھنے آ رہی ہے۔

"چلو کچھ تو تمہیں بھی پاگل کرتا ہے۔ ابوبکر تو نہیں کر سکا حیرت ہی سہی۔" یسریٰ نے اسے تپانے اور بھڑکانے والی مسکراہٹ لبوں پہ سجا کے دیکھا۔

"اور بابا کا مزاج میں کبھی چرانا بھی نہیں چاہوں گی۔" وہ سابقہ انداز سے ہٹ کر بولی کہ اقصیٰ ہنوز سکون و صبر کی دولت سے مالا مال تھی، تلخ لہجہ، تند آواز جس میں اکتاہٹ اور بےزاری نمایاں تھی۔ اقصیٰ گنگ سی اسے دیکھتی رہ گئی۔ نرم روئی، نرم گوئی جو اس کی شخصیت کا خاصہ تھی وہ آج کسی دہلیز کے طاق پہ دھرے ان سونے برآمدوں تک چلی آئی تھی۔

"پتا نہیں بابا نے دلوں کو توڑنے کا ہنر کہاں سے سیکھا ہے۔"

ایک ہلکے سے توقف کے بعد وہ بولی تو اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ اقصیٰ نے اسے دکھ سے دیکھا۔ وہ باپ کے نقش قدم پہ چلتے ہوئے تاریخ میں پی ایچ ڈی کر رہی تھی۔ وہ خود بھی کسی قدیم ادب کے مصرعے کی طرح تھی جلد سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ نیند کی مانند جانے کب غالب آ جائے۔ آج وہ ان سونے سنسان برآمدوں کا حصہ لگ رہی تھی جن کے باریک پردوں سے گرمیوں کی آخری آندھی کی گرد ابھی جھڑی نہیں تھی۔ شمالی سمت ان برآمدوں کی صفائی آصفہ کرتی ہوگی۔ تب ہی تو ہر جگہ گرد سے اٹی پڑی ہے۔ اقصیٰ نے پردہ چٹکی میں بھر کر ہلکا سا جھاڑا۔

"دادی اور مجھے موسم کے ساتھ حالات بدلنے کی بھی امید ہے۔" وہ یک لخت اپنی ازلی نرم آواز میں کسی کلی کی طرح چٹک کے گویا ہوئی۔

اقصیٰ کا منہ بےیقینی سے کھلا۔ اس نے یسریٰ کا رنگ بدلتا مزاج تھم کے دیکھا۔ جس کی چہرے پر امید، پہلی تاریخ کے نئے نویلے چاند کی طرح اچانک ابھری تھی۔

"دیکھنا وہ جلد آ جائے گا۔" اس نے محبت سے منہ بگاڑ کر کہا تو اقصیٰ نم آنکھوں کے ساتھ ہنس دی۔

☆☆☆

سلطنت آرا رات سے سر پہ پٹی باندھ کے پڑی تھیں۔ وہ بیٹی کو بار ہا فون کر چکی تھیں۔

"آپ کا ملایا ہوا نمبر فی الحال بند ہے" ہر بار یہ ہی جواب ملتا۔ سو آج آس امید کی تمام کشتیاں ثاقب ولا میں غرقابی کی جانب گامزن تھیں۔

دادی سے جب کچھ اور نہ بن پڑا تو شام ڈھلے انیب کو فون ملایا۔

"ابوبکر سے کسی طور بھی رابطہ کر دو ورنہ....."

اور نانی کی "ورنہ" میں بات، قطرہ قطرہ ٹپک رہی تھی کہ اس ملول لہجے نے اس کا دل وحشت زدہ کر دیا۔ اب بھلا گھر کون بیٹھتا۔ ایک گھنٹے بعد وہ ثاقب ولا میں موجود تھا۔

"ابھی ایک ہفتے میں چھ دن پڑے ہیں نانی، آپ پریشان مت ہوں۔ ابوبکر سے میری بات ہو چکی ہے۔" مطمئن سا تھا۔

"میری بھی اپنے دوست کی فیملی سے بات ہو چکی ہے۔" جانے پروفیسر صاحب کب اندر تشریف لائے۔ ان کی ٹھنڈی ٹھار آواز نے انیب کا سکون بھک سے اڑا دیا۔

"اماں کو صبر آ جائے گا کہ ابھی ایک ہفتے میں چھ دن پڑے ہیں۔" انہوں نے انیب کا جملہ کسی لٹھ کی طرح اس کے منہ پہ مارا تو وہ نظر جھکا کے رخ پھیر گیا کہ چہرے پہ ہتک کے مارے سرخی آ گئی تھی۔

یسریٰ کا دل دادی کے آنسوؤں سے پانی، پانی تو مزاج باپ کی باتوں سے جنگجو ہوا۔ فیصلے پہ پہنچ کر مضبوط قدموں سے باپ کے کمرے میں گئی۔ وہ جو ہمیشہ اپنے بیڈ روم میں اس کا استقبال مسکرا کے کرتے تھے کہ وہ ان سے تھیسز ڈسکس کرنے آتی تھی۔ کمرے میں سگریٹ کی ہلکی سی مہک تھی کہ ان کا باپ یہ شوق اکیلے میں ہی پورا کرتا تھا۔ وہ چاہنے پر بھی آج

مسکرا نہیں پائے۔ وہ بلا اجازت ہی ان کے سامنے ٹک گئی۔ انہوں نے سوالیہ اور منتظر نگاہوں سے بیٹی کو دیکھا جو باپ کی بھاری غلافی آنکھوں پہ نظر جما کے بیٹھی تھی۔ برہان کا دل الہامی انداز میں دھڑکا۔

''بابا...... رشتوں کا ٹوٹ جانا کیا اک نامحسوس عمل ہے۔ کیا تعلق کا ٹوٹ جانا تکلیف دہ نہیں ہوتا؟'' وہ کرب سے اور اذیت سے لب کشا ہوئی۔

بیٹی نے یہ کیسا سوال کیا تھا۔ سینہ درد سے جیسے دہک اٹھا۔ بھلا ان سے بڑھ کر یہ تکلیف کون جان سکتا تھا۔ انہیں یسریٰ سے اس قسم کی گفتگو کی توقع نہیں تھی۔ وہ اپنے حال میں مست الست رہنے والی ہستی تھی۔ پھر کیا تھا کہ وہ اپنی بہن کا کیس لڑنے باپ کے مقابل آ چکی تھی۔

ابوبکر کی ماں جو یسریٰ کی اکلوتی پھوپھی تھیں جن سے وہ اپنی زندگی میں شاید دس دفعہ ملی ہو۔ تو پھر کیا اماں کی ایما پہ۔ جو ریت کی مانند بکھرے اڑتے رشتوں کو بھی سمیٹ ہی نہیں پائیں اور اگر یہ دونوں حوالے یسریٰ کو میرے سامنے نہیں لائے تو پھر اس کرب۔ ان آنسوؤں کی وجہ کیا ہے جو اس وقت ان کی خوش باش بیٹی کے چہرے پہ رواں تھے تو کیا؟ ان کا دل مبہم سا کانپا۔ انہوں نے سر صوفے کی پشت پہ گرا لیا تو۔ کیا اقصیٰ کا دل بھی اس صحرائی قوم کے لیے دھڑکنے لگا تھا۔ کیا ابوبکر کی آنکھیں بھی دلوں کو خاک کرنے کا نسخہ جانتی تھیں۔ ان کا دل بے ساختہ سگریٹ سلگانے کو چاہا، مگر انہوں نے ممکنہ طور پر خود کو اس عمل سے روکا اور پھر خاموشی سے آنسو بہاتی بیٹی پہ بے چین نگاہ ڈالی جو پہلی بار ان کے پاس کوئی سوال لے کر آئی تھی۔

وہ اپنے معاملات اپنے ہاتھ میں رکھنے والے شخص تھے۔ پھر بھی وہ کبھی جیت نہیں پائے اور اب یسریٰ کی چاند جیسی امید کو اپنی ضد اور اپنی انا کی طرح اندھیرے میں نہیں دھکیلنا چاہتے تھے۔ کیوں ہر بار وہی کیوں جیت جاتے ہیں۔ دل نے تڑپ کے سرگوشی کی۔

''میں نے ہمیشہ اس قبیلے کے اونٹوں کو دور سے دیکھا۔ میں کبھی ان کی نکیل اپنے ہاتھ میں نہیں لے پایا۔ پھر میں کیسے جیت سکتا تھا۔'' انہوں نے دل کو لاجواب سا کر دیا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ اگر وہ سنڈے سے قبل آ جائیں۔'' یسریٰ کا فشار خون بلند ہوا۔ ''مگر اماں سے کہہ دینا میری بھی شرط یاد رکھیں۔''

خوشی کا پیمانہ بلند ہو کے جیسے زیرو پہ آیا تھا۔ سب سمجھتے ہوئے وہ مایوسی سے ایک دم کامیابی کی جانب اڑی تھی۔ وہ باپ کا شکریہ ادا کرتی خوش ہو کے ہی کمرے سے نکلی۔ وہ مڑ کے دیکھ بھی لیتی تو نہیں جان سکتی تھی کہ ان خاموش آنکھوں کے گیلے ساحلوں پہ یادوں کی بے درد لہریں کیسا، کیسا دھواں اگل رہی تھیں کہ سمندر میں اک آگ سی جل اٹھی تھی۔

☆☆☆

اس نے عرشے پر آ کر دیکھا۔ مومنہ اور اس کی بیوی دونوں مچھلی فرائی کر رہی تھیں۔ وہ عرشے پر پڑی کرسیوں کی جانب بڑھا۔ وہ خاصے آرام دہ موڈ میں کرسی پر پھیل کے بیٹھا۔ پھر چہار سو دیکھا۔

''کشف الہدیٰ نظر نہیں آ رہی۔'' اس نے اونچی آواز سے پوچھا۔

''ابھی انیب سے بات کر رہی تھی۔ شاید آگے نکل گئی ہو۔'' سفینہ نے بھی بلند آواز میں جواب دیا۔ ساتھ ہی چولہا بند کیا۔ وہ دونوں اب اس کی جانب بڑھ رہی تھیں۔ آج ساحلی موسم اچھا تھا۔ ہلکی ہوا سکون آور تھی۔ ''آہن کو اپنے پروگرام میں شامل کیوں نہیں کیا۔'' وہ قریب آئیں تو رہبر نے پوچھا۔

اسے مومنہ کی ذہنی حالت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی تھی وہ آسمان کی وسعتوں سے نیچے لپکتے بگلوں کو مڑ، مڑ کے دیکھ رہی تھی۔

''وہ شادی کی تیاریوں میں مصروف تھے۔'' جواب سفینہ کی طرف سے آیا کہ وہ شوہر کی جانب متوجہ تھی۔ یہ جانے وہ کب کی کسی بھی شے کو مڑ کے دیکھنا چھوڑ چکی تھی۔

''مومو بی...... ذرا یہاں آنا۔'' کہیں سے کشف الہدیٰ اچانک رونما ہوئی۔

''مومنہ پریشان ہے، اداس بھی ہے پھر اس نے یہ فیصلہ...... میرا مطلب حسام کو چھوڑنے کا فیصلہ کیوں کیا ہے؟'' رہبر ایک دم سنجیدہ ہوا۔

وہ متحیر ہوئی اور ساکت بھی پھر اچنبھے سے شوہر پہ نظر ڈالی۔ ''یہ تم کہہ رہے ہو۔ کیا تمہیں ایسا کہنا چاہیے؟'' اس کی دھیمی آواز شکوے سے بھری تھی۔ ''میں نے تمہیں اپنانے کا فیصلہ کیوں کیا تھا؟'' اس کی لبوں سے پھسلنے والا سوال بے ساختہ تھا۔

''میری بات اور تھی۔'' وہ جیسے ٹال گیا۔

''کسی کی بات بھی دو یا اور نہیں ہوتی...... جب عورت کی عزت پہ بن جائے تو وہ دوسرا کنارہ بھی ڈھونڈ لیتی ہے۔'' اس نے جیسے خود کلامی کی تھی۔

''مومنہ کی قسمت اچھی تھی کہ حسام نے آہن نام کے نشتر اسے شادی سے قبل چبھونے شروع کر دیے اور میرے انجام نے اس کی آنکھیں بروقت کھول دیں۔'' وہ جیسے جبراً مسکرائی۔ رہبر کے دل کو کچھ ہوا۔

''میں تم سے محبت کرتا تھا سفینہ!''

''اور میں تمہیں اپنا دوست سمجھتی تھی۔ یہیں تو تم نے غلط کیا۔ برا کیا رہبر!''

وہ ابھی کچھ اور بھی کہتی، مگر مومنہ اور اس کی بیٹی ان کے سر پہ پہنچ چکی تھیں۔

''کیا باتیں ہو رہی ہیں۔'' کشف کو وہاں ماحول کچھ سنجیدہ محسوس ہو رہا تھا۔ ان دونوں نے جلد ہی خود کو سنبھالا۔

''میں کہہ رہی تھی ساحل پہ کھڑے ہو کر پورا چاند دیکھنا ساحل کی جانب بڑھتے بحری جہاز سے زیادہ پرکشش ہوتا ہے۔''

آج سفینہ کو دوسری بار بھی جبراً مسکرانا پڑا۔

(اف یہ کس قدر مشکل ہے)

''اور میں کہہ رہا تھا کہ عورت بوڑھی بھی ہو جائے تو اسے بادل، چاند اور خواب پھر بھی اچھے لگتے ہیں۔'' رہبر بیٹی کا ہاتھ تھام کر اسے سامنے بٹھا کر بشاشت سے مسکرایا۔

''ویسے پاپا یہ مرد لوگ عورت کے اندر چھپے اس اسرار پہ اس قدر کڑھتے کیوں ہیں؟'' کشف اچھا خاصا منہ بنا کر باپ کو شکایتی نظروں سے دیکھنے لگی۔

(عورت جانتی ہی نہیں کہ اس سے بادل، چاند اور خواب کتنی جلدی چھن جاتے ہیں)

''پاگل عورت!'' وہ بڑبڑائی۔ مومنہ بچی نہیں تھی وہ سمجھ چکی تھی کہ سفینہ کی ہلکی گیلی آنکھوں نے سمندر سے نمی نہیں لی تھی۔ یاد کا کوئی گیلا جھونکا اسے چھو کے گزر چکا تھا۔

☆☆☆

''رہبر ٹھیک ہی کہتا ہے۔ ہر عورت کے اندر اک چکور چھپا ہوتا ہے۔''

رات کا کھانا کھانے کے بعد وہ دونوں کافی کے مگ تھامے عرشے کے کنارے، کرسیوں پر بیٹھی تھیں۔ دور فاصلے پہ کوسٹ گارڈ کی کشتی اپنے معمول کے گشت پہ آ جا رہی تھی۔ عرشے پہ ابھی بھی تلی ہوئی مچھلی کی مہک تازہ تھی۔ وہ اور مومنہ پچھلے دس سالوں سے ہمسائیگی کے رشتے میں بندھی تھیں۔ مومنہ امریکا ہی کی پروردہ تھی اور سفینہ وطن بدر تھی۔ بقول مومنہ کے جب وہ چار برس کی تھی تو چھ سالہ آہن کی فیملی ملائیشیا سے آ کر ان کے مغربی سمت والے گھر میں شفٹ ہوئی تھی۔ یوں آہن سے اس کی دوستی برابر پروان چڑھتی رہی۔ (رہبر میری خالہ کا ہمسایہ تھا اور میرے بچپن کا دوست)

مومنہ کی منگنی امریکا میں مقیم اپنے کزن کے ساتھ بچپن میں ہی طے ہو چکی تھی۔ میری بھی (شعیب سے بچپن کی نسبت تھی) مومنہ کی منگنی کچھ عرصہ پہلے ٹوٹ چکی تھی (مگر میری شعیب سے شادی ہو گئی تھی) مجھے آہن سے محبت نہیں تھی (مجھے بھی رہبر سے محبت نہیں تھی) حسام کہتا تھا صرف تمہارا دوست نہیں (شعیب بھی کہتا تھا) مگر یہ صرف شک تھا۔

''حسام کا شک کسی حد تک نہیں سو فیصد درست تھا موی...... تمہیں پتا ہے مرد اور عورت کی دوستی

پگھلتی، سلگتی شمعوں کی طرح ہوتی ہے جب دوستی کا موم پگھل جاتا ہے تو اس موٹی ڈھیر میں سے تپی تپی محبت جھکنے لگتی ہے۔ ایسا بھی یک طرفہ ہوتا ہے اور بسا اوقات دونوں جانب بھی یہ ہی فیلنگز ہوتی ہیں۔ مرد کبھی عورت کا دوست ہو ہی نہیں سکتا۔ اس فرینڈ شپ کا اصل چہرہ اٹریکشن یا پھر محبت ہے۔" "یہ ہی تو ہماری خوش فہمی ہوتی ہے جو ہم عورتوں کو لے ڈوبتی ہے تب ہی تو ہمارا معاشرہ مرد عورت کی دوستی پہ ہنستا ہے، تسلیم ہی نہیں کرتا کیونکہ یہ رشتہ اسلامی اقدار کے منافی ہے۔ عورت دھوکا کھا جاتی ہے۔ اسے مرد سے دوستی جیسی بہادری بہت مہنگی پڑتی ہے۔"

کبھی اس میں اور مومنہ میں یہ باتیں ڈسکس ہوتی تھیں، مگر آج مومنہ اس سے کچھ اور سننا چاہتی تھی کچھ اور جاننا چاہتی تھی۔

☆☆☆

''وہ بہت عجیب رات تھی۔ وہ خوش فہمیوں کے لبادے تار تار کرنے والا پل تھا۔ اس رات مجھ پہ منکشف ہوا کہ جس گھر میں، میں قدم جما کر کھڑی تھی، وہاں شعیب کے بیٹے کے لیے رتی بھر جگہ نہیں تھی۔ انیب کے لیے برہان کی نفرت دیکھ کر میں شاکڈ رہ گئی تھی جب اولاد کے سامنے شوہر عدالت لگاتا ہے تو عورت بے توقیر ہو کر بدنامی کے ریلے میں خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتی ہے۔ میں سترہ سالوں تک شک کے اس سیلاب کے آگے بند نہیں باندھ پائی تھی۔ ہم الگ ہو گئے تھے۔ میں نے تو یہ بھی نہیں چاہا تھا۔

پھر رہبر اندر چلا آیا۔ شاید وہ دروازے سے باہر کھڑا تھا۔

''ہاں میں نے پورے وقار اور عزت کے ساتھ اس عورت سے محبت کی ہے۔'' وہ پورے قد کے ساتھ شعیب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بولا تھا اور اس نے میری سماعت میں بدترین حیرت انڈیلی تھی۔ اس کے اعتراف محبت نے مجھے برہان کی نظروں میں بے اعتبار کر دیا تھا۔'' مومنہ بری طرح چونکی۔ یہ سفینہ کے لبوں کو چھونے والا نیا نام کس کا تھا۔ وہ ذرا سانس ہموار کرنے لگی۔

''دونوں مردوں نے مجھے ٹھکرا دیا تھا۔ ایک وہ جس سے میں نے شادی کی۔ ایک وہ جس سے میں نے محبت کی۔ اب سوچتی ہوں کہ میرا وہ انتقامی فیصلہ درست نہیں تھا۔ میرا بیٹا جوان ہو رہا تھا، زندگی اس کے ساتھ اس کے سہارے سہل گزر جاتی، مگر انسان کم فہم اور جلد باز ہوتا ہے۔ میں ان دو مردوں کو منہ کے بل گرانے کے لیے تیسرے شخص کی زندگی میں شامل ہو گئی جو واقعی مجھے چاہتا تھا۔ جس کے گھر میں میرے بیٹے کے لیے آج بھی گنجائش ہے۔''

اس کا رواں سانس نقاہت کا شکار ہوا۔ مومنہ جیسے بے چینی سے اس کے خاموش ہونے کی منتظر تھی۔

''برہان کون تھا؟'' اس نے دھیمی سرگوشی کی اور سفینہ کی سانس جیسے نزاعی حالت پہ کانپی۔

مومنہ نے دیکھا اس کی بے کل آنکھوں میں اک آوارہ سا ساحلی جھونکا اترا۔ پھر آنسوؤں کے پانی میں پانی ہی بن گیا۔

☆☆☆

بیٹی اور داماد کی آمد کے ساتھ ہی سلطنت آرا شادی کی تیاریوں میں دوبارہ جوان ہو گئی تھیں، جس میں اقصیٰ اکثر و بیشتر یسریٰ کو بھی شامل کر لیا کرتی۔ ان کی روشن خیال اور معتدل مزاج بیٹی مہ پارہ (جو اقصیٰ کی ساس تھی) انہیں روکنے ٹوکنے کا عمل بھی جاری رکھے ہوئے تھی

''اماں پلیز کچھ مت خریدیں۔ اقصیٰ تو ان شاء اللہ ہمارے ساتھ چلی جائے گی یہ جہیز وغیرہ پاکستان میں پڑا رہ جائے گا۔''

''ہاں تو خیر سکھ سے سو سال پڑا رہے۔ خدانخواستہ کوئی چیز اڑ تو نہیں جائے گی۔ سالوں بعد دیکھنے پر بھی ایک عورت کو جو محبت اپنے جہیز سے ہوتی ہے اس کا سرور ہی الگ ہے۔''

آج مہ پارہ پوری فیملی سمیت بطور خاص میکے میں ڈنر پہ مدعو تھیں۔ یسریٰ کی اک ذرا ہمت نے

حیرت انگیز طور پر حالات بدل دیے ورنہ جانے کیا ہو چکا ہوتا۔ وہ اب بھی یسریٰ کا یہ کارنامہ انیب سمیت حاضرین محفل کے گوش گزار کر رہی تھیں۔" یہ لڑکی بالکل اپنے دادا جیسی ہے۔ دیکھنے میں کم گو اور فقیرانہ سی مگر زیادتی اور ناانصافی کسی طور قبول نہیں کرتی۔" پس پردہ وہ اپنے میکے والوں پر اپنے مرحوم شوہر کی خوبیاں منکشف کر رہی تھیں (کہ تم لوگوں نے یوں ہی بیر باندھے رکھا) "چاہے سورج شمال سے طلوع ہو جائے، یسریٰ غلط فیصلوں پہ سرینڈر نہیں کرتی۔" انیب اس کی ان خوبیوں سے آج دوبارہ متعارف ہو رہا تھا جو کہ نانی اسے پہلے ہی فون پہ بتا چکی تھیں۔ اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی بے اختیار اسے دیکھا جو گلابی چہرے کے ساتھ دادی کو اس موضوع سے ہٹنے کا اشارہ کر رہی تھی۔ (لو......دادی مجھے خواہ مخواہ ہی نمرہ احمد کے ناول حالم کا وان فاتح ثابت کرنا چاہتی ہیں)

توفیق کی انیب سے سال بعد ملاقات ہو رہی تھی۔ وہ اس کے قریبی رشتہ دار تھے، مگر انیب ان کے نجی فنکشنوں میں کبھی شرکت نہیں کرتا تھا۔ وہ آج بھی توفیق سے مودب ہو کر ملا تھا اور حال احوال بھی خوش مزاجی سے دریافت کیا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ اسے برہان کے گھر دیکھ کر توفیق اپنی حیرت کمال ضبط سے چھپا گئے تھے کہ پہلی نظر پڑتے ہی دھچکا بلا کا لگا تھا۔

بات ابھی اور بھی آگے بڑھتی کہ برہان کی آمد پر وہاں موجود تمام نفوس مضطربانہ سا پہلو بدل کر رہ گئے۔ ان کی شخصیت میں آج بھی تلخ سی سنجیدگی اور سرد مزاجی تھی۔ توفیق نے دیکھا کہ آج بھی ان کے نقوش میں اک تناؤ اور چہرے پر کھردرا پن نمایاں تھا۔ وہ آج ان سب کے مقابل صاحب اختیار افراد کی لسٹ میں تھے۔ برہان اور توفیق انتہائی پرتکلف انداز میں ایک دوسرے سے مخاطب ہوئے اور چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد شادی کی تاریخ فائنل کر لی گئی۔ برہان بالآخر جیت چکے تھے۔ ان کی شرط پوری ہو گئی تھی۔ بیٹی نے ماں کو گلے لگا کر مبارکباد دی اور انیب بھی نانی کی بغل میں جیسے گھسا ہوا تھا۔ زین باپ کی موجودگی میں فی الحال انسانیت کے چولے میں ہی بیٹھا تھا اور رمیض کو فنکشن کی مناسبت سے ابو بکر کی کمی کھٹک رہی تھی۔ انیب ابو بکر کو مبارک کا میسج سینڈ کر چکا تھا۔

"کل آپ سب ڈنر ہماری طرف کیجیے گا۔" پارہ بطور خاص بھائی سے مخاطب ہوئیں جو ٹھٹک کے رکے تھے۔ بہن کے دل کو کچھ ہوا کہ رکنے والے کی پیشانی کے بل تک بے سکون تھے۔

"توفیق انکل! ابھی پروفیسر صاحب کی "روئی زمین" پڑھیے گا جیسے عقل کسی روشن ہالے میں بھٹک جاتی ہے۔" اپنی بات ختم کر کے وہ متانت سے مسکرایا۔

برہان کی ریڑھ کی ہڈی سنسنا کے رہ گئی وہ جیسے کھڑے کھڑے برف ہو چکے تھے توفیق پہلے تو یک ٹک انہیں دیکھتے رہے جیسے بات سمجھ سے باہر ہو اور جب بات عقل میں آئی تو حوصلہ افزا مسکراہٹ انیب کی طرف اچھالی جب کہ مہ پارہ سانس روکے بیٹھی تھیں کہ جانے برہان اب کیا جواب دیں گے، لیکن خاصے توقف کے بعد برہان نے جب دھیمی آواز میں بغور انیب کو دیکھ کر لفظ شکریہ بولا تو مہ پارہ نے جیسے کھل کے سانس لیا۔ ساتھ ہی بہن کو مخاطب کیا۔

"سوری مہ پارہ...... پھر کبھی ان شاء اللہ۔"

ماضی میں کسی جنوں خیز کیفیت میں جب توفیق، شعیب کی حمایت میں بول رہے تھے۔ برہان نے درشت الفاظ میں ان سے کہا تھا۔

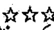
"شعیب کے حمایتوں کے لیے میں اپنے گھر کے دروازے آئندہ کبھی نہیں کھولوں گا۔" پھر آج اس خاص موقع پر ان کا رویہ ہتک آمیز کیوں تھا۔ اگلے پل وہ خود احتسابی کے عمل سے گزرے۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ وہ کھلے دل کے مالک تو کبھی بھی نہیں تھے (بھلے ان کی تنگ دلی کی وجہ وہ خاندان تھا) مگر وہ جانے سے قبل انیب پہ اک ٹھنڈی نگاہ ڈالنا نہیں بھولے تھے۔

"میں ذرا چینج کر لوں۔" بہنوئی کے چہرے کے بگڑتے زاویے ان کی نظر میں تھے۔ وجہ برہان کا کل کے ڈنر سے انکار تھا۔

کچھ دیر بعد آصفہ کے ساتھ یسریٰ سب کو مٹھائی اور چائے پیش کرنے لگی کہ کھانے میں ابھی دیر تھی۔ وہ بند ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے اسے انہماک سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے چائے بناتے ہوئے سب سے چینی کی مقدار پوچھی تھی۔ مگر اس نے کچھ بھی پوچھے بنا، کہے بنا چائے کی پیالی اس کی جانب بڑھائی۔ چائے کا گھونٹ بھرتے ہی وہ جامد ہوا۔

"مٹھائی کے ساتھ پھیکی چائے کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔" اس کی یاد میں اپنا لہجہ روبرو ہوا۔ وہ اس چہرے سے نظر نہیں ہٹا سکا۔

اس رات صد شکر کہ برہان نے ڈنر سب کے ساتھ کیا تھا۔ مہ پارہ بے پناہ خوشی سے سرشار تو توفیق اسے آپے سے باہر دیکھ کر ضرورت سے زیادہ سنجیدہ ہو چکے تھے۔ ابو بکر نے جس طرح باپ کو سمجھا سمجھا کر پاکستان بھیجا تھا۔ وہ ایک الگ کہانی تھی اگر اس صبح وہ بیٹے کی دگرگوں حالت اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ چکے ہوتے تو ثاقب ولا میں قدم رکھنے کا کبھی سوچتے بھی نہیں۔ جس طرح کبھی ماضی بعید میں سلطنت آرا کا شوہر خاکوان فیملی کے لیے ناقابل برداشت چیز تھا، اب وقت نے انہیں اس مقام پہ لا کھڑا کیا تھا۔



وہ ڈنمارک میں کسی انٹرنیشنل کمپنی میں جاب کرتا تھا اور وہیں ایک لگژری فلیٹ میں رہائش پذیر تھا۔ اسے ماں یا باپ کے بزنس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے ان دونوں ہستیوں کے عزیز و اقارب میں بھی اب کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔

ماں ہر مہینے اس کے اکاؤنٹ میں پیسے ڈال دیتی تھی۔ جو وہ خود سے زیادہ اپنے دوستوں پہ خرچ کرتا تھا۔ جانے کیوں ابو بکر نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ ایک دن اچانک اس کے فلیٹ پہ ابو بکر نے جیسے چھاپہ مارا تھا۔ وہ شاید نشے میں تھا۔ ابو بکر نے اسے تاسف سے دیکھا۔ "تم اپنے ساتھ یہ سب کیوں کر رہے ہو؟"

"میں تعلیم یافتہ ہوں۔ گولڈ میڈلسٹ ہوں اور ایک ہائی فائی کمپنی میں اچھی جاب پر ہوں۔" اس کی آواز میں ہلکی سی لڑکھڑاہٹ تھی۔

"تمہارا باپ بھی اعلا تعلیم یافتہ تھا۔ ہنہ۔"

اس کا نشہ، ہرن ہوا، وہ تڑپ اٹھا۔ "مجھے اس شخص کے ساتھ آپ کبھی کمپیئر مت کریں۔ پلیز۔" اس نے نظر جھکا کے التجا کی تھی۔ "کبھی کبھی پی لیتا ہوں، لیکن کریکٹر لیس نہیں ہوں۔" فوری صفائی دی۔

'جب ایک حرام چیز کو خود پہ حلال کر سکتے ہو تو باقی کے مراحل بھی بخوبی طے کرتے جاؤ گے۔ پھر تم اپنے ہاتھ کبھی نہیں لگو گے انیب!"

"بدکردار ماں باپ کی اولاد کبھی اپنے ہاتھ لگتی بھی نہیں۔" اس کا لہجہ سیاہ اور ہولناک تھا کہ ابو بکر حق دق اسے دیکھتا رہ گیا۔

"تمہاری ماں بدکردار نہیں تھی؟" ابو بکر نے اسے تھپڑ مارنے کی خواہش کو کڑے ضبط سے رد کیا تھا۔

"پاپا کی بات کو چھوڑیں۔ کیا دادی بھی جھوٹ بولتی تھیں؟" وہ سُرعت سے گویا ہوا۔

"دوسری شادی بدکرداری کے زمرے میں نہیں آتی۔ بیوہ یا مطلقہ کے جلد نکاح کا حکم ہمیں ہمارا مذہب دیتا ہے۔ تم اس وقت چھوٹے تھے۔ تمہاری ماں کو بزنس بھی سنبھالنا تھا۔ اس ایک رہبر کا طعنہ دینے والے آئندہ وقت میں دو چار رہبر کہیں اور سے بھی ڈھونڈ نکالتے۔ آنٹی کا جلد بازی میں کیا گیا فیصلہ بالکل درست تھا۔" انیب کے پاس جیسے الفاظ ختم ہو چکے تھے۔

اگلے دن ابو بکر نے اس کا فلیٹ مقفل کیا اور اس کا ضروری سامان اٹھا کر اسے اسمتھ ہاؤس چھوڑ گیا۔

"اگر تم چاہتے ہو کہ کوئی یہ کہے جیسا باپ ویسا بیٹا...... تو اپنے ان آوارہ دوستوں سے ضرور ملتے رہنا اور اگر اپنی زندگی کو خوب صورت بنانا چاہتے ہو تو وہ ماضی بھول جاؤ انیب! جس نے تمہیں تکلیف دی۔

جس میں تم کبھی مسکراتے یا ہنستے تھے، بس زندگی کا وہ حصہ ضرور یاد رکھنا۔"

ابوبکر کے جانے کے بعد وہ تادیر ہنستا رہا تھا۔ ہوش سنبھالتے ہی اس نے ماں باپ کے مابین ایک تلخ فاصلہ ہی محسوس کیا تھا۔ اس نے ان دونوں کو آپس میں مسکرا کے بات چیت کرتے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ اپنی یاد میں اچھے دن کہاں سے ڈھونڈتا۔

باپ نے کسی رقاصہ سے دوسری شادی کرلی تھی۔ تیسری کسی بیوہ سے اور چوتھی آج کل کی ایک ابھرتی ماڈل گرل...... ماں بھی اپنا گھر دوسری بار آباد کرچکی تھی۔ اگر کوئی برباد حال تھا تو وہ خود تھا۔ پینسٹھ سے اوپر اور ستر سال سے کم۔ سانتا اسمتھ نے ایک دن کھیل ہی کھیل میں اچانک اسے اس کی زندگی کے ہنستے مسکراتے دن یاد کروا دیے تھے۔

☆☆☆

"ڈیٹ فکس ہونے پر وہاں کل ملا کے سات بندے تھے۔ کیا فنکشن ایسے ہوتے ہیں؟ اوپر سے سب کے چہروں پہ ایسے تاثرات جیسے کسی کی بھینس چرا کے بیٹھے ہوں۔" رمیض کا واویلا سن کر سب بے ساختہ ہی ہنس دیے۔

"میں تو ماموں کی اس قدر کنجوسی پہ اب تک حیران ہوں۔" رمیض کے جلے بھنے انداز اور بچی بات پہ جہاں زین کا قہقہہ فلک شگاف تھا وہیں مہ پارہ نے خفگی کر بیٹے کو گھورا۔ آج وہ سب مہ پارہ کے ہاں ڈنر پہ اکٹھے تھے۔

"دولت پہ کوئی کنجوسی نہیں دکھاتا۔ کوئی تجوری نہ تالا۔ بھلے کوئی لوٹ کے لے جائے تمہارا ماموں ہر رنگ کے نوٹ اپنی کھلی الماری میں رکھنے کا عادی ہے۔ بس رشتے ناتوں کے معاملات میں سدا کنجوسی کا قائل رہا ہے۔" سلطنت آرا نے سرد آہ بھر کے کسی غیر مرئی شے کو گھورا۔

ماں کا اداس لہجہ مہ پارہ کے دل پہ بوجھ کی طرح پڑا تو بیٹے پہ غصیلی نگاہ ڈالی۔

"مہ پارہ کا بابا کہتا تھا، سلطنت! اس قدر ٹیڑھا بیٹا کیوں پیدا کیا۔ اونٹ کی سو کلیں بھلے سیدھی ہوجائیں، مگر برہان کی ایک کل بھی سیدھی نہیں ہوسکتی۔"

اس بات پہ وہاں ہنسی کا ہلکا سا شور ابھرا تھا۔ صرف انیب نے ہی مسکرانے پہ اکتفا کیا۔

"اپنی شادی کے لیے اس قدر کڑی شرط رکھی تھی کہ کیا بتاؤں۔" انہوں نے پھر سے گہرا سانس بھرا۔ یسریٰ نے جز بز سا ہو کے دادی کو دیکھا کہ نہ ہی بتائیں۔

"نانی پلیز! بتادیں۔" زین مارے تجسس کے ان کے گھٹنے سے جڑ کے بیٹھا۔ زین مزید کچھ قریب کھسک آیا۔ انیب نے کھسیاہٹ چھپائی یسریٰ کو دلچسپی سے دیکھا۔

"اے ہے۔ ایسی کون سی اس نے سولہ آنے بات کی تھی بے صبرو......" انہوں نے پوتے اور نواسے کے ہاتھ اپنے کندھوں سے کھسکائے۔ "وہ ایک گھمانے والی خواہش تھی نہ صرف لڑکی اکلوتی ہو بلکہ اس کے اماں بادا بھی۔ ورنہ شادی اور وہ بھی میری، بھول جائیں۔"

"اف!" دونوں نوجوان دنگ اور بالکل گنگ سے ہوچکے تھے۔ مہ پارہ مسکراتی رہیں۔ (اس قصے سے واقف جو تھیں)

"اور...... پھر کیا ہوا؟" رمیض اور زین کا گنگ رہنا چند لمحوں سے زیادہ نہیں چل سکا۔ انیب بھی جیسے مجسم سماعت تھا۔

"سمجھو کہ دریا سے چھلہ (انگوٹھی) نکالنے جیسا معاملہ تھا۔" سلطنت نے ایک لمبا سانس لیا۔ "دو سال تک رشتہ کروانے والی دس عورتیں اس محاذ پر ڈٹی رہیں۔ ان میں سے ایک کامیابی سے ہمکنار ہو ہی گئی۔ اب جو میں نے اپنے صاحبزادے کو یہ خوش خبری سنائی تو مجھے یوں دیکھا جیسے ماں نہیں سامنے بلا کھڑی ہے۔ چہرے پہ وحشت، آنکھیں سرخ اور بولا تو یہ، کہ لاحول ولاقوۃ...... یہ عورتوں کی نسل اس قدر ڈھیٹ اور مہم جو کیوں ہوتی ہے۔"

پیر پٹختا میرے سامنے سے ہٹ گیا تھا۔ (پھر ٹھنڈی آہ) انیب سمیت وہاں سب کے اعصاب جیسے پرسکون ہوئے۔

"لو اب بتاؤ رمیض میاں کہ رشتے دار کیا آسمان سے ٹپکیں گے۔" وہ بلاتامل بولیں تو آواز میں ہلکی سی افسردگی گھلی ہوئی تھی۔

"چھوڑیں بھی اماں۔ زین کو یوں ہی فضول بولنے کی عادت ہے۔" مہ پارہ نے وہاں کوئی اور موضوع چھیڑنا چاہا۔

"آپ کی یہ بھتیجی بھی ماموں کی طرح روکھی پھیکی اور اس قدر ثقیل گفتگو کرتی ہیں کہ اگلے بندے کے سوئیٹ جذبات دھواں بن کے اڑ جاتے ہیں۔" اب رمیض نے گفتگو کا اک نیا پہلو نکالا۔ "اس ہینڈسم لڑکے پہ اک اور ظلم۔" یسریٰ نے بوکھلا کے انیب کو دیکھا۔

"اسے ہر روز کسی سے محبت ہوجاتی ہے۔"

"اس کی بات کا برا مت ماننا۔" مہ پارہ نے ہنستے ہوئے۔ رمیض کو گھورتی یسریٰ پہ نظر ڈالی تو ذہن میں یوں ہی اک خیال سا ابھرا۔

"ویسے اماں! یسریٰ کی شادی بھی اقصیٰ کے ساتھ ہی نپٹ جاتی تو اچھا تھا مدت بعد تو پاکستان کا چکر لگتا ہے۔"

وہ اپنی شادی کے ذکر پہ سر جھکا کے رہ گئی۔ انیب کے وجود میں اک مشکل سا وقت ٹھہر سا گیا۔

"لو جی جیسے بھائی کو تو آپ جانتی ہی نہیں۔" وہ دانت پیس کے گویا ہوئیں۔

"شادی تو ان کے نزدیک ایک دوسری بات اور کبھی بھی انجام پایا جانے والا عمل ہے پہلے پی ایچ ڈی یسریٰ کے لیے زیادہ ضروری ہے۔ کیسے اچھے اچھے رشتے آئے اور مایوس ہو کر اب بال بچوں والے ہوچکے ہوں گے۔ ہزار بار سمجھایا کہ اک عمر کے بعد اچھے رشتے نہیں ملتے۔

اوپر سے موٹی کتابیں چاٹ چاٹ کے لڑکیوں کے چہروں سے رونق ویسے ہی غائب ہوجاتی ہے۔"

"دادی چھوڑیں بھی ناں!" وہ آخر کار روہانسی سی ہو کر منمنائی کہ اس شخص کی آنکھیں خاموشی اور باریک بینی سے اس کے چہرے پہ پژمردگی ڈھونڈ رہی تھیں، مگر وہاں تو خوب رونق تھی۔ تب ہی توفیق اپنی سنجیدہ شکل کے ساتھ نمودار ہوئے جنہیں برہان کے ڈنر پہ نہ آنے کا قلق تھا۔ وہ ان کے اس عمل کو اپنی بے عزتی محسوس کررہے تھے۔

"دیکھ لیا نا...... مہ پارہ بیگم! تمہارے بھائی کی نظر میں ان رشتوں کی کیا ویلیو ہے۔" انہوں نے بیوی کو کٹہرے میں کھڑا کیا۔ "اسے پانچ سال بعد بھی بہن کے گھر آنا گوارا نہیں۔"

ماحول ایک دم بوجھل ہوا۔

"میں تم سے بحث نہیں کروں گی توفیق! مگر میری التجا ضرور ہے، تمام کدورتوں کو نظر انداز کردو یہ وقت خوش اسلوبی سے نبھاؤ، کبھی کبھار انسان رسماً بھی تو خوش ہولیتا ہے، یہ تو پھر تمہارے بیٹے کی خواہش کا معاملہ ہے۔" نانی کے عاجزانہ تاثرات، اس کا جھکا سر، انیب کے دل پہ تیر سے چلے تھے۔ اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"کیا ہی اچھا ہوتا کہ ہمارے بڑے اپنے، اپنے خاندانوں کو ایک دوسرے سے اعلا و ارفع سمجھنے کے بجائے ایک دوسرے سے مقابلے میں خود کو اچھا انسان ثابت کرنے کی کوشش کرتے۔ (کہ بے شک تم میں سے وہی اچھا ہے، جس کا اخلاق اور کردار اچھا ہے۔) تو ہم جیسی اگلی نسلیں ان کے غرور اور کدورتوں کی نظر نہ ہوتیں۔ کیا کبھی پروفیسر برہان ثاقب، یا پھر توفیق داؤد، شعیب صاحب اور دوسرے بہت سوں نے یہ سوچا ہوگا کہ ان کی نسلیں، ان کے بچے کسی رعایت، مروت یا رحم کے مستحق ہیں۔ جنہوں نے وراثت میں خاندانی مال و دولت کے سوا ہر رشتہ کھو دیا۔ جن کے بزرگوں کو اپنے اپنے قبیلے کا غرور لے ڈوبا۔ غرور جس کا انجام فقط زوال ہے۔ غرور جو جنت سے باہر کردیتا ہے۔

☆☆☆

سانتھا اسمتھ ایک اسمارٹ دراز قد اور خوش

شکل عورت تھی۔ جو کھانا کم اور ہوا زیادہ کھاتی تھی۔ جس کا ذریعہ معاش عجیب طریقہ تعلیم تھا۔ شام کے وقت آس پڑوس کے گھروں سے بچے سانتا کے ساتھ گیم کھیلنے آجاتے تھے۔ وہ بظاہر حیرت انگیز گیم نہیں تھا۔ وہ دیکھتا، سانتا ہر بچے کو ایک خالی کاغذ تھما دیتی تھی۔ پھر وہ خالی کاغذ کے بیچ ایک لکیر کھینچ دیتی، جو لوگ ہمیں پسند ہیں ان کے نام دائیں طرف اور ناپسند افراد کے نام بائیں طرف، لیکن جیتے گا وہی جو سچ بولے گا اور جس کی لسٹ میں ناپسندیدہ افراد کم ہوں گے۔ وہ جیت جائے گا۔ جس بچے کی لسٹ ان کے ناموں سے خالی ہوگی۔ اسے اول انعام ملے گا۔

انیب روز دیکھتا کہ بچے اول انعام سے محروم رہ جاتے تھے کہ وہ سچ لکھتے تھے، آہستہ آہستہ اس کی سمجھ میں آگیا کہ سانتا ان کی ذہنی تربیت کیا خوب اور آسان طریقے سے کررہی ہے۔

پسند ہے تو وجہ، ناپسند ہے، تو کیوں؟

وجہ جاننے کے بعد وہ ان کے والدین کو بتاتی تھی کہ ان کا بچہ کس کی وجہ سے ڈسٹرب ہورہا ہے اور کن لوگوں کی کمپنی میں خوش رہتا ہے، اس کے گھر میں بچوں کی تعداد پہلے سے زیادہ ہوتی جارہی تھی۔

اسمتھ ہاؤس میں انیب کے علاوہ ایک لیبیا کا، ایک بنگلہ دیشی اور ایک (ہنزہ) پاکستان سے غالب مختار بھی رہتا تھا۔ جسے ہنسنے کی بیماری تھی۔ یہ وقت ان تینوں کی چائے کا ہوتا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ بچوں کا کھیل بھی دلچسپی سے دیکھتے رہتے۔

''میڈم! آج ہم بھی کھیلنا چاہتے ہیں۔'' غالب مختار نے خالی کپ رکھتے ہوئے درخواست کی۔

''پہلے کپ اٹھاؤ، اسے دھوکر خشک کپڑے سے صاف کرکے کاؤنٹر پہ رکھ آؤ۔'' سانتا نے آنکھیں گول گول گھما کے اسے دیکھا۔ تو بے چارا جیسے پیر گھسیٹتا ہوا کچن تک گیا کہ وہ اکثر ان دھلے برتن رکھ کے غائب ہوجاتا تھا۔

''اس کی شرط سچ ہے۔'' اس نے غالب مختار کے سامنے کاغذ قلم رکھا۔ غالب نے حسب عادت بتیس دانتوں کی نمائش کی۔ سانتا نے انیب کے سامنے بھی کاغذ اور پین رکھا۔

''کبھی کبھار بچہ بننے میں بھی کوئی حرج نہیں۔'' وہ آنکھ دبا کے مسکرائی۔ ''اس گیم میں راز بھی شرط ہے۔ ون، ٹو، تھری، اسٹارٹ۔''

پانچ منٹ بعد قلم کاغذ پہ رکھ کے غالب مسکرارہا تھا کہ اس نے جو لکھنا تھا لکھ دیا تھا۔ انیب ابھی بچوں کی طرح سر نہوڑائے کاغذ پہ جھکا تھا۔

☆☆☆

گنجان آبادی سے قدرے ہٹ کر وہ ایک کشادہ پرسکون اور خاصا قدیم کیفے ٹیریا تھا۔ ساٹھ کی دہائی سے لے کر آج تک نامور شعرا اور ادیب حضرات اپنی شامیں وہیں گزرتے تھے۔ ان ــــ کے فینز یونی اسٹوڈنٹس کے گروپس ان سے اپنے تھیسز ڈسکس کرنے کم اور انہیں سننے اور دیکھنے کی چاہ میں زیادہ آتے تھے۔ پروفیسر برہان کی شامیں بھی اکثر وہی تمام ہوتی تھیں۔ کبھی کبھار یسریٰ بھی ان کے ساتھ ہوتی تھی۔ آج بھی وہ پی ایچ ڈی ڈاکٹر انجم امین کے ساتھ اپنے تھیسس کے چند پوائنٹ ڈسکس کرنے وہاں موجود تھی۔ وہاں موجود نفوس کے ملبوسات سے پھوٹنے والی پرفیومز کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ وہاں مدھم آوازوں اور کانچ کے برتنوں (کپوں) سے اٹھنے والا ہلکا سا شور وغل اعصاب پہ اثر انداز نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے اس جگہ کا ماحول یسریٰ کو پسند تھا۔ وہ بے یقین ہوئی اور حیرانی کے عالم میں اسے اندر آتے دیکھا۔ وہ بلیک پینٹ اور ایش گرے شرٹ میں ڈھلتی شام جیسا محسوس ہورہا تھا، کچھ تھکا سا تھا، کچھ اترا، اترا سا چہرہ، آستینیں کہنیوں تک موڑ رکھی تھیں ــ وہ اپنے اڑے، اڑے بالوں کو انگلیوں سے سیٹ کرتا ناک کی سیدھ میں چلتا گیا۔

انجم امین نے پہلی بار یسریٰ کی نظر کو ٹھٹکتے اور پھر کسی چہرے پہ ساکن ہوتے دیکھا تھا۔

''یہ انیب شعیب ہیں۔ اب تو ادھر اکثر دکھائی دیتے ہیں، وہ ماڈل گرل ہے نا۔'' اس نے اپنی پیشانی کو مسلا۔ ''کیا بھلا سا نام ہے۔ شعیب صاحب نے اس سے نکاح کررکھا ہے۔''

یسریٰ نے اپنے عقب میں ایک ذرا گردن موڑ کے دیکھا۔ یعنی انجم امین کو حیرت کا ایک اور جھٹکا دیا۔ انیب کا رخ اسی جانب تھا جہاں اس کا باپ بھی براجمان تھا۔ اس نے دیکھا کہ اس کے باپ کے سوا باقی تینوں اپنی نشستوں کو چھوڑ کر خیر مقدمی انداز میں بڑھ کر اس سے ملے۔ اسے وہاں دیکھ کر پروفیسر برہان بھی پورے وجود کے ساتھ ٹھٹکے تھے۔ انجم امین نے ہلکا سا کھنکار کر یسریٰ کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا۔ وہ جیسے کھسیا کر سیدھی ہوئی تھی اور ایک دبا سا سانس لیا۔

رات کو انہوں نے پہلی بار گھر میں ڈھولک رکھی تھی، تو دادی نے انیب کو بھی دعوت دے ڈالی۔

''لو بھلا میں وہاں لڑکیوں میں کیا کروں گا۔'' اسپیکر آن تھا۔ یسریٰ نے اس کی مسکراتی آواز میں انکار سنا تو دادی کو چڑانے کی خاطر خاصا اونچا بولی۔

''کہا تھا نا...... مت فون کریں۔'' مقصد کچھ اسے بھی سنانا تھا۔ وہ اس کی تپی آواز سن کے ہلکا سا ہنسا تھا۔

''آپ کی پوتی کو پھیکی چائے بنانے کی زحمت اٹھانا پڑتی۔'' جواب برجستگی سے آیا۔ یسریٰ کے کان تک گلابی ہوئے۔ ساتھ ہی کلس کے صوفہ چھوڑا۔

''آجائیں بھائی! یسریٰ کی سہیلیوں کو تاڑیں گے، ساتھ مٹھائی بھی کھائیں گے۔'' زین سیل فون میں منہ گھسا کر جیسے چیخا۔ وہ دوسری جانب کا جواب سننے کو بے اختیار رکی۔

''موٹی موٹی کتابوں کے کورٹے مارنے والی تمام لڑکیوں کے چہرے بے رونق ہوتے ہیں یار۔'' وہ شرارتی لہجے میں بولا تھا۔ قیاس تھا کہ وہ چڑ چڑی سی لڑکی موجود ہوگی۔

''خیر، دل پر پتھر رکھ کر دیکھ بھی لیتے، مگر کچھ ٹمپریچر فیل ہورہا ہے۔'' آواز سے بھی ظاہر ہورہا تھا۔

''اب آپ کے لیے میری سہیلیاں چہرے پہ مینا بازار تو نہیں سجاسکتیں۔'' وہ سیل فون منہ کے قریب لاکر جیسے بھڑکی تھی۔

زین اور فون سننے والے کا قہقہہ غالباً مشترکہ تھا۔

آج اسے دیکھا تو واقعی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ یسریٰ نے اپنی کرسی پہ پہلو بدلا۔ ابھی اس نے انجم امین صاحب کو کچھ کہنے کے لیے لبوں کو جنبش دی ہی تھی کہ اس کے کانوں میں ایک مشہور مصنف کی آواز پڑی۔ وہ جیسے برہان صاحب سے مخاطب ہوکر کہہ رہا تھا۔

پروفیسر صاحب ان حضرت کا (یعنی انیب کا) خاندانی پس منظر پشت در پشت اعلا وارفع ہے، یعنی ریشم کے تار میں سوتی دھاگے کا تصور ہی نہیں۔'' اس مصنف کی دھیمی آواز نے برہان کے دماغ میں انتشار برپا کردیا تھا۔ اس نے کرسی کے ہتھے پہ اپنے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑتی محسوس کی۔

''ایسا کچھ بھی نہیں سر! آپ جو بیان کررہے ہیں۔'' وہ کچھ محتاط سا ہو کے مسکرایا۔

''خطاب خاکوان نے اپنی بڑی صاحب زادی کی شادی خاندان سے باہر ہی کی تھی۔'' وہ خبر ایسی تھی کہ وہاں سب کے منہ خفیف سے کھلے تھے۔ ''اور جس خاندان میں کی تھی گویا ریشم کی تار میں، میں نے اصلی ریشم جوڑ دیا تھا۔''

برہان نے اس آواز، اس بات کو جیسے گمان سمجھا تھا۔ وہ اس کی طرف دیکھتے رہ گئے۔ کچھ ایسا ہی حال یسریٰ کا بھی تھا۔ نشے کی بوتل میں محض نشہ نہیں ہوتا جیسے ڈھکن کھلتے ہی ہزار عیاشیوں کا منہ کھل جاتا ہے۔

''اور افسوس کے ساتھ کہنا پڑرہا ہے کہ خطاب خاکوان صاحب کے علاوہ ہمارے خاندان کے بزرگ حضرات ان عبرت ناک عیاشیوں سے لطف اندوز ہونے کے سوا بس اپنا خاندانی غرور ہی قبر میں لے جاسکے۔'' وہ بے بسی میں گھر کے مسکرایا۔ پروفیسر برہان پرغور انداز میں ہونٹ بھینچے اسے سن رہے تھے۔ جیسے اس کی ذہنی حالت پہ شبہ ہورہا ہو۔

''خاندانی وقار، سادہ لوح، صاف ستھری تہذیب کے پروردہ تو پروفیسر برہان ثاقب جیسے

خانوادے ہیں سر...... جو سگریٹ تک اپنے بچوں کے سامنے، ماں کے سامنے پینا معیوب سمجھتے ہیں۔ روایات اور اقدار تو ہمیشہ سے ایسے خاندانوں اور گھروں میں پنپتی ہیں جہاں اسلام کا دامن ہاتھ میں رہتا ہے۔" وہ بجھے سے لہجے میں کچھ دھیما پڑا۔

برہان اس کے چہرے پہ نظریں جمائے کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"خواب گاہوں میں کھلی بوتلیں اچھے برے کی تمیز اور تہذیب ایمان، شرم سب نکل جاتی ہیں۔ دولت مندوں کو سلیوٹ کرنا، اسلام اس کا حکم کہاں دیتا ہے۔"

"لیکن شعیب صاحب! یہ دنیا دولت مندوں کی ہی ہے۔" کسی شخص نے اس کی بات سنی ان سنی کر کے بے صبرے پن سے جواب دیا۔

"میں اس بات سے انکار نہیں کرتا۔" اس نے چہرہ موڑ کے پیچھے دیکھا۔ تب ہی اس کی نگاہ یسریٰ پہ پڑی۔ جو سب لوگوں کی طرح اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ چند لمحوں کے لیے اس کی توجہ ہر چیز سے ہٹ گئی۔

"کسی بھی خاندان میں جنم لینا، کسی کے اختیار میں کہاں ہے۔" ایک شاعر نے آدھ بھر کے کہا۔ تو وہ چونک کے سیدھا ہوا۔

"کسی بھی رتبے، عہدے، اقتدار، خاندان سے بالاتر ہو کے انسان کی عزت کرنا، یہ تو انسان کے اختیار میں ہے نا امتیاز صاحب۔" اس نے برہان صاحب پہ مسکراتی نگاہ فوکس کیے ان ہی کے جملے دہرا دیے تھے۔ مدھم اور دھیمی آواز کے ساتھ۔

"اب اس بات پہ کم از کم میں فخر نہیں کر سکتا کہ میں خاکوانوں میں سے ہوں تو میں بہترین ہوں۔ اگر میں اچھا انسان ہوں تو بہترین ہوں۔ اگر میں خلق خدا سے عزت سے پیش آتا ہوں تو میں بہترین تر ہوں۔" وہ خوش گواری سے بولا۔

"آج برہان صاحب کچھ زیادہ ہی خاموش نہیں۔" ان کے قریبی دوست نے انہیں گہری نظر سے دیکھا۔

"نہیں، بس ایسے ہی آج میں ذرا سننے کے موڈ میں ہوں۔" انہوں نے پہلوتہی سے کام لیا۔ ذہنی تناؤ کے تحت ان کی آنکھیں کچھ بھاری سی ہو رہی تھیں۔

"پھر اپنی نئی کتاب کا نام سوچ لیا ہے کیا؟" اسی شخص نے سلسلہ کلام دوبارہ جوڑا۔

"آں...... ہاں نہیں...... ابھی دو، تین نام زیر غور ہیں۔"

وہاں آج کی ہائی ٹی انیب کی طرف سے تھی۔ اس نے محتاط سا ہو کر سامنے دیکھا۔ چائے پیتے برہان کی آنکھوں میں کشیدگی کا تاثر بس مدھم سا تھا۔ بہرحال انہوں نے ایک صبر آزما وقت کا سامنا کیا تھا۔ وہ رائٹر تھے اور ان کا قاری، ان کے اپنے الفاظ کے پھیلائے ہوئے جال میں انہیں ـــ باندھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

مگر وہ ایسا کیوں کر رہا تھا؟

برہان نے اسے چور نظروں سے دیکھا۔ وہ اب اسٹوڈنٹس کے گروپ میں بیٹھا ان کی کسی بات کا جواب سنجیدگی سے دے رہا تھا۔ یسریٰ نے واپسی پہ اپنی دوست کے ساتھ لائبریری کا چکر لگا کے گھر جانا تھا۔ وہ وہاں سے جا چکی تھی۔

☆☆☆

سانتا اسمتھ چونکہ ہوا کھانا پسند کرتی تھی۔ اس لیے اپنا فارغ وقت ٹیرس پہ بیٹھ کر جانے زمینی دنیا پہ غور کرتی تھی آسمانی دنیا پہ...... ایک رات ٹیرس پہ اس معزز خاتون کے ساتھ بیٹھے، بیٹھے جب انیب کی کمر تختہ ہونے لگی تو اس نے یہ آس امید توڑتے ہوئے (کہ کچھ پوچھے تو سہی، میاں کیوں بیٹھے ہو۔) جیسے خود کلامی کی تھی۔

"میں بے سکون ہوں مسز اسمتھ!"

"کسی سے محبت کرتے ہو؟" اس کی مسکراتی آواز سرگوشی نما تھی۔

"نہیں۔" اس نے فوراً سر کو نفی میں جنبش دی۔

"میرا باپ کہتا تھا کہ میری ماں کسی کو چاہتی تھی۔" وہ استہزا سے ہنسا۔

سانتا نے انیب پہ ناپسندیدہ نظر ڈالی۔

"ماں، باپ کا ذکر اچھے الفاظ میں کرنا چاہیے۔" ساتھ ہی مشورہ بھی دیا۔

"ماں سے ملتے ہو؟" کافی دیر کے بعد اس نے نرم لہجے میں پوچھا تھا۔

"ہاں سال میں شاید ایک آدھ بار۔"

"اس نے مجھے چھوڑ دیا تھا۔ وہ دوسری شادی کر کے اپنے شوہر کے ساتھ امریکہ آ گئی تھی۔ اب میری زندگی سے ہر اچھا موسم گزر چکا ہے سانتا اسمتھ۔" وہ رندھی آواز کے ساتھ گویا ہوا۔

"موسم پلٹ کر آتے رہتے ہیں۔ تم مایوس کیوں ہو انیب، موسم ہمارے من چاہے لوگوں کے ساتھ ہی خوب صورت ہوتے ہیں۔ تمہاری زندگی کا ایک اچھا موسم ابوبکر بھی تو ہے، جو تمہیں تپتی دھوپ سے اٹھا کر یہاں لے آیا ہے۔ تمہاری زندگی کا سب سے اچھا موسم تمہاری ماں کی دعاؤں میں ہے اور تمہاری ان اخروٹی رنگ آنکھوں کو سرسبز رکھنے کا موسم تمہاری ماں کا چہرہ ہے۔"

اس آواز میں جانے کیا تھا کہ اس کا پتھر دل دھیرے دھیرے جیسے کوے سے باہر آ رہا تھا۔

☆☆☆

ابوبکر کی تمام شاپنگ بھی زین اور انیب نے ہی کی تھی۔ اقصیٰ کے غصے کی کوئی حد نہیں تھی۔

"اس سے کہہ دیں، وہیں بیٹھا رہے۔" آج کل وہ اس کا فون بھی نہیں سن رہی تھی۔

"کیا تھا جو شادی سے پندرہ دن پہلے آ جاتا۔" وہ اکیلے میں یسریٰ کے سامنے دل کی بھڑاس نکالتی۔ یسریٰ کا دھیان کب اس کی باتوں کی طرف ہوتا۔ کسی لباس کے ساتھ کے سینڈل رہ گئے تھے تو کسی کے ساتھ جیولری خریدنا باقی تھی۔

شادی میں ایک ہفتہ رہ گیا تھا۔ آج یسریٰ کی مصروفیت کی نوعیت ذرا الگ تھی۔ سارا گھر نئے پینٹ سے چمک رہا تھا۔ باقی کی کسر برقی قمقموں نے پوری کر دی تھی۔ ایسے میں یسریٰ کو تیتریوں اور جوگی (طوطا) کا پنجرہ بے رنگ سا لگا تھا۔ جنہیں وہ آج رنگ رہی تھی۔

"انیب نے کس طرح سارے کام سنبھالے۔ جی خوش ہو گیا۔ کام اپنے ذمے لیے۔ جی خوش ہو گیا۔" سلطنت آرا اپنے سیل فون پہ بیٹی سے بات کر رہی تھیں۔

"دادی بھی حد کرتی ہیں۔ ایک اس نے چند کارڈز لکھے ہیں، دوسرا ابوبکر کی شاپنگ کی ہے۔ باقی اٹھانوے کام کس خوشی میں اس کے کھاتے میں ڈالے جا رہے ہیں۔"

اس نے بڑبڑاتے ہوئے ہرے رنگ کے محلول میں برش ڈبویا۔ انیب پہلی سیڑھی پہ قدم رکھتے ہوئے اس کی بڑبڑاہٹ بخوبی سن چکا تھا۔ ہلکا سا مسکرایا۔

"باجی! پنجرے کا رنگ ہرا تو مت کریں۔ طوطا بے چارا خاک اچھا لگے گا۔" آصفہ نے اسے مشورہ دینے کے ساتھ ہی سہم کے دیکھا۔ وہ سیدھی ہوئی۔ پھر پہلو پہ ہاتھ رکھ کے اسے گھورا۔

"طوطا اندر ہو گا تو نظر آئے گا۔" زین اسے چڑا کر آگے بڑھ گیا۔

"آئے ہائے یسریٰ نے پھر سے جوگی کو اڑا دیا۔" دادی کے کانوں میں آدھی ادھوری بات پڑی تو دل پہ ہاتھ رکھ کے دہائی دی۔

تب ہی یسریٰ نے اسے دیکھا جو آبخورے کے پاس متبسم چہرے کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس نے فوراً دوپٹا درست کیا۔

"نہیں دادی! اسے میں نے اصغری کے ڈربے میں تھوڑی دیر کے لیے بند کیا ہے۔" اس نے سٹپٹا کے فوری وضاحت کی۔

"نانی! آپ کی ایک خرگوشنی بھی ہوتی تھی، مینا کماری۔" وہ ایک ہاتھ پینٹ کی جیب میں ڈالے رنگ ہوتے پنجروں کے پاس آ کر ٹھہرا۔ "غالباً اس جگہ اس کا ایک چھوٹا سا ہٹ بھی ہوتا تھا۔"

وہ مشرقی کونے کی طرف ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ اس کے چہرے پہ بلا کی شرارت تھی۔ وہ ہلکی سی جھنجلاہٹ کا شکار ہوتی برق کی سی تیزی سے دانستہ مڑی اور تپ کے اسے دیکھا۔

"جی ہاں...... یہاں ایک پیلے رنگ کا سورج بھی نکلتا تھا غالباً۔" وہ دسمبر کی دھوپ جتنا ہی تپ کر بولی تھی کہ انیب کی مسکراہٹ مزید گہری ہوئی۔

"ماشاء اللہ، انیب کی یادداشت اچھی اور حافظہ تیز ہے۔" منورہ بوا اس کے لیے چائے لے کر آئی تھیں۔

"وہ ساجدہ کی بیٹی کو بہت پسند آ گئی تھی، تو تمہاری نانی نے اسے ہی دے دی۔"

وہ چونکا اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔

"ساجدہ...... آپ کی پوتی، چھوٹی سی عمر میں جس کی شادی ہو گئی تھی؟" یاد کے کسی نم موسم میں اس کا لہجہ پہلے پھیکا، پھر چہکا۔" جو سارا دن سسرال سے حاصل کردہ رنگی برنگی چیزوں کو بار بار گنتی تھی اور......"

یسریٰ کا دل اس کے مسکراتے گدگداتے نم لہجے سے بھیگ کے دھڑکا۔

"ہاں، وہی ماشاء اللہ سے اس کے چار بچے ہیں اب۔" منورہ بوا نے ہنستے ہوئے بتایا۔

"اس شخص کو کیا کچھ یاد نہیں۔" برش مضبوطی سے پکڑا۔

"مجھے یاد آ رہا ہے کہ......" جانے وہ کیا کہنے والا تھا۔ مگر وہ اپنی بچکانہ خواہش یاد کر کے پانی پانی ہوئی۔ برش ڈبے میں پھینکا اور اپنی خجالت چھپانے اس کے سامنے تن کر کھڑی ہوئی کہ ان مسکراتی آنکھوں میں خواہ مخواہ کی حیرت، شرارت کے ساتھ گھل مل چکی تھی۔

"آپ کو وہ سبزی والا کریمو چاچا بھی یاد ہوگا یقیناً جس کی کھوتی ریڑھی ہوا کرتی تھی۔" مقابل نے ابرو چڑھائے اور لبوں کے گوشے بھینچ کے جیسے یاد کرنے کی کوشش کی۔ وہ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد دوبارہ بولی۔

"اس کی کھوتی کا نام رانی تھا غالباً۔" وہ بات مکمل کرنے کے بعد وہاں رکی نہیں تھی۔ انیب کا فلک شگاف قہقہہ دوپہر کے سناٹے میں دور تک سنائی دیا تھا۔ وہ قہقہہ سن کے گھر آئی کسی خاتون سے بات کرتی، سلطنت آرا کے دل سے اک ہوک سی اٹھی تھی۔

☆☆☆

سائنا آج کل پریشان تھی کہ ہر بچے کی ناپسندیدہ فہرست میں "دادی" ضرور لکھا ہوتا تھا۔ وجہ جاننے پہ ہر بچہ منہ بگاڑ کے کہتا۔ "ہماری مما کو دادی پسند نہیں کرتیں اور پاپا سے مما کو ڈانٹ بھی پڑواتی ہیں۔"

"وہ مما اور دادی کا مسئلہ ہے، تم لوگوں کا نہیں۔" وہ بچوں کو اپنے طریقے سے سمجھاتی۔

ایک دن اپنا بیڈروم صاف کرتے ہوئے وہ لسٹ اس کو مل گئی، جس گیم میں انیب نے حصہ لیا تھا، وہ سائنا کے سمجھانے پہ ماں کو معاف کر چکا تھا اور گاہے بگاہے ان سے ملنے جا رہا تھا۔ اس میں ایک مثبت تبدیلی آئی تھی۔ وہ فارغ اوقات میں ٹی وی دیکھنے کے بجائے کتابیں پڑھتا تھا یہ بھی مسز اسمتھ کی بدولت ہوا تھا۔

سب سے پہلے اس نے قرآن پاک کو باترجمہ مع تفسیر کے پڑھا تھا۔ پھر وہ اپنی اصلاح کیوں کر نہ کر پاتا، اس نے اس نسخہ حیات کو محض پڑھنے کے لیے نہیں پڑھا تھا، بلکہ رہنمائی پانے کے لیے پڑھا تھا۔ ان ہی دنوں ابوبکر سے ملاقات ہوئی تو اس نے دھماکا خیز انکشاف کیا کہ برہان ثاقب دو کتابوں کے مصنف بن چکے ہیں اور ان کی کتابوں کا موضوع جان کر انیب جیسے گہری نیند سے جاگا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ دونوں ایک ہی کشتی کے مسافر تھے۔

☆☆☆

مہندی کے فنکشن پہ انہوں نے اپنے ہمسائیوں میں سے چند گھرانوں کو بلایا تھا۔ باقی کا تمام ہجوم مہ پارہ جانے کہاں سے اکٹھا کر کے لائی تھیں۔ اس نے کھلی

کھڑکی سے نیچے لان میں جھانکا۔ جہاں اب فنکشن عروج پہ تھا۔ اگر کوئی خوشی مکمل شکل میں دیکھنا چاہتا ہو تو اسے اس وقت ابوبکر کا چہرہ دیکھ لینا چاہیے تھا۔

شام کو رسم نکاح پر اسے اپنا باپ یاد آیا تھا۔

"آپ نے دوبارہ اسی خاندان میں اقصیٰ کی نسبت طے کر کے مجھ پر بہت بڑا ظلم کیا ہے بابا!" مرد ہو کے باپ کے اس فیصلے پر وہ جیسے رو پڑے تھے۔

"شر کا بدلا خیر سے دینے میں ہی بھلائی ہے جو انہوں نے کیا۔ وہی تم نے دہرایا۔ اگر میں یہ فیصلہ نہ کرتا تو حساب برابر کرنے کے چکر میں تم میری بہن کا منہ بھی نہیں دیکھتے۔"

"بابا آپ نے بہت اچھا کیا تھا۔" آج ان کی نظر مہ پارہ پہ ہی لگی ہوئی تھی۔ انہوں نے گہرا سانس ہوا کے سپرد کرتے ہوئے سگریٹ سلگائی اور ایک گہرا کش لیا۔ ابوبکر کے پہلو میں مہندی کی دلہن لمبا گھونگھٹ اوڑھ کے بیٹھی تھی جو دولہا کی ہزار التجاؤں پہ بھی اس نے ذرا سا بھی نہیں سرکایا تھا۔ مگر اس کی مہندی سے سجی ہتھیلیوں پہ زمانے بھر کی خوشی ادھم مچا رہی تھی۔

دسمبر کا یہ دوسرا ہفتہ جانے کتنی بہاریں سمیٹ کر اس گھر میں اترا تھا۔

اچانک دروازہ کھلا۔ وہ بے ساختہ پلٹا۔ کوئی اس کے قریب آیا اور اس کی لرزتی انگلیوں سے سگریٹ نوچ کے دور پھینکا۔ کمرے میں مہندی کی خوشبو بھر گئی۔ وہ زرد لباس پہنے ہوئے تھی۔

"اب بھی وقت ہے۔" اس نے کسی فسوں کی طرح خوشبو بھری سرگوشی کی تھی۔ اس نے متوحش سا ہو کے اسے دیکھا۔ مگر وہ اب نظر نہیں آئی تھی۔ نیچے ابوبکر کے پہلو میں دلہن تو بیٹھی ہوئی تھی۔ پھر کچھ دیر پہلے کمرے میں کون آیا تھا۔

نیچے ثاقب ولا کے لان میں کھلے دیس بدیس کے پیڑ پودے آج پھر وہی خوشبو اپنے دامن میں سمیٹ رہے تھے۔ ابوبکر کی مسکراتی نگاہ انیب سے ٹکرائی، جو سلطنت آرا سے کسی بات پہ الجھ رہا تھا۔

اس کو ہفتہ بھر پہلے کی وہ شام یاد آئی۔ جب وہ شادی کا کارڈ لے کر رہبر کے گھر گیا تھا۔ سفینہ کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے دیکھ کر اس کے دل کو کچھ ہوا تھا۔

"اب وہاں بہت کچھ بدل چکا ہے۔ آپ پہل کریں گی تو وہ بت بھی ٹوٹ جائے گا اور وہ پہرے لگاتا حکم تو برہان ماموں بھول بھی چکے ہوں گے۔" ابوبکر کے نرم الفاظ اور ٹھہرے لہجے پہ سفینہ نے اپنی تڑپ چھپاتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔

"اسے کچھ بھی نہیں بھولا، نہ میں، نہ وہ حکم، نہ وہ میرے آنسوؤں کی چند بوندیں، جو اس کی آستین پہ اب بھی نم ہوں گی۔ وہ اپنے وجود پہ ثبت ہلکا سا گیلا پن برقرار رکھنے کے لیے اب بھی ہواؤں کے موسم میں کھڑکیاں بند رکھتا ہے۔" وہ تادیر ابوبکر کو دیکھتی رہیں خاموشی کے ساتھ۔

"شاید ایسا ہی ہو۔" انہوں نے بے نیازی سے کندھے اچکائے۔ "مگر معذرت کے ساتھ ابوبکر کہ میری بہت قریبی دوست کی شادی بھی اسی تاریخ کو ہو رہی ہے۔ پھر انیب تو وہیں ہے، ہم سب کی کمی کیا اس سے پوری نہیں ہوگی۔" وہ پھیکا سا مسکرائی تھیں، جیسے کوئی رو دیا ہو۔

"کوئی اور ہوتا تو مان لیتا۔ وہ ابوبکر تھا، مہ پارہ کا دوست، سب جانتا تھا۔

"یاد رکھنا ابوبکر! شادی کے بعد اقصیٰ کے ساتھ سب سے پہلے میرے گھر آنا ہے۔" وہ اسے بار، بار تاکید کرتی تھیں۔ آج اس خوشی کے موقع پر بھی اس نے دیکھا تھا کہ اس کی ماں اپنی آنکھوں سے سفینہ نامی اس عورت کے آنسو بار، بار پونچھتی تھی اور سلطنت آرا کے آنسو پونچھنے کے لیے انیب جو تھا۔ جس کا دل مسرور سا ہو کے اس موسم کے لیے دھڑکنے لگا تھا جو ابھی آیا ہی نہیں تھا۔

☆☆☆

سائنا اسمتھ، انیب کے سامنے کسی سائیکا

ٹرسٹ کی طرح بیٹھی تھی۔ اس کے بیڈ روم میں ہلکی نیلگوں روشنی تھی اور اس کے ہاتھ میں انیب کی چھ ماہ پہلے کی کھیل والی لسٹ تھی۔ ابوبکر جانتا تھا، مگر انیب نہیں جانتا تھا کہ سانتا بہت بڑی ہپناٹائزر تھی۔

بچے تو بچے تھے، مگر آج تینتیس سالہ انیب کی فہرست میں لفظ دادی ناپسندیدہ افراد میں پڑھ کر وہ شاکڈ رہ گئی تھی۔ اس نے سوچا وہ جلد ہی کسی ٹاک شو میں یہ ٹاپک ڈسکس کرے گی کہ ملکی اور غیر ملکی دادیوں کو اب سدھر جانا چاہیے۔

پہلا نام شعیب اس کو چھوڑ کر وہ آگے بڑھی۔

''دادی' میری ماں کو پسند نہیں کرتی تھی۔

''ہوں......'' اس نے ہنکارا بھرا۔ نیکسٹ، موسیو کون؟''

''اس نے مجھے پہلی بار—— پلائی تھی۔''

''ہوں، نیکسٹ۔'' وہ آرام دہ کرسی پہ نیم دراز تھا، اس کی آنکھیں بند اور ذہن کھلا، مگر خواب آگیں تھا۔

''لولیزا کون؟''

اس لڑکی نے مجھے ڈسٹرب کرنے کی کوشش کی تھی۔''

''او مائی گاڈ!'' سانتا نے ہونٹوں پہ ہاتھ رکھ کے قہقہہ کنٹرول کیا۔ ''ہوں! نیکسٹ ڈونلڈ ٹرمپ کون؟''

''مسلمانوں کو آپس میں لڑانے مروانے والا۔''

تم پاکستانی بھی عجیب ہو۔ جہاں رہتے ہو، کماتے ہو انہیں کو......''

''جہاں خدا نے ہمارا بسیرا اور رزق لکھا ہو، ہماری اوقات ہی کیا ہے۔'' وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔

''مگر پاکستانی اپنی اوقات میں بھی کہاں رہتے ہیں۔''

''مگر ہم پاکستانی عجیب اور غریب بھی ہیں، جیسے کہ عجیب میں اور غالب غریب مختار۔'' وہ منہ بند کر کے مسکرلیا۔ وہ اس کی قطع کلامی پہ کچھ ناراض ہوئی، پھر کندھے جھٹک کر پوچھا۔

''نیکسٹ، مودی کون؟''

''اسلام دشمن۔''

''نیکسٹ؟''

''پاکستان کے دشمن۔''

''ہوں، نیکسٹ کلاریا، ہوازشی۔''

''ویلنٹائن ڈے پہ اس نے مجھے گھور کے کہا تھا۔ سرخ پھول ختم ہو چکے ہیں۔'' اس کا لہجہ اس پل بھی غنودگی کے زیر اثر تھا۔

''تم وہ سرخ گلاب کسے دینا چاہتے تھے انیب۔'' سانتا کا لہجہ میٹھا اور ہوا کی طرح ہلکا ہوا۔ وہ جیسے ہپناٹائز ہو چکا تھا۔ ''یونی کی تمام لڑکیوں میں وہ مجھے اچھی لگتی تھی، اس کا نام یسریٰ تھا۔''

سانتا بری طرح چونکی، مگر سوالات جاری رکھے۔

''ہوں نیکسٹ، کریم اللہ کون؟''

وہ کچھ الجھا، اس نے ذہن پہ زور دیا۔ کریم اللہ، یہ، یہ، یہ رہبر کا چوکیدار۔ جب میں آخری بار ثاقب ہاؤس سے سامان اٹھانے جا رہا تھا تو اس نے مجھے دیکھ کے قہقہہ لگایا تھا۔

''مگر کسی کو دیکھ کر ہنسنا کچھ معیوب تو نہیں؟'' سانتا نے اسے کریدا۔

''وہ میری دادی سے جیسے بٹور کر ان کے کہنے پر میرے باپ کو میری ماں کے متعلق جھوٹی خبریں دیتا تھا۔''

سانتا کے لیے سانس لینا دشوار رہا۔ کتنی ہی دیر بعد اس کا سکتہ ٹوٹا تو جیسے ہلکی سی سرگوشی کی۔ ''ثاقب ہاؤس میں کون رہتا تھا؟''

''وہ جنت تھی' وہاں پھول تھے، محبت تھی پرندے تھے۔ نانی اور یسریٰ تھیں۔

سانتا کے ہونٹوں پہ پر اسرار مسکراہٹ رینگی ''یسریٰ تو یونی میں ہوتی تھی؟''

''لیکن میں نے اسے وہاں بھی دیکھا تھا۔'' وہ کسمایا۔

''تو کیا یہ وہی یسریٰ تھی؟''

شاید ہاں مگر نہیں۔ وہ گڑیوں سے کھیلتی تھی۔ وہ آنجوروں سے پرندے اڑا دیا کرتی تھی۔ وہ ہر ایک سے لڑنے کے لیے تیار رہتی تھی۔ وہ وہ......انیب جیسے غنودگی میں اتر چکا تھا۔

سانتا نے اسے فی الحال سونے دیا۔

دوسرے دن جب سانتا نے اس کے سامنے فہرست رکھی تو وہ اپنے پسندیدہ نام پڑھ کے ہکا بکا رہ گیا

''کیا یہ میں نے ہی لکھے تھے۔''

''مینار پاکستان سفید تھا یا سیاہ'' غالب مختار نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''سفید تھا یار۔'' وہ برجستہ بولا۔

''تو انیب صاحب تف ہے تم پر سب یاد ہے بس ایک نانی کا گھر بھول چکے ہو۔''

''نانی کے بیٹے نے کہا تھا دوبارہ یہاں مت آنا۔'' اس نے سچ بول کر غالب کے قہقہوں کو روکا۔

''تو کیا ابھی زندہ ہے؟'' وہ کچھ سنجیدہ ہوا۔

''ٹھہرو ابھی ابوبکر سے پوچھتا ہوں۔''

''نانی کا حال کیا ہے؟'' اس کے منہ سے یہ سوال سن کر ابوبکر کی جیسے نیند اڑ گئی تھی کیونکہ —— وہ گہری نیند سو رہا تھا۔

''رات کے تین بجے نانی کیوں یاد آگئیں بھائی۔'' وہ جمائی لیتے ہوئے ہنسا۔

''ان کی دو نواسیاں' بھی تھیں'' دوسرا سوال کیا۔

''نہیں ان کا ایک نواسا انیب تھا باقی دو پوتیاں تھیں''۔ ابوبکر اس کی بوکھلاہٹ سے محظوظ ہوا

''بڑی پوتی میری فیانسی ہے اور چھوٹی ابھی یہ

''ہاں مجھے یاد ہے وہ بہت چھوٹی تھی۔''

''چودہ سال پہلے گھامڑ'' اب وہ امی سے بھی لمبا' قد نکال چکی ہے مگر یہ بھی یاد رکھ کہ ان کے ایک ابا حضور بھی ہیں جو چودہ سال پہلے تجھ پہ اپنے گھر کے دروازے بند کر چکے ہیں، اوپر سے رات کے تین بجے جناب کو ان کی نواسیاں یاد آرہی ہیں۔ لہٰذا میں فون بند کر رہا ہوں۔''

غالب اور سانتا نے بھی آن لاؤڈر سے ابوبکر کی گفتگو سنی تھی کچھ مشورے سے غالب نے دیے جو انتہائی فضول تھے۔ کچھ عرصے بعد سانتا اسمتھ نے اس کی رہنمائی کی تھی۔

''بس یہاں تم بہت رہ لیے اپنا ٹرانسفر کرواؤ اور اپنے ملک سدھارو' بلا دھڑک اس گھر کا دروازہ پار تو کرو کیا خبر وقت وہاں ٹھہرا ہوا ہو' رشتے کہہ دینے سے ختم نہیں ہوتے برہان کو سمجھنے کی کوشش کرو انہیں اپنی بات سمجھانے کی تدبیر سوچو۔''

سانتا کی بات میں وزن تھا وہ رخت سفر باندھ کر پاکستان آگیا تھا پاکستان آکر اچھی طرح گھر بار سیٹ کرنے کے بعد خود کو اچھی طرح مطمئن کر کے ایک شام وہ ثاقب ولا کی ڈور بیل بجا رہا تھا۔

☆☆☆

آج یسریٰ کسی رشوت کے موڈ میں نہیں تھی۔ اس نے ہری جھنڈی دکھا دی سلطنت آرا بھی نیند کے مارے کمرے کا رخ کر چکی تھیں۔ ان دونوں فیملیوں کے علاوہ وہاں انیب بھی تھا جس نے ابوبکر کے ساتھ ہی جانا تھا اور دولہا صاحب کی رٹ تھی کہ ''دلہن دیکھے بنا جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

اس نے کوئی اکیسویں بار کہا تو جمائیاں روکتے رمیض نے بڑے بھائی کو آنکھیں پھاڑ کے دیکھا۔

''اب ایسا بھی کیا میک اپ کے ساتھ بھی بنی تمام عورتیں ہی اچھی لگتی ہیں بھائی! آپ ذرا گھر تو چلیے۔''

ہیں! تو کیا بھابھی کو کبھی بنا کر مٹھی میں بند کر لیا ہے'' اس نے رمیض کو خوامخواہ ہی گھورا۔

''گھر جا کر میں تمام حسینوں کی مایوں مہندی کی پک آپ کو دکھاؤں گا۔''

''واہ کیا خوب مشورہ ہے۔'' وہ نا چاہتے ہوئے

بھی سب کے ساتھ ہنس دیا۔

"جب تمہاری شادی ہو گی نا بچو! تو تمہاری دلہن کو گیسٹ روم میں لاک کر کے میں بھی تمہیں تمام حسینوں کی تصویریں چھوڑ ویڈیوز دکھاؤں گا۔"

"لو۔۔ایویں" بات اس کے پلے پڑی تو کھسیا کر منمنایا ماں نے پیچھے سے آ کر کان مروڑا۔

"بالکل ایویں ہی' اب چلو میرے ساتھ تمہارے بابا کا دوبار فون آ چکا ہے۔" اب وہ بھائی سے نظر چراتا' دوسرے ہاتھ سے کان سہلاتا ماں کے آگے' آگے تھا۔

سنہری کام والے ڈریس میں یسریٰ اس قدر اچھی لگ رہی تھی کہ سبھی نے اس کی تعریف کی تھی مگر انیب نے اس پہ اک نظر بھی نہیں ڈالی تھی۔ اب بھی وہ جانے کہاں دیکھ رہا تھا کہ یسریٰ نے محتاط سا ہو کے دیکھا تو بے نیاز سے بیٹھے اس شخص کی چراغ نظر نے اچانک ہی خبر لی تھی اس چشم شوق میں مضطر سا کاجل پھیل چکا تھا یسریٰ نے جھینپ کے نگاہ چرائی۔۔

ابھی بوا اس کے کمرے میں چائے لے کر جا رہی ہیں یہ آخری لمحہ ہے۔ بہادری دکھایئے۔" نیند سے اسکا برا حال تھا۔

ابوبکر بوا کے پیچھے آہستہ سے بڑھا کہ بوا بھی بے خبر تھیں۔ بالآخر یسریٰ کو دولہا پہ ترس آ ہی گیا۔ وہاں اب صرف وہ دونوں تھے۔

شور و وحشت بھی نہیں' تنگی داماں بھی نہیں

مجھ پہ اتری ہے محبت بڑی تہذیب کے ساتھ

☆☆☆

اس نے ڈور بیل پہ ہاتھ رکھا اور وہاں کھڑے کھڑے اسے سب کچھ یاد آنے لگا تھا۔ اس نے اک نظر رہبر ہاؤس پہ بھی ڈالی جہاں اب کرائے دار رہتے تھے۔

"میرے گھر کا دروازہ ان کے لیے اب کبھی نہیں کھلنا چاہیے۔"

اب وہ اس حکم کو یاد کر کے ــــــ مسکرا رہا تھا۔ تبھی گیٹ کا چھوٹا پٹ کھلا۔ چند لمحے دیکھتے رہنے کے بعد اس ادھیڑ عمر آدمی کی آنکھوں میں پہچان کا تاثر ابھرا تھا۔

انیب شعیب کے سامنے سے ہٹ کر اس نے اسے اندر آنے کا راستہ دیا۔ گویا ملازم بھی مالک کا حکم بھلا چکا تھا۔

اندر آ کر اور سب سے مل کر اسے اندازہ ہوا کہ وقت محض زمانے کے لیے بدلا تھا یا لوگ وقت کے ساتھ بدلے ہوں گے۔ ثاقب ولا میں تو وقت جیسے کب کا ٹھہر چکا تھا نانی کا وہی محبت بھرا لمس' نہ برسوں پہلے کی کوئی بات' نہ حال سے کوئی گلہ شکوہ' بس کپکپاتے ہاتھوں میں انہوں نے چہرہ بھر کے تادیر نم آنکھوں کے ساتھ دیکھتی رہیں پیشانی پہ وہ محبت بھرا بوسہ۔

"اب تو مجھ بڑھیا کے چل چلاؤ کے دن قریب تھے۔ اچھا کیا چلے آئے۔" بس اس ایک جملے میں انتظار اور محبت کو ساتھ کھڑا کر دیا۔ اقصیٰ کا وہی مہربان سا جود۔ منورہ بوا نے اس کا سر چوم کے کیسی کیسی بلائیں نہیں لی تھیں۔ وہ ان سب کو یوں یاد تھا جیسے یہاں سے کل ہی اٹھ کر گیا تھا۔

ایک چھوٹی لڑکی نے آب خورے کی زنجیر ہلائی تھی آس پاس اک مانوس سی کھنک ابھری' ہنسی کی دبی دبی سی آوازیں' جن میں سے اک آواز اس کی اپنی تھی اور دوسری۔۔۔

"نانی آپ کی ایک اور پوتی بھی تھی؟" کچھ ہچکچا کے پوچھا۔

"لو ذرا سنو تو آج کل کے بچوں کے حافظے۔" منورہ بوا نے مسکرا ــــــ کے سر جھٹکا۔ "یسریٰ کی تو مانو' تم سہیلی تھی' تمہارے جانے کے بعد مہینوں اداس رہی سمجھو کہ بچی نے سارے کھیل کھلونے توڑ دیے تھے۔ رشتہ داروں کا اس قدر کال تھا اور تم ماں بیٹے کے علاوہ بھلا اس گھر میں کون آتا جاتا تھا۔" تب ہی نانی نے بوا کو ہلکا سا گھور کے وہ موضوع بدل دیا تھا۔

برہان سے ملاقات ہوتے ہی وہ جان گیا تھا کہ یہاں مزاج ہنوز ویسے ہی تھے۔

دوسری بار ثاقب ولا جانے کے بعد اسے پختہ یقین ہو چلا تھا کہ یہاں کے باسی کسی سوئے ہوئے محل سے ابھی کہ ابھی جاگے ہیں۔ یسریٰ کو دیکھ کے ذہن نے جیسے پرانی کتاب کھول لی تھی وہ یسریٰ کو دیکھتے ہی پہچان گیا تھا جو اس کے جھوٹ بولنے پہ آج بھی اس سے خفا تھی۔

☆☆☆

سفینہ' مومنہ کے پیلے منقش گوٹے کناری سے سجے لباس پہ نگاہیں گاڑے بیٹھی تھی۔ مسکراہٹ تو دور کی بات وہ اپنے حال سے بھی فی الوقت نا آشنائی برت رہی تھی۔

وہ کیوں تھی۔ کون اور کہاں تھی؟

آج اس نے اپنی دوست کے سامنے ماضی کے اس شہر کا دروازہ کھول دیا تھا جہاں کبھی تلواریں اٹھائی گئیں نہ بندوقیں چلیں مگر رویوں اور زبان کی جھلستی دھوپ نے ان خاندانوں کو محبت کی' اپنائیت کی چھاؤں سے ہمیشہ محروم رکھا۔

خطاب عمر خاکوان سے یہ غلطی سرزد ہوئی کہ انہوں نے اپنی بڑی بیٹی کا رشتہ خاندان سے باہر کر دیا تھا اور اگر زندگی ان سے وفا کرتی تو وہ اپنی چھوٹی بیٹی تہنیت آرا کو بھی اپنے خاندان میں نہ بیاہتے۔ انسان دوست' باکردار اور پانچوں وقت خدا کے حضور جھکنے والے خطاب عمر دولت و حیثیت کے اعتبار سے اپنے خاندان میں سب سے بڑھ کر تھے مگر وہ خدا کی اس فراخ دلانہ عنایت کو انسان کی آزمائش سمجھتے تھے' اور ان کا باقی خاندان اس عنایت و مہربانی کو اپنی قابلیت سمجھتے ہوئے اخلاقی تنزلی کا شکار ہو چکا تھا۔

مضبوط قد کاٹھ اور گندمی رنگت' شائستہ اطوار کے مالک ثابت سہیل جوڈیشن جج کے عہدے پہ فائز تھے۔ انہیں کچھ یوں دل کے قریب محسوس ہوا کہ چند ماہ میں ان سے کیملی روابط استوار کرتے ہوئے، سلطنت آرا کو اسی خاندان کا حصہ بنا دیا۔

ثاقب سہیل کا خاندان کسی زمانے میں بھی ہزکمانوں کے چولہوں میں آگ نہیں جلایا کرتا تھا۔ اور خاکوانوں کو کون سا خدا نے نسل در نسل اولیاء سے نوازا تھا کہ ان کا غرور آسمان کو چھوتا تھا۔

تہنیت کی شادی باپ کی وفات کے بعد اپنے چچازاد بھائی سے ہوئی تھی قرین قیاس تھا کہ اس نے یہ شادی اپنی مرضی سے کی تھی۔ جب بھی دونوں بہنیں اپنے اپنے سسرال سمیت اکٹھی ہوتیں' تو ان کے بچے جواب جوان ہو رہے تھے۔ گھما پھرا کے بات قوم قبیلے پہ لے آتے۔

"سنا ہے تمہارے آباؤ اجداد لکھنؤ میں نوابوں کے غلام ہوتے ہے اور قیام پاکستان کے بعد جب تمہارے دادا ہجرت کر کے پاکستان آنے لگے تو ان نوابوں نے اپنی حیدر آبادی حویلیاں اور جاگیریں تمہارے دادا اور دادی کو بطور انعام بخش دی تھیں۔" وہ قہقہہ لگا کر کہتے۔

تہنیت آرا اپنے دیور جیٹھوں کے بچوں کو اس بدتمیزی سے کبھی منع نہ کرتیں۔

برہان خالہ کے اس رویے پہ حیران ہوتا عمر کے ساتھ وہ ذہنی طور پہ اپنے ننھیالی خاندان سے دور ہوتا چلا گیا جو کہ اب اس کے رویے سے بھی ظاہر تھا۔

تہنیت نے جانے کس خدشے کے تحت اپنی بیٹی کا رشتہ سسرال میں ہی طے کر لیا تھا وہ بڑی بہن کی طرح روشن خیال اور کھلے دل کی مالک نہیں تھیں۔ سالوں گزر جانے کے بعد بھی دونوں خاندانوں کے بیچ موجود تناؤ اور فاصلہ ہنوز برقرار رہا۔

مہ پارہ کے لیے اسی خاندان سے رشتہ آیا تو برہان بھڑک اٹھا تھا۔

"ہرگز نہیں ایسا سوچے گا بھی نہیں۔" اس نے ماں کے سامنے پہلی بار اونچی آواز میں بات کی تھی اور شاید وہ اس قدر مشتعل نہ ہوتا کہ ایک دن پہلے اس نے اپنی خالہ کو ماں سے یہی بات کرتے سنا تھا۔

"خیر جو بھی ہوا پا مگر ہمارے خاندان میں کچھ تو سب سے بڑھ کر ہے کہ تمہارے شوہر کی چوبیس سالوں بعد بھی خاکوانوں سے مرعوبیت ذرا کم نہیں ہوئی۔ ہمارے خاندان کے مردوں سے وہ آج بھی

بھی سب کے ساتھ ہنس دیا۔

"جب تمہاری شادی ہوگی نا بچو! تو تمہاری دلہن کو گیسٹ روم میں لاک کر کے میں بھی تمہیں تمام حسینوں کی تصویریں چھوڑ ویڈیوز دکھاؤں گا۔"

"لو۔ ایویں" بات اس کے پلے پڑی تو کھسیا کر منمنایا ماں نے پیچھے سے آکر کان مروڑا۔

"بالکل ایویں ہی' اب چلو میرے ساتھ تمہارے بابا کا دوبار فون آچکا ہے۔" اب وہ بھائی سے نظر چراتا' دوسرے ہاتھ سے کان سہلاتا ماں کے آگے' آگے تھا۔

سنہری کام والے ڈریس میں یسریٰ اس قدر اچھی لگ رہی تھی کبھی نے اس کی تعریف کی تھی مگر انیب نے اس پہ اک نظر بھی نہیں ڈالی تھی۔ اب بھی وہ جانے کہاں دیکھ رہا تھا کہ یسریٰ نے محتاط سا ہو کے دیکھا تو بے نیاز سے بیٹھے اس شخص کی چراغ نظر نے اچانک ہی خبر لی تھی اس چشم شوق میں مضطرب سا کاجل پھیل چکا تھا یسریٰ نے جھینپ کے نگاہ چرائی۔۔۔

ابھی بوا اس کے کمرے میں چائے لے کر جا رہی ہیں یہ آخری لمحہ ہے۔ بہادری دکھایئے۔" نیند سے اسکا برا حال تھا۔

ابوبکر بوا کے پیچھے آہستہ سے بڑھا کہ بوا بھی بے خبر تھیں۔ بالآخر یسریٰ کو دولہا پہ ترس آ ہی گیا۔ وہاں اب صرف وہ دونوں تھے۔

شور وحشت بھی نہیں' تنگی داماں بھی نہیں
مجھ پہ اتری ہے محبت بڑی تہذیب کے ساتھ

☆☆☆

اس نے ڈور بیل پہ ہاتھ رکھا اور وہاں کھڑے کھڑے اسے سب کچھ یاد آنے لگا تھا۔ اس نے اک نظر رہبر ہاؤس پہ بھی ڈالی جہاں اب کرائے دار رہتے تھے۔

"میرے گھر کا دروازہ ان کے لیے اب بھی نہیں کھلنا چاہیے"

اب وہ اس حکم کو یاد کر کے ـــــ مسکرا رہا تھا۔ تبھی گیٹ کا چھوٹا پٹ کھلا۔ چند لمحے دیکھتے رہنے کے بعد اس ادھیڑ عمر آدمی کی آنکھوں میں پہچان کا تاثر ابھرا تھا۔

انیب شعیب کے سامنے سے ہٹ کر اس نے اسے اندر آنے کا راستہ دیا۔ گویا ملازم بھی مالک کا حکم بھلا چکا تھا۔

اندر آکر اور سب سے مل کر اسے اندازہ ہوا کہ وقت محض زمانے کے لیے بدلا تھا یا لوگ وقت کے ساتھ بدلے ہوں گے۔ ثاقب ولا میں تو وقت جیسے کب کا ٹھہر چکا تھا نانی کا وہی محبت بھرا لمس' نہ برسوں پہلے کی کوئی بات' نہ حال سے کوئی گلہ شکوہ' بس کپکپاتے ہاتھوں میں انہوں نے چہرہ بھر کے تادیر نم آنکھوں کے ساتھ دیکھتی رہیں پیشانی پہ وہ محبت بھرا بوسہ۔

"اب تو مجھ بڑھیا کے چل چلاؤ کے دن قریب تھے۔ اچھا کیا چلے آئے۔" بس اس ایک جملے میں انتظار اور محبت کو ساتھ کھڑا کر دیا۔ اقصیٰ کا وہی مہربان سا جود۔ منورہ بوا نے اس کا سر چوم کے کیسی کیسی بلائیں نہیں لی تھیں۔ وہ ان سب کو یوں یاد تھا جیسے یہاں سے کل ہی اٹھ کر گیا تھا۔

ایک چھوٹی لڑکی نے آب خورے کی زنجیر ہلائی تھی آس پاس اک مانوس سی کھنک ابھری' ہنسی کی دبی دبی سی آوازیں' جن میں سے اک آواز اس کی اپنی تھی اور دوسری۔۔۔

"نانی آپ کی ایک اور پوتی بھی تھی؟" کچھ ہچکچا کے پوچھا۔

"لو ذرا سنو تو آج کل کے بچوں کے حافظے۔" منورہ بوا نے مسکرا ـــــ کے سر جھٹکا۔ "یسریٰ کی تو مانو' تم سہیلی تھی' تمہارے جانے کے بعد مہینوں اداس رہی سمجھو کہ بچی نے سارے کھیل کھلونے توڑ دیے تھے۔ رشتہ داروں کا اس قدر کال تھا اور تم ماں بیٹے کے علاوہ بھلا اس گھر میں کون آتا جاتا تھا۔" تب ہی نانی نے بوا کو ہلکا سا گھورکے وہ موضوع بدل دیا تھا۔

برہان سے ملاقات ہوتے ہی وہ جان گیا تھا کہ یہاں مزاج ہنوز ویسے ہی تھے۔

دوسری بار ثاقب ولا جانے کے بعد اسے پختہ یقین ہو چلا تھا کہ یہاں کے باسی کسی سوئے ہوئے محل سے ابھی کہ ابھی جاگے ہیں۔ یسریٰ کو دیکھ کے ذہن نے جیسے پرانی کتاب کھول لی تھی وہ یسریٰ کو دیکھتے ہی پہچان گیا تھا جو اس کے جھوٹ بولنے پہ آج بھی اس سے خفا تھی۔

☆☆☆

سفینہ' مومنہ کے پیلے منقش گوٹے کناری سے سجے لباس پہ نگاہیں گاڑے بیٹھی تھی۔ مسکراہٹ تو دور کی بات وہ اپنے حال سے بھی فی الوقت نا آشنائی برت رہی تھی۔

وہ کیوں تھی۔ کون اور کہاں تھی؟

آج اس نے اپنی دوست کے سامنے ماضی کے اس شہر کا دروازہ کھول دیا تھا جہاں کبھی تلواریں اٹھائی گئیں نہ بندوقیں چلیں مگر رویوں اور زبان کی جھلستی دھوپ نے ان خاندانوں کو محبت کی' اپنائیت کی چھاؤں سے ہمیشہ محروم رکھا۔

خطاب عمر خاکوان سے یہ غلطی سرزد ہوئی کہ انہوں نے اپنی بڑی بیٹی کا رشتہ خاندان سے باہر کر دیا تھا اور اگر زندگی ان سے وفا کرتی تو وہ اپنی چھوٹی بیٹی تہنیت آرا کو بھی اپنے خاندان میں نہ بیاہتے۔ انسان دوست' باکردار اور پانچوں وقت خدا کے حضور جھکنے والے خطاب عمر دولت و حیثیت کے اعتبار سے اپنے خاندان میں سب سے بڑھ کر تھے مگر وہ خدا کی اس فراخ دلانہ عنایت کو انسان کی آزمائش سمجھتے تھے' اور ان کا باقی خاندان اس عنایت و مہربانی کو اپنی قابلیت سمجھتے ہوئے اخلاقی تنزلی کا شکار ہو چکا تھا۔

مضبوط قد کاٹھ اور گندمی رنگت' شائستہ اطوار کے مالک ثابت سہیل جو سیشن جج کے عہدے پہ فائز تھے۔ انہیں کچھ یوں دل کے قریب محسوس ہوا کہ چند ماہ میں ان سے فیملی روابط استوار کرتے ہوئے، سلطنت آرا کو اسی خاندان کا حصہ بنا دیا۔

ثاقب سہیل کا خاندان کسی زمانے میں بھی ترکمانوں کے چولہوں میں آگ نہیں جلایا کرتا تھا۔ اور خاکوانوں کو کون سا خدا نے نسل در نسل اولیاء سے نوازا تھا کہ ان کا غرور آسمان کو چھوتا تھا۔

تہنیت کی شادی باپ کی وفات کے بعد اپنے چچازاد بھائی سے ہوگئی تھی قرین قیاس تھا کہ اس نے یہ شادی اپنی مرضی سے کی تھی۔ جب بھی دونوں بہنیں اپنے اپنے سسرال سمیت اکٹھی ہوتیں' تو ان کے بچے جواب جوان ہو رہے تھے۔ گھما پھرا کے بات تو م قبیلے پہ لے آتے۔

"سنا ہے تمہارے آباؤ اجداد لکھنؤ میں نوابوں کے غلام ہوتے ہے اور قیام پاکستان کے بعد جب تمہارے دادا ہجرت کر کے پاکستان آنے لگے تو ان نوابوں نے اپنی حیدر آبادی حویلیاں اور جاگیریں تمہارے دادا اور دادی کو بطور انعام بخش دی تھیں' وہ قہقہہ لگا کر کہتے۔

تہنیت آرا اپنے دیور جیٹھوں کے بچوں کو اس بدتمیزی سے کبھی منع نہ کرتیں۔

برہان' خالہ کے اس رویے پہ حیران ہوتا عمر کے ساتھ وہ ذہنی طور پہ اپنے ننھیالی خاندان سے دور ہوتا چلا گیا جو کہ اب اس کے رویے سے بھی ظاہر تھا۔

تہنیت نے جانے کس خدشے کے تحت اپنی بیٹی کا رشتہ سسرال میں ہی طے کر لیا تھا وہ بڑی بہن کی طرح روشن خیال اور کھلے دل کی مالک نہیں تھیں۔ سالوں گزر جانے کے بعد بھی دونوں خاندانوں کے بیچ موجود تناؤ اور فاصلہ ہنوز برقرار رہا۔

مہ پارہ کے لیے اسی خاندان سے رشتہ آیا تو برہان بھڑک اٹھا تھا۔

"ہرگز نہیں ایسا سوچیے گا بھی نہیں۔" اس نے ماں کے سامنے پہلی بار اونچی آواز میں بات کی تھی اور شاید وہ اس قدر مشتعل نہ ہوتا کہ ایک دن پہلے اس نے اپنی خالہ کو ماں سے یہی بات کرتے سنا تھا۔

"خیر جو بھی ہوا پا مگر ہمارے خاندان میں کچھ تو سب سے بڑھ کر ہے کہ تمہارے شوہر کی چوبیس سالوں بعد بھی خاکوانوں سے مرعوبیت ذرا کم نہیں ہوئی۔ ہمارے خاندان کے مردوں سے وہ آج بھی

مؤدب ہو کر اور نگاہ جھکا کے بات کرتا ہے۔"

اس پل میں نے برہان کے چہرے پہ زلزلے کے آثار دیکھے تھے۔ پھر جانے ماں کا خیال واقعی صحیح تھا یا بات مقدر کی تھی کہ برہان کے لاکھ نہ چاہنے کے باوجود مہ پارہ کی شادی توفیق سے ہی ہو گئی تھی۔

اب وہ مجھے اور میرے اونچے خاندان کو جلی کٹی سنانے والا تپا تپا سا خفا سا نوجوان نہیں تھا۔ وہ ایک معروف کالج میں لیکچرار تھا۔ ساتھ ہی پی ایچ ڈی بھی کر رہا تھا۔ اب وہ دو گھڑی کے لیے بھی میرے پاس بیٹھنا اور لمحہ بھر کے لیے بھی مجھے دیکھنا چھوڑ چکا تھا۔ ماما کی اچانک موت نے مجھے بالکل گم صم سا کر دیا تھا تو خالہ مجھے اپنے گھر لے آئی تھیں جس کی وجہ سے شعیب تقریباً ہر روز وہاں آ جاتا تھا۔ اور برہان شعیب کی حرکتوں سے بہت چڑتا تھا۔ ایک شعیب کیا جیسے وہ اس خاندان کے ہر فرد سے قطع تعلق چاہتا تھا۔

اتفاق سے شعیب جب بھی آتا تو رہبر میرے پاس ہی کہیں ہوتا تھا۔ سچ پوچھو تو مومنہ! خاندان اور حسب نسب کے اس تقابل میں قلبی' اور ذہنی نقصان' صرف میرا' اور برہان کا ہوا۔"

اس نے پر خیال نظروں سے خلا کو گھورا' اس کے لہجے میں کسی وحشت کی جھلک تھی۔

"اور پھر میں اپنی تمام خواہشوں سمیت اس کی زندگی سے صبح کے آخری ستارے کی طرح معدوم ہو لی گئی۔ پھر بھی میں نے ایک آخری کوشش کی تھی، کہ دل کو چین ہی نہیں آتا تھا، جو بس اسی کی ضد کیے جا رہا تھا، دو دن بعد میری شادی تھی۔ اس سے پہلے کہ شعیب کے نام کی مہندی میری ہتھیلی کو چھو کے مجھے پتھر کا کر دیتی میں اس کے پاس چلی آئی تھی' میرا چار حرفی جملہ سن کر وہ تلخی سے مسکرایا تھا۔ "وقت کسی کے ہاتھ میں کب ہوتا ہے مانو۔!" اک عرصے بعد اس نے مجھے اس نام سے مخاطب کیا تھا۔

"میرے ہی گھر میں تمہیں یہ زرد لباس پہننے کا کوئی حق نہیں تھا۔ اپنے باقی خاندان کی طرح تم بھی بے رحم ہو' اس پل میرا دل چاہا کہ میں اس سے لپٹ کے پھوٹ پھوٹ کے روؤں اس نے میرے چہرے کے اطراف بکھری لٹوں کو نرمی سے میرے کانوں کے پیچھے ٹکایا۔

"وقت یہاں ہوتا ہے مانو!" اس نے میری دو انگلیاں نرمی سے چھو کر اپنی کلائی پہ دھریں جہاں نبض کی ٹک' ٹک تھی۔ "اور تم یہاں ہو۔"

اس قدر دھیمی آواز کہ وہ ذرا بھی دور ہوتا تو میں کنگال ہی اس کے کمرے سے لوٹ آتی' یقین کرو مومنہ! کہ وہ چار حرف ہی اس کے حرف محبت تھے اظہار تھے۔ میں اس آستین پہ اپنے آنسوؤں کا ہار رکھ کے لوٹ گئی تھی' ہم نے ایک دوسرے کو جانے کیوں چاہا اور خاموشی سے ایک دوسرے کی زندگیوں سے نکل گئے۔"

"آپ واقعی بے رحم تھیں سفینہ کہ اس کے ہی گھر میں' اس کے سامنے شعیب کی دلہن' اف!! آپ کس قدر سنگدل تھیں۔" مومنہ نے اپنے آنسو صاف کیے۔

"وہ خالہ کی خواہش تھی' پھر میں دوسری صبح ہی اپنے گھر چلی گئی تھی اور رخصتی وہیں سے ہوئی تھی۔ خالا مجھ سے کافی عرصہ ناراض رہیں کہ تم نے مجھے اپنی ماں کا درجہ نہیں دیا اور میں ان کی بات سن کر سر جھکا لیتی تھی۔ شعیب ہنی مون کے لیے مجھے ورلڈ ٹور پہ لے گیا تھا' وہیں پہ مہ پارہ نے مجھے برہان کی شادی کی خبر دی تھی' اور وہ میرے واپس آنے تک اپنی مسز کے ساتھ آئرلینڈ شفٹ ہو چکا تھا۔"

وہ خاموش ہوئی اور مومنہ کے پاس سے اٹھ کر کھڑکی میں کھڑی ہو گئی۔

"جب زین کی پیدائش کے موقع پر اس کی بیوی کی ڈیتھ ہوئی تو ڈیڈ باڈی کے ساتھ بچوں کو بھی ماں کے سپرد کر گیا۔ جیسے وہ ان آنکھوں سے ناراض ہو چکا تھا کہ اب یہ چہرہ کبھی نہیں دکھاؤں گا۔"

سفینہ ہلکا سا ہنسی اور خاموش ہو گئی۔

"پھر اس کے بعد؟" مومنہ کی آواز ابھری۔

"میں نے تو ثاقب ولا آنا جانا نہیں چھوڑا تھا۔ اس کی بیوی کی موت کا پرسہ بھی اس کا باپ ہی

وصول کرتا رہا تھا۔ وہ شخص کس قدر عجیب تھا۔"

"پھر وہ پاکستان کب لوٹا"؟ مومنہ نے سوال کیا۔

"جب شعیب نے مجھے آزاد کر دیا تھا۔

وہ اپنی کتاب کے سلسلے میں آیا تھا۔" وہ رکی

"میں چاہتا ہوں' تم اسی گھر میں اماں کے پاس رہو" ایک دوپہر اس نے مجھ سے یونہی سر راہ اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ اور کچھ عرصے بعد مجھ پہ واضح ہو گیا کہ وہ انیب شعیب کو اپنے گھر میں رکھنے کا روادار نہیں تھا وہ مجھے اب وقت سے چرانے کا روادار نہیں تھا۔"

"آپ مجھے اپنے گھر میں کس حیثیت سے دیکھنا چاہتے ہیں؟"

ایک شام میں نے بھی اسی کی طرح سر راہ سوال کیا شاید میرے سوال کی نوعیت سمجھتے ہوئے وہ فوری طور پر کچھ نہیں بولا بس مجھے دیکھتا رہا۔

"تمہارے اکیلے پن کی وجہ سے یونہی اک خیال سا گزرا تھا۔ اگر تم ایسا نہیں چاہتیں تو تمہاری مرضی"۔

وہ کندھے جھٹک کے میرے سامنے سے ہٹ گیا تھا اور میں' میری سانس میں اک آگ سی بھڑک اٹھی تھی۔ اور/اور پھر میں نے رہبر سے شادی کا فیصلہ کر لیا تھا' تو اسے کیوں تکلیف پہنچی تھی۔ اس کی سانسوں میں کونسی آگ بھڑک اٹھی تھی کہ اس نے مجھے اپنی نبض کی ٹک ٹک سے بھی نکال پھینکا' میں جیتی جاگتی عورت تھی قیصر ثاقب کی دیوار پہ سجی پینٹنگ نہیں تھی جو وہ آتے جاتے دیکھتے رہنا چاہتا تھا اس کی انا زمین میں نہ رل جاتی اگر وہ خاکوانوں کی بیٹی سے شادی کر لیتا' جو وہ خاکوانوں کی مطلقہ بہو سے شادی کر لیتا۔"

"زندگی میں آئندہ میں تمہیں کبھی نہیں دیکھنا چاہوں گا۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا مسز رہبر!"

اس نے مجھ سے آخری بات کی تھی۔"

سفینہ کی کہانی مکمل ہو چکی تھی جس میں شور جنوں تھا۔ اس کے بیٹے کی کہانی جاری تھی جس میں محبت کی سرگوشیاں تھیں۔

☆☆☆

برہان دیکھ رہے تھے کہ شادی کے ان آخری دنوں میں انیب کا زیادہ وقت ثاقب ولا میں ہی گزر رہا تھا۔

اب آمنا سامنا ہونے پہ وہ اس کے سلام کا جواب ماتھے پہ بل ڈالے بنا دیتے تھے۔ انہوں نے دل میں تسلیم کیا کہ انیب میں باپ کے مزاج کی رمق تک نہیں تھی۔ اس کے برعکس وہ متوازن طبیعت کا حامل تھا اس کی شخصیت میں متحمل مزاجی کے ساتھ بُردباری بھی جھلکتی تھی۔ اس نے کچھ عادتیں ماں سے بھی چرائی تھیں جو یاد آتی تو برہان کے کسی گہرے زخم سے پٹی کھل جاتی تھی۔ ابھی وہ انیب کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ اماں نے کہا "جب تک وہ یہاں ہے" "یہ جملہ انہیں مطمئن کرتا تھا کہ بالآخر اس نے یہاں سے چلے جانا تھا۔"

آج مہ پارہ ماں اور انیب کے ساتھ بہو کا زیور خرید کے لائی تھیں وہ لوگ لاؤنج میں آئے تو یسریٰ اور زین آپس میں جھگڑ رہے تھے۔

انہیں دیکھ کر خاموش ہو گئے۔ زین تو تھوڑی دیر بعد کھلکھلا رہا تھا مگر یسریٰ آف موڈ کے ساتھ زیورات دیکھ رہی تھی۔

"لگتا ہے یسریٰ کو جیولری پسند نہیں آئی۔" یسریٰ کا بجھا سا چہرہ دیکھ کے مہ پارہ نے خیال ظاہر کیا۔

"ارے نہیں پھپھو! دراصل اس کے شوز اور چند ایک چیزیں رہتی ہیں۔ زین نے ساتھ جانے سے انکار کر دیا ہے' آپ جانتی تو ہیں بابا رات کو فضل انکل کے ساتھ کی جانے کی اجازت نہیں دیتے اگر زین ساتھ نہ ہو تو۔" اقصیٰ نے وضاحت کی تھی۔

انیب نے اسے غور سے دیکھا جو زین کو نگاہوں سے نکلنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"قسم سے پھوپھو! یہ سو دکانیں پھرنے کے بعد ایک جوتا خریدتی ہے"۔ زین مسکرایا۔ "خیر اس سے کہیں پانچ منٹ بعد پورچ میں آ جائے۔" وہ کالر

جھاڑتے ہوئے اٹھا تو سب مسکرا دیے۔

"رات کے دس بجے کون کہاں جا رہا ہے۔" برہان اچانک ہی ماں کے کمرے میں آگئے تھے۔

"یسریٰ کو جوتا خریدنا ہے۔" سلطنت آرا نے انہیں اپنے قریب ہی بیٹھنے کو جگہ دی۔

"حالات دیکھ رہی ہیں آپ جو حال کراچی کا ہے ابھی یہ اتنا ذمہ دار نہیں ہے۔ اس کو دو دوست نظر آگئے تو بہن کو شاپنگ مال میں چھوڑ کے بھاگ جائے گا۔" انہوں نے ہلکے پھلکے انداز میں بیٹے کو آئینہ دکھایا تھا' یسریٰ کچھ مایوس ہوئی۔

"انیب ساتھ جا رہا ہے برہان!" مہ پارہ نے ان سب کا مسئلہ ایک منٹ میں حل کیا۔" بلکہ ہم اکٹھا ہی نکلتے ہیں میں راستے میں کال کرکے ابوبکر کو بلا لوں گی پھر انیب اپنے گھر چلا جائے گا۔"

بات معقول تھی لہٰذا برہان نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ یسریٰ انیب کا سن کے کچھ گڑبڑائی تھی مگر پھوپھی کی اگلی بات نے اسے جیسے مطمئن سا کر دیا۔ وہ اپنے کمرے سے بیگ لینے کو دوڑی۔

پانچ منٹ بعد وہ پورچ میں آئی تو ڈرائیونگ سیٹ پہ انیب بیٹھا تھا اس کے برابر زین۔

"وہ بھائی' ذرا اگلے چوک پہ مجھے اتار دیجیے گا" زین نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔

"وہاں اس نے اپنے دوستوں کو بلا رکھا ہوگا۔" یسریٰ نے کہا تو انیب مسکرا دیا کہ یسریٰ کی بات سو فیصد سچ تھی۔

"دراصل چند دوستوں کی طرف کارڈز دینا باقی تھے۔ کل رات تو بارات ہوگی اس لیے۔" اس کا چوک آگیا تھا۔

"یہ زین تو واقعی چیز ہے۔" مہ پارہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔

ابھی وہ شاپنگ مال میں داخل ہوئے ہی تھے کہ ابوبکر کی کال آگئی۔ "ماں جی! دونوں پھوپھیاں بمعہ اہل و عیال آچکی ہیں۔ رمیض کو بھیج چکا ہوں۔" اس نے بمشکل شاپنگ مال کا پوچھ کر فون کاٹ دیا۔

اگلے دس بارہ منٹوں بعد وہ اکیلی انیب کے ساتھ تھی کہ رمیض اس شاپنگ مال کی لوکیشن پہ ہی تھا! اب وہ آگے یوں ہی بے دھیانی میں چل رہی تھی اور وہ دو قدم پیچھے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے یسریٰ؟" دس منٹ گزرنے کے بعد اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"مگر میں تمہارے ساتھ کیسے جوتا خرید سکتی ہوں" وہ کچھ سادگی سے کچھ روانی سے سچ بول گئی۔ اس نے ایک گہرا سانس خارج کیا پھر اپنے حلیے پہ اک نظر ڈالی۔

"کیوں؟ میرے کپڑے ٹھیک ٹھاک ہیں۔" پھر پاؤں پہ نگاہ کی۔ "جوتا بھی اتنا برا نہیں۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کے نرمی سے مسکرایا

"اف آپ سمجھ نہیں رہے۔" بدحواس سی ہو کر بولی' حالانکہ وہ سمجھ رہا تھا۔

"آپ ریلیکس ہو کے شاپنگ کیجیے' جیسے آپ اکیلی ہیں" وہ ادھر ادھر دیکھ کر دوستانہ انداز میں گویا ہوا' اب وہاں کچھ یوں ہو رہا تھا کہ وہ کوئی اکیسویں دکان میں گھس رہی تھی۔ وہ اتنا خاموش جیسے ساتھ ہی نہیں تھا۔

"کوئی ایک بھی کام کا نہیں۔" لہجہ حد درجہ بیزار تھا۔

"مجھے تو سارے ہی اچھے لگ رہے ہیں۔" وہ بے چارہ سا منہ بنا کر بولا۔ البتہ مسکراہٹ کسی طور دبا نہ لی تھی کہ وہ اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے دیکھتے ایک دم نگاہ جھکا گئی۔ وہ کس قدر اپنا سا لگ رہا تھا۔ پونے گھنٹے سے اس کے ساتھ ساتھ خوار ہو رہا تھا۔ زین ہوتا تو کوئی بھی جوتا دلوا کر اب تک گھر واپس ہو جاتا۔ "زین ہوتا تو میں اس کی پسند سے خرید چکی ہوتی۔" یونہی نگاہ موڑے ہی جواب دیا۔ انیب کے دل کی کیفیت عجیب سی ہوئی' وہ جیسے گہری نیند میں گھر کر اس لڑکی کو دیکھنے لگا جو اس کے سامنے نگاہ جھکائے کچھ نروس سی تھی وہ حقیقت تھی یا خواب تھی۔

"اوکے۔" اس نے ایک قدم آگے بڑھایا۔

اور اگلے پندرہ منٹ بعد وہ انیب کی پسند سے خاصا مہنگا اور اسٹائلش سا جوتا خرید چکی تھی۔

"اب کال کرکے زین کو بلائیں یا پھر گھر؟" اس کی طرف دیکھے بنا اس نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔

"زین سے تو میں اب کل شام ہی بات کروں گی۔"

"زین ہم واپس جا رہے ہیں بے عزتی سے بچنا چاہتے ہو تو جلدی آجانا۔" راستے میں یسریٰ نے اسے کال کی تھی۔ انیب کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ گہری ہوئی۔

وہ دونوں راستہ بھر خاموش رہے تھے گیٹ کے سامنے پہنچ کر اس نے مخصوص ہارن دیا پھر چہرہ موڑ کے اسے بغور دیکھا۔

"اب تو پورے سو کام میرے کھاتے میں ڈالے جا سکتے ہیں۔" وہ ذومعنی لہجے میں بولا تو اسے اپنی بات یاد آگئی۔

"آپ کی یادداشت اتنی بری بھی نہیں۔" تب ہی فضل نے گیٹ وا کیا' وہ کچھ جزبز سی ہوئی پھر جیسے کچھ جتانے کی کوشش کی۔

"اگر بابا کو زین کی گمشدگی کا علم ہو گیا تو اک نیا مسئلہ کھڑا ہو جائے گا" وہ اسے آہستگی سے کہتی گاڑی سے اتر گئی۔

"جی!" اس نے مسکراتے ہوئے اس کی تائید کی اور گاڑی بیک کرنے لگا۔

☆☆☆

"دادی دیکھیں تو اقصیٰ کتنی اچھی لگ رہی ہے۔"

اس نے کوئی ساتویں بار یہ کہا تو وہ جو ابوبکر کے ساتھ کسی نہایت سنجیدہ موضوع پہ گفتگو کر رہا تھا' بجائے اچھا لگنے والی کے اچانک پہلو بدل کے تعریف کرنے والی کو نسبتاً دھیان سے دیکھا۔

"اف!! لڑکیوں کی یہ جذباتی کیفیت۔" وہ اچھا خاصا محظوظ سا ہو کے مسکرا لیا۔ یسریٰ دس دن کی دلہن بھی نظر لگا کے بیٹھی تھی۔ چونکہ اسکی ذہنی یکسوئی بٹ چکی تھی جسے ابوبکر نے بھی محسوس کیا تھا۔ سو گفتگو چند جملوں میں سمیٹ کر وہ مصنوعی سنجیدگی کے ساتھ مخاطب ہوا۔

"یسریٰ تمہاری بیوی کو نظر لگانے کے موڈ میں ہے۔"

"جی نہیں۔" وہ شپٹائی فوراً اقصیٰ سے نظر ہٹا کے اسے دیکھا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" ابوبکر رسان سے بولا مگر ساتھ ہی مسکرا دیا۔

"دلہن کیسے اچھی نہیں لگتی۔" ابوبکر نے ایک تیر سے دو شکار کیے اب شپٹانے کی باری اقصیٰ کی تھی۔

"میں ذرا کچن دیکھ لوں۔" ساتھ ہی اٹھ بھی گئی۔

آج انیب نے انہیں اپنے گھر مدعو کیا تھا۔ دادی لحاف میں دبکی پڑی تھیں' کچھ ایسا ہی حال مہ پارہ کا بھی تھا۔ کہ جنوری اسٹارٹ ہو چکی تھی۔ اندازہ۔ ایسا۔ تھا کہ کراچی میں سردی کی یہ لہر دو تین دن سے زیادہ نہیں ٹکے گی۔

"انیب میں نے شادی پہ تمہارے لیے دو تین لڑکیاں پسند کی ہیں۔"

مہ پارہ نے سنجیدگی سے کہا اور لحاف ہٹاتے ہوئے جوتے کی تلاش میں نگاہیں بھٹکائیں۔

"سچ آنٹی! یعنی کہ دو تین۔" وہ بچوں کی طرح خوش ہو کر بولا۔ یسریٰ نے اسے حیرت سے دیکھا۔

"شکریہ آنٹی ورنہ اس نفسانفسی کے دور میں کون کسی کے کام آتا ہے۔"

ساتھ ہی کن اکھیوں سے اسے دیکھا جس کی مسکراہٹ پھیکی سی تھی۔ "یعنی کہ اکٹھی دو تین دلہنیں آپ کی محبت کھل کر سامنے آگئی۔"

"بیٹے کے ساتھ زیادتی' ایک پہ ہی ٹرخا دیا۔ اور بھانجے پہ عنایات ہو رہی ہیں۔" ابوبکر نے اقصیٰ کو اندر آتے دیکھ لیا تھا۔

"ان شاء اللہ' میں ان تینوں کے ساتھ برابری کے سلوک کی کوشش کروں گا' اللہ" مہ پارہ نے انیب کا کان زور سے مروڑا تھا۔

"یسریٰ وہ جس نے سفید سوٹ پہنا ہوا تھا لمبے کھلے بالوں والی جو بارات والے دن تمہارے ساتھ ساتھ ہی تھی۔"

"مہ پارہ واقعی سنجیدہ تھیں' یسریٰ کا دل جیسے سمٹ کر دھڑکا تھا۔ (جی میں آیا کہہ دے وہ تو بال بچوں والی ہے)

"جی پھپھو وہ میری دوست عرفانہ تھی۔"

"تھی یعنی کہ گزر گئی۔ ہائے میرے اللہ اسے جنت میں جگہ دینا۔" اندر آتے زین نے شوشا چھوڑا'

اس کے ساتھ کھڑے رمیض نے زور و شور سے آمین کہا۔ وہاں اب قہقہوں کا طوفان امڈ آیا تھا۔

''میں سیریس ہوں زین! تم لوگ اپنا بازار بے وقوف بند کرو'' مہ پارہ نے جھڑک کے کہا تو ماحول کچھ سنجیدہ ہوا۔

''دوسری وہ پنک سوٹ والی جس کی بڑی بڑی آنکھیں تھیں''۔

(یوں کہیں بھینس کے جیسی یسریٰ نے جل کے سوچا)

''وہ تو ہمارے سامنے ہی رہتی ہے سمعیہ''۔ وہ مری مری سی آواز میں بولی۔

''خدانخواستہ اسے کوئی بیماری وغیرہ تو نہیں جو تم اس قدر پژمردگی سے بتا رہی ہو'' رمیض انتہائی سنجیدگی سے مسکرایا تو باقی سب کے ساتھ انیب کے لبوں پہ آنے والی مسکراہٹ ـــــ پُراسرار اور جان دار تھی۔

مہ پارہ ہنوز سنجیدہ رہیں۔'' اور تیسری نے ولیمے کے روز تمہارے ہی ـــ رنگ کا پہنا ہوا تھا۔ وہ جس کا ہیئر اسٹائل بھی تمہارے جیسا ہی تھا۔'' انیب صوفے کی پشت پہ کہنی لگائے ـــ ہاتھ پہ سر ٹکائے ٹکٹکی باندھ کے اسے دیکھ رہا تھا جبکہ مسکراہٹ صرف آنکھوں تک محدود تھی۔

''وہ میری دوست کی چھوٹی بہن بوستانہ تھی''۔

اس بار اس نے لہجہ تر و تازہ ہی رکھا، 'کہ جو میرا نہیں ہو سکتا بھلے سوئمبر رچاتا پھرے' ساتھ ہی اسے دیکھ کے مبہم سا مسکرائی بھی کہ اب مجھ پر سے نگاہیں ہٹا لیجیے مگر وہ آج حکم عدولی کے موڈ میں تھا۔

''اب انیب کو شادی کی ویڈیو اور تصویریں دکھائی جائیں گی پھر اسکے بعد یہ جناب ہمیں اپنی چوائس سے آگاہ کریں گے۔''

سب ہی مہ پارہ کی اس تجویز سے متفق ہوئے تھے۔

''وہ سب تو ٹھیک ہے آنٹی مگر''۔ وہ گردن مسلتے ہوئے کچھ دیر کو رکا۔

''مگر کیا؟'' آواز کورس کے ساتھ آئی۔

''لڑکیوں کے نام خاصے ہیوی قسم کے ہیں۔'' وہ شرارتی تاثر کے ساتھ بولا۔ یسریٰ نے اسے آنکھیں سکیڑ کے دیکھا۔

''ڈونٹ وری ڈیئر، آپ ان کا پیار سے چندا، ہنی، تارا، کچھ بھی نام رکھ سکتے ہیں'' مہ پارہ نے لاپروائی سے کندھے جھٹکے اور کھڑی ہوئیں کہ ڈنر تیار تھا۔ باربی کیو کی اشتہا انگیز خوشبوئیں پڑوسیوں کے معدے بھی بیدار کر رہی تھیں،

''آپ تو کچھ لے ہی نہیں رہی ہے''۔ وہ اچانک اس کے سامنے آ کر مبہم انداز میں بولا۔

''اتنا کچھ تو ہے۔'' اس نے اپنی پلیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ حق میزبانی نبھا کر چلا جائے گا مگر وہ اب بھی اس کے پہلو میں کھڑا تھا، نہ مزید کچھ پوچھا نہ اسے دیکھا پھر بھی پاس کھڑے شخص کے وجود میں جلا کوئی چراغ سا اس کی خبر پوچھ رہا تھا۔

''یہ انیب ضرور یسریٰ سے ان لڑکیوں کی سن گن لے رہا ہے''۔ یہ آواز اقصیٰ کی تھی۔

ان دونوں نے بے ساختہ ایک دوسرے کی۔۔ آنکھوں میں ذرا سا دیکھا، وہ مسکرا بھی نہیں سکے تھے، مگر آہستگی سے پلٹ کر اس محفل میں آ بیٹھے، (تھوڑی دیر بعد) اب وہاں کافی اک دور چل رہا تھا۔

''شکر ہے مجھے یاد آ گیا۔ برہان بتا رہا تھا کہ اس سنڈے کو نادر کی فیملی ہمارے یہاں آنا چاہتی ہے''۔ سلطنت آرا نے جس خوش گواری کے ساتھ یہ بات کی تھی تو سب کا ٹھٹکنا لازمی تھا۔

''نادر کی مسز کو یسریٰ بہت پسند آئی ہے''

انیب کا دل کسی بحران کی زد میں آیا۔ اس نے بے ساختہ راستہ بھولنے والی اس لڑکی کو دیکھا جو آج بھی ان قدیم آب خوروں کی زنجیر ہلا کر اسے بھی اپنے ساتھ ماضی میں بھٹکاتی تھی۔

''برہان کہہ رہا تھا۔ اقصیٰ اور مہ پارہ کی موجودگی میں ہی میں اس فرض سے بھی سبکدوش ہونا چاہتا ہوں لو، بھلا سنو، ایک شادی کی تھکن ابھی اتری نہیں'' سلطنت آرا نے سر جھٹکا'' نہ خود کبھی چین سے بیٹھا نہ کسی کے چین سکون کی خبر لی۔ عجیب ہی ہے۔''

سلطنت آرا کا لہجہ افسردہ تھا۔ ایک بے نام سی اداسی ان کے درمیان جگہ پا گئی تھی۔

☆☆☆

شعیب ایک عیاش مرد تھا وہ سفینہ کے وجود کی خاموشی کی وجہ رہبر کو سمجھتا تھا، رہبر ایک خوش باش بے ضرر سا انسان جو اپنے اکلوتے پن کی وجہ سے مہ پارہ اور سفینہ کے گرد ہمہ وقت پایا جاتا تھا۔ جس کا باپ اسے چھوٹی سی عمر میں اس کی ماں سے چھین کے پاکستان لے آیا تھا جو سلطنت آرا کی گود میں پلا ان ہی کے گھر کھیل کود کر جوان ہوا۔ کسے خبر تھی کہ وہ ایک دن قصر ثابت کی بنیادیں ہلا دے گا، اور سفینہ۔۔۔

☆☆☆

ان کے دروازے پہ ہلکی سی دستک ہوئی، وہ پہچان گئے یہ مہ پارہ تھیں، آج وہ اندر آتے ہوئے مسکرائیں نہ اندر آ کر، انیب نے انہیں کس امتحان میں ڈال دیا تھا، وہ صوفے پہ بیٹھ چکی تھیں مگر انہیں لگ رہا تھا وہ ہوا میں معلق ہیں۔ انیب رات کو ان کے گھر آیا تھا، وہ کیا کہہ رہا تھا۔ وہ بے وقوفوں کی طرح اسے دیکھے گئیں۔

" وہ لڑکی بوستانہ جسے آپ نے ولیمے کے روز دیکھا تھا۔''اچھا، اچھا تو تمہیں وہ پسند ہے؟'' وہ اس کی ادھوری بات سن کے خوش ہوئیں''نہیں'' اس نے سنجیدگی سے انکار کیا۔

''تو؟'' مہ پارہ کچھ الجھیں۔

'' جو لڑکی بوستانہ کے ساتھ تھی۔ اس نے بوستانہ جیسا سوٹ پہنا ہوا تھا اور جس کا ہیئر اسٹائل بھی اس جیسا تھا۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں'' وہی سنجیدہ انداز۔

مہ پارہ تصور میں الجھیں، چکر سا آیا، پھر ان کی آنکھیں باہر آئیں۔

پلیز آپ کو صرف میرا پروپوزل لے کر جانا ہے۔'' ہمت کے ساتھ مسکرائیں۔

اب مہ پارہ سوچ رہی تھیں کہ بیٹھنے سے قبل کھڑکی کھول دیتیں۔ (کاش بات کرنے کے بعد وہ آیو سمتی ـــ میں ڈھل جائیں)

''یہ آپ نے اچھا سوچا کہ ہماری موجودگی میں ہی یسریٰ کی شادی بھی ہو جائے تو'' انہوں نے اپنے خشک لبوں کو زبان پھیر کے تر کیا۔

''سچ کہوں تو اتنی جلدی دوسری بیٹی بیاہنے کا دل تو نہیں چاہ رہا، اماں بھی ایک دم اکیلی ہو جائیں گی، مگر نادر کچھ زیادہ ہی اصرار کر رہا ہے۔'' انہوں نے بہن سے دل کا حال شیئر کیا تو، مہ پارہ کو بھی کچھ ڈھارس ملی۔

''اتنی دور مت کریں، ادھر کراچی میں بھی ایک دو اچھے رشتے میرے جاننے والوں میں بھی ہیں''۔ وہ خوش ہوئیں کہ گفتگو خود ہی اسی نہج پہ جا رہی تھی۔

'' اچھا کون ہیں؟'' وہ ان کی طرف متوجہ ہوئے۔

''وہ سلمیٰ جنجوعہ تھی نا، اس کا بھتیجا ہے۔ ماشاءاللہ فارن سروس میں ہوتا ہے، اور دوسرا یہ'' وہ اپنی ہی اگلی بات پہ بے تاب سی ہوئیں، ''مطلب دوسرا وہ ارے یہی اپنا انیب''

(اکاش میں دشت جنوں کی آیو سمتی ہوتی)

''وہ شل ہوئے پھر، حیران پھر جیسے ڈھے گئے،

'' مہ پارہ تم'' آواز کپکپا کے رہ گئی وہ اپنا جملہ مکمل نہ کر سکے، ان کے گوشہ چشم سے سرخ آندھی اٹھنے لگی،

''یہ، یہ تم کہہ رہی ہو''۔ بے یقینی سی بے یقینی تھی۔

''نہیں'' ایسا انیب چاہتا ہے'' اگر حیرانی کی کوئی تشریح ہوتی تو اس وقت برہان کے چہرے پر پڑھی جا سکتی تھی۔

یہ کس قماش کے لوگ تھے وہ تہ در تہ ہل چکے تھے۔ یہ خاندان ڈھٹائی میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتا تھا۔، وہ ضبط کی حد کو چھوتے ہوئے بس اتنا ہی سوچ سکے۔

☆☆☆

سفینہ نے دوسری شادی کیوں کی تھی؟ سلطنت آرا آج تک یہ معمہ حل نہ کر پائیں، مگر ان کا اعتبار کرچی کرچی ہو گیا تھا۔ شعیب کا شک یقین میں کیونکر بدلا وہ اس راز سے بھی پردہ کبھی نہ اٹھا سکیں، پتا

نہیں وہ دل میں تھی یا دل سے اتر چکی تھی وہ کبھی خود کو یہ بھی نہ بتا سکیں مگر انیب تو خود تنہائی کا مارا تھا سلطنت آرا نے اپنے دل کے دروازے اس کے لیے ہمیشہ کھلے ہی رکھے۔ اور، اب یہ اس نے کیا کر دیا تھا؟

وہ انیب کی اس خواہش پہ حد درجہ پریشان تھیں۔ پچھلے چار روز سے ثاقب ولا سناٹوں کی زد میں تھا۔ کہ برہان نے یسریٰ کا رشتہ کمال سے طے کر دیا تھا، ابھی لاؤنج کے ملگجے سے اندھیرے میں سلطنت آرا نے انیب کو برہان کی اسٹڈی میں جاتے دیکھا تھا۔ دیکھا تو اسے بالکونی میں کھڑی یسریٰ نے بھی تھا۔

"کیا وہ اس گھر میں آخری بار آیا تھا۔"

☆☆☆

وہ دستک انجان تھی۔ انہوں نے اندازہ لگانے کی کوشش ترک کرتے ہوئے صرف یس کہا۔ تو کیا ان لوگوں کو مٹی سے نہیں پتھر سے بنایا گیا تھا، ان کے ماتھے پہ ان گنت بل پڑے۔

"میں اس وقت مصروف ہوں۔" سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لینے کے بعد انہوں نے آہستگی سے کہا،

"میں آپکے صرف پانچ منٹ لوں گا پلیز۔" وہ ضبط کے کڑے امتحان سے گزرا۔

"میں اپنی بیٹی کا رشتہ طے کر چکا ہوں، میں اس موضوع پہ بات نہیں کرنا چاہتا۔"

"میں جانتا ہوں۔ قطع کلامی کے لیے معذرت۔"

وہ مسکرا کے ٹیبل کی دوسری جانب بڑھا وہ جانتا تھا کہ اسے بیٹھنے کی پیشکش نہیں کی جائے گی سو خود ہی کرسی گھسیٹ کے بیٹھ گیا۔

"فرمایئے" قدرے بیزاری سے کہا گیا۔

"تین دوست ایک جنگل سے گزر رہے تھے، ایک سیاست دان، دوسرا رائٹر، اور تیسرا باغبان تھا"

برہان نے قلم رکھ دیا اور انیب کے سنجیدہ سپاٹ چہرے پہ نظر جمائی۔

"سیاست دان نے کنویں کے قریب سے گزرتے ہوئے اس کی منڈیر پہ ہاتھ رکھا جو کچی اور بھربھری تھی۔ خود کو سنبھال نہیں سکا اور کنویں میں گر گیا جو کہ خشک تھا اور بارہ تیرہ فٹ ہی گہرا تھا۔"

برہان کے انداز میں ذرا سی دلچسپی در آئی۔

"کنویں کی دیواریں اس قدر چکنی تھیں کہ وہاں سے نکلنا محال تھا، اب ہم تو ڈوبے ہیں صنم، جیسی صورت حال سے دوچار سیاست دان نے باقی دونوں دوستوں کو حسرت سے دیکھا اسے خیال گزرا کہ کیا خبر مجھے اس مشکل میں چھوڑ کے یہ بھاگ جائیں۔

"یہاں سے باہر نکلنا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں" اچھی جگہ ہے' میں تھوڑی دیر خود اس طلسماتی کنویں میں رکنا چاہتا ہوں یہاں کا گہرا خنک ماحول' میرے احساسات جانے کون سی دنیا کو چھو رہے ہیں"

یہ احوال سن کر رائٹر کا دل بے ایمان ہوا،

"تھوڑی دیر تک میں بھی یہ سب محسوس کرنا چاہتا ہوں" وہ اپنے باغبان دوست کو محو حیرت چھوڑ اگلے ہی لمحے سیاست دان کے ساتھ تھا۔ مگر کودتے ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ سیاستدان۔ "غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے اسے پھنسا چکا ہے"

برہان کے ہونٹوں پہ مبہم سی مسکراہٹ رینگی۔

"اب پیچھے رہ گیا باغبان' اس نے رائٹر سے پوچھا، سناؤ دوست کیا محسوس کر رہے ہو؟"

انیب نے برہان کی آنکھوں میں جھانکا جیسے وہ استفسار اس کے لیے ہو، جیسے کنویں میں بیٹھا وہ رائٹر برہان ہی ہو۔ برہان نے نگاہ چراتے ہوئے کھلے صفحات پہ ٹکائی۔ "صد شکر کہ کنویں کے اطراف اونچے گھنے درخت تھے۔" انیب نے سلسلہ کلام دوبارہ جوڑا، تو آواز میں مسکراہٹ کا رنگ تھا۔

"کیا میں بھی کود جاؤں؟" باغبان نے مشورہ مانگا۔ چونکہ وہ رائٹر تھا اس لیے وہ غلط بیانی سے کام نہیں لے سکتا تھا۔ برہان کی مسکراہٹ پل میں سمٹی۔

"میری والی غلطی مت کرنا دوست، یہاں کودنے کے بعد کسی کی مدد کے بنا باہر آنا ممکن ہی نہیں۔" اس رائٹر نے اس مشکل کا سامنا اپنے دوست کو نہیں کرنے دیا جس میں وہ خود گرفتار تھا۔"

انیب کی آواز دھیمی ہوئی برہان کے چہرے کا رنگ اڑا۔ وہاں اب گھمبیر سناٹا تھا۔

"ایک اچھے انسان کو متعلقہ حوالوں کی وجہ سے رد کرنا اس کی اچھائی کو گویا قتل کرنے جیسا فعل ہے۔"

برہان کی نظر سامنے کھلے صفحات کے ان جملوں پہ پڑی ان کی نئی آنے والی کتاب تقریباً مکمل ہو چکی تھی۔

"ایک رائٹر جو لکھتا ہے سب لفاظی ہوتی ہے یارا، کبھی ان پہ خود آزمائش کی گھڑی آجائے تو اپنے جملوں کو اندھوں کی طرح پڑھتے ہیں۔" اسے اپنے ایک تاجر دوست کی بات یاد آئی۔

"تھینک یو سر! میں نے آپ کا قیمتی وقت لیا!" وہ کرسی گھسیٹ کے کھڑا ہوا۔

"مجھ میں بھی بلا کا شور تھا، خانہ بدوشی میرے قدموں کا مقدر تھی، پھر میں نے مسز اسمتھ کے کہنے پہ کتابوں کو پڑھنا شروع کیا تو مجھ جیسے پتھر میں اک خوشبو سی پھوٹ پڑی تھی، پھر میں نے آپ کو پڑھا۔" وہ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد گویا ہوا۔ اس کا لباس شکن زدہ تھا، وہ ڈسٹرب تھا۔

برہان نے اسے دل کڑا کر کے دیکھا، اس کی آنکھوں میں نمی چمک رہی تھی۔

میں نے آپکو پڑھا تو، میں رخت سفر باندھنے پہ مجبور ہو گیا، میرے اندر بپا شور تھمنے لگا، آپ کی کتاب قافلہ انساں پڑھنے کے بعد مجھے ثاقب ولا کے پرندے یاد آنے لگے تھے میں نے اس شام کو بھلا دیا تھا جس کی وجہ سے میں برسوں بھٹکا تھا، مجھے یہاں پڑے خالی پنجرے یاد آنے لگے میرے اندر قصر ثاقب کے پھولوں کی خوشبو سر اٹھانے لگی تھی اور، اور میں لوٹ آیا۔" "وہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے کے باوجود بھی مسکرایا۔ قدم دروازے کی جانب بڑھائے۔ وہ دروازہ کھولنے سے قبل رکا، پلٹ کے انہیں دیکھا، جو اسے ہی دیکھ رہے تھے "میری ایک درخواست ہے سر" برہان نے اپنی توجہ اپنے سامنے کھلے مسودے پہ مبذول کی۔

"آپ بھی اپنی کتابوں کو کبھی غور سے پڑھیے گا۔"

اس شخص نے انہیں خنک کنویں کی جانب اچھالا تھا، وہ جامد ہوئے۔

"آپ کو بھی ثاقب ولا سے اڑنے پرندے یاد آجائیں گے جن کے پنجرے آج بھی خالی پڑے ہیں۔"

برہان کے جسم کا تمام خون جیسے چہرے پہ سمٹ آیا تھا۔ انہوں نے دروازہ کھلنے اور پھر بند ہونے کی ہلکی آواز سنی۔ وہ اس پہاڑ نما جملے سے ٹکرا کے پاش پاش ہو چکے تھے۔

☆☆☆

کیفے ٹیریا میں آج رش معمول سے زیادہ تھا۔

آج وہاں ایک بین الاقوامی شہرت یافتہ جرنلسٹ کی باتوں پہ سب کا دھیان تھا، باتوں کا رخ گھومتا گھامتا خاکوانوں کی طرف مڑ چکا تھا

"یہ اس میں اضافی صلاحیت ہے کہ وہ بہت با رسوخ بندہ ہے" نام سن کے برہان چونکے۔

"آج سے چار پانچ سال قبل شعیب خاکوان واقعی کراچی کا سب سے معروف انڈسٹریلسٹ تھا مگر آج اپنی عیاشیوں کی بنا پر سمجھو تقریباً دیوالیہ ہو چکا ہے"

برہان کے لیے یہ رپورٹ خوشی کا باعث ثابت ہوئی۔

"آج کل دن رات اس کی میٹنگز دبئی کے ایک نامور تاجر کے ساتھ ہو رہی ہیں۔ شعیب، اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی اس کی بیٹی سے کرنا چاہتا ہے۔"

پروفیسر صاحب کا دھیان اب تمام سمتوں سے ہٹ کے اس اخباری نمائندے پہ مرکوز ہو چکا تھا۔

"مگر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، امپاسبل۔" اس نے کندھے اچکائے۔ "شعیب کا بیٹا کبھی اس شادی کے لیے رضامند نہیں ہوگا۔"

"ہاں وہ اچھا انسان ہے، اکثر اس کیفے ٹیریا میں آتا ہے۔ مگر شعیب کی بیوی کے پاس بھی تو کروڑوں کی پراپرٹی تھی۔" وہاں موجود ایک نو آموز صحافی نے اس سے اچانک سوال کر کے برہان کے

دل کی حالت غیر کردی تھی۔

"وہ پراپرٹی تو بہت ماضی میں ہی مسز شعیب نے اپنے بیٹے کے نام ٹرانسفر کردی تھی۔ اسی لیے تو شعیب نے کبھی بیٹے کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ وہ تو اس عورت کی قسمت اچھی تھی جو اس نے دوسری شادی طلاق کے فوراً بعد ہی کرلی تھی، ورنہ شعیب کی والدہ نے بہو کو بدکردار ثابت کرکے بیٹے سے ہی ماں کا مرڈر کروا دینا تھا۔" آج کیسی، کیسی حقیقتیں اس پہ آشکار ہورہی تھیں۔ انہیں اپنی ہتھیلیوں پہ پسینہ اترتا محسوس ہوا۔

"سننے میں تو یہ بھی آیا ہے کہ انیب نے اپنی پراپرٹی میں سے سوتیلی بہن کو بھی حصہ دیا ہے۔"

(انیب تم کیا شے ہو۔) برہان نے سگریٹ سلگاتے ہوئے سوچا۔

"اور اب تم سب دیکھنا کہ شعیب اسد دو چار روز بعد ہارٹ اٹیک جیسا ڈراما کرکے بیٹے کو کس قدر پریشرائز کرسکتا ہے۔" یہ انکشاف بھی دھما کا خیز تھا۔ شعیب کی بیوی جس طرح اکلوتی تھی تو اس کا نام و نشان مٹانا شعیب اور اس کی والدہ کے لیے کوئی بڑا کام نہیں تھا۔" (اس کی والدہ بھی اپنے وقت میں نامور ماڈل تھی۔) یہ بات اس نے قدرے رازداری سے کی تھی۔ برہان کے حواس تک بھک سے اڑے۔ (سفینہ کسی بھی رشتے اور حیثیت کے بنا ثاقب ولا میں کیسے رہ سکتی تھی۔) انہیں آج اپنی کم علمی اور خود پسندی پر بے حد دکھ ہوا۔ افسوس ہوا۔ انہوں نے اسے موقع ہی کب دیا کہ وہ اپنا دکھ سکھ ان کے ساتھ شیئر کرسکتی۔

برہان نے ممنون نگاہوں سے اس جرنلسٹ کو دیکھا تھا۔

☆☆☆

مہ پارہ، اقصیٰ، ابوبکر، دادی سب خاموش بیٹھے مجسم سوال تھے۔ بیٹے کے کہنے پہ ہی سلطنت آرا نے انہیں ناشتے پہ مدعو کیا تھا۔

"یسریٰ کو یہاں بلائیں۔" کوئی گھنٹہ بھر کی خاموشی کے بعد برہان کے منہ سے ادا ہونے والا یہ پہلا جملہ تھا۔ سب نے مضطرب سا ہو کے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پانچ منٹ بعد یسریٰ ان کے سامنے تھی۔

"میں تم سے معافی چاہتا ہوں کہ میں نے اپنا فیصلہ تمہاری مرضی جانے بغیر ہی سنا دیا۔" اتنا کہہ کر اس کے سر پہ نرمی سے ہاتھ رکھا، "جو کہ شرعاً بھی جائز نہیں۔"

"جی!" وہ حیران ہوئی۔ کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

"آپ کے توفیق انکل کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔ اسی وجہ سے آپ کی بہن اور پھوپھی کل یا پرسوں جارہی ہیں۔" وہ خاموش ہوئے۔ پھر ہلکا سا کھنکھار کے دوبارہ مخاطب ہوئے۔

"شام کو تمہاری رخصتی ہے بیٹا۔"

"جی!" اس نے مختل حواس کے ساتھ باپ کو دیکھا۔ باقی سب کا حال اس سے بھی برا ہوا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو؟" سلطنت آرا کی آواز کسی دھاڑ سے کم نہیں تھی۔

"ہمارے یہاں بیٹیاں اس طرح رخصت نہیں ہوتیں برہان!" لہجہ دبنگ اور پرجلال تھا۔

"اگر شعیب کے بیٹے کے ساتھ رخصتی ہوگی تو آج ہی اور اسی طرح ہوگی ورنہ۔" انہوں نے ماں سے بھی بڑھ کے جلال کا مظاہرہ کیا۔ وہاں سب کو جیسے سانپ، بلکہ اژدھا سونگھ چکا تھا۔

"ایں، ہیں یہ برہان کیا کہہ رہا ہے۔" بات جب سمجھ میں آئی تو وہاں سب کے دل جگر، گردے تک پھول کے کپا ہوچکے تھے۔ بس یسریٰ وہاں سن سی بیٹھی تھی۔

"دو روز پہلے انیب نے بابا سے ایسا کیا کہا تھا کہ وہ اس طرح ایمرجنسی نافذ کررہے ہیں۔ بھلا شادی یوں بھی ہوتی ہے۔" اس کی آنکھیں پانی سے بھر چکی تھیں۔

"ارے اب کہاں بھاگے جارہے ہو برہان! ارے سنو تو میرے مرنے سے پہلے کوئی ایک کل ہی سیدھی کرلو بچے! کوئی بھی کام کبھی سیدھے طریقے سے مت کرنا۔ اپنی شادی بھی یوں ہی افراتفری کے عالم میں ہی کی تھی۔"

"مگر میری کیوں دادی؟" یسریٰ یوں پھپھک کے روئی کہ سب کو پریشان کردیا۔ وہ پریشان ہوئیں کہ اس کی مرضی شامل نہیں، ورنہ اس قدر رونا، دھونا کیا، ابوبکر انیب کو کال کررہا تھا۔

"لیجیے نانی! بات کریں۔" انیب نے کال ریسیو کرلی تھی اور نانی نے جو کہا تھا تو سننے والے کے اکیس طبق روشن ہوگئے۔

"گیارہ بج چکے ہیں اور شام میں صرف پانچ گھنٹے پڑے ہیں۔" وہ شدید بوکھلاہٹ کا شکار ہوا۔

"دبئی کے لیے میری چار بجے کی فلائٹ ہے، پاپا کی طبیعت بہت خراب ہے نانی۔" وہ سچ مچ پریشان ہوگیا۔ سلطنت آرا کا جوش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ وہ ہیلو، ہیلو کی گردان کیے جارہا تھا۔ ابوبکر نے نانی کے ہاتھ سے فون پکڑا۔ دوسری طرف کا ماجرا سن کر وہ ٹھٹکا۔

"واٹ..... سب ڈراما ہے۔ مجھے میکال نے کل کی پارٹی کی فوٹوز واٹس ایپ کی ہیں، وہ خوش باش سنبل کے ساتھ ڈانس کررہے تھے۔" ان کی بات کے جواب میں جانے انیب نے کیا کہا تھا۔

"یہ سب دھوکا ہے انیب!۔ بہرحال آج کے بعد یسریٰ تمہاری زندگی سے نکل جائے گی۔" ابوبکر کا لہجہ خطرناک حد تک سنجیدہ تھا۔ اس نے فون بند کرکے نانی کے پاس رکھا۔ وہاں اب دوبارہ انیب کی کال آرہی تھی۔

☆☆☆

بیس، پچیس افراد کی وہ مختصر سی بارات تھی۔ مگر ثاقب ولا میں تقریباً سو کے قریب مہمان جمع ہوچکے تھے اور ابھی آمد جاری تھی۔ پورا قصر ثاقب جگمگ کررہا تھا۔ مہ پارہ اور اقصیٰ کی اچانک روانگی کو وجہ شادی بتایا جارہا تھا، مگر اصل صورت حال کیفے ٹیریا کی ٹیبل پہ گپ شپ کرتے، خبریں اڑاتے ایک جرنلسٹ سمیت باقی پانچ افراد جانتے تھے۔ جو اس وقت دولہا کے مسکراتے بشاش چہرے پہ ٹکٹکی باندھ کے بیٹھے تھے۔ جبکہ اندر اپنے بیڈروم میں روایتی دلہنوں کے برعکس دلہن صوفے پہ پھسکڑا مار کے بیٹھی تھی۔ جو مہ پارہ کے بے حد اصرار پہ بیوٹیشن کے ہتھے چڑھی تھی۔ جوڑا دیکھنے میں سادہ، نفیس مگر قیمت میں لاکھوں کا تھا۔

نکاح کے بعد جب وہ کمرے سے باہر آئی تو لوگوں کا جم غفیر دیکھ کے دنگ رہ گئی، اسے دل ہی دل میں باپ پہ ڈھیروں پیار آیا کہ اقصیٰ کی بارات پہ بھی اتنی ہی گیدرنگ تھی۔ اوپر سے گھر میں شادی کی ایک اپنی ہی رونق ہوتی ہے۔ وہ خوش تو ہوئی تھی، پھر منہ بنا کے بیٹھی تو انیب کا دھیان کئی (سمتوں) میں بٹا ہوا تھا۔

وہ اپنی ماں اور کشف الہدیٰ کو مس کررہا تھا۔ اسے مسز اسمتھ بھی یاد آرہی تھیں اور اس کا باپ...... پھر بھی اس نے ایک بار گردن موڑ کے یسریٰ کو دیکھا تھا جو اس سے غافل اور بے نیاز سی ہوکر بیٹھی تھی۔ یوں جیسے وہ اس کے پہلو میں بیٹھا ہی نہیں تھا۔

ان دنوں کراچی میں سردی معمول سے ہٹ کر تھی۔ سو دیکھنے والوں نے دیکھا اور محسوس کیا کہ دولہا، دلہن کے احساسات پہ بھی وہ سردی حاوی ہوچکی تھی۔

☆☆☆

یسریٰ کو تمام راستے اپنے باپ کے آنسو پریشان کرتے رہے تھے۔ اس طرح تو وہ اقصیٰ کی رخصتی پہ بھی آبدیدہ نہیں تھے۔ جس طرح وہ آج سردیوں کی بارش کی طرح قطرہ قطرہ برس رہے تھے۔

"اب بس بھی کرچکو۔ سب لڑکیوں کی شادیاں ہوتی ہیں۔ تمہارے ساتھ کچھ انوکھا تو نہیں ہوا۔" مہ پارہ اور ابوبکر کے جانے کے بعد وہ پہلی بار اس سے مخاطب ہوا۔ جو روایتی دلہنوں سے ہٹ کر بیٹھنے کے بجائے صوفے پہ بیٹھی تھی اور وہ بھی پہلا دولہا تھا جو دلہن کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے اپنے روزمرہ

کے کام نپٹا رہا تھا۔

بیڈ روم میں جابجا ٹیولپ، اور گلاب کے ڈھیر تھے۔ انیب نے ٹائی اتار کے بیڈ پہ پھینکی کہ اپنی پہلی بات کا اسے جواب تک نہیں ملا تھا۔

''آپ نے بابا سے کیا کہا تھا کہ انہوں نے اس طرح آناً فاناً شادی کا فیصلہ کیا۔؟''

اس نے ذرا سا ترچھا ہو کے انیب کو دیکھا کہ جس کے ہاتھ آستین کے بٹن کھولتے ساکت ہوئے۔ اس نے یسریٰ کو اچنبھے سے دیکھا۔

''آج مجھے یقین ہو چلا ہے کہ تمہارے باپ کو علاج کی ضرورت جانے کب سے ہے۔'' وہ استہزائیہ ہنسا۔ یسریٰ کا چہرہ غصے سے سرخ ہوا۔

''یہ میری بات کا جواب نہیں ہے۔'' وہ جیسے تپ کے بولی۔

''جو بھی کہا ہو، مگر میں نے تمہارا ذکر نہیں کیا تھا۔'' وہ اب گریبان کے بٹن کھول رہا تھا۔

''آپ غلط کہہ رہے ہیں۔'' اس کا لہجہ اس قدر تیز تھا کہ وہ متحیر سا اسے دیکھتا رہ گیا۔

''اب میں ان سے یہ تو نہیں کہہ سکتا تھا کہ تمہیں دلہن بننے کا کتنا شوق ہے۔'' کافی دیر بعد وہ شرارت سے بولا تو وہ اسے گھورتی ہی رہ گئی۔ ''وہ بھی میری دلہن......'' وہ ہنسا، جیسے اسے چڑا رہا ہو۔

''مجھے کوئی شوق نہیں تھا۔ آنٹی نے کہا تھا۔ میں تو بس ان چیزوں کے لیے......'' مارے غصے کے اپنی بات مکمل بھی نہیں کر پائی۔

''ہاں تو، میں نے مہ پارہ آنٹی سے کہا کہ ایک چیز بھی کم نہ ہو۔ تم نے گنی تو یقیناً ہوں گی۔'' وہ زیر لب مسکرایا۔

وہ مارے طیش کے مٹھیاں بھینچ کے رہ گئی، پھر جیسے پلٹ کے اس سے پوچھا۔

''یعنی کہ مجھ سمیت آپ کو ہر بات یاد تھی۔''

وہ ہنسا ضرور، مگر خاموش رہا۔ وہ اس کے سامنے آیا۔ پھر بیڈ کے کنارے ٹک کر جوتے اتارنے لگا۔

''شادی اس طرح ہوتی ہے، بھاگ بھاگ کے پاؤں بے چارے غبارہ ہو چکے ہیں۔'' اس نے پاؤں کی ایڑی کو نرمی سے دبایا۔

''دادی کو انکار کر تو دیا تھا، ابوبکر کے کہنے پہ بھی نہیں کرتے۔''

''لیجیے ایک اور شکوہ۔'' وہ موزے اتارتے ہوئے جھکے سر کے ساتھ ہی مسکرایا۔ ''ابوبکر نے مجبور ہی اتنا کیا تو......''

''میں بابا کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔'' دانت پیس کے کہا۔

''بالکل بھی مت کرنا۔'' وہ وہاں سے ہٹتے ہوئے اٹھا اور موزے اٹھا کر واش روم میں گھسا۔ اسے آنسو بہانے کا موقع مل گیا۔ کافی دیر بعد وہ آہستگی سے اس کے قریب بیٹھا تو ایک حواس کو چھونے والی مہک اس کے وجود سے اٹھ رہی تھی۔ اس نے آنسو جلدی سے دوپٹے کے کونے سے ہی صاف کیے، کمرے میں کہیں بھی ٹشو نہیں تھے۔

''کل صبح میں بہت پریشان تھا۔''

''پاپا کی سیکریٹری نے مجھے فون پہ بتایا کہ ہارٹ اٹیک کی بنا پہ ہاسپٹلائز ہیں۔ اگر ابوبکر یا پھر نانی ایک گھنٹہ لیٹ فون کرتے تو میں روانہ ہو چکا ہوتا اور اس وقت میرے پہلو میں بھلا تم کہاں ہوتیں۔''

اس نے ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی، جو ناکام ٹھہری۔

''میری تو شکل تک آپ کو یاد نہیں تھی۔'' سب سے بھاری شکوہ۔

''اس وقت تمہاری ناک کس قدر بہتی تھی۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

پھر وہ کتنی ہی دیر تک ہنستا رہا۔

''سچ کہوں تو میں اس چھوٹی سی لڑکی یسریٰ سے محبت نہیں کرتا تھا کہ اس کے لیے واپس آتا......مگر یہ سچ ہے کہ واپس آنے کے بعد مجھے اس یسریٰ سے محبت ہو گئی تھی۔'' وہ طرز تخاطب ساحرانہ تھا۔ ''مجھے تمہارا چہرہ یاد تھا، مگر میں نانی کے سامنے کیسے کہہ سکتا تھا کہ ہاں مجھے یاد ہے؟'' وہ دھیمی سی مسکراہٹ کے

ساتھ بولا۔

''یعنی کہ تمہارے دل میں چور تھا۔'' وہ ایک دم ہی خوش ہوئی اور چہرہ صاف کرنا چاہا۔

''ارے، ارے۔'' انیب نے ایک ہاتھ سے اس کی کلائی اور دوسرے میں ہاتھ پکڑا۔ ''پونے تین لاکھ کے جوڑے مسز انیب بطور ٹشو استعمال کر رہی ہیں۔''

''یہاں ٹشو ہیں ہی نہیں۔''

''مجھے اندازہ ہوتا کہ تم اس قدر روؤ گی تو واش روم کے بجائے سائڈ ٹیبل پہ رکھتا۔ ویسے اتنا روئی کیوں ہو۔'' انیب نے اس کی سرخ آنکھوں میں جھانک کے سوال کیا۔ لہجے کا رنگ اچانک ہی بدلا۔ انیب نے جانے کب اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے تھے۔

یسریٰ نے اسے دھیان سے دیکھا۔ ''میں نے تمہیں فوراً پہچان لیا تھا کہ میں نے تمہیں ہمیشہ یاد رکھا۔''

پہلے وہ مسکرایا پھر ایک دم بوکھلایا۔ ''یسریٰ یہ تم کیا کر رہی ہو یار؟'' وہ بے چاری پریشان ہوئی۔

''دلہن نگاہیں جھکا کے شرماتی ہے۔''

انیب نے اسے بری طرح کنفیوز کر دیا تھا۔ وہ بلش ہوئی۔ گھبرائی، پھر سٹپٹا کے اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پہ کیا کچھ نہیں تھا۔ وہ ہنسنا بھول کے اسے تکے جا رہا تھا۔

☆☆☆

وہ آئی سی یو سے پرائیویٹ روم میں شفٹ ہو چکا تھا۔ یہ ڈراما ایکٹ کرنے کے لیے جانے کتنا پیسہ برباد کرنا پڑا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں بیٹے کو ایک ہزار گالیاں دی تھیں جو موت کی کشمکش میں مبتلا باپ کو دیکھنے تک نہیں آیا تھا۔

ہلکی سی دستک کے بعد دروازہ کھلا، اندر آنے والی لڑکی جوان اور حسین تھی۔ جسے دیکھتے ہی عین سامنے سنگل بیڈ پہ لیٹا وہ شخص مسکرایا۔ مگر لڑکی جرا بھی نہیں مسکرا سکی۔

''مجھے یقین تھا کہ آپ ابھی تک بے خبر ہی ہوں گے۔''

اس نے سنبل کو بغور دیکھا اور اس کی چھٹی حس اسے کسی انہونی کی خبر دینے لگی۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اس کے قریب آئی اور پھر ہاتھ میں پکڑے اخبار کا صفحہ اس کے سامنے کیا۔

خبر پر نظر پڑتے ہی اسے محسوس ہوا کہ اس کا دل اس صدمے سے واقعی بند ہو جائے گا۔

''مشہور معروف انڈسٹریلسٹ شعیب اسد کے صاحب زادے انیب خاکوان کی شادی خانہ آبادی گزشتہ شام نواب زادہ پروفیسر ڈاکٹر برہان ثاقب کی صاحب زادی یسریٰ برہان سے بخیر و خوبی انجام پائی۔''

انیب کی تصویر بھی تھی۔ وہ ابوبکر اور برہان کے ساتھ کھڑا ان کی کسی بات پہ مسکرا رہا تھا۔ جنہیں دیکھ کر شعیب خاکوان کے دل سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ بے بسی سے اس کے جبڑے بھنچ گئے۔ پھر اس کے چہرے پر وحشیانہ پن جھلکا۔ برہان اور اس کے خاندان کو اس نے شاندار گالیوں سے نوازا، وہ اپنی ماں کو بھی ساتھ ہی گھسیٹنے لگا، جس نے سفینہ جیسی سونے کی چڑیا کو اس کی زندگی سے نکال دیا تھا، پھر بھی وہ اپنے گھناؤنے منصوبے میں کامیاب نہ ہو سکی اور ایک اولڈ ہاؤس میں لاوارثوں کی طرح ہی زندگی کے دن پورے کر کے گزر چکی تھی۔ تب ہی دروازہ کھٹکھٹایا جانے لگا۔

''ہوش کرو شعیب، یہ اسپتال ہے۔'' سنبل نے لیس کیا تو اگلے لمحے مسکراتی ہوئی خوش شکل سی نرس اندر آ چکی تھی۔

☆☆☆

''یہ پاکستان میں کیا ہو رہا ہے ابوبکر۔'' سفینہ کی سنجیدہ آواز میں کلیوں کی سی تازگی تھی۔

''اوں...... یہاں۔'' وہ خواہ مخواہ سنجیدہ ہوا۔ ''یہاں کیا ہو سکتا ہے۔ فی الحال تو انیب کا گونگا پن ہی ختم نہیں ہو رہا۔ اوپر سے ملک کی دو بڑی پارٹیاں اندرون خانہ گٹھ جوڑ کر کے بظاہر ایک دوسرے پہ کیچڑ اچھال رہی ہیں۔ البتہ نوجوان نسل کی فیورٹ پارٹی......''

''اوشٹ اپ...... پلیز۔'' وہ مسکراتی آواز میں گرجیں۔ ''میں اس نیوز کی بات کر رہی ہوں، جو آج

کے نیوز پیپر کی سب سے اچھی خبر ہے۔" وہ جیسے ہوا کی طرح ہلکی ہو کر بولیں۔

"ہونا کیا تھا۔ نانی بے چاری دہائیاں دیتی رہ گئیں اور برہان صاحب نے حسب مزاج اپنی بے کل موکلوں کے ساتھ آپ کے بیٹے کو دولہا بننے پہ مجبور کر ہی دیا۔"

وہ ہنستی ہی گئیں۔ "چلو زندگی میں پروفیسر صاحب نے کوئی ایک کام تو ڈھنگ کا کیا۔" ان کا یوں ہنسنا ابوبکر کے لیے طمانیت کا باعث تھا۔

☆☆☆

آج ان کی شادی کی یہ تیسری شام تقریب ولیمہ کی تیاریوں میں گزر رہی تھی۔ اقصیٰ لوگوں کی فلائٹ کا ٹائم رات چار بجے کا تھا۔

"پرسوں بھی اور آج پھر میرے دونوں ڈریسز کے ساتھ آپ نے شوز تو لیے ہی نہیں۔" وہ مکمل تیار ہو چکی تھی۔

"سوری یسریٰ! لیکن میں تمہارے ساتھ اس واحد چیز کی شاپنگ نہ اب، نہ آئندہ کبھی کر سکوں گا۔" اس نے پرفیوم کا بے دریغ استعمال کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ "کہ تم اچھے بھلے شوز ریجیکٹ کرتی چلی جاتی ہو۔"

"مگر ان میں سے کچھ مجھے سوٹ نہیں کرتے۔ کچھ مجھے اچھے نہیں لگتے۔" وہ منہ بنا کے منمنائی۔

"جو بھی ہو، مگر میں پچاس دکانوں کے چکر نہیں کاٹ سکتا۔" وہ ہاتھ اٹھا کر معذرتی انداز میں گویا ہوا۔

"مگر اس دن تو آپ نے پورا ایک گھنٹہ میرے ساتھ چکر کاٹے تھے۔" وہ اس کے قریب سے گزر کر باہر جانے لگا، تو وہ یاد دہانی کرانا نہیں بھولی تھی۔ وہ پلٹ کر اس کے پاس آیا۔

"اس دن میں اپنی محبوبہ کے ساتھ ایک گھنٹہ اور بھی چکر کاٹ سکتا تھا۔" وہ بری طرح بلش ہوئی۔

"اگر یاد کرو تو اب تم میری بیوی ہو۔" وہ اس کا گال تھپتھپا کے پھر آگے بڑھا۔

"مرد شوہر بنتے ہی کیسے رنگ بدل لیتا ہے۔" وہ واقعی جل بھن کے بولی تھی۔

"اب ہر کوئی برہان تو نہیں ہوتا، جسے ہمیشہ محبوب کے عہدے پہ فائز رہنا ہی پسند ہو۔" چند لمحے اسے دیکھتے رہنے کے بعد وہ قدرے اداسی سے مسکرایا کہ پروفیسر صاحب کی نئی کتاب شائع ہو کر مارکیٹ میں آج ہی آئی تھی، جسے ابوبکر فوراً ہی خرید لایا تھا۔ پھر ناراض سی بیوی کا ہاتھ تھاما۔

"تم مسز انیب ہو، آج کی تقریب کی چیف گیسٹ، جو شوز بھی پہن لو گی، واؤ، اسٹائلش، ہر طرف سے یہیں آواز آئے گی۔" اس نے خوب صورت لہجے میں جو جال پھینکا تھا' وہ واقعی اس میں آ چکی تھی۔

☆☆☆

تمام ادبی حلقوں میں، کیفے میریا میں اور قارئین کی اس صنف میں جو برہان کو پڑھتے آج شام وہاں اک حیرانی کی لہر تھی۔ دل ناداں کا قصہ ان کے نئے ناول کا موضوع تھا۔

"مما! یہ کوریئر سے آپ کے لیے کچھ آیا ہے۔"

کشف الہدیٰ نے ایک پھولا ہوا خاکی لفافہ ان کی جانب بڑھایا، جس کے ایک کونے پہ فرام ابوبکر لکھا تھا۔ انہوں نے لفافہ چاک کیا۔ جس میں سے ایک نئی نکور کتاب برآمد ہوئی۔ وہ یقیناً ایک ناول تھا، نام پڑھ کے وہ کچھ الجھیں۔

"تھم گیا شور جنوں۔" کتنی ہی دیر وہ ان چار لفظوں کو پڑھتی رہیں۔ پھر جب معنی و مطلب سمجھ میں آئے تو اختیاری طور پہ مسکرائیں۔ انہوں نے کتاب کھولی۔ لفظ اڑ، اڑ کے انہیں چھونے لگے۔

بانو کے نام۔ (جو آج بھی میری نبض کی ٹک ٹک میں ہے۔)

"خالہ سچ ہی کہتی ہیں۔ برہان، کبھی لمحہ بھر کو خود بھی حیران ہو لیا کرو، دنیا کو حیران کرنے کا کام ہمیشہ تمہارا ہی رہے گا"۔ وہ ہولے سے سر جھٹک کر مدت بعد آج دل سے مسکرائی تھیں۔



عنبرین اعجاز

حسن عیوں دل پہ

"گھیئے (لوکی) کا حلوہ جب میری خالہ نے پہلی بار میرے خالو کو کھلایا تھا تو خوش ہو کے انہوں نے میری خالہ کو پورے پانچ سو روپے دیے تھے۔ یہ آج سے بیس سال پرانا واقعہ ہے۔ اور ایک آپ کہ پورا پیالہ کھا کے بھی روکھی سوکھی واہ! واہ پہ ہی ٹرخا دیا مجھے۔"

عائلہ نے منمناتی ہوئی آواز میں منہ بسورتے



ہوئے گلہ کیا۔

ٹشو پیپر سے منہ صاف کرتے سفیر کے ہاتھ وہیں رک گئے۔ لمحہ بھر کو اس نے عائلہ کی طرف دیکھا، جو ابھی تک شکوہ کناں نظروں سے شوہر کو دیکھ رہی تھی۔ سفیر نے ایک وزنی ڈکار کے ساتھ دیسی گھی کی خوشبو میں رچا بسا ٹشو پیپر عائلہ کے ہاتھ میں پکڑی خالی پلیٹ میں یوں ادائے بے نیازی سے دھر دیا۔ گویا کسی فائیو اسٹار ہوٹل کے بیرے کو ہزار روپے کے کئی کڑکڑاتے نوٹ بطور ٹپ ادا کیے ہوں۔

''پہلی بات تو یہ کہ میں تمہارا خالو نہیں ہوں اور دوسری بات یہ کہ تم شاید بھول رہی ہو کہ عرصہ دراز تک تمہیں مجھ سے شکایت رہی کہ میں تمہارے ہاتھ کے بنے کھانوں کی تعریف نہیں کرتا۔ اب میں نے تعریف کی ہے تو تمہارا فرمائشی پروگرام چل نکلا ہے۔ میرے نانا جی نے ایک بار مجھے سچ نصیحت کی تھی کہ پودوں اور عورتوں کی کانٹ چھانٹ کرتے رہنا چاہیے۔ انہیں زیادہ ڈھیل نہیں دینی چاہیے، ورنہ بہت تیزی سے پھیلنے لگتے ہیں۔ پودوں کا تو جنگل بن ہی جاتا ہے، لیکن عورتوں کی فرمائشوں کا جنگل، توبہ......توبہ۔''

سفیر کانوں کو ہاتھ لگاتا اٹھ کھڑا ہوا۔ عائلہ بے زاری سے برتن سمیٹنے لگی۔ آہ! فرمائشوں کا تو نہیں، لیکن اس کے خوابوں کا جنگل بہت وسیع اور گھنا تھا۔ اب شادی کے بعد ایک ایک کر کے امید کی ساری کلیاں دم توڑ گئی تھیں۔ آس کے غنچے مرجھا گئے تھے کہ اس گھر میں شادی کے بعد روز اول سے ایک ہی اصول اس کے لیے وضع کیا گیا تھا۔

''گربہ کشتن روز اوّل''

☆☆☆

فیروزہ بیگم شہر کی نامور سوشل ورکر تھیں۔ دور اندیش — شاطر ذہن اور طویل المیعاد منصوبہ بندی میں باکمال، ان کا ہر تیر نشانے پہ فٹ بیٹھتا اور حسب توقع مثبت نتائج برآمد ہوتے۔ اگرچہ خاندان میں ایک سے بڑھ کر ایک خوش شکل، تعلیم یافتہ لڑکیاں موجود تھیں۔ علاوہ ازیں باہر سے بھی ہم پلہ خاندانوں کے امراء آس لگائے بیٹھے تھے، لیکن فیروزہ بیگم کی دوررس نگاہیں دور پار کے ایک رشتے دار کی منجھلی بیٹی پہ جا ٹھہریں۔ قصباتی شہر اور لوئر مڈل کلاس فیملی کی چھ بیٹیوں میں عائلہ کا تیسرا نمبر تھا۔ قبول صورت، واجبی تعلیم اور پھر فیروزہ بیگم نے جہیز کے نام پر ایک پیسہ تک وصول نہ کیا تھا۔ سوشل سرکل میں انہوں نے خوب داد سمیٹی۔

عائلہ اپنی قسمت پہ نازاں تھی۔ منگنی سے رخصتی تک کا مختصر عرصہ اس نے سپنوں میں بلند و بالا محلات میں ہی بسر کیا۔ بعد میں عقدہ کھلا کہ فیروزہ بیگم کو دراصل ایک فل ٹائم ہاؤس کیپر کم سرونٹ کی تاحیات ضرورت تھی، جو چوبیس گھنٹے سروس مہیا کرے۔ عید، تہوار پہ کوئی چھٹی نہ لے اور لب پہ حرف شکایت بھی نہ لائے۔ اپنی کلاس اور خاندان میں تو ایسی بہو ملنے سے رہی جو خاموش طبع، کم گو، سر جھکائے، نظر جھکائے کسی بے گناہ مجرم کی طرح ناکردہ گناہوں کی عمر قید کی سزا بھگتنے کا حوصلہ رکھتی ہو۔

اماں، ابا نے بھی یہ ہی سوچا کہ رانی بیٹی راج کرے گی، مگر یہ بھی بعد میں پتا چلا کہ یہاں ایک عدد ''رانی'' نند کے روپ میں پہلے سے ہی موجود تھی، عائلہ تو درحقیقت ''کنیز خاص'' تھی۔

☆☆☆

عائلہ ٹرے تھامے ٹی وی لاؤنج کی حدود پار کر رہی تھی کہ اچانک ددیا ساس (دادی ساس) پر کھانسی کا شدید حملہ ہوا۔ ٹرے وہیں چھوڑ وہ لپک کے کارنر ٹیبل کی دراز میں سفید رنگ کی ''پولو'' کی گولی نکالنے لگی۔

اس نے گولی نکال کے دادو کے منہ میں یوں اڑس دی گویا نسوار کی چٹکی داڑھ میں دبا دی ہو۔ عائلہ نے ان کی گود میں دھرائی دی ریموٹ اٹھایا اور ٹی وی آف کر دیا۔

دادو کے من پسند ڈرامے کا اختتام اگر من پسند

نہ ہوتا تو دادو کو یوں ہی کھانسی کا دورہ پڑ جاتا تھا۔ اس وقت بھی دادو غم و غصے اور بے بسی کی کیفیت سے دوچار تھیں۔ عائلہ ان کی پیٹھ سہلا رہی تھی۔ طبیعت قدرے سنبھلی تو دادو نے نظریں اٹھا کے عائلہ کی طرف دیکھا۔

''دلہنیا! یہ تو کیوں منہ لٹکائے ہوئے ہے؟ کہیں ''پاناما'' میں تیرا نام بھی تو نہیں آ گیا؟''

حالات حاضرہ سے باخبر دادو نے چٹکلہ چھوڑا تو عائلہ کی بے ساختہ ہنسی چھوٹ گئی۔ دادو کی باتیں اکثر عائلہ کے لیے ٹرینکولائزر ثابت ہوتی تھیں۔ پوچھنے کی دیر تھی کہ عائلہ وہیں ان کے قدموں میں فلور کشن پہ بیٹھ گئی اور لوکی کے حلوے پر ہونے والے اپنے اور سفیر کے ''مذاکرات'' گوش گزار کرنے لگی۔ دادو نے سفیر کے رویے پہ اتنی تشویش کا اظہار نہیں کیا جتنی دلچسپی انہوں نے کھیئے کے حلوے میں دکھائی۔

''بس دلہنیا بس! اب اتنی تفصیل سے تم نے حلوے کی ترکیب مع جزئیات بیان کی ہے کہ یقین مانو خوشبو آنے لگی ہے۔ دلہن بہو! اب تو تم میرے لیے حلوہ بنا ہی ڈالو۔''

دادو نے منہ میں پولو کی گولی چوستے اور مزے لیتے ہوئے کہا۔ انہیں پولو میں بھی لوکی کے حلوہ کا ذائقہ محسوس ہو رہا تھا۔

''افوہ! اگر آپ دونوں کا کوکنگ شو ختم ہو چکا ہو تو پلیز بھابھی! میرے کمرے میں دو گولی ڈسپرین بھجوا دیں۔ سر درد سے پھٹا جا رہا ہے۔''

رانیہ نے لاؤنج میں نیچے جھانکتے ہوئے غصے سے کہا۔ اس کی دھاڑ سنتے ہی عائلہ سب کچھ چھوڑ کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ رانیہ کا حکم بجا لانے میں تاخیر کا مطلب اپنی شامت کو دعوت شاہی دینا اور رانیہ تو اپنی ذات میں پوری سسرال تھی۔ روایتی، مشرقی، ظالمانہ سسرال، عجیب رنگ ڈھنگ تھے اس کے۔ فیروزہ بیگم نے غیر معمولی توجہ اور انوکھے انداز میں اس کی پرورش کی تھی۔

ان دنوں افراد خانہ ویسے ہی خاصے تناؤ کا شکار تھے۔ ابھی چند ماہ قبل ہی رانیہ کی شادی خوب دھوم دھام سے انجام پائی تھی۔ فیروزہ بیگم اس بار بھی دور کی کوڑی لائی تھیں۔ یعنی اپنے دور پار کے ایک عزیز رشتے دار کے توسط سے یہ رشتہ ہوا تھا۔ لڑکا گھر میں سب سے چھوٹا تھا اور یتیم بھی تھا۔ قبول صورت، مناسب تعلیم یافتہ، پابند صوم و صلوٰۃ تھا۔ مضافاتی علاقے سے نکال کر اس شہر میں اسے ملازمت دلوائی گئی تھی۔

یہ تو بعد میں انکشاف ہوا کہ مقصد دراصل اسے گھر داماد بنانا تھا۔ رانیہ کے اطوار بھی بعد میں ہی کھلے تھے۔ اب ایسی نخریلو، نازک مزاج، شاہانہ طرز زندگی گزارنے والی رانیہ اتنی قلیل تنخواہ میں بغیر خدمت گاروں کے کیوں کر زندگی بسر کر سکتی تھی۔ سو گھر داماد بننے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ لیکن یہاں معاملہ داماد کا تھا، بہو کا نہیں۔

سو سب سے پہلا خلاف توقع کام تو یہ ہوا کہ داماد جی نے خاموشی سے سسر جی کی عنایت کردہ نوکری کو خیرباد کہہ دیا اور ایک پرائیویٹ فرم میں جاب کر لی۔ سابقہ تجربے کی بنا پر انہیں اچھی تنخواہ مل رہی تھی۔ دوسرا بڑا دھماکا یہ ہوا کہ داماد جی نے سختی سے کہہ دیا کہ وہ کھانا اگر کھائیں گے تو صرف اپنی بیوی رانیہ کے ہاتھ کا بنا ہوا۔ یہ سنتے ہی رانیہ کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ رانیہ تو وہ ملکہ تھی جس نے آج تک سامنے میز پہ پڑے جگ سے گلاس میں اپنے لیے پانی تک نہ انڈیلا تھا۔ تیسری ضد یہ کہ داماد جی اڑ گئے تھے کہ ان کے کپڑے صرف رانیہ دھوئے گی، خواہ ہاتھوں سے دھوئے یا واشنگ مشین سے، لیکن کوئی تیسرا ان کے کپڑوں کو چھوئے گا بھی نہیں۔

ابھی ایک سچویشن سے سنبھلنے نہ پاتے کہ دوسری افتاد آن پڑتی۔ سمجھ سے بالاتر تھا کہ ان حالات سے کیسے نبرد آزما ہوا جائے۔ انسان سوچتا کیا ہے اور ہوتا کیا ہے۔

"میں نے کتنی بار تجھے کہا تھا نا فیروزہ کہ لڑکی کو زیادہ نہیں تو تھوڑی بہت ہی گھرداری سکھا۔ اپنا آپ سنبھالنے لائق تو کر...... لیکن تیرے بے جا لاڈ پیار نے تو اسے ہاتھ پاؤں ہلانے کے قابل بھی نہیں چھوڑا۔" دادو نے فیروزہ بیگم کی سرزنش کرتے ہوئے کہا۔ فیروزہ بیگم نے گہرا سانس اندر کھینچا اور موبائل فون پہ اسکرین آگے پیچھے کرنے لگیں۔

"ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے ماں جی! میری معصوم بچی۔ اسے تو دنیا کی ہوا ہی نہیں لگی، لیکن یہ لڑکا بہت شارپ ہے۔ میری بچی کو دنیاداری اور اس کے کاموں کا کیا پتا۔" فیروزہ بیگم نے اپنی بیٹی کی وکالت کی۔

"اے ہے! یاد ہے تجھے میں نے جب کہا کہ عائلہ کو دیکھ، کیسے کاموں میں جتی رہتی ہے، کولہو کے بیل کی طرح۔ رانیہ اسے دیکھ کے ہی کچھ سیکھ لے تو، تو نے کیا کہا تھا۔" دادو نے لاؤنج میں داخل ہوتی عائلہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے کچھ نہیں یاد! آپ بھی کن پرانی باتوں کو لے کر بیٹھ گئی ہیں ماں جی! مجھے اور بھی کئی فکریں ہیں۔" فیروزہ بیگم نے بہو کی آمد کے پیش نظر بات پلٹنے کی کوشش کی۔

"اب بات نہ ٹال فیروزہ! تو نے کہا تھا کہ اماں جی! کچھ لوگ کام کرنے کے لیے پیدا ہوتے ہیں اور کچھ آرام کرنے کے لیے اور کچھ راج کرنے کے لیے۔ اب دیکھ لے، تیرے چاؤ چونچلوں نے رانیہ کو نہ گھر کا چھوڑا، نہ کام کاج کا، اب آرام کہاں کے، راج کہاں کا۔" دادو نے مزید وضاحت کی۔ فیروزہ بیگم تلملا کے رہ گئیں۔

"اماں جی! اگر تسلی نہیں دینی تو طعنے بھی مت دیں۔ عائلہ! اماں جی کے منہ میں ایک گولی پولو کی دے دو۔" فیروزہ بیگم غصے میں بپھری شیرنی کی طرح لگ رہی تھیں۔

"مما! مما!" بالائی منزل سے رانیہ کے رونے کی صدائیں بلند ہوئیں تو فیروزہ بیگم کے ہاتھ سے موبائل چھوٹ گیا۔ رانیہ زاروقطار روئے جارہی تھی۔ روتے روتے جب ہچکی بندھ گئی تو عائلہ نے پانی کا گلاس بڑھایا۔ بمشکل تمام دو گھونٹ بھرے، پھر دوبارہ دھاڑیں مارنے لگی۔

دراصل ملائیشیا سے داماد جی کا فون آیا تھا۔ داماد جی ان دنوں پندرہ روزہ دورے پر ملائیشیا گئے ہوئے تھے۔ انہوں نے وہیں سے مژدہ سنایا تھا کہ ان کی جاب ملائیشیا میں ہوگئی ہے۔ انہوں نے عائلہ کو جلد از جلد سامان کی پیکنگ کا حکم دیا تھا۔ ایک ہفتے بعد ہی دونوں وہاں شفٹ ہونے والے تھے۔ اپارٹمنٹ تک پسند کرلیا گیا تھا۔

داماد جی نے خاص طور پر تاکید کی تھی کہ رانیہ اپنے تمام تعلیمی سرٹیفکیٹس اور ڈگریاں لازماً ہمراہ لائے، کیونکہ مستقبل میں اسے بھی جاب کرنا ہوگی۔ رانیہ کو تو ملازموں سے بھی کام کروانا نہ آتا تھا، کجا کہ خود کام کرنا وہ بھی دیارِ غیر میں۔ نہ نوکر چاکر، نہ ممی، نہ بھابھی۔ فیروزہ بیگم کو فضا میں رانیہ کے تمام جعلی سرٹیفکیٹس اور ڈگریاں لہراتے پھڑپھڑاتے سے دکھائی دے رہے تھے۔ ان کی چہیتی لاڈلی بیٹی نے تو ان تعلیمی اداروں کی عمارت تک نہ دیکھی تھی۔

سائڈ ٹیبل پہ پڑے لیپ ٹاپ کی اسکرین پر کسی ایوارڈ کی تقریب جاری تھی۔

یہ گلیاں یہ چوبارہ، یہاں آنا نہ دوبارہ
کہ اب ہم تو ہوئے پردیسی
کہ تیرا یہاں کوئی نہیں، کہ تیرا یہاں کوئی نہیں

"افوہ! مما!" رانیہ نے دھاڑیں مارتے مارتے سر تکیے پہ پٹخ دیا۔

"عائلہ!" فیروزہ بیگم نے عائلہ کو مخاطب کرتے ہوئے لیپ ٹاپ کی جانب اشارہ کیا۔ عائلہ بیڈ کے دوسرے کنارے کی طرف بڑھنے لگی۔ یہ سوچتے ہوئے کہ "ممی جی! اگر آپ کہیں تو ایک گولی پولو اس لیپ ٹاپ کے منہ میں بھی دے دوں؟"

☆

سائرہ رضا

حسن لا آج اور....



عبدالمبین اور مولانا صاحب کی صحبت میں رہ کر موسیٰ دن بہ دن کے نزدیک ہوتا جاتا ہے۔ موسیٰ کے والدین موسیٰ کی جدائی میں تڑپتے ہیں۔ موسیٰ شوبز چھوڑ دیتا ہے اور حسنل کو بھی چھوڑنے پر مجبور کرتا ہے۔ حسنل شوہر کے حوالے سے اپنے خیالات موسیٰ پر واضح کرتی ہے۔ موسیٰ ان خیالات کو عبدالمبین کے سامنے رکھ کر رہنمائی کا طالب ہوتا ہے۔ شہزاد دوستی کے پردے میں حسنل سے دشمنی کا آغاز کر دیتی ہے۔ جیک اپنی دوست کو شادی کا پیغام دیتا ہے جسے وہ سختی سے رد کر دیتی ہے۔

حسنل کی شوبز میں آمد اور اس کی بے باکی دونوں ماموؤں اور نانا کو بہت ناگوار گزرتی ہے۔ مگر حسنل سب کے اعتراضات کو ذرا اہمیت نہیں دیتی۔ وہ عبدالمبین کے گھر اس سے لڑنے پہنچ جاتی ہے۔ جہاں موسیٰ بھی آ جاتا ہے اور حسنل کی بدتمیزی پر اسے تھپڑ مار دیتا ہے۔ حسنل، محی الدین سے اس کی شکایت کرتی ہے مگر موسیٰ انہیں حقیقت بتاتا ہے۔ وہ حسنل

کو بھی سمجھاتا ہے۔

موسیٰ، اسکارلٹ کی شدید خواہش پہ ان سے ملنے جاتا ہے اور نہایت سرد مہری سے پیش آتا ہے۔ لندن میں جیکب کی دوست کو اس کے ادارے والے اسے موسیٰ کا ایک متنازعہ انٹرویو لینے کے لیے مجبور کرتے ہیں مگر وہ انکار کر دیتی ہے۔ اور موسیٰ کو یہ بات بتانے پہنچ جاتی ہے۔ جہاں موسیٰ اسے ماہ رو فیاض کی حیثیت سے پہچان لیتا ہے۔

بارھویں قسط



''ہاں! یہ بہت فلمی سی بچکانہ حرکت تھی۔ مگر مجھے فوری طور پر اور کوئی حل نہ سوجھا۔'' اس نے خجالت سے اعتراف کر لیا۔

''نہیں...... تم نے بہت اچھا کیا۔ مجھے واقعی اس طرح سے گھیرے جانے کا آئیڈیا نہیں تھا۔'' اس نے تسلیم کیا۔

''حالانکہ یہ تو سامنے کی بات ہے۔''

''ہاں ...... مگر مجھے اب پتا لگا کہ مجھے بالکل سامنے کی بات ہی کا تو پتا نہیں چلتا۔'' وہ پژمردہ دکھائی دینے لگا۔ ''مجھے اپنے قریب کی چیزوں کو پہچاننے میں غلطی ہوئی۔''

سامنے بیٹھا وہ شخص کون تھا......؟ اس نے اپنی پوری زندگی میں اسے تین بار روبرو دیکھا تھا۔ جب وہ کالج کنسرٹ میں اسٹیج پر گا رہا تھا۔ اور جب اس نے اپنی جیکٹ ہوا میں اڑا دی تھی اور وہ حسنل کے سر پر جا گری تھی اور ماہ رو نے جس پر

ہاتھ رکھ دیا تھا۔

دوسری بار آئس کریم پارلر میں وہ چند گز کے فاصلے پر تھا اور تیسری بار جب وہ اسے شاپنگ مال میں ملا تھا۔

اور یہ جو سامنے براجمان تھا۔ انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کے اینگل میں ٹھوڑی ٹکائے وہ کسی غیر مرئی نقطے کو تک رہا تھا اور صاف لگتا تھا، حاضر نہیں ہے۔

ہاں ملال، افسردگی اور بے بسی کا رنگ عیاں تھا۔

اور کوئی اتنا بھی بدل جاتا ہے۔ اس نے حلیہ بدل لیا تھا۔ وہ زیادہ خوب صورت دکھائی دے رہا تھا۔ اس سے نگاہ ملانا مشکل لگ رہا تھا۔ وہ بہت دیر بعد اس نتیجے پر پہنچی اس کی خوب صورتی میں ایک جلال سا ابھر آیا تھا۔ اک پاکیزگی سی۔

''کیا یہ سب اتنا آسان تھا؟'' اس کے منہ سے بلا ارادہ نکل گیا۔

وہ چونکا...... وہ اس کی تبدیلی کی سمت اشارہ کر رہی تھی۔

''سوری، بٹ مجھے لگتا ہے، یہ بہت مشکل ہوتا ہے۔ انسان اتنی آسانی سے نہیں بدلتے۔ بلکہ بدل ہی نہیں سکتے، دھوکا دیتے ہیں خود کو...... اور دوسروں کو بھی۔''

موسیٰ کو اس تبصرے سے تکلیف پہنچی تھی۔ مگر پھر بھی اس نے محسوس کیا۔ یہ تبصرہ نہیں تجربہ بولا تھا۔

وہ جیسے اس کے تناظر میں کسی اور کو دیکھ رہی تھی۔ یہ تلخی اس کے لیے نہیں کسی اور کے لیے تھی۔

وہ پھیکا سا مسکرا دیا۔ مہرو کی نظروں میں چبھن موجود تھی۔

''جب لوگ میرے بارے میں ایسے بات کرتے ہیں ناں تو مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ مجھے لگتا ہے وہ ایسے جملے بول کر در حقیقت مجھے گرانا چاہتے ہیں۔''

''تمہاری دل آزاری ہوئی ہے تو میں سوری کر لیتی ہوں۔ مگر ہم جو بھی کہتے ہیں وہ یا تو جگ بیتی ہوتا ہے یا آپ بیتی۔'' اس کے معذرتی لہجے میں تلخی گھل گئی۔

وہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی تھی۔

''اچھا......!'' موسیٰ کی آواز پر بھی اس کے ساکت وجود میں جنبش نہ ہوئی۔

''تو اس آپ بیتی کو شیئر نہیں کرو گی۔''

وہ یوں اچھلی جیسے موسیٰ نے اس پر ٹھنڈے پانی کا جگ الٹ دیا ہو۔

وہ اپنے ہی جملے کے ہاتھوں پکڑ میں آ گئی تھی۔

''تم کہاں چلی گئی تھیں مہرو...... تم، تم سب لوگ...... کوئی ایسے بھی غائب ہوتا ہے بھلا؟'' وہ آگے کو جھکا اور اس کا چہرہ دیکھنا چاہا۔

وہ عجیب سے انداز میں مسکرا رہی تھی۔

''پوچھ تو تم ایسے رہے ہو جیسے تم نے ڈھونڈا ہو...... گلی گلی صدا لگائی ہو۔'' اس نے سر جھٹک کر اپنا اعتماد بحال کیا۔

''آں ہاں شکوہ نہیں کر رہی جتا بھی نہیں رہی۔ تم نے ایسے پوچھا تو منہ سے نکل گیا۔ تم تو ان دنوں خوشیوں کے ہنڈولے میں جھول رہے تھے۔ حسن الماآپ جیسی بیوی جسے مل جائے اسے کیا پڑی ہے کہ وہ اس لڑکی کو صدا لگائے جس نے اسے ریجیکٹ کر دیا ہو۔ ہمارے بیچ رشتہ ہی کیا تھا۔ اور خیر۔

جن سے رشتے تھے انہوں نے کون سا نبا◆ لیے۔ ماہ رو فیاض...... مہرو...... میری...... اس کی آپ بیتی میں جگ نے اپنا کردار خوب نبھایا کوئی کسر نہ چھوڑی۔

بعض باتوں کو دہرانا ایسے ہوتا ہے۔ جیسے آپ سوئی لے کر اپنے آپ کو رفو کرنا شروع کر دیں اور خود کو رفو کرنے کی سب سے خراب بات یہ ہوتی ہے کہ ایک ٹانکا صحیح نہیں جڑتا، پھر خود کو ادھیڑنا پڑتا ہے۔ پھر دوبارہ سے سینا...... سینے ادھیڑنے کے اس عمل میں انسان دھجی دھجی ہو جاتا ہے۔'' اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔

''میں پھر بھی چاہتا ہوں کہ تم مجھے بتاؤ کیا ہوا تھا۔'' وہ بھونچکا رہ گئی وہ موسیٰ کو ایسا سخت دل نہیں سمجھتی تھی۔

''دہراؤ، مہرو! میں سننا چاہتا ہوں۔''

☆☆☆

لاک میں چابی گھماتے ہوئے وہ ٹھٹکی۔ دروازے کے ساتھ لگی کھڑکی پر دبیز پردے پڑے رہتے تھے۔ مگر کسی سرکے ہوئے کونے سے نکلتی روشنی کی لکیر نے اسے چونکایا۔ اسے یقین تھا وہ صبح نکلنے سے پہلے لائٹ آف کر کے گئی تھی۔

ہو سکتا ہے بھول گئی ہوں۔ آج کل ہوش ہی کب رہتا ہے۔ کھٹاک۔ اس نے دروازہ کھول دیا۔

''سرپرائز۔''

سامنے صوفوں پر براجمان نفوس جو لاک میں چابی کی کھٹ پٹ پر سانس روک کر بیٹھے تھے۔ یک آواز ہو کر چلائے۔ اس نے دل کر دیوار تھامی۔

''اوہ...... او مائی گاڈ...... تم لوگ۔'' اس نے بیگ زمین پر پھینک دیا۔

''جی ہاں...... ہم لوگ۔'' موحد اور واحد تب تک اس کے قریب آ چکے تھے اور اسے خود سے لپٹا لیا۔ دونوں کی بیویاں بھی آ گئیں۔

وہ پانچوں گول کیپ لینے کے بعد ایک دوسرے پر گر جانے والے فٹ بالرز کی طرح ایک دوسرے کو بھینچے کھڑے تھے اور اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے۔

''بس بس......'' وہ ہانپتی ہوئی صوفے پر جا بیٹھی۔ ''بس......''

''آپ کو خوشی نہیں ہوئی ہمیں دیکھ کر؟'' واحد کی بیوی نے کمر پر ہاتھ جما کر پوچھا۔

اس نے سر ہلایا۔ اس کی تو ابھی سانسیں ہی بحال نہ ہوئی تھیں۔

''میں نے تو کئی بار کہا آپ کو کال کر کے بتا دیں مگر ان لوگوں کا سرپرائز خراب ہوتا تھا۔'' موحد کی بیوی نے پانی کا گلاس اس کی سمت بڑھایا۔

''کر دیتے کال...... میں تو یونہی بیٹھی ہوئی تھی۔'' اس کے منہ سے بچ نکلا۔

''کر دیتے مگر پھر آپ کی ایسی حیران صورت کیسے دیکھتے۔'' واحد اس کے برابر بیٹھ گیا اور بازو پھیلا کر اسے خود سے قریب کر لیا۔ وہ یک بیک جذباتی ہو گئی۔ اس نے لمبا سا سانس کھینچ کر اس کے وجود سے آتی مہک کو اندر اتارا...... کیسا تحفظ...... کیسی اپنائیت...... کیسا سکون رگ و پے میں اتر گیا تھا۔

''کھانا لگا دوں؟'' واحد کی بیوی نے کسی ویٹر کی طرح جھک کر سب سے پوچھا۔

''کھانا......'' اس کی آنکھیں پھیلیں۔ ''...... کھانا بھی بنا لیا۔''

''ہاں تو...... ڈھائی گھنٹے میں اور کیا کرتے۔'' اس نے ہاتھ نچایا۔

''ڈھائی گھنٹے......؟ اتنی دیر سے آئے ہوئے ہو؟''

''اور بھوکے ہیں بہنا!'' موحد نے مسکین صورت بنا کر پیٹ پر ہاتھ رکھا۔

''میں بس چینج کر لوں۔'' وہ اٹھنے لگی۔ واحد نے ہاتھ کھینچ کر بٹھا لیا۔

''شیروں نے بھی کبھی منہ دھویا ہے۔''

میز پر سجے کھانے دیکھ کر اس کی آنکھیں جھلملا سی گئیں۔ یخنی پلاؤ...... کباب، کھیر، مکس سبزی اسے اچھی طرح سے پتا چل رہا تھا۔ صرف پلاؤ یہاں آ کر

بنایا گیا ہے۔ باقی سب وہ اپنے ساتھ بنا کر لائے تھے۔ اور ایسا وہ سب ہمیشہ سے کرتے تھے۔

اس کے لیے کھانے بنا کر لاتے تھے اور کپڑے اور بہت سی چھوٹی چھوٹی چیزیں جنہیں خریدنا وہ برسوں پہلے فراموش کر چکی تھی۔

وہ شکریہ کے لیے الفاظ موزوں کرنے لگی۔ مگر اس کی زبان ہلنے سے پہلے ہی واحد نے ہاتھ جوڑ دیے۔

''یقین کرو آپی...... میں ان گھسے پٹے الفاظ کو نہیں سن سکتا۔ ویسے بھی نہ میں تمہیں روتا دیکھ سکتا ہوں اور نہ آنسو پونچھ سکتا ہوں۔ مجھے بہت بھوک لگی ہے یار!'' اس نے باقی سب کی سمت دیکھا۔

سب نے زور و شور سے تائید کی تو اسے دیکھنے لگا۔

اس نے دیکھا، سب منتظر تھے کہ وہ شروع کرے تو وہ بھی شروع ہوں۔ اس نے جلدی سے نوالہ منہ میں رکھا۔ ان چاروں نے مسکرا کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ اور اپنی پلیٹ قریب کر لی۔

''تم لوگوں کو تو کرسمس پر آنا تھا ناں؟'' کب سے مچلتا سوال لبوں پر آ گیا۔ وہ ابھی آ گئے تھے۔ دوبارہ کیسے آتے یعنی اسے کرسمس اکیلے گزارنا پڑتا۔ وہ دل گرفتہ ہوئی۔

''کرسمس پر بھی آ جائیں گے۔'' موحد نے واحد کو دیکھا۔

''تو پھر یہ میرا برتھ ڈے بھی نہیں ہے۔'' اسے ان کی اس سرپرائز آمد کی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

''آپ سے کس نے کہا ہم آپ سے ملنے آئے ہیں۔'' موحد کی بیوی نے مصنوعی بے نیازی سے کہا۔

''پھر کس سے؟'' وہ باری باری سب کی صورت دیکھنے لگی۔

''بوجھو تو جانیں۔''

اسے موحد کی شوخی عجیب لگی۔ وہ اٹھائیس، انتیس برس کا سمجھ دار آدمی تھا اور مزاجاً سنجیدہ تھا۔ وہ نفی میں سر ہلانے لگی۔

''اوہ چھوڑیں بھی ناں۔'' واحد کی بیوی کو اس کی پریشانی سے پریشانی ہوئی۔

''ہم سمیع بھائی سے ملنے آئے ہیں۔'' واحد نے بیوی کا جملہ مکمل کر دیا۔ اس کے لہجے میں خوشی اور جوش کا عنصر نمایاں تھا۔

''سمیع...... تمہارا مطلب...... مم، مو۔''

''جی ہاں موسیٰ بی...... لیکن ہمارے لیے تو وہ سمیع بھائی ہی ہیں۔'' واحد نے بچوں کے سے انداز میں کہا۔ جیسے وہ جوان مرد نہ ہو۔ بچہ ہو جو سمیع الدین سے بے حد متاثر ہو کر گھر آیا تھا۔

جس سے اس نے گٹار سکھانے کا وعدہ لیا تھا۔

اور جس کے بارے میں اس نے اپنے ہر کلاس فیلو کو روک روک کر بتایا تھا کہ وہ جو موسیٰ بی ہے ناں وہ اس کے سمیع بھائی ہیں۔ خدیجہ بانو کی سخت ہدایات تھیں ورنہ یہ بھی بتاتا میری آپی کے دولہا بنیں گے وہ......

مگر وہ دولہا نہیں بنا...... آپی نے منع کر دیا۔ نجانے کیا واقعہ تھا۔ ہاں گھر میں ایک سرد ماحول چھا گیا اور سمیع بھائی کی شادی کسی اور سے ہو گئی۔

''تمہیں اس سے ملنے کی کیا ضرورت ہے۔'' اس نے باری باری سب کی صورت دیکھی۔

''ضرورت مطلب آپی...... میں نے معجزے ہونے کے بارے میں سنا ہے۔ میں معجزے کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں۔'' اس نے دیکھا باقی سب بھی کھانا روک کر تائیدی انداز میں سر ہلا رہے تھے۔ ''کوئی ایسے بھی بدل سکتا ہے اور کیوں؟''

''اوہ......!'' اس نے لمبا سانس لیا۔ اس کی سمجھ میں اب بات آئی۔ اس نے اپنے دونوں بھائیوں کی صورتیں دیکھیں مغربی ملک میں...... مغربی لباس و انداز میں کانٹے چھری سے کھانا کھانے والے بھائیوں کے چہروں پر داڑھیاں تھیں۔ دونوں بھابیوں نے سردی کی مناسبت سے پینٹ کے ساتھ لانگ کوٹ پہن رکھے تھے اور سر اسکارف سے ڈھکے تھے۔

''یہ تو اتنا مایوس ہوا کہ ان کے ٹور میں ہمارا شہر شامل نہیں تھا۔ پھر ہم نے فوری فیصلہ کیا وہ نہیں آ رہے تو کیا؟ ہم چلے جاتے ہیں۔ اتنی مشکل سے چھٹی ملی ہے۔ اف......

''آپ بھی چلیے گا ناں ہمارے ساتھ۔'' واحد کی بیوی کا لہجہ پُرمسرت تھا۔

''آپ کو ملنا چاہیے آپی!'' موحد نے گہری نظر سے اسے دیکھا اور سب کے سر ہلنے لگے۔

''بھائی ٹھیک کہتا ہے۔ آپ سمیع الدین سے خاص طور پر نہ ملیں لیکن آپ کو باقی سب سے ملنا ہی چاہیے۔''

''اب تم تبلیغ کرو گے۔'' اس کا لہجہ تن گیا۔

''نہیں...... وہ تو مبلغ کرتے ہیں۔ میں تو صرف لفظی کوشش کر رہا ہوں اور کرتا رہوں گا۔'' وہ بے قوفی سے بولا۔

''جانتے ہوئے بھی کہ مجھ پر اثر نہیں ہو گا۔'' اس نے بھی صاف جواب دیا۔

''دادی کہتی تھیں مسلسل گرتا قطرہ بھی پتھر میں سوراخ کر دیتا ہے۔''

''مجھے دادی کے فرمودات مت سنانا...... وہ میں تم سے بہتر جانتی ہوں۔'' وہ کرسی کھسکا کر کھڑی ہو گئی۔

''زندگی ڈولتے ہوئے نہیں گزرتی آپی!'' واحد نے آواز لگائی۔

''تم سے کس نے کہا کہ میں ڈول رہی ہوں۔ میں قائم ہوں۔ یہ سب ڈھکوسلہ ہے۔'' اس کا اشارہ ان کے حلیوں کی طرف تھا۔ ''یہ سب فریب ہے جو ہم دوسروں کو دیتے ہیں اور خود کو دیتے ہیں۔''

وہ شروع ہوا چاہتی تھی۔ چاروں نے لب بھینچ لیے۔ وہ شروع کہاں سے کرتی تھی۔ سب جانتے تھے۔ وہ اختتام بھول جاتی تھی۔ سب جھیل چکے تھے۔

''آپ نہ جائیں۔ مگر اتنا بولیں بھی مت...... کافی ہے بس۔'' موحد نے سرخ آنکھوں سے اس کے سرخ چہرے کو دیکھا۔

☆☆☆

''موحد...... واحد......!'' موسیٰ نے متحیر لہجے میں دونوں کی سمت باری باری اشارہ کرتے ہوئے تصدیق چاہی۔ دونوں نے مسکراتے ہوئے سر اثبات میں ہلایا اور اگلے ہی لمحے موسیٰ فرطِ مسرت سے لبریز ہو کر اپنی نشست چھوڑ کر دونوں سے بغل گیر ہو گیا۔

''مجھے یقین نہیں آ رہا۔'' اس نے واحد کو شانوں سے تھام کر اس کے چہرے کو دیکھا۔ ہلکی داڑھی چمکتی آنکھیں مسکراتا چہرہ...... موسیٰ نے یاد دلایا۔

''کیا یہ وہی چھوٹا سا لڑکا ہے۔ جو مجھے شرما کر دیکھتا تھا اور جس نے ڈرتے ڈرتے گٹار سکھا دینے کی فرمائش کی تھی؟''

''ہاں' بچپن میں صحیح غلط کی پہچان نہیں ہوتی۔ مجھے شوق تھا گٹار کا۔'' اس نے سادہ الفاظ میں جواب دیا۔ موسیٰ کی مسکراہٹ پھیکی پڑ گئی۔

''ہمیں بہت شوق تھا آپ سے ملنے کا۔'' موحد رشک بھرے انداز سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ''ہمیشہ سے...... لیکن اب تو رہا نہیں گیا۔ اسی لیے چلے آئے۔''

موسیٰ حیران رہ گیا۔ وہ دوسرے شہر سے محض دو روز کی چھٹی لے کر اس سے ملنے آئے تھے؟ موحد نے تصحیح کی۔ ''صرف آپ سے نہیں...... سب سے۔'' اس نے موسیٰ کے ہمراہ آئے دوسرے علماء کا نام بہت عزت سے لیا۔ وہ بتا رہا تھا کہ وہ ہمیشہ سے انہیں فالو کرتے ہیں۔

نہ صرف ان کے لیکچرز اور تقاریر کو سننے جاتے ہیں بلکہ اپنے گھر میں بھی ایسی محافل اور درس کا انعقاد کرتے ہیں۔ جس میں نئی نسل کو بالخصوص نومسلم کو دین سیکھنے کو ملے۔ وہ اپنے مسائل کا حل پوچھ سکیں۔

اور اس سلسلے میں وہ بہت فعال تھے۔ موحد نے اپنے موبائل سے ان سب محافل کے کلپس دکھائے۔

دونوں بھائی شرمساری سے بتا رہے تھے کہ وہ بہت کچھ کرنا چاہتے ہیں مگر بڑے پیمانے پر کر نہیں پاتے۔ ویسے بھی یہاں مسلمانوں پر بہت سخت نگاہ رکھی جاتی ہے۔ سو اس تناظر میں وہ یہیں تک محدود ہیں۔

خود کو بہت کمتر سمجھتے ہوئے انہیں سنتا موسیٰ سخت دل گرفتہ ہوا۔ وہ اب تک کس دنیا کا باسی رہا تھا۔ کہاں بچا رہا تھا اور کیسے؟ اور یہ کہ سب کو صحیح راستے کی خبر تھی...... بس اسی کو...... اور وہ بھی اگر وہ نہ بھٹکتا نہیں

اس کے ساتھ وہ سب نہ ہوتا تو اسے تو پتا ہی نہ چلتا کہ وہ کیسی بے خبر اور بے ڈھب زندگی گزار رہا ہے۔

یکدم اس کی پژمردگی طمانیت میں بدل گئی۔

اس نے پہلی بار خود سے سوچا کہ کتنا اچھا ہوا تھا اس کے ساتھ...... جسے وہ بھٹکنا کہہ کر تڑپا تھا۔ وہ تو دراصل اس کا مل جانا تھا۔ اس نے خود کو پالیا تھا۔ اس نے پایا تھا کہ وہ کون ہے اور اسے کس لیے دنیا میں بھیجا گیا تھا۔

اسے ان دونوں پر رشک آنے لگا۔

ہاں خدیجہ بیگم کے پوتوں کو ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔

اسے ماریہ اور فیاض (منا) بھی پوری طرح سے یاد تھے۔ ماریہ سلیقے سے دوپٹے میں خود کو لپیٹے محتاط روی سے بات کرتی تھیں۔ فیاض کتنی فرماں برداری سے ماں سے بات کرتے تھے اور کتنی متانت اور لحاظ تھا اس خاندان میں...... جن سے وہ فقط دو بار ملا تھا۔ مگر ان دو ملاقاتوں نے گہرا نقش چھوڑا تھا۔

کہاں وہ شرمائے مودب نو عمر لڑکے...... اور کہاں یہ باریش نوجوان۔ موحد کے ماتھے پر سیاہ نشان تھا۔

موسیٰ کو یاد آیا۔ جب وہ ساری فیملی محی الدین سہگل کے ہاں مدعو تھی۔ تب اذان کی آواز پر خدیجہ بانو نے صرف آواز لگائی تھی۔ ''موحد، احد۔'' اور سر پر دوپٹے کو کستے ہوئے آنکھ سے اشارہ کیا تھا۔ دونوں منٹ میں اٹھ گئے تھے۔ موسیٰ نے دیکھا دونوں نماز ادا کر رہے تھے۔ موسیٰ نے دیکھا محی الدین سہگل کا سینہ فخر سے پھولا ہوا تھا۔ تب اس نے یہ ہی سمجھا تھا کہ وہ خوش ہیں۔ وہ راضی ہیں تو سب ٹھیک ہے۔

موسیٰ آج سوچ رہا تھا۔ ان نو عمر شریر لڑکوں کو ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ وہ حیران کیوں ہو رہا ہے۔ ہاں وہ اسے دیکھ کر جس حیرت کا اظہار کر رہے تھے۔ وہ جائز تھی۔ وہ اس کی گمشدگی کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ اسے مل جانے کی مبارک باد دے رہے تھے۔

''آپ واقعی مل گئے ہیں سر؟'' سادہ نقوش والی یہ واحد کی بیوی تھی۔

موسیٰ کو اس کی بات سمجھنے میں ذرا دقت نہ ہوئی۔

اس کا لباس گفتگو اور انداز بتا رہا تھا۔ وہ کس مزاج و عادات کی مالک ہے موسیٰ کی سمجھ میں یہ بھی آ گیا۔ اس کے جملے کا اصل مطلب کیا ہے۔ انسان خود کو ڈھونڈ لے اس سے بڑی مبارک کی بات اور کوئی نہیں ہوتی۔

مشرقی سلونے نقوش والی یہ لڑکی ایک قابل سونولوجسٹ تھی۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ کیا کرتی تھی۔ یہ اس کی گفتگو سے ظاہر تھا۔

موحد کی بیوی نے اسے حیران کیا۔ اس کے نقوش میں مغربیت واضح دکھائی دیتی تھی۔ نیلی آنکھیں، سفید رنگت...... وہ اسکارف اتار کر رکھ دیتی تو نسلی انگریز دکھائی دیتی۔ پکا تلفظ مگر جب اس نے زیادہ روانی و بلاغت سے دوران گفتگو ایک آیت پڑھی تو موسیٰ بھونچکا رہ گیا۔

موحد کی بیوی جو پیشے کے لحاظ سے ایک فائیو اسٹار ہوٹل کی منیجر تھی۔ مگر یہاں آنے کا مقصد...... وہ سورۃ النساء پر ایک تحقیقی مضمون لکھ رہی تھی۔ اس نے اپنے نوٹس سے مولانا اظہر...... کو آگاہ کیا۔ تب ان کی آنکھوں کی ستائش کسی سے ڈھکی چھپی نہ رہی۔

تو موحد اور احد کی بیویاں ایسی ہی ہونی چاہیے تھیں۔ ایک تصویر کے دو رخ' جیسے اسے ہنی یاد آ گئی۔ کچھ عرصہ پہلے موسیٰ اور ہنی کے لیے بھی لوگ ایسی ہی مثالیں دیا کرتے تھے۔ مگر اب...... اس نے سر جھکا تو یعنی ایک مسلم وومن کو ایسا ہونا چاہیے (موحد کی بیوی نے باتوں باتوں میں کافی کا جھاگ موحد کی ناک پر نقطے کی صورت لگا دیا تھا۔

موحد نے سب کی موجودگی کے خیال سے خائف ہو کر اسے گھورا تو وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

کچھ دیر بعد موسیٰ نے دیکھا' وہ مولانا اظہر...... کے روبرو نوٹ بک کھولے بیٹھی تھی۔ سورۃ النساء کی کسی آیت کو حساب کے سوال کی طرح کھول کھول کر رکھ دیا تھا اور حل کروانا چاہتی تھی۔ دلیل سنتی تھی کسی مودب شاگرد کی طرح، دلیل دیتی تھی' کسی فقیہہ کی طرح......

تو اسے کہتے ہیں دین اور دنیا کو ساتھ لے کر چلنا۔ اس کے دل میں شدت سے خواہش ابھری کہ کاش وہ یہ منظر ہنی کو دکھا دے' سمجھا دے۔

مولانا اظہر اور مولانا اسد سے ان سب کا پہلے سے تعارف تھا۔ مولانا صاحب ان کی کوششوں کو سراہ رہے تھے۔ موسیٰ سے تعلق داری نکل آنے پر انہیں خصوصی عزت بخشی گئی۔

''مہرو نہیں آئی تم لوگوں کے ساتھ؟'' اس نے ان چاروں کو ڈنر تک روک لیا تھا۔

''مہرو......؟'' موحد اور احد۔ فاطمہ اور انعم دونوں نے ایک دوسرے کو چونک کر دیکھا جیسے وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں جواب ڈھونڈنے لگے۔

''وہ اس طرح کی جگہوں پر نہیں آتیں۔'' موحد نے صاف آواز سے کہا۔

''اس طرح کی جگہ مطلب؟'' موسیٰ نے دہرایا۔

''ایسی دینی نشست...... دراصل۔'' اس نے سب کو دیکھا پھر موسیٰ کو...... واحد نے نظریں پھیری تھیں۔ ''وہ کہتی ہیں' مذہب کچھ نہیں ہوتا بس انسانیت ہونی چاہیے۔''

''کیا......؟'' وہ سب کی صورتیں دیکھنے لگا۔

سحر آمیز جملہ...... زہر آمیز جملہ اور قہر آمیز جملہ...... تو ایک جملے میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ وہ پیروں سے زمین کھینچ لے یا سر سے آسمان...... بے یقینی سی بے یقینی صدمہ سا صدمہ سننے والے پر قیامت ٹوٹی تھی۔ تو کہنے والے کو بھی گویائی سلب ہونے کا احساس ہو رہا تھا۔

☆☆☆

سامنے کھڑے سمیع الدین کو دیکھ کر اس نے اپنی جذباتیت اور حلیہ باز فطرت کو ایک بار پھر کوسا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

''اندر آنے کو نہیں کہو گی۔''

اس نے سائیڈ پر ہو کر اسے اندر آنے کا راستہ دے دیا۔ جواب بہت تسلی سے صوفے پر ٹک کر اسے دروازے پر جما دیکھ رہا تھا۔ وہ ٹھنڈا سانس بھرتی اندر آ گئی۔ دستک سے پہلے وہ اپنے لیے کافی پھینٹ رہی تھی۔ اس نے دوبارہ وہی کام شروع کر دیا۔ جیسے اس کے آنے سے کوئی فرق نہ پڑا ہو۔ وہ پہلے کی طرح گھر میں اکیلی ہی ہو۔

مگر کپ میں چلتا چمچ...... وہ اتنی تیزی سے چل رہا تھا۔ کہ کپ ٹوٹنے کا گمان ہونے لگا۔

اس کی کافی تیار ہو گئی تھی۔ وہ کپ لیے اس کے عین سامنے آ کر صوفے پر ٹک گئی اور دونوں ہاتھوں سے کپ کو تھامے کافی کے گھونٹ بھرنے لگی۔ جیسے وہ تنہا تھی۔

''اکیلی رہتی ہو؟'' اسے کچھ تو بولنا تھا۔

اس نے تیکھے چتون سے اسے دیکھا۔ ''کوئی دوسرا دکھائی دے رہا ہے۔''

''کافی میں شکر نہیں ہے کیا؟'' وہ مسکرا کر پوچھ رہا تھا۔ وہ اس سوال کا مطلب سمجھ کر منہ پھیر گئی۔ وہ اس کے لہجے اور چہرے کی تلخی کو جتا رہا تھا۔

''منہ میں شکر بھر لینے سے کیا زندگی کی تلخی کم ہو جاتی ہے۔ ایسا ہوتا تو ساری دنیا شیرے کے ڈرم میں جا بیٹھتی۔''

منہ پر ہاتھ رکھے بغیر بھی مقابل کا منہ بند کر دینا اسی کو کہتے ہوں گے۔

یہ ان دونوں کی تیسری ملاقات تھی۔ تینوں ملاقاتوں میں اس کے چہرے پر افسردگی و تنفر کا ملا جلا تاثر تھا۔ مگر موسیٰ کو بخوبی اندازہ تھا اگر وہ مسکرائے گی تو کیسی دکھائی دے۔ اس نے میکی کو ہمیشہ ہنستا مسکراتا دیکھا تھا۔ وہ دونوں بے حد مشابہت رکھتی تھیں۔

''ہاں میکی؟'' اسے یک دم یاد آیا۔

''میکی......؟'' اس کے منہ سے نکلا۔ اس کا جھکا سر جھٹکے سے اٹھا۔

''مجھے میکی کے لیے بہت افسوس ہے۔ میں آنا چاہتا تھا مگر۔'' اس نے بہت سوچ کر جملے کا انتخاب کیا۔ مگر افسوس اس نے غلط انتخاب کیا۔ اس کے بے تاثر چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ آن ٹھہری۔

''آ نہیں سکا۔ ہے ناں...... یہی کہنا تھا ناں؟

”میں سمجھ سکتی ہوں۔ آپ کو بھی منع کر دیا گیا ہوگا۔ آپ کے ڈیئر وشرز نے ......لائک یور گرینڈ فادر نے کیا نام تھا محی الدین سہگل نے کہ تم جاؤ گے تو دنیا باتیں کرے گی۔ جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ ایسی چیزیں بہت زیادہ نوٹس میں آ جاتی ہیں۔ اینڈ بلا بلا بلا......“

”ایسا نہیں ہے مہرو......“ وہ کتنی دیر بعد بول سکا۔ جو اس نے ایک سانس میں قیافہ لگایا تھا۔ وہ ایسے درست تھا جیسے محی الدین سہگل نے اس کی موجودگی میں ہی کہا ہو۔

”ایسا ہی ہے سمیع الدین صاحب!“ اس نے انداز نشست اب بدلا۔ وہ پوری طرح متوجہ ہو گئی تھی۔ ”آپ کو کسی نے یہ نہیں بتایا کہ پرسہ دینے کا بھی ایک وقت ہوتا ہے۔ آپ پندرہ برس بعد آ کر بتائیں گے کہ آپ کو میری بہن کے مرنے کا بہت دکھ ہوا۔ یہ تو پرانے زخم کو نوچ لینے جیسی بات ہو گی۔ میں آپ کو اتنا شقی القلب نہیں سمجھتی تھی۔“ اس کی آنکھیں لبریز ہو گئیں اور چہرہ متبسم ہو گیا۔

”کیوں آئے ہیں آپ یہاں ......؟“ اس نے جارحیت سے گردن کو جھٹکا دے کر کہا۔

”یقین کیجیے ہم سب سیٹل ہو چکے ہیں۔ یقین کیجیے اب تو بھولے سے بھی یاد نہیں آتا کہ کوئی میکی بھی تھی۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔ ”ہم تین نہیں چار تھے۔“

”آئی ایم سوری۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے برابر آن بیٹھا۔

”سوری......!“ وہ چیخی تھی۔ ”سوری فار واٹ؟ نفرت ہے مجھے اس لفظ سے......کسی کی جان چلی جائے اور سوری۔“

وہ حیران رہ گیا۔ ”مہرو پلیز......“

وہ ہذیانی انداز میں چلانے لگی تھی۔ اس نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے شانت کرنا چاہا۔ مگر اس نے جھٹکے سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ وہ اس کے سر پر کھڑی ہو گئی۔ اس کا انداز جواب طلبی کا سا تھا۔

”نفرت ہے مجھے اس لفظ سے، مجھ سے بھی سوری مت کرنا۔“ وہ اپنے گالوں کو پونچھتے ہوئے دھپ سے اس کے مقابل بیٹھ گئی۔

”بعض غلطیوں کا سوری نہیں ہو سکتا۔ آج تم سوری کرنے آئے ہو۔ کل ماما نے سوری کر لیا۔ نہ ادھر رکھا نہ ادھر کا......دادی نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ مجھے معاف کر دو مہرو......پاپا نے گردن جھکا لی تھی۔“

اس کی لبریز آنکھیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ مگر پندرہ برس بعد نظر آنے والا یہ شخص وہ تھا جس کی صورت پر نگاہ پڑنے پر بہت سی صورتیں یاد آ گئی تھیں۔

”ذیشان نے سوری کر لیا۔ میں امی ابو کے خلاف نہیں جا سکتا مہرو۔“

اور میکی کے ڈاکٹر نے آپریشن تھیٹر سے آ کر میکی کے لیے سوری کر لیا۔ کس نے بنایا ہے یہ لفظ......؟

اس نے سمیع الدین کے جھکے ہوئے ہاتھ کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ اور لایعنی جملے بول رہی تھی۔ جن کا اک حرف سمجھ نہیں آتا تھا۔ وہ ششدر تھا۔

اس نے اس کی سمت گلاس بڑھایا۔ ہونٹوں سے لگایا۔

”میں تمہیں سننا چاہتا ہوں مہرو......!“ وہ پچکار رہا تھا۔

اس نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ کیا سننا چاہتا تھا۔

اس نے خود کو کمزور پڑتے دیکھا وہ اس کیفیت سے نکلنا چاہتی تھی۔

وہ نجانے کیا پوچھ رہا تھا۔ اس پر انکشاف ہوا کہ وہ تو خود ایسے کسی پل کے انتظار میں تھی جب اس سے پوچھا جائے۔ اس سے کہا جائے کہ مہرو......دہراؤ زندگی کو ......کیسی گزری کیا کیا ہوا' وہ بھی جو نہیں ہوا......اور جو ہونا چاہیے تھا اور جو نہیں ہونا چاہیے تھا مگر ہوا......بولو مہرو......میری اے ماورد فیاض۔“

کوئی اسے اندر سے پکار رہا تھا جیسے غلام گردشوں میں آوازیں ٹکراتی ہیں۔

☆☆☆

”مہرو......میری......اے سنتی کیوں نہیں، بولتی کیوں نہیں مہرو؟“

”آٹھ سالہ مہرو نے اچنبھے سے خدیجہ بانو کی صورت دیکھی۔ وہ اسے تیار ہونے کا کہہ رہی تھیں۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ وہ اپنی ماں سے اس کے ساتھ نانا کے گھر جانے کی ضد کرے۔

”ماما منع کر دیں گی کہ آپ اجازت نہیں دیں گی۔“

مہرو کی یادداشت غضب کی تھی۔ اسے بخوبی یاد تھا۔ کچھ عرصہ پہلے ہی کی بات تھی۔ جب وہ چاروں ماریہ کے ہمراہ گاڑی میں بیٹھ کر نانا کے گھر جانے کو نکل رہے تھے۔ اور خدیجہ بانو پیچھے سے پکارتی آئی تھیں اور بہت جارحانہ انداز سے گاڑی کا شیشہ بجاتے ہوئے وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی ماریہ سے کچھ کہہ رہی تھیں۔

ماریہ نے ہاتھ بڑھا کر شیشہ نیچے کیا۔

”جی امی......!“

خدیجہ بانو نے جواب نہیں دیا۔ ہاتھ اندر کر کے دروازہ کھولا اور میکی اور میری کو ایک ہی جست میں باہر کھینچ لیا۔

”یہ تمہارے ساتھ نہیں جائیں گی۔“

”امی! یہ ابھی آپ کی اجازت سے ہی آپ کے سامنے نکلی ہیں۔“

”ہاں لیکن اب میری اجازت نہیں ہے۔“

ماریہ کا رنگ سفید پڑ گیا۔ مہرو کا چہرہ بھی اتر گیا۔ وہ صرف امی کو نانا کے گھر جاتا دیکھتی تھی اور آج جب جانے کا موقع ملا کتنی پرجوش تھی وہ......

دوسری طرف میکی ......اس نے ایک پل میں پچویشن کو جانچا تھا۔ اور احتجاجاً اچھلنا شروع کر دیا کہ اسے جانا ہے۔ خدیجہ بانو نے اس کا بازو سختی سے پکڑا اور آنکھ کے اشارے سے ماریہ کو جانے کی اجازت دے دی۔

ماریہ نے ایک نظر میکی پر ڈالی......ایک میری پر......اور ٹھنڈا سانس لے کر ایکسیلیٹر پر دباؤ بڑھا دیا۔

میکی کی کمر میں دھموکا جڑ کے اسے اندر لے جا کر اوپر والی چٹخنی چڑھا دینا' خدیجہ بانو کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ میری بے آواز ان کے پیچھے ہی تھی۔ یہ بات وہ پیچھے مڑے بغیر بھی جانتی تھیں۔ اور پھر میری نے کبھی ضد نہیں کی اور میکی نے ہر بار ”مجھے بھی جانا ہے۔“ کی فرمائش پر ڈانٹ یا ایک آدھ تھپڑ کھا لیا۔

تو وہی خدیجہ بانو آج مہرو سے کہہ رہی تھیں کہ وہ اپنے نانا نانی کے گھر جانے کی ضد کرے اور یہ کہ ماریہ کو یہ پتا نہ چلے کہ یہ دراصل خدیجہ بانو کی ہدایت ہے۔

اور پھر مہرو......

اس نے انگلیوں کی پوروں پر گنتی کی......

اتنے بہت سارے رشتے ......نانا، نانی ...... بڑی نانی......دو ماموں، ایک مامی، یوحنا اور ایلس اور فاری خالہ ان کی بیٹی ٹینا......اور اتنا خوب صورت اتنا بڑا سارا گھر اور اتنا بہت زیادہ پیار کرنے والے لوگ انہیں وی آئی پی پروٹوکول ملتا......

سب سے زیادہ پیار نانا کرتے تھے۔ پہلی ملاقات میں وہ کتنی دیر انہیں خود سے لگائے بے آواز آنسو بہاتے رہے۔

اور نانی زیادہ بات نہیں کرتی تھیں۔ ہاں میٹھی نظروں سے دیکھتی تھیں۔ ہاں اس مٹھاس میں کبھی کبھی کھٹاس محسوس ہوتی۔ ان کا چہرہ بجھ سا جاتا' پتا نہیں کیوں؟“

فاری خالہ کا تناؤ برقرار رہا......وہ اجنبی نگاہوں سے ان سب کو دیکھا کرتیں۔ یا پھر اپنے کمرے میں بند ہو جاتیں۔

”وہ ٹینا کو ہمارے ساتھ کیوں کھیلنے نہیں دیتیں؟“ اس نے سوال کیا۔

ماریہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس اس کا ہاتھ تھپتھپا کر خاموشی کی تلقین کر دی۔

پہلی دوسری......تیسری ملاقات وہ ڈھونڈ کر بھی کھوج نہ لگا سکی کہ آخر دادی کو ماما کے ادھر آنے پر کیا اعتراض تھا۔ ہر ویک اینڈ پر ان کے گھر کا ماحول سخت تناؤ کا شکار ہو جاتا تھا۔

ماریہ کی خاص بات یہ تھی کہ وہ بہت سکون سے اپنے کام سرانجام دیتی۔ خدیجہ بانو کے منہ سے جیسے بھی جملے نکلیں' اس نے جیسے جواب نہ دینے کی قسم کھا

رکھی تھی۔ وہ لاکھ اکساتے جملے بول دیتیں۔ ماریہ چکنا گھڑا ثابت ہوئی۔

خدیجہ بانو اس وقت کو کوستیں جب وہ جذبات میں بہہ گئیں اور ایک غلط فیصلہ کر بیٹھیں...... ماریہ چپ۔

اس کے والدین کے بارے میں جو جی میں آتا کہہ دیتیں...... ماریہ چپ۔

وہ بیماری کا بہانہ بھی کرتیں...... بے سود۔

یہاں منا آڑے آجاتا۔

''تم جاؤ ماریہ! میں ہوں امی کے پاس......'' اور ماریہ بہ آواز بلند باادب انداز سے خدا حافظ کہتی غائب۔

مہرو دیکھتی' پیچھے سے دادی اور پاپا لڑتے ...... بلکہ لڑتا بھی کیا ...... دادی بولتیں۔ پاپا چپ رہتے۔ نہ تردید کرتے نہ تنقید ...... جو آپ کہہ رہی ہیں وہ درست ...... بالکل بجا فرمایا۔

''ہاں ان دونوں کو دیکھ کر تادیب کر دیتے۔'' امی ا بچیوں کے سامنے نہیں۔''

اور خدیجہ بانو دم سادھ لیتیں۔ ایک آدھ بار وہ منہ پر دوپٹا رکھ کر رونے بھی لگیں۔

مہرو نے جو نانا کے گھر میری تھی۔ دادی کی تنقیدی نگاہ کے تناظر میں نانا کو اور نانا کے گھر کو دیکھنا شروع کر دیا...... پر یہاں بھی اسے کچھ نہ ملا۔

وہ سب بہت محبت کرتے تھے ان سب سے...... اس نے گول مول' مبہم انداز میں اپنی ہی جیسی ننھی منی کلاس فیلو سے دادی کی ناپسندیدگی کا ذکر کر دیا۔ دوست کے لیے یہ بات کوئی بات ہی نہ تھی۔

''میری دادی بھی ہم سب لوگوں کا نانی کے گھر آنا جانا کچھ خاص پسند نہیں کرتیں۔ مگر میری ممی کہتی ہیں۔ وہ کیا اب دادی کی ناپسند ہونے پر اپنے پیرنٹس کو چھوڑ دیں گی۔''

''میری ممی پاپا نے لو میرج کی ہے ناں...... دادی کو یہ بات پسند نہیں۔ ان فیکٹ میری دادی میری نانی کو...... اور نانی دادی کو چڑیل پلس ڈائن اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ کہتی ہیں۔ کیا تمہاری دادی بھی تمہاری نانی کو ایسے کہتی ہیں۔''

معصوم تبصرہ...... معصوم سوال۔

''اچھا چھوڑو ہمیں کیا' جو کہتا ہے وہی ہوتا ہے...... ہے ناں؟''

وہ قصہ نبٹا کر بھول بھال گئی۔ مہرو کی سوئی نکل گئی۔ ہاں لو میرج تو اس کے ممی پاپا کی بھی تھی۔

''تو کیا یہ بہت بڑا گناہ ہوتا ہے؟'' اس نے اسی عالم فاضل دوست سے رجوع کیا۔

''آئی تھنک یس...... دادی کہتی ہیں، یہ کٹنیوں کا کام ہوتا ہے۔''

''ہی ہی ہی۔'' ساتھ ہی سہیلی نے اپنی دادی کے فرمودات سنانے شروع کر دیے۔ حرف حرف کو بغور سنتی مہرو کا سر نفی میں ہلنے لگا۔ نہیں اس کی دادی تو ایسی باتیں نہیں کرتیں۔ وہ تو عجیب ہی طرح کی باتیں کرتی تھیں۔

دادی پسند نہیں کرتی تھیں۔ بچے وہاں جا کر کھانا کھائیں۔ مہرو نے دیکھا اس کی نانی اور فاری خالہ' ماما سے بھی زیادہ ذائقہ بخش اور صحت بخش کھانا بنایا کرتیں پھر دادی کیوں...... انہیں تاکید کرتی تھیں کہ گھر سے کھا کر جاؤ۔

''وہاں سے پانی بھی مت پینا۔'' اور یہ بات وہ جانتی بھی تھیں کہ یہ عملی طور پر ناممکن ہے۔ پھر بھی ہر دفعہ کی بحث۔

اور دادی نے جب بھی مہرو کے ننھیال والوں کا ذکر کیا۔ وہ جمع کا لفظ استعمال کرتی تھیں۔ ہم لوگ ...... تم لوگ۔

مہرو سوچتی آخر کون لوگ۔

اور پھر جب دادی کو اتنے اعتراضات تھے تو انہیں جانے ہی نہ دیتیں۔

پہلے روکے رکھا...... پھر جانے دیا۔

میکی لاپرواہ اور لاابالی تھی۔ اپنے حال میں خوش، مست الست۔ جبکہ مہرو حساس تھی۔ اسے باریک بینی سے جائزہ لینے کی عادت تھی۔ اس کی قوت مشاہدہ تیز تھی۔ اور پھر اس نے پتا لگا لیا۔

دراصل انہیں ہمراہ کرنے میں خدیجہ بانو کا مقصد تھا۔ وہ جاننا چاہتی تھیں۔ ماریہ وہاں جا کر کیا

کرتی ہے۔ وہ سب کیا کرتے ہیں۔

''میکی سارے گھر میں کھیلتی ہے۔ اس کی یوحنا اور ایلس سے بہت دوستی ہو گئی ہے۔

واحد اور موحد ...... تو بس لان میں ہی رہتے ہیں۔ نانا کے پاس طوطے ہیں' خرگوش کبوتر، رنگین چڑیاں اور فش ایکوریم بھی ہے۔''

''اور ماریہ۔'' خدیجہ بانو کے لہجے کی عجلت عیاں تھی۔

''ماما......!'' اسے ذہن پر زیادہ زور نہ دینا پڑا کیونکہ ماریہ کچھ بھی نہیں کرتی تھی۔

وہ جہاں ایک بار بیٹھ جاتیں۔ دس گھنٹے گزرنے کے بعد بھی وہیں براجمان ہوتیں۔ زیادہ بات چیت بھی نہیں کرتی تھیں۔ ہاں نانا کی صحت کے حوالے سے فکرمندی عیاں ہوتی رہتی۔

فزیوتھراپسٹ کی بتائی ایکسرسائز کرواتیں۔ (مگر رویہ بہت محتاط ہوتا۔)

''بس......'' خدیجہ بانو کی تشفی نہ ہوتی۔

''ہاں بس......!''

''اور باقی لوگ کیا کرتے ہیں۔ گھر میں کون کون ہے۔''

''سب اپنے اپنے کام کرتے ہیں دادی۔ مامی چاکلیٹ دیتی ہیں۔ ماموں بروسٹ لاتے ہیں۔ جوس بھی...... ڈیڈ یو آئس کریم کھلاتے ہیں۔ ہاں بس فاری خالہ ہم سے بات نہیں کرتیں۔ ماما کہہ رہی تھیں۔ وہ ہیں ہی ایسی...... لیکن وہ ایسی نہیں ہیں۔ یوحنا اور ایلس کی بہت اچھی آنٹی ہیں۔ لینا کے ساتھ ڈول ہاؤس سے کھیلتی ہیں۔ مگر ہم سے نہیں' مجھے لگتا ہے، فاری آنٹی ٹینا کو منع کرتی ہیں۔ ہمارے ساتھ کھیلنے سے''مہرو کے معصوم چہرے پر دکھ آمیز الجھن تیرنے لگی۔

خدیجہ بانو تن فن کرتی ماریہ کے سر پر پہنچی تھیں۔

''ہاں بھئی یہ تمہاری بہن کو کس چیز کا نخرہ ہے؟''

وہ کمر پر ہاتھ جمائے کھڑی تھیں۔

''میری بہن کو...... یہ کس نے کہا؟''

''کس نے کہنا ہے وہ مہرو وغیرہ سے سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتی۔ گھورتی ہے اور اپنی لڑکی کو ان سب کے ساتھ کھیلنے سے منع کرتی ہے۔ میں کہتی ہوں ایسے کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں اس کی لڑکی میں۔''

''اوہ......؟'' ایک منٹ میں ماریہ کی سمجھ میں سب آ گیا وہ کچن سمیٹ رہی تھی۔ خدیجہ بانو جواب کی منتظر تھیں اور وہ ساکت کھڑی تھی۔ پھر اس نے ٹھنڈا سا سانس بھرا اور خدیجہ بانو کو نظرانداز کر کے دوبارہ سے سلیب پر کپڑا پھیرنا شروع کر دیا۔

خدیجہ بانو کو سخت ہتک کا احساس ہوا۔ طیش میں گھر کر اس کے ہاتھ سے کپڑا جھپٹ لیا۔ ''میں تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں اور تم......''

''میں کسی دوسرے کے عمل کی توجیہہ کیسے پیش کر سکتی ہوں؟'' یعنی اس نے ہری جھنڈی دکھائی۔

''تو ٹھیک ہے پھر میرے بچے نہیں جائیں گے ادھر۔''

''اس کے لیے تو آپ بہانے ڈھونڈتی ہیں۔'' نہ چاہنے کے باوجود اس کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔

خدیجہ بانو تن فن کرتی منے کے سامنے پہنچیں۔ ایک کی چار لگائیں۔ وہ باز پرس کو کھڑا ہو گیا۔

''وہ نہیں چاہتی کہ ہمارے بچے اس کی بیٹی کے ساتھ گھلیں ملیں۔''

''کیا مطلب؟'' منے کی تیوری چڑھ گئی۔

خدیجہ بانو کے نتھنے پھڑکنے لگے۔

''وہ کہتی ہے میں نہیں چاہتی کہ میری بیٹی تمہارے بچوں کے ساتھ گھلے ملے اور ان کے اثرات قبول کرے۔ مجھے اس کے مذہب کی فکر ہے۔ تمہاری ساس کو اور تمہیں تمہارا مذہب پیارا ہے۔ تو مجھے اپنی چیزوں سے پیار ہے۔ تمہاری ساس نے انہیں ہمارے برتنوں میں کھانا کھانے سے منع کیا ہے تو میں بھی نہیں چاہتی کہ میری بچی تمہارے بچوں کے ساتھ کھانا کھائے۔''

خدیجہ بانو جیسے جلتے توے پر کھڑی ہو گئیں۔ وہ چھت تک اچھل رہی تھیں۔ ''اقدار روایات ...... ہے کیا اس کی اوقات...... چوڑی نہ ہو تو۔ آئی بڑی

مذہب والی...... چار حرف پڑھ گئی اور چار پیسے ہاتھ آ گئے تو عزت مآب ہو گئی۔

"امی......!" جھٹک کے شدید احساس نے ماریہ کو دھپ سے صوفے پر گرا دیا۔ "چپ ہو جایئے۔"

"کیوں سچ سن کر آگ لگ گئی۔ چار حرف انگریزی کے آ گئے تو۔"

"تم کان کھول کر سن لو منّے! میرا کوئی بچہ وہاں نہیں جائے گا۔"

"آپ کان کھول کر سن لیں فیاض......! میں نہیں رکوں گی۔"

خدیجہ بانو ہکا بکا رہ گئیں۔ وہ کبھی اس طرح سینہ تان کر مقابلے پر نہیں اتری تھی۔ پھر جو گھمسان کا رن پڑا تو...... پسپائی کے لیے کوئی تیار نہ تھا۔

اور خاموشی سے سنتی مہرو۔

نانا، نانی اتنے خراب تھے پہلے...... اس کا دل ماننے کو تیار نہ تھا۔

ان کی بک شیلف میں سجی نایاب انگلش کتب...... ان کا لاجواب برٹش تلفظ...... ان کی اردو بھی بہت اچھی تھی۔ خاموش نانی یا تو کوکنگ کرتی تھیں یا کتابیں پڑھتی تھیں۔

نہیں...... ضرور دادی کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ لیکن وہ بحث کو بھلائے پھر اسی سوال پہ آ رکی۔ وہ کون سا فرق تھا۔ جس کا ذکر دادی کرتی تھیں۔

وہ کون سی برتری تھی جو ان سب کو تو حاصل تھی مگر نانا کو حاصل نہیں تھی۔

☆☆☆

اور ایک بار پھر اس نے ہر چیز کو سب ٹھیک ہونے کا کلیئرنس دے دیا۔ نو برس کی بچی آخر کتنی عمیق نگاہی کا مظاہرہ کر سکتی تھی۔

اس کی سمجھ میں لو میرج کا مطلب آ گیا تھا۔ اس نے اس موضوع پر ایک فلم بھی دیکھ لی۔ بیٹے نے اپنی پسند سے شادی کر لی تھی۔ ساس نے ساری زندگی اس جرم کو معاف نہ کیا۔

ہاں یہی ہوا ہو گا یقیناً...... وہ مطمئن ہو گئی۔ لیکن ایک روز......

یوحنا کو سائیکل سے کرتب دکھانے میں ایسی مہارت تھی جیسے وہ سرکس میں کام کرتا ہو۔ سب سے زیادہ خوش وہ تب ہوتا تھا۔ جب اگلا ٹائر اور دونوں ہاتھ ہوا میں اٹھا کر تالی پیٹتے ہوئے ان کے پاس سے گزرتا۔

لیکن اس روز وہ گر گیا۔ سائیکل دور پڑی خود بخود گھوم رہی تھی اور منہ کے بل گرے یوحنا کا سر پھٹ گیا تھا۔ پہلے اس کی چیخوں نے سب کو دہلایا...... اور پھر بری طرح تڑپتے ہوئے وہ بے ہوش ہو گیا۔

مامی نہا رہی تھیں۔ ان کے باہر آنے تک ماموں اسے ہاسپٹل لے کر چلے گئے تھے۔ مامی نے چیخیں سنی تھیں اور فرش پر پڑے خون کی ڈھیری کو دیکھا تھا۔ انہیں غش پڑنے لگے۔ وہ کسی سے سنبھالی نہیں جا رہی تھیں۔ نانی مسلسل آنسو بہاتے ہوئے زیر لب کچھ پڑھ رہی تھیں۔ ماریہ نے دونوں ہاتھوں سے منہ کو ڈھانپ رکھا تھا۔

وہ بھی دعا گو تھی۔

مامی رو رو کر تھک گئیں۔ سب انہیں چپ ہونے اور دعا کی تلقین کا کہہ رہے تھے۔

"مت روئیں مامی!" اس نے بری طرح روتے ہوئے اپنے چھوٹے ہاتھوں سے ان کے آنسو پونچھے۔

"اوہ میری......!" مامی نے اس کا ہاتھ تھام کر بوسہ لیا۔ "تم دُعا کرو بچوں کی دعا قبول ہوتی ہے۔" ان کا انداز منت بھرا تھا۔

انہوں نے باقی بچوں کو بھی دیکھا۔ موحد اور واحد نے فوراً دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔

مہرو نے زور سے سر ہلایا۔ "میں کر رہی ہوں جب سے کر رہی ہوں۔ دادی کہتی ہیں۔ سورۃ فاتحہ بہت ساری پڑھنی چاہیے اور سورۃ یٰسین بھی...... مصیبت ٹل جاتی ہے۔ ان شاء اللہ یوحنا ٹھیک ہو کر آ جائے گا۔ دیکھیے گا آپ...... بلکہ آپ ایسا کریں دو نفل پڑھ لیں۔ جب ہمیں بخار ہوتا ہے تو دادی ایسے ہی کرتی ہیں۔ بخار اتر جاتا ہے۔ ہے ناں ماما؟" اس نے ماریہ سے تصدیق چاہی۔

ماریہ کے چہرے پر عجیب تاثر تھا تو وہ اسے

خاموش رہنے کا اشارہ کر رہی تھیں۔ اس نے ناسمجھی کے عالم میں سر جھکا اور تب ہی نگاہ سب سے دور اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھی بڑی نانی پر پڑ گئی۔ جنہوں نے گلے میں پڑی چین میں موجود صلیب کو چوما تھا۔ آنکھوں سے لگایا تھا۔

اور پھر انہوں نے سینے پر کراس کا نشان بنایا۔

ان کی دیکھا دیکھی...... ایلس اور ٹینا...... پھر فاریہ خالہ نے بھی اسی عمل کو دہرایا۔ مہرو بھونچکا رہ گئی۔ فاریہ اسے جتاتی نفرت آمیز نظر سے دیکھ رہی تھی۔

اس نے نانا نانی کو دیکھا۔ نانا کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ بے آواز رو رہے تھے۔ نانی کی دبی دبی سسکیاں ہنوز تھیں۔

اس نے سرعت سے ماریہ کو دیکھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔

اس نے موحد واحد کو دیکھا۔ ان کے ہاتھ دعا کے لیے اٹھے ہوئے تھے۔ اور وہ ہونقوں کی طرح سب کو دیکھ رہے تھے۔

"اوہ جیزس......" بڑی نانی کی مدد طلب منت بھری نگاہیں چھت تک اٹھ کر جھک گئیں۔

تو...... تو یہ تھا وہ فرق، اوہ خدا سب کچھ کھلی کتاب کی طرح سامنے آ گیا۔

خدیجہ بانو نے واشگاف الفاظ میں نہ کہا، مگر سب پر نگاہ رکھنے کی ذمہ داری مہرو کو سونپ رکھی تھی۔

وہ ہر بار ننھیال سے واپسی پر غیر محسوس طریقے سے گزارے ہوئے ایک ایک پل کا حساب لے لیتی تھیں۔ یہاں تک کہ......

مہرو ان کے ساتھ لپٹ کر سوتے ہوئے، چوٹیاں بنواتے ہوئے، ان کے سر میں تیل ڈالتے ہوئے شروع ہو جاتی۔

اسے اس چیز کا بھی اندازہ نہیں تھا کہ بعد میں اسی تفصیل سے میں رائی اٹھا کر دادی ماریہ کے سامنے پہاڑ کھڑا کر دیا کرتی تھیں۔

لیکن یہاں خدیجہ بانو سے چوک ہو گئی۔

کاش وہ کسی سے کہہ کر مہرو پر بھی نظر رکھوا لیتیں۔

اور مہرو...... اس نے تھوڑے ہی عرصے میں بائبل کی کتنی ہی جلدیں پڑھ ڈالیں۔

مہرو کو خدیجہ بانو کے منہ سے کی گئی کوئی برائی ننھیال والوں میں نظر نہیں آتی تھی۔

وہ سب بہت بااخلاق تھے۔ مہرو کو دادی سے بے پناہ محبت تھی، مگر اس کا پلڑا ننھیال کی طرف بھی جھکا رہتا تھا۔ ہاں یہ تھا کہ اس نے برملا اظہار نہ کیا۔ (جیسے میکی کر لیتی تھی۔)

اس کا دل چاہتا، وہ اس چیز کو خدیجہ بانو سے ڈسکس کرے، لیکن وہ جانتی تھی، وہ بھڑک اٹھیں گی۔

لیکن بات اسے کرنی تھی۔ اس نے ان کی زبان سے اتنی برائیاں اور حقارت سن رکھی تھی۔ وہ انہیں اس سے باز رکھنا چاہتی تھی۔

یا وہ اسے قائل کر لیں۔

خدیجہ بانو سے کہنے سننے کے لیے تو وہ مناسب موقع کی متلاشی تھی، لیکن فاریہ خالہ نے سب سن لیا۔

اور یہ بڑا غلط ہوا۔ مہرو کو کئی سال لگے اس بات کو سمجھنے میں۔

☆☆☆

اس نے پہلی بار بہت ڈرتے ڈرتے چھپ کر بائبل کو اٹھایا تھا۔ وہ بہت تیزی سے صفحات بدلتے

ہوئے جلدی جلدی سب پڑھ لینا چاہتی تھی۔ پر نانا کی نظر پڑ گئی۔ ان کی آنکھوں میں تحیر تھا۔ میری نے کسی چیز کو سرعت سے ہاتھ پیچھے کر کے چھپایا تھا۔

"کیا چیز ہے میری؟" ان کے لہجے میں سختی نہیں تھی۔ مگر میری نے مجرم کی طرح دونوں ہاتھ سامنے کر دیے۔ اس میں بائبل تھی۔

"تم اسے پڑھنا چاہتی ہو" وہ مسکرائے۔ میری کا سر اثبات میں ہلا۔

"تو تم اسے لے سکتی ہو۔"

"نہیں، میں بس دیکھ رہی تھی۔" وہ جھینپ سی گئی۔

اگلی بار نانا کی طبیعت خراب تھی۔ انہوں نے اس سے کہا کہ وہ پڑھ کر سنائے انہیں۔ میری کے لیے اردو ترجمہ پڑھنا کچھ مشکل نہ تھا۔

کمرے کی خاموشی میں اس کی آواز کی چاشنی کا رچاؤ آن بسا۔

ماریہ گھر جانے کے لیے نکل رہی تھی۔ اس کے تینوں بچے یہاں آ کر سارے گھر میں پھیل جاتے تھے۔ ماسوائے میری کے...... وہ جانتی تھی اسے نانا کے پاس بیٹھنا اچھا لگتا ہے۔ کچھ ماریہ کا یہ اندازہ بھی درست تھا کہ دادی نے زیادہ گھلنے ملنے سے منع کیا تھا اور میری دادی کی تابعدار تھی۔ مگر یہ بھی کہ اسے نانا بہت اچھے لگتے تھے۔

اور یہیں ماریہ کا وہ کردار واضح سامنے آیا تھا۔ جس نے میرو سے کہلوایا تھا کہ سمیع الدین کے رشتے کو منع کرنے کی بہت سی وجوہات ہیں، مگر ایک تھیں خدیجہ بانو...... اور ایک تھی ماریہ۔

سو اندر داخل ہوتے پر نانا، نواسی کی سرگرمی دیکھ کر ماریہ کے چہرے پر اولاً اچنبھا اور پھر مسکراہٹ ابھر آئی۔

وہ دونوں کہنے سننے میں ایسے مگن تھے کہ اس کی آمد پر بھی نہیں چونکے۔

"گھر نہیں چلنا میری......؟" ماریہ نے پیار سے اس کا گال چھوا۔

"سوری ڈیڈی!" وہ معذرت خواہانہ نظروں سے کہنے لگی۔ "شام ہو گئی ہے۔ گھر جاتے جاتے رات ہو جائے گی۔"

"ہاں، ہاں بالکل......" ڈیڈی نے اجازت دے دی۔ ماریہ نے جھک کر ان کی پیشانی کا بوسہ لیا۔ میری نے ہاتھ ملایا تب ڈیڈی نے اس کا ہاتھ چوم لیا۔

"باقی آئندہ سناؤں گی۔"

"میں انتظار کروں گا۔"

اور باقی آئندہ کی قسط کبھی ایک ماہ بعد لگتی......

کبھی مہینے میں چار بار...... ہر ویک اینڈ پر......

وہ بہت دلچسپی سے پڑھ کر سناتی تھی۔ اسے پچھلا پڑھا بھولتا نہیں تھا۔ وہ نانا سے واقعات کو ڈسکس کرتی تھی۔

"تم سب سے اچھی بیٹی ہو" نانا نے بڑی نانی کے سامنے اس کی مدح سرائی کی۔

نانی سمیت سب نے سر اثبات میں ہلایا۔ میرو جھینپ گئی۔

"میری دادی بھی یہی کہتی ہیں کہ میرو سب سے اچھی بیٹی ہے۔"

"ہاں تمہاری دادی۔" سب نے ایک دوسرے سے نگاہیں چرائیں۔ "وہ بھی اچھی خاتون ہیں۔" انہوں نے مہذب انداز میں سرد آہ بھری تھی۔

"ہاں میں نے ان سے کہا تھا۔ میرے نانا اور سب لوگ بہت اچھے ہیں۔"

"تم ان کے سامنے ہمارا ذکر کرتی ہو۔" خاموش طبع نانی کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

میرو چونکی۔ اس پر عجیب سا انکشاف ہوا۔ عرصہ ہوا اس نے نانا کے گھر کی سرگرمیوں کا تذکرہ چھوڑ دیا تھا۔ وہ بس یوں ہی سرسری ساذکر کر کے بات بدل دیتی تھی۔ اسے ذہن پر بہت زور دینے پر بھی سمجھ نہ آیا کہ ایسا کب اور کیوں ہوا۔

وہ خدیجہ بانو کی سب سے اچھی پوتی تھی، تو تھی۔

مگر وہ نانا سالومن کی سب سے اچھی نواسی بن گئی اور کسی کو خبر نہ ہوئی۔ ماریہ کو بھی نہیں۔ حالانکہ اسے ہونا چاہیے تھی۔

ماریہ سے تعلقات کی بحالی کو سب سے زیادہ ناپسند کرنے والی فاریہ تھی۔ ایک زمانہ تھا جب وہ دو بہنیں ایک جان دو قالب ہوا کرتی تھیں، لیکن جب ماریہ نے قلب بدل لیا۔ تو...... سب سے زیادہ صدمہ فاریہ کو لگتا اسے ہی پہنچا ہے۔

فاریہ کا میاں انگلینڈ میں ہوتا تھا۔ وہ اکیلی ہی ماریہ کی آمد پر اپنی بچی کو لے کر گھر سے نکل جاتی۔

وہ ماریہ کے بچوں کو بہت سے معیوب ناموں سے پکارتی تھی۔ اس کے لہجے میں ان کے لیے حقارت اور نفرت ہوتی تھی۔ وہ اولاً تو ان سب کی سمت دیکھتی ہی نہ تھی۔

اور کبھی یہ ہوتا کہ ساکت و جامد ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے گھنٹے گزر جاتے، ایسے میں اس کے چہرے کو دیکھنے سے خوف آتا تھا۔

کینہ توز بے رحم نگاہیں۔

تو اسی فاریہ نے ایک روز میرو کو بہت پیار سے پکارا۔

شہد آگیں لہجہ...... حلاوت و محبت کی مشفق انداز...... وہ نا صرف اس کے ساتھ بیٹھ گئی، بلکہ شانے پر بازو بھی پھیلا دیا تھا۔

☆☆☆

نانا کو بائبل کی آیات و واقعات پڑھ کر سناتے سناتے بات کب معنی و تشریح تک چلی گئی، کسی کو پتا نہیں چلا۔

نانا سالومن کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ وہ دنیا کے ہر موضوع پر بلا تکان بولتے تھے۔ اور پھر فاریہ بھی ان میں شامل ہو گئی

اس نے اپنے انداز سے اپنی مرضی سے اس کی تشریح کی۔

ایسے کہ میرو...... عرف میری...... ماہ رو فیاض نہ ادھر کی رہی، نہ اُدھر کی۔

☆☆☆

وہ چاروں دنیا کے وہ عجیب بچے تھے جو صبح دادی کے ساتھ نماز کے لیے اٹھتے تھے۔ تو ساتھ ہی وہ بڑی نانی و دیگر کی دیکھا دیکھی کسی بھی مشکل کے وقت بے ساختہ یسوع کو پکارتے۔

اور سینے پر کراس کا نشان بھی بنا لیتے۔

مزے کی بات یہ تھی ان چاروں نے بہت بچپن میں یہ بھی سیکھ لیا کہ صلیب دادی کے سامنے نہیں بنانی اور دعا کے لیے ہاتھ نانا کے گھر میں اور طریقے سے اٹھائے جاتے ہیں۔

وہ عید بھی پوری عقیدت و احترام سے مناتے تھے۔

اور نانا کے گھر کی کرسمس پارٹی کا بھی سارا سال شدت سے انتظار کرتے تھے۔

بچے بڑے ہو گئے تھے۔ پڑھائی کی مصروفیات نے ننھیال جانے میں رکاوٹ پیدا کر دی۔ خدیجہ بانو کے اعتراضات بھی کم ہو گئے۔ پہلے ویک اینڈ پر جاتے تھے، خوشی غمی اس کے علاوہ، اب دو تین ماہ تک بھی جانا نہ ہو پاتا۔

سب سے زیادہ خوشی خدیجہ بانو کو ہوئی، چلو جان چھوٹی۔ مگر جو ہونا تھا، وہ ہو چکا تھا۔

بچوں کی اس دہری شخصیت، دہرے رویے کی واحد گواہ ماریہ تھی اور اسے شاید اس چیز کا احساس نہیں تھا، یا جان بوجھ کر نظر انداز کر چکی تھی۔ یہ سوال ہنوز باقی تھا۔ مگر خدیجہ بانو کے لیے......

ماریہ کا فیاض...... یعنی ان چاروں کا باپ بھی عینی شاہد بن گیا۔

وہ بھونچکا رہ گیا۔

جیسے اس کے اوپر سے بلٹ ٹرین گزر گئی ہو۔

☆☆☆

موحد، واحد کا کا رزلٹ ڈے تھا۔ ماریہ کے چاروں بچے پڑھائی میں بہت تیز تھے۔ مکی اور واحد سب سے زیادہ...... امید تھی اس سال واحد ٹاپ کرے گا۔ مگر اس بار مقابلہ ٹکر کا تھا۔ چند پوائنٹ سے پوزیشن اوپر نیچے ہو سکتی تھی۔ سب کی خواہش تھی وہ تیسرے سال بھی پوزیشن لے کر ہیٹ ٹرک کرے۔

اور خصوصی انعام کا حق دار قرار پائے۔ بہت پُریقین ہونے کے باوجود آخری منٹوں میں دل کی دھڑکن بڑھ گئی تھی۔

اور تھرڈ آئے ہیں۔ پرنسپل پکار چکی تھی۔ اب فرسٹ اور سیکنڈ......

واحد سے بے چینی پر قابو نہ پایا گیا۔ وہ اپنی نشست سے کھڑا ہو کر پنجوں کے بل ہلکا ہلکا اچھل رہا تھا۔ ماریہ اور فیاض کی مسکراتی نگاہیں اس پر جمی تھیں۔

پھر اس نے مٹھیاں بھینچ لیں، آنکھیں بھی، وہ دعا مانگ رہا تھا اور دعا مانگتے مانگتے ہی اس کے نام کے اعلان ہو گیا۔

ایک ہاہاکار مچ گئی۔ فیاض اسے گود میں اٹھانے کو آگے بڑھنے لگا، مگر یہ کیا، ان کے قدم پتھر کے ہو گئے۔ واحد سینے پر صلیب کا نشان بنا رہا تھا۔ وہ بالکل یوحنا کے سے انداز میں خداوند کو پکار رہا تھا۔ وہ خدا کا شکر گزار تھا۔

اپنے نام کی دوسری پکار پر وہ بھاگ کر اسٹیج پر چلا گیا۔

فیاض جہاں جما تھا، جما رہا۔

☆☆☆

"کیا وہ فیل ہو گیا تھا۔" خدیجہ بانو نے سخت اچنبھے سے سوچا۔ منے نے اپنے منے کو بازو سے گھسیٹ کر لا کر صوفے پر پٹخ دیا تھا اور خدیجہ بانو کے آگے آنے تک وہ اس کے گالوں کو تھپڑوں سے لال کر چکا تھا۔

"ارے...... کیسی پاگل ہو، روکو اسے۔" وہ ماریہ کو لتاڑتی درمیان میں آ گئیں۔ "ہو جاتے ہیں بچے فیل...... چھوٹا سا تو ہے۔"

"ہٹ جائیں آپ۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ کیا کر رہے تھے وہاں...... تم۔" وہ دھاڑا۔

یہ...... خدیجہ بانو نے منے کا ہاتھ جھٹک کر سسکیاں بھرتے واحد کو آغوش میں بھر لیا۔ ان کی استفہامیہ نظریں، بہو، بیٹے کی سمت اٹھی ہوئی تھیں۔

بچہ اپنے جرم سے آگاہ نہیں تھا۔

"یہ سینے پر کراس بنا کر خدا کا شکر ادا کر رہا تھا۔" منے نے پھٹی آواز سے خدیجہ بانو سے شکایت کی۔ جہاں ایک طرف خدیجہ بانو نے اسے چھوت کا مریض سمجھ کر خود سے دور کیا تھا۔ وہیں ماریہ نے انداز نشست بدل کر ٹانگ پر ٹانگ جمالی۔

اور دیوار پر لگی پینٹنگ کو یوں دیکھنے لگی۔ جیسے اس کا اس سارے قصے سے تعلق ہی نہیں۔

"کیا؟" خدیجہ بانو کے حلق میں خراشیں پڑ گئیں۔ منا ان کی کیفیت سے بے خبر آنکھوں دیکھی کو خود کلامی کے انداز میں دہرا رہا تھا۔ چونکا تب جب خدیجہ بانو کو دونوں ہاتھوں سے اپنے سینے پر مارتے دیکھا۔

"اسی دن کے لیے...... ہائے اسی دن کے لیے میں ان سب کو وہاں جانے سے منع کرتی تھی۔ ہائے اسی دن کے لیے کلموہی......" ساتھ ہی ایک زور کا ہاتھ ماریہ کو ایسا مارا کہ اس کی چڑھی ٹانگ لڑکھڑا کر سیدھی ہوئی۔

وہ زمین پر منہ کے بل گرنے سے بمشکل بچ پائی تھی۔ دو باتیں اور ہوئیں۔

میکی ماں کے پاس جا کھڑی ہوئی اور میری دادی سے لپٹ گئی کہ انہیں روک سکے۔ جو سینہ کوبی کر رہی تھیں۔

خدیجہ بانو کو غش پر غش پڑ رہے تھے

"نہیں کسی کا قصور نہیں۔ سارا قصور میرا ہے۔ میں نے ہی جذبات میں آ کر اسے اجازت دی تھی کہ رچالے بیاہ...... ہائے...... آ...... ادھر آ...... کس نے سکھائیں تجھے یہ چیزیں۔"

انہوں نے واحد کا ہاتھ چیل کی طرح جھپٹا اور کمر پر دھموکے جڑ دیے۔ بچہ اوندھا ہو گیا۔ وہ مقدور بھر طاقت سے اس کا بازو مروڑ رہی تھیں۔

"کسی نے...... نہیں...... نانا...... یوحنا...... سب ایسے کرتے ہیں وہاں......" وہ درد سے تڑپ گیا۔

"چھوڑ دیں دادی! کیا اس کا بازو توڑیں گی۔" میکی نے آگے ہو کر واحد کو بانہوں میں چھپا لیا۔ بھینچ لیا۔

دادی سمیت سب نے چونک کر میکی کو دیکھا تھا۔ اتنے ترش اور جارحانہ رویے سے کسی نے آج تک انہیں نہیں پکارا تھا۔ "بچہ ہے یہ۔"

"پر تمہارا باپ اور تمہاری یہ ماں تو بچہ نہیں تھی

چہرہ نگاہوں میں سموئے۔ اس کا ذکر محبت سے کرتے ہوئے وہ اس لڑکی سے پڑتال کر رہا تھا، جو اسے مسترد کر چکی تھی۔

"ہاں وہ ٹھیک کہتی ہے۔" ماہ رو کے لبوں پر زہرخند مسکراہٹ در آئی۔ "ہم میں سے کوئی یقین نہیں کرتا تھا۔ خاص طور پر میں...... کہ اس کی دعا قبول ہو گی۔"

وہ پھر جیسے کہیں پہنچ گئی۔ یہ دیکھے بغیر پہلے موسیٰ کے چہرے پر اچنبھا نمودار ہوا، جیسے اسے سننے میں غلطی ہوئی ہو۔ پھر اس نے اس کے جملے کو زیر لب دہرایا۔

"ہم میں سے کوئی یقین نہیں......"

"کیا مطلب...... کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ ہنی کی یہ بات تم پہلے سے جانتی تھیں؟" وہ اس کا شانہ ہلا کر پوچھ رہا تھا۔ اس نے یک دم پہلو بدلا، اسے فوری طور پر یاد نہ آیا کہ اس نے کیا کہا ہے؟

"کیا تم ہنی کو پہلے سے جانتی تھیں میرو؟" اگلا سوال اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔

اس نے قصہ وہاں سے شروع کیا تھا، جب خدیجہ بانو کے منے نے پہلی بار ماریہ سالومن کو دیکھا تھا۔ اور اس قصے کو وہاں جانے سے پہلے روک دیا تھا۔ جہاں سے آگے کہنا بہت مشکل تھا۔

مگر اس کا کیا کرتی۔

جو شدت سے جواب کا منتظر تھا۔

☆☆☆

"وہ اپنا گھر برباد کر لے گی صبغہ!" حسنل کے گھر سے لوٹنے کے بعد سے امی یہ ہی گردان کر رہی تھیں۔ صبغہ ہونٹ بھینچے ان کی بے قراری کو دیکھ رہی تھی۔

"میں کیا کر سکتی ہوں امی۔"

"تم...... تم میرے ساتھ اس کے گھر چلو...... اسے سمجھاؤ، وہ کیوں اپنے ہاتھوں، اپنے گھر کو آگ لگا لینے پر تلی ہے۔"

"امی! آپ جانتی ہیں۔ آپ کے بھتیجے نے مجھے حسنل سے کسی بھی قسم کا رابطہ رکھنے پر سخت نتائج کی دھمکی دے رکھی ہے۔" اس کی آواز میں لرزش آ گئی۔

"اسے میں سمجھا لوں گی۔" امی نے تیزی سے کہا۔

"امی......" وہ اپنی پیشانی مسلنے لگی۔ "میرا خود بھی دل نہیں کرتا۔" اس نے سچ اور جھوٹ کی آمیزش سے کہا۔

امی کو یک دم چپ لگ گئی۔ ہاں سب نے حسنل کو جھیلا تھا۔ صبغہ نے سب سے الگ طرح۔

صبغہ کا نکاح ان کے چھوٹے بھائی کے بیٹے سے پہلے ہوا تھا۔ رخصتی حسنل کی پہلے ہو گئی۔ مفتی عبیدالرحمٰن کے سامنے بولنے کی کسی نے جرات نہیں کی تھی۔ مگر اس نے ولیمے پر موسیٰ سے ملنے کے بعد ہی مفتی صاحب کے فیصلے کو غلط قرار دیا تھا۔ اس نے واشگاف الفاظ میں دماغ خراب ہونے اور "کیا وجہ تھی" کا سوال رکھ دیا تھا۔

مفتی صاحب نے تو چپ کی قسم کھالی تھی۔ اس نے اپنی منکوحہ صبغہ کو جا لیا۔ اسے یقین تھا، وہ جانتی ہے۔ صبغہ نے خود سے قسم کھا کر کہ ایک لفظ نہیں بولے گی، انکار کر دیا۔

"کیا اس کا کوئی خفیہ معاشقہ چل رہا تھا؟" اس کے سوال میں یقین کا عنصر غالب تھا۔

"نہیں تو......" صبغہ نے سچ کہا، مگر وہ ڈٹ گیا۔ مفتی عبیدالرحمٰن کے گھر کا ماحول...... جہاں بالغ ہوتے ہی کزنز کا باہم بیٹھنا بھی معیوب سمجھا جاتا تھا۔ وہاں ناکح ایسے بیچ راہ میں روک لے۔ بازو دبوچ لے اور اس کے تیور کڑے ہوں۔ وہ صبغہ کے چہرے پر جھک جھک جاتا تھا اور جواب طلب کرتا تھا۔ صبغہ نے بہت کوشش سے جواب کو ہلکا کرنا چاہا تھا، مگر......

وہ پہلے حق دق رہ گیا، پھر بپھر گیا۔

اس نے سب سے صبغہ کی رخصتی مانگی اور فوج میں کمیشن لے کر سب سے دور چلا گیا۔ صبغہ ایک سخت زندگی گزار رہی تھی۔ اسے حسنل کے اعمال کی خبریں یا تو ماں سے مل جاتیں یا پھر تب پتا چلتیں جب شوہر اسے کٹہرے میں کھڑا کر دیتا۔ اس کے گھر میں اخبار تک نہیں آتا تھا۔

کہ انہیں اس سارے معاملے کی باریکی سمجھانا بہت مشکل تھا۔ مگر ساتھ ہی وہ اس نازک بیل کی طرح بھی تھے۔ جسے جس جانب دل چاہے موڑا جا سکتا تھا۔

یہ مشکل کام تھا۔ مگر جب فیاض نے ٹھان لی تو بالآخر کامیاب ہو گیا۔

میکی نے ماں کے حق میں آواز اٹھائی تھی۔ خدیجہ بانو اور فیاض نے اس روز تو اس کے خیالات سن لیے تھے اور طے کر لیا تھا کہ وہ بزور طاقت اسے باز رکھ سکتے ہیں۔ ایک بار پھر ننھیال والوں کو خبر مل چکی تھی کہ ماریہ کے شوہر نے بچوں کے ان سے ملنے پر پابندی لگادی ہے۔

ظاہر ہے انہیں صدمہ پہنچا۔ بالخصوص فاریہ کو...... وہ میری کو متزلزل کر کے اپنے طور پر انتقام لینا چاہتی تھی، تو اگر وہ اب نہ آتی تو سارے کیے کرائے پر پانی پھر جاتا۔ میری کے دماغ کی کشمکش سے اگر کوئی واقف تھا تو وہ نانا سالومن تھے اور نانی تھیں اور فاریہ......

وہ دونوں تلملاتی رہیں۔

میری دادی کی فرماں برداری میں دم سادھ کر بیٹھ گئی تھی۔ جیسے اس کا کبھی کوئی واسطہ ہی نہ رہا تھا۔

مگر ماریہ کا جانا...... اور میکی کی وہ دوستی جو اس نے سب سے قائم کر رکھی تھی۔ وہ رابطہ تو برقرار تھا نا۔

میری کو میکی پر رشک آتا۔ اس نے کتنی آسانی سے دونوں خاندانوں کے فرق کو تسلیم کر لیا تھا اور اسے اس سب سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ دونوں کتنے جدا ہیں ایک دوسرے سے......

خدیجہ بانو اسے ماریہ کی بیٹی ماریہ کی سگی کہتی تھیں، مگر ساتھ ہی وہ دیکھتیں کہ خدیجہ بانو کی تربیت کا رنگ بھی کہیں سے مدھم نہیں پڑا تھا۔ اپنے حلیے گفتگو، چال ڈھال اور عمومی مذہبی ارکان کی ادائی میں وہ ایک عام مسلمان لڑکی تھی۔

فیاض نے موحد اور واحد دونوں پر اب دنیوی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم کا زور بھی بڑھا دیا تھا۔

وہ خود رات کو ان سے قرآن پاک کا سبق سنا کرتا اور ذرا سی غلطی بھی نہ بخشتا۔ ایسے میں مار کے ڈر سے واحد کبھی دادی اور کبھی میری، میکی کے پاس بیٹھ جاتا۔ دونوں اس پر بھرپور توجہ دیتیں۔

مگر خدیجہ بانو کی توجہ میکی پر ہوتی۔ وہ فوراً وضو کر کے آجاتی اور اسے سبق یاد کروانے لگتی۔ بہت پیار اور فکرمندی سے...... اس کی قرات میری سے زیادہ اچھی تھی۔ ح حلق سے واحد...... ''س'' زبان دانتوں میں دبا کر گزرے۔

''دیکھو سانس جاری رہے اور آواز بلند ہو جائے، اس کو سکتہ کہتے ہیں۔ تم سانس توڑ دیتے ہو۔''

''ٹوٹ جاتی ہے۔'' وہ روہانسا ہو جاتا۔

''اچھا، اوکے...... میرے ساتھ ساتھ پڑھو...... شاباش۔'' وہ اسے یاد کروا کے دم لیتی۔

اور روز میکے جانے کو تیار ماریہ کے ساتھ بھی ہو لیتی۔ اسے سب کی سالگراہیں یاد ہوتیں۔ خوشی کے موقع پر وش کرنا نہ بھولتی۔

غم تو پھر بانٹنا پڑتا ہے۔ بڑی نانی کا انتقال ہو گیا۔ ان کی آخری رسومات میں شرکت کے لیے فیاض کو بھی جانا پڑا۔

نانا کو اپنی والدہ کا بہت صدمہ تھا۔ وہ میری کو یاد کر رہے تھے۔

میری، خدیجہ بانو کی مرضی کے بغیر جانا نہیں چاہتی تھی۔ ''ہاں، جاؤ......'' ان کی نظریں قطعیت سے کھڑی میکی پر ٹکی تھیں۔ جو میری کو لیے بغیر جانے والی نہیں تھی۔

''آخر کو وہ سب تمہارے رشتے دار ہیں۔'' انہوں نے میکی کے الفاظ دہرائے۔

''ہاں دادی! یہ ایسی سچائی ہے جسے کوئی نہیں جھٹلا سکتا۔'' وہ میری کا ہاتھ تھامے نکل گئی۔

چھوٹے ماموں کی شادی کے لیے ماموں خود اتنے پرجوش نہیں تھے۔ جتنا کہ میکی...... اور یہ بھی مخفی نہ رہا کہ میری بھی......'' میکی نے ماریہ کے لاکھ ڈراوے دینے کے باوجود ویسا ہی لباس بنوایا جیسا ایلیس اور ٹینا اور دیگر کا تھا۔ لمبا پنک فراک...... اور جب گھر میں پہن کر کیٹ واک کر رہی تھی تو ظاہر ہے نا۔ ہائے میری نسل تباہ کر دی۔'' وہ پھر بین کرنے لگیں۔ پھر جھٹکے سے اٹھیں۔ بیٹے کو گریبان سے تھام کر اس سے اپنا قصور پوچھ رہی تھیں۔

''اسی دن کے لیے بیٹے...... اسی دن کے لیے۔''

مہرو کو ان پر ترس آنے لگا۔ وہ کیسے بلک بلک کر رو رہی تھیں۔ بے دم، بے بس۔

مہرو نے انہیں دلاسا دینا چاہا تو اسے بھی جھٹک دیا۔ ''تم بھی یہ ہی سب کرتی ہو گی، دور ہٹو مجھ سے۔''

مہرو ساکت ہو گئی۔ اس کے پاس چپ ہونے کے سوا چارہ نہیں تھا۔

''ہم ایسا کچھ نہیں کرتے دادی...... ہم جانتے ہیں، ہم مسلم ہیں۔ واحد بچہ ہے، اسے ابھی صحیح غلط کی تمیز نہیں۔''

میرو کو میکی کی صاف گوئی پر رشک آیا۔

''ہم مسلمان ہیں، مسلمان ہی رہیں گے، دیٹس اٹ۔''

وہ سب کو ششدر چھوڑ کر واحد کو لیے چلی گئی۔

دادی بے دم لاش کی طرح پڑ گئی تھیں۔ منا سر پکڑے بیٹھا تھا۔ اور ماریہ بے تاثر چہرہ لیے یوں لگتی تھی۔ جیسے اس کا یہاں ہونے والے کسی واقعے سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ ساکت، جامد رہ گئی میرو۔ اس کا جسم بے جان تھا اور دماغ کی اکھاڑ پچھاڑ نے باقی کسر پوری کر دی۔ وہ صرف میکی کو سوچ رہی تھی۔

اگلی صبح خدیجہ بانو کسی مردے کی طرح بے رنگ تھیں۔

مہرو نے ماں کو دیکھا۔ وہ معمول کی طرح اپنے روزمرہ کے کام نپٹا رہی تھی۔ سنڈے تھا اور سب کے لیے من پسند ناشتا تیار تھا۔

پاپا نے اعلان کر دیا۔ ''آج کے بعد کوئی وہاں نہیں جائے گا۔''

ماریہ کے گلاس کی طرف بڑھتے ہاتھ ایک پل کو رکے۔ پھر وہ سکون سے پانی پینے لگی۔

''ہنہ......!'' خدیجہ بانو نے بیٹے کو دیکھا۔

''اب...... بیٹے اب...... جس چیز سے ڈرتی تھی وہ تو ہو گئی۔''

''کچھ نہیں ہوا، میں سب ٹھیک کرنا جانتا ہوں۔''

''میں نے واحد کو سمجھا دیا ہے پاپا...... ہم مسلمز ہیں، یہ آئندہ ایسا نہیں کرے گا، لیکن؟'' میکی نے کہا۔

''لیکن......'' سب نے اسے دیکھا۔

''ہم نانا کے ہاں جانے سے نہیں رک سکتے۔ وہ سب ہمارے ریلٹوز (رشتہ دار) ہیں۔''

''اوہ...... یہ اطلاع نہیں تھی...... اعلان تھا...... فیصلہ تھا۔

''ہائے......'' خدیجہ بانو کی گردن ڈھلک سی گئی۔ ''غلط نہیں کہہ رہی یہ...... بالکل صحیح کہہ رہی ہے۔ تو نے کیسے سمجھ لیا تھا بیٹے کہ شادی صرف ایک عورت سے ہوتی ہے۔''

''دادی پلیز......'' میرو نے ان کا ہاتھ تھاما۔

''آپ اپنی جگہ درست ہیں دادی...... میں نے بہت سوچا کہ ہمارے رشتے نارمل نہیں ہیں، مگر میں اس چیز کو سمجھ چکی ہوں کہ ہم مسلمز ہیں اور وہ نہیں ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم انہیں چھوڑ دیں۔ ان سب سے بہت محبت ہے مجھے۔''

''میکی......'' فیاض چلائے تھے۔

''سوری پاپا! مگر یہ سچ ہے۔''

''اسی دن کے لیے بیٹے...... اسی دن کے لیے...... اس بچی کا کوئی قصور نہیں۔''

''سارا قصور میرا ہے۔ تیرا ہے اور اس کا...... یہ گھنی جو منہ میں دہی جما کر بیٹھ گئی ہے۔''

''تم کچھ نہیں کہو گی ماریہ۔'' فیاض نے رات سے اب جا کر پہلا جملہ کہا تھا۔

''نہیں...... بس یہ کہ میں ان سے ملنا نہیں چھوڑ سکتی۔''

''ماریہ۔'' فیاض دھاڑنے لگا۔

''ہاں...... یہ آپ کے بچے ہیں، آپ انہیں روک سکتے ہیں۔ مگر میرے لیے یہ ممکن نہیں، کیا میں کہوں تو آپ اپنی ماں کو چھوڑ دیں گے؟

وہ کچھ بول نہیں سکے تھے

☆☆☆

موحد اور خاص طور پر واحد اتنے چھوٹے تھے

دادی نے بھی دیکھا۔

کتنی بہادر تھی میکی اور ادھر وہ میری خود...... آہ......

کتنا اچھا ہوتا کہ وہ بھی میکی کی طرح ہر چیز کو اس کی جگہ پر رکھنا سیکھ لیتی۔ مگر وہ تو خود مدار سے نکلی ہوئی تھی۔ ڈولتی، ڈگمگاتی...... وہ کیسے کسی چیز کو بھی جما سکتی تھی۔

☆☆☆

ایک سوال کے جواب میں پوری داستان ہوگی، اسے اندازہ نہیں تھا۔ اور کیسی عجیب داستان...... اس نے تو نہ پہلے کبھی سنی، نہ دیکھی۔

''پھر......'' اس نے آہستہ سے اس کے ہاتھ کی پشت کو چھوا۔ وہ چونکی اور زخمی مسکراہٹ سے اسے دیکھنے لگی۔ ''آگے کیا ہوا؟''

''آگے تو کچھ بھی نہیں ہوا...... جو ہوا پہلے ہی ہوا۔ ہم فصل کاٹنے والے لوگ تھے موسیٰ! ہمارے اختیار میں کچھ بھی نہیں تھا۔ بونے والوں نے خار بوئے تھے۔ آج تک انگلیاں فگار ہیں۔'' اس نے اپنی شفاف ہتھیلیاں سامنے کر دیں۔ موسیٰ ایک لفظ نہ کہہ سکا۔

''چلیں......'' وہ کھڑی ہوگئی۔

''ایک سوال پوچھ لوں...... بس ایک آخری سوال۔'' اس نے انگلی اٹھا کر یقین دلایا۔ اس کی خاموشی اجازت تھی۔

''مجھ سے شادی سے انکار کیوں کیا تھا؟ میں نے تم سے کہا تھا نا کہ، اس سوال کا جواب ادھار رہے گا۔''

ماہ رو کی پتلیاں سکڑ کر پھیلیں۔ اسے اس سوال کی امید تو کبھی بھی نہیں تھی۔ انہوں نے عشق نہیں کیا تھا کہ وہ یاد رکھتا اور حسنل جیسی بیوی پا کر بھی وہ اس سوال کو یاد رکھے ہوئے تھا۔ اس کے چہرے سے داستان حیات کا غم مدھم پڑ گیا۔ وہ بے یقینی میں گھری اسے دیکھ رہی تھی۔ جو مسکراتے ہوئے آج جواب لیے بغیر ٹلنے والا لگتا نہیں تھا۔

اس کا چہرہ تن گیا۔

''اور میں نے کہا تھا' میں بتانا ضروری نہیں سمجھتی۔''

''اور میں نے کہا تھا، اگر میں اصرار کروں تو......'' تو دونوں کو وہ مکالمے آج بھی یاد تھے۔

''مجھے ادھورے جواب، ادھورے قصے' سخت تکلیف دیتے ہیں میرد۔

بس سنوں گا۔''

''تو پھر جواب تو تمہیں کب کا مل چکا ہے۔''

''کب...... کب......؟'' وہ اس کی سمت گھوما۔ ''میری داستان حیات ہی تو میرا جواب ہے۔ تم ڈھونڈو، تمہیں مل جائے گا۔''

''میں تمہارے منہ سے سننا چاہتا ہوں۔'' موسیٰ کو یاد آ رہا تھا۔

''اپنے انکار کی وجہ میں تمہیں بتا سکتی ہوں۔ میں اسے کبھی بھولی نہیں۔''

''لیکن پتا ہے۔'' وہ عجیب سے انداز میں مسکرائی۔ اس کی آنکھیں خلا میں ساکت ہوگئیں۔ وہ یہاں حاضر ہوتے ہوئے جیسے کہیں اور پہنچ گئی۔ اسے میکی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے بھی ایسا ہی ملتا جلتا سوال کیا تھا۔

''میں اسے کھو دینے کے غم سے نہیں رو رہی میکی۔ پتا ہے اقرار کر بھی لیتی نا تو پھر بھی وہ مجھے نہ ملتا میکی۔ مسئلہ میری ہاں کا نہیں تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ اللہ پہلے ہی حسنل کی دعا قبول کر چکا تھا۔''

پوری سنجیدگی سے ماہ رو کو دیکھتے موسیٰ کے لبوں پر مسکراہٹ چمکی۔ اس نے کیا شان دار جواب دیا تھا۔ ایسے کہ خود کو مزید زحمت سے بچا لیا۔ یقیناً اس نے ہنی اور موسیٰ کے کسی انٹرویو میں ہنی کی دعا والی بات کو سن لیا ہوگا۔

اس نے اسی جملے کو اپنی ڈھال بنا لیا، تو ماہ رو کی ذہانت میں کوئی شک نہیں تھا۔

کتنا سادہ جواب تھا کہ اس لیے انکار کیا کہ اللہ حسنل کی دعا سن چکا تھا۔

''ہاں ہنی، یہ ہی کہتی ہے۔'' کتنے عرصے بعد موسیٰ نے ہنی کو اس حلاوت سے پکارا تھا۔

اور کیسا عجیب ترین معاملہ تھا۔ بیوی کا حسین

موسیٰ کی گمشدگی پر اس کے شوہر نے دو جملے کہے تھے۔

''ایک' کبھی نہ ملے۔''

''دوسرے' بیوی کو بھی ساتھ لے کر گم ہوتا۔''

اور جو کہانی ادھر آ کر سے پتا لگی، وہ صبغہ کا غیر جانا نہ تھا۔ وہ امی کے ساتھ چلنے کو مان گئی اور کیسی بہن تھی حسن المآب...... اتنے سال بعد بہن کو دیکھ کر ذرا گرم جوشی کا اظہار نہ کیا۔ اس کے حیران چہرے پر تنفر پھیل گیا۔

''نصیحتوں کی پٹاری مت کھولنا۔ میں پہلے ہی ناک تک عاجز ہوں۔''

''تم سے کس نے کہا۔ مجھے دیوار سے سر پھوڑنے کا شوق ہے۔ بس ماں کو انکار نہیں کر سکی۔ انہیں لگتا ہے تمہیں سمجھایا جا سکتا ہے۔'' حسنل کو حسنل کی ٹکر کا جواب صبغہ کے سوا کون دے سکتا تھا۔

''وہ بند کمرہ تھا حسن المآب...... تمہارے زریں خیالات کو ماں، بہنیں پی گئیں۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ پر آج...... تمہیں اندازہ ہے کہ تمہارے یہ اعمال تم کو مذہب کی تذلیل کا مجرم بنا دیں گے۔''

''میں نے کسی کی تذلیل نہیں کی۔ یہ ہی کہا تھا نا کہ شوہر اپنی مرضی کا چاہیے۔'' اس نے چمک کر کہا۔

''ہاں تو مل گیا تھا نا۔ اب کیا تکلیف ہے؟''

''جھگڑا مت کرو صبغہ!'' امی نے لرزتی آواز سے کہا۔

''تم اچھی طرح جانتی ہو۔ مجھے کیا تکلیف ہے۔'' اس نے ایک نگاہ غلط انداز ماں پر ڈالی اور گویا ہوئی۔ ''ایسے شخص سے شادی کرنا ہوتی تو عبدالمبین سے کر لیتی، عبدالمتین سے...... میرے پاس تو چوائس کا آپشن بھی تھا۔''

امی دہل کر اس کی صورت دیکھ رہی تھیں۔ اس نے ایسا ہی جملہ اس روز عبدالمبین سے بھی کہا تھا۔

''تم ہی سے نہ کر لیتی۔'' امی نے بے بسی کے احساس میں گھر کر نفی میں سر ہلانے لگیں۔

''ہاں ٹھیک کہتی ہو، تمہارے پاس چوائس تھی۔''

صبغہ نے بے خوفی سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ ''مگر اس کا کیا کیجیے کہ آج موسیٰ بی...... سمیع الدین بن گیا۔ سمیع الدین کے معنی جانتی ہو ناں...... سننے والا...... اس نے سن لیا۔ اس کی سن لی گئی آج ان تینوں کو...... تین مطلب سمیع الدین، عبدالمبین اور عبدالمتین کو ایک ساتھ کھڑا کر دیا جائے تو لگے گا ایک دوسرے کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں ہیں۔''

صبغہ کے لہجے اور چہرے سے گہرا طنز جھلکنے لگا۔ جملے کے اختتام پر وہ مسکرا رہی تھی۔

''اوہ' تو تم امی کا بہانہ کر کے میرا تماشا دیکھنے آئی ہو۔ جتانے آئی ہو۔''

''نہیں، میں صرف یہ جاننا چاہتی ہوں کہ کیا انجام سوچ رکھا ہے تم نے...... کیا ہوگا اب...... ہمارا تماشا تو اسی دن لگ گیا تھا جب تم حسن المآب سے ہنی بنی تھیں جب تمہارے تعارف میں موسیٰ کے نام سے پہلے...... مفتی عبیدالرحمٰن کا نام لیا جانے لگا تھا۔ تم صرف یہ بتا دو کہ چاہتی کیا ہو۔ تمہیں تو عشق تھا ناں موسیٰ سے...... وہ خیالی پیکر...... وہ خواب...... مرنے مارنے پر تلی تھیں۔''

''ہاں تھا عشق...... مگر موسیٰ سے...... سمیع الدین سے نہیں۔'' اس نے ہونٹ کچکچائے۔

صبغہ کو بتانے کی کوشش میں وہ بات زبان سے نکل گئی جسے —— اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود اس نے خود سے بھی نہیں کہی تھی۔

''کبھی عشق بھی پلٹتا ہے یا مشروط ہوتا ہے حسنل......؟'' صبغہ متحیر تھی۔

''باز آ جا حسنل...... کیسے اللہ نے مالا مال کر رکھا ہے تجھے...... چنگاریوں سے کھیلنے پر آگ سب سے پہلے خود کا دامن پکڑ لی ہے تو تو میری سب سے نیک بچی تھی۔''

''میں اب بھی نیک ہوں۔'' اس نے گردن اکڑا کر کہا۔

''کافر، کتے کو پانی پلا دے تو نیکی درج ہو جاتی

ہے، شرک کا گناہ بدستور رہتا ہے۔" صبغہ جگہ سے اٹھ گئی۔

حسنل کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

"میرے ہی گھر میں کھڑی ہو کر تم مجھ ہی کو گالیاں دے رہی ہو۔"

"ہاں...... ورنہ کرنا تو یہ تھا کہ دروازے پر کھڑے ہو کر دیتی یا تو چلا چلا کر چار لوگ اکٹھے کرتی، مگر کیا کروں۔ مجھے تماشا لگانے کی عادت نہیں...... آپ ای! آپ بھی بری الذمہ ہوئیں کوئی پوچھے تو کہنے والی ہوں گی کہ آپ نے کوشش کی تھی۔"

وہ پانی پیے بغیر دہلیز پار کر گئی تھی۔

اور اب یہاں بیٹھی رو رہی تھی۔ کیوں...... اسے خود پتا نہیں چل رہا تھا۔

حلیمہ کے سارے سوال دم توڑ گئے۔ وہ کیا پوچھتی۔ حسنل کا "جواب" امی کی بھری آنکھوں اور صبغہ کی بہتی آنکھوں سے چھلک رہا تھا۔

"وہ سمجھنے کی حد سے گزر چکی ہے؟ مجھے لگتا ہے اس کے دل پر مہر لگ گئی ہے امی......" اس کے گلے میں آنسو گولہ بن گئے۔

امی پھر سے رو پڑیں۔ خیال انہیں بھی یہی آیا تھا، مگر کہنے سے ہول اٹھا تھا۔

"لیکن......" صبغہ نے بے دردی سے اپنے گال پونچھے۔

"اسے ایسے نہیں چھوڑا جا سکتا امی...... میری بہن ہے وہ...... میں اسے سمجھاؤں گی، میں دوبارہ جاؤں گی اس کے پاس اور اب غصہ نہیں کروں گی' پیار سے امی...... آپ بھی چلیے گا...... بلکہ تم بھی حلیمہ...... تمہاری تو وہ بچپن کی دوست ہے۔ تم بھی چلنا...... مجھ پر تو وہ ہمیشہ سے غصہ ہو جاتی ہے، مگر تم سے نہیں ہو گی۔ تم چلو گی ناں......؟"

حلیمہ اس کے اس طرح جذباتی ہونے پر ہکا بکا تھی۔

عبدالمبین بھی جاتے ہوئے اسے یہی ذمہ داری دے گیا تھا۔ "اسے سمجھانا...... تم دوست ہو اس کی...... ہاں دوستی تو تھی، مگر......"

☆☆☆

مفتی عبیدالرحمٰن کے گھر میں سرشام ہی رات اتر آئی تھی۔ کبھی کبھار صبغہ کے بچوں کی آوازیں ارتعاش پیدا کر دیتیں تو اپنے بیڈ پر پہلو کے بل لیٹی حلیمہ کی سوچیں منتشر ہو جاتیں۔

اس نے اپنے والد کو حسنل کے نانا کے آگے رکوع ہو کر دونوں ہاتھوں سے سلام کرتے دیکھا تھا۔ وہ ان کی دل سے عزت کرتے تھے اور یہی تربیت انہوں نے اپنے گھر کے ہر فرد کی کی تھی۔ اس کی امی اور بہن بھائی بھی...... ان کا گھر حلیمہ کے گھر سے بہت بڑا تھا۔ بہت زیادہ خوبصورت تھا۔

اور اس خوب صورت گھر میں رہنے والی خوب صورت حسن المآب......

حلیمہ ایک عام سی بچی تھی اور حسن المآب...... سر تا پا حسن...... پر خفا حسن...... ناراض بے زار چڑچڑا خود میں مگن...... اس نے حسنل کو ہمیشہ اکیلے کھیلتے دیکھا تھا۔

وہ اسے بے پناہ اچھی لگتی۔ اسے اس پر رشک آتا۔ وہ اتنے معتبر خاندان کی بیٹی تھی جس سے ان کا پورا خاندان تعظیم سے ملتا تھا۔ وہ اتنے پیارے گھر میں رہتی تھی اور وہ اتنی خوب صورت تھی اس کے اپنے پورے خاندان بلکہ اسکول میں بھی اس جیسی دوسری نہیں دیکھی تھی۔ پھر ان دونوں کا اسکول ایک ہو گیا۔

وہ ایک وین میں جانے لگیں۔ حلیمہ کو اچھا لگتا جب سب انہیں دوست کہنے لگے۔ وین کے دیر سویر پر حسنل اس کا انتظار کرتی۔ حلیمہ کی کاپی تو کھو گئی حسنل نے سارا اسکول سر پر اٹھا لیا۔ کاپی تو نہ ملی، مگر حلیمہ کا دل خوشی سے بھر گیا۔ اسے کتنا خیال تھا حلیمہ کے نقصان کا' اس کے رونے کا......

اس نے بھی کسی کو بھنک بھی نہیں پڑنے دی کہ اسے حسنل کی دوست کہلایا جانا کتنا پسند ہے۔ حسنل اسکول میں اور پھر کالج میں تنک چڑھی...... بے زار اور مغرور مشہور تھی، لیکن حلیمہ کی تو وہ دوست تھی۔

حلیمہ اس کی اداؤں کو نخروں کو خوش دلی سے برداشت کرتی تھی۔ اپنی ذات کے حوالے سے وہ پڑھنے لکھنے اٹھنے بیٹھنے گفتگو میں بڑی متوازی شخصیت تھی۔

حسنل کی موجودگی سے اس کے اندر جو ایک خائف سی سوچ ابھرتی تھی۔ اسے اس نے بڑی خوب صورتی سے کم گوئی اور متانت کی چادر میں چھپا دیا تھا۔

وہ اپنا اعتماد بحال رکھتی اور ذرا بھی نہ چوکتی۔

مفتی عبیدالرحمٰن ان دونوں کی دوستی سے بہت خوش ہوتے۔ وہ حلیمہ کو پسند کرتے تھے۔ اکثر اس کے والد کے سامنے اس کی تعریف بھی کرتے۔ حسنل کا بے زار مزاج گھر والوں کے لیے بھی تھا۔ وہ اکثر خفا پائی جاتی۔ اس کی امی اسے حسنل کا خیال رکھنے کی تاکید کرتیں۔

"اس نے ناشتا نہیں کیا حلیمہ......!" حلیمہ کے والدین بھی اسے حسنل کی دوستی پر فخر سے دیکھتے اور ہر چیز کا خیال رکھنے کی تلقین کرتے۔

کالج آنے تک حلیمہ کا انداز' ربیانہ سا ہو گیا۔

حسنل خاموش رہنے کے بجائے رائے کا اظہار کرنے لگی تھی۔

حسنل اپنی پسند ناپسند اور رائے کے اظہار میں دوٹوک تھی۔

اسے جو کہنا ہے وہ کہہ دیتا ہے جبکہ حلیمہ کے والد کا سخت انتہا پسندانہ رویہ درست کو درست کہنے کی اجازت بھی نہیں دیتا تھا اور حسنل کتنی نڈر تھی۔

اور پھر موسیٰ کی آمد...... ہفت آسمان گھوم گئے اس کے سامنے۔ حسنل کیسی باتیں کر رہی تھی اور کہتی تھی اسے عشق ہے اور وہ پا لینے کا دعوا کرتی تھی اور طریقہ...... وہ دعا مانگے گی۔ حلیمہ کا دعا پر یقین تھا، مگر ایسی لایعنی دیوانے کی صدا جیسی بات...... جیسے بھنگ چڑھا کر لوگ دعوے کرتے ہیں، مگر حسن المآب تو بقائمی ہوش و حواس - بات کرتی تھی۔

بے حد حیرت اور خوف کھانے کے باوجود حلیمہ لاشعوری طور پر منتظر تھی کہ وہ دیکھے کہ کیا ہو گا اور حسنل کیا کرے گی اور حسنل نے موسیٰ کو پا لیا اور ایسے کہ...... کوئی مثال...... مثال نہ لگے۔ ایسے بھی ہوتا ہے بھلا......

اس کے والد کی منجمد سوچوں نے اس سے بڑے بہن بھائیوں کی زندگیوں کو ٹھہرا دیا تھا۔ وہ اپنے لیے کسی خیر کی امید رکھتی۔ اسے حسنل...... حسنل کا خاندان اور عبدالمبین ہمیشہ خود سے بہت بلند لگتے تھے۔

اس نے حسنل کو دیکھا تھا۔ کیسے اس نے دعا مانگ کر موسیٰ کو پایا تھا۔ اسے اپنا منہ اس قابل بھی نہ لگتا۔ کہ اللہ سے اپنے لیے عبدالمبین کو مانگ لے

"تم دعا مانگو حلیمہ......! کیا تمہیں میں نظر نہیں آتی؟" حسنل اسے دیکھ کر حظ اٹھاتی۔ حلیمہ کا رشک بڑھ جاتا اور اپنی کم مائیگی کا احساس بھی......

"کہنے کو تو میں کہہ دوں، مگر اگر میری مامیوں کو پتا لگ گیا ناں کہ عبدالمبین کی دلہن کے لیے میں نے تمہارا نام دیا ہے تو یاد رکھو، وہ زندگی بھر بھائی کنوارا رکھ لیں گی' تمہیں نہیں بیاہیں گی۔" وہ متبسم لہجے میں کہہ رہی تھی۔

حلیمہ کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ ہاں وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔

"اچھا...... میں تمہارے لیے دعا کروں گی۔"

اسے شاید اس پر ترس آ گیا تھا یا یوں ہی اس نے تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔ "اے اللہ حلیمہ کی شادی عبدالمبین سے کروا دے۔ اے اللہ......"

وہ ہنسی بھرے لہجے میں اس کا مذاق اڑا رہی تھی۔ حلیمہ کا دل ڈوب گیا۔ وہ نجانے اللہ سے کیا کیا کہہ رہی تھی۔ حلیمہ اسے ٹوک بھی نہ سکی اور ایسی ہی گنگ وہ اگلی شام بلکہ اگلے کئی سالوں تک رہی۔

اگلی شام اس کے والد بے یقینی اور سرخوشی میں گھر سے اس کی امی کو بتا رہے تھے۔ مفتی عبیدالرحمٰن نے حلیمہ کا رشتہ مانگا ہے۔ عبدالمبین کے لیے......

چوبیس گھنٹے پہلے ہی تو وہ اس کا مذاق اڑا رہی تھی جیسے...... اسے چڑا رہی تھی' جتا رہی تھی اور اب......

وہ عبدالمبین جو اسے ہمیشہ پہنچ سے دور لگتا تھا وہ فقط حسنل کے لبوں سے بے پروائی سے ادا کیے گئے

لفظوں کے بعد اس کا بتا دیا گیا، آہ...... آہ۔

وہ اسے عام انسانوں سے کچھ ہٹ کر لگنے لگی۔ بڑی پہنچی ہوئی ہستی۔

''میں دعا کروں گی۔ وہ تمہیں پورے دل سے اپنائے۔''

اور یہ دعا بھی قبول ہوگئی۔ اس کے لاشعور میں تھا۔ عبدالمبین کسی بھی بہانے سے اس ذکر کو ضرور لائے گا، مگر ایسا کچھ نہ ہو۔

اس گھر میں حسن المآب کا ذکر ہوتا ہی نہیں تھا۔ ہاں اس کی نندیں یعنی حسنل کی مامیاں...... اس کی حرکات پر لعن طعن کرتے ہوئے شکر ادا کرتیں کہ حسنل جیسی سے ان کا بھائی بچ گیا۔

حسنل نے حلیمہ کو حیران کرنا کبھی نہیں چھوڑا۔ وہ اسے خوش سرشار دیکھ کر سوچتی۔ وہ وہی زندگی جی رہی تھی جس کے خواب دیکھا کرتی تھی۔

وہ اسے ماڈرن پیر لگتی...... زندہ پیر......

اس نے ایمانے کو بھی دعاؤں سے پایا تھا۔ وہ اس سے کہتی۔ وہ اس کے لیے بھی اولاد کی دعا کرے۔ عبدالمبین نے ٹوک دیا۔ ''تم خود کیوں نہیں کرتیں۔''

''حسنل کی دعائیں قبول ہوتی ہیں۔'' اس کا لہجہ یقین سے بھرپور تھا۔

''اچھا......!'' عبدالمبین نے اسے عجیب سی نگاہوں سے دیکھا۔ ''مثلاً کون کون سی......؟'' حلیمہ کے لب سل جاتے۔

اس کی نندوں کو حلیمہ کے حسنل سے میل جول پر اعتراض تھا، مگر عبدالمبین نے کبھی نہیں ٹوکا۔ وہ وہاں ایمانے کی چاہ میں جاتی تھی۔

حیران کن بات تھی کہ سب سے کنارہ کر لینے والی حسن المآب نے بھی حلیمہ سے دوستی کے رشتے کو برقرار رکھا ہوا تھا۔ وہ اس کی نصیحتیں بھی سن لیتی تھی۔ انہیں چٹکیوں میں اڑا بھی دیا کرتی تھی۔

مگر کیا وہ اب اس کے سمجھانے پر سمجھ جائے گی۔ کیا بعید تھا کہ حلیمہ کو بھی چار سنا کر رخصت کر دیا جاتا جتنی بے دید وہ اس روز دکھائی دی تھی۔

کتنی بے عزتی کر کے گئی تھی وہ اس روز عبدالمبین کی...... حلیمہ اس کے خیالات سے ہمیشہ سے واقفیت رکھتی تھی۔ دوستی تھی دونوں کی...... مگر اب اگر اس کے دل میں حسنل کے لیے کوئی جذبہ تھا۔ تو وہ غصہ تھا شدید غصہ۔

وہ اسے آئینہ دکھانا چاہتی تھی۔ عبدالمبین اسے اصلاح کے لیے بھیجنا چاہتا تھا۔

تو کیا اب اسے جانا چاہیے۔

جس نے ماں بہن کو آٹھ آٹھ آنسو رُلا دیے۔ وہ اسے کس گنتی میں رکھتی۔

☆☆☆

''کالج میں ہم چار دوستیں تھیں، میں...... اریبہ...... حلیمہ اور حسن المآب......''

''حسن المآب......!'' موسیٰ نے دہرایا۔

''میں تو یہ سمجھتا رہا کہ اس پوری دنیا میں اس نام کی صرف ایک لڑکی ہے۔ میری بیوی...... ہنی......'' موسیٰ اپنا پچھلا سوال بھول کر کہہ رہا تھا۔

''میں اسی کا ذکر کر رہی ہوں...... تمہاری ہنی اور ہماری حسنل۔'' اس نے اس کی طرف دیکھے بغیر زخمی مسکراہٹ سے کہا۔

موسیٰ کے سر پر بے یقینی کا پہاڑ ٹوٹا...... ہنی...... میرو کی دوست!

ہنی کی ایک ہی دوست سے وہ واقف تھا۔ عبدالمبین کی بیوی حلیمہ...... اور اریبہ...... ہاں...... ہاں اس نے یہ نام سنا تھا، ہنی کے منہ سے...... بلکہ...... اسے یاد آگیا۔ وہ اریبہ سے مل چکا تھا۔

تو یعنی میرو سچ کہہ رہی تھی، لیکن اس نے کبھی غلطی سے بھی ہنی کے منہ سے میرو کا نام نہیں سنا تھا۔ نہ میرو...... نہ میری...... یہاں تک کہ ماہ رو فیاض بھی نہیں اور موسیٰ کے اچنبھے سے پرے وہ اپنی ہی کہہ رہی تھی۔

کالج میں وہ نہ میری...... نہ میرو۔

وہ ماہ رو فیاض تھی۔ تتلی، رنگین پتنگ، حباب، چٹکلا، ہنسی شوخی و برجستگی کا ایسا شاہکار...... جس کے

اعتماد کے آگے سب زیر ہو جاتے تھے۔ اسے پسند کرنے والوں کی اپنی اپنی وجوہات تھیں۔

سب سے پہلے اس کی لکس...... وہ ہفتے کے سات دن مختلف طرح کے بال بنا کر آتی تھی اور آنکھوں پر نیلا آئی لائنر لگاتی تھی اور بالوں کی لٹوں کو رنگ لیتی تھی۔ اس کے چوڑیوں اور کڑوں کو لڑکیاں بازار میں ڈھونڈا کرتی تھیں۔

وہ پڑھائی میں بہت اچھی تھی۔ ساری شوخیوں شرارتوں کے ساتھ......

وہ باادب شاگرد تھی۔ قابل اعتبار دوست......

اپنی تین پکی سہیلیوں کے علاوہ وہ آدھے کالج کی دوست بھی تھی۔

لڑکیاں اس سے اپنے مسائل کہتیں...... پر اس نے کبھی کسی سے اپنے مسئلے نہ کہے۔

سب کو وہ مکمل لگتی۔ اس پر رشک کیا جاتا تھا۔ اس جیسا ہونے کی خواہش کی جاتی تھی۔

اور وہ خود...... وہ خود جیسا کبھی نہیں ہونا چاہتی تھی۔

اس جیسا ہونا بہت مشکل تھا۔ یہ آزمائش تھی۔ جو کاٹے نہیں کٹتی تھی۔ قیامت تھی جاری مسلسل...... جیسے رِستا کھلا زخم...... باقی سب کو تو چھوڑیں...... اس کی اپنی تینوں سہیلیاں بھی اس پر رشک کرتی تھیں۔

بے فکر تتلی...... یہ حلیمہ کا خیال تھا۔

حلیمہ کے مسائل تھے۔ والد صاحب ایک خاص مذہبی سوچ کے تناظر میں اپنے بچوں کے رشتے نہیں کر پا رہے تھے۔ اس چیز نے ان کے گھر کے ماحول کو آزردہ کر رکھا تھا۔ ناامیدی...... اندھیرا...... انہیں سب کمتر، عیب دار لگتے تھے۔

اریبہ کے گھر میں بڑی بہنوں کی قطار تھی اور رشتوں کے مسائل...... کہنے سننے کو یہ عام سی بات تھی، مگر جن پر پڑی تھی، ان کی سانسیں خشک تھیں۔ اریبہ کے والدین ٹینشن سے ہائی بلڈ پریشر کے مریض بن چکے تھے۔ چڑچڑی مایوس بہنیں لڑتے جھگڑتے بھائی...... امی کی آہیں۔ ابو کی جھکی کمر......

اریبہ سب سے چھوٹی تھی۔ حساس چھوٹی بچی تھی جب یہ سب دیکھ رہی تھی۔ اب اتنی بڑی ہوگئی کہ باجیوں سے قد نکال گئی۔ مسئلہ جوں کا توں......

وہ ہفتے میں ایک بار ضرور تینوں کے بیچ یہ کہانی شروع سے سناتی، ادھورے انجام کے ساتھ...... خوش اُمیدی کے ساتھ۔ کاش اس بار...... دعا کرو یار۔

اور حسنل......

وہ تو قصہ ہی الگ تھا۔ اس نے اپنے مسائل کسی سے کہے نہیں، مگر وہ اسے سب سے بڑھ کر لگتے۔ اسے لگتا اس سے زیادہ مشکل میں کوئی دوسرا ہو ہی نہیں سکتا۔

تو ایسے میں ماہ رو...... اس کی زندگی میں کوئی مسئلہ تھا ہی نہیں۔ سب اس کے بارے میں یہی جانتے تھے۔

وہ دو بہنیں...... میکی کا نکاح ہو چکا ہے۔ اسے پڑھ لکھ کر کچھ بننا ہے۔ دو بھائی چھوٹے ہیں اور بہت ذہین ہیں۔ ماما، پاپا اچھی پوسٹ پر کام کرتے ہیں۔

بہت محبت کرنے والی دادی ہے۔

ننھیال کا ذکر بھی کر لیتی تھی...... فاری خالہ...... نانا نانی...... ہیپی فیملی...... دیٹس اٹ......

اس نے آٹھ نو برس کی عمر سے خود کو مخفی رکھنا سیکھ لیا تھا اور اب تو وہ اس فن میں طاق ہوگئی تھی۔

(خدیجہ بانو نے سکھا دیا تھا۔ کبھی کسی کو بھنک بھی نہ پڑے۔ اس کی نانی، نانا ''کیسے لوگ ہیں۔'' ''کیسے لوگوں'' کی وضاحت خدیجہ بانو نے جس طرح کی اسے دہرانے سے کیا فائدہ......)

وہ دونوں بہنوں کو لے کر بیٹھ جاتیں اور چہرے کے بہترین تاثرات سے سنسنی و حقارت لیے بولتی چلی جاتیں۔ جس میں وہ ماریہ کو کوستیں۔ جس نے ان کے منے کو پھانس لیا۔ منے کو کوستیں جسے اتنی بڑی دنیا میں کوئی اور دکھائی نہ دی اور پھر خود کو سر پر ہاتھ مار مار کے...... ایسے میں حیرت سے دیکھتی میکی، میری کے لیے ان کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔

تو یہ ان کے بڑوں کا جرم تھا جسے انہیں بھگتنا بھی تھا اور چھپانا بھی تھا۔

اس نے خود کو مخفی رکھنا سیکھ لیا۔ میری اور میرو کے ذہن و دل کی اکھاڑ پچھاڑ کا بظاہر ماہ رو فیاض کی زندگی پر شائبہ بھی نہ تھا۔

ادھر حسنل...... وہ سر سے پیر تک ماہ رو کے متاثرین میں سے تھی۔ اسے اس کی نارمل زندگی پر رشک آتا۔

اس کے لباس، بول چال، بے فکرے پن پر...... وہ اپنے گھر ماحول کو ایب نارمل سمجھتی تھی۔ وہ سوچتی۔ وہ مسلمان ہے تو مسلمان تو ماہ رو بھی ہے، مگر وہ جس طرح آج کے زمانے سے ہم آہنگ ہے۔ وہ اس کی ساری فیملی......

تو حسنل کو دراصل ایسے گھرانے میں پیدا ہونا چاہیے تھا۔ اس کا رشک بعض اوقات حسد کے دائرے میں داخل ہو جاتا۔ تب وہ خود کو ملامت کرتے ہوئے کڑھتی۔

وہ کن انکھیوں سے دیر تک ماہ رو کو دیکھتی۔ حسنل کا حسن بے مثال بھی ماہ رو کے اعتماد و انداز کے آگے ماند پڑ جاتا۔ جب وہ پین کی نوک دانت میں دبا کر لیکچر سنتی یا دلائل دیتی۔

سب اپنے اپنے طور پر اس پر رشک کرتے تھے۔

یہ جانے بغیر بظاہر کامل نظر آتی ماہ رو کو دنیا میں سب بڑھ کر اگر کسی پر ترس آتا تھا تو خود پر......

وہ سوچتی...... اریبہ کے مسائل بھی کبھی نہ کبھی ختم ہو جائیں گے۔ دیر سویر سے ہی سہی......

حلیمہ کے والد کو بھی من پسند داماد اور بہوویں مل جائیں گی۔

حسنل کے خود ساختہ مسائل کو اس نے کبھی اہم گردانا ہی نہیں، لیکن وہ...... اور اس کے مسائل کیا کبھی حل ہوں گے۔ کیا دل و دماغ پر چھائی دھند کبھی چھٹے گی۔ اس کی شخصیت میں پڑی دراڑیں کبھی بھریں گی۔

ماریہ کے شدید اور فیاض کے سرسری اعتراض کے باوجود اس نے اختیاری مضامین میں اسلامیات کے مضمون کو چنا تھا۔

اس کی دوستیں۔ اس کا اسکول...... گردو پیش کا ماحول سب مسلم تھا، لامحالہ پلڑا اس طرف جھکنا تھا۔

اس کی تینوں سہیلیوں کا اللہ پر ایمان قابل رشک تھا۔ جو کام خدیجہ بانو کی اتنے سال کی تربیت نہیں کر پائی تھی (کہ اسے ایک جانب کر دیتی)

دوستوں کی محبت میں وہ کام بس ہوا چاہتا تھا۔

دوست اس کی بہت اچھی دوست...... وہ سوچتی کہ وہ انہیں بتائے گی' اس نے کہاں سے سفر شروع کیا اور اختتام ان سب کی مدد سے ہو گیا۔

وہ تسلیم کرنے لگی تھی کہ نانا کا مذہب آفاقی ضرور ہے، مگر وہ منسوخ ہو چکا ہے اور وہ

کہ اللہ ایک ہے اور محمد اس کے رسول ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ پیدائشی مسلمان تھی، مگر اس کا دل چاہتا، وہ باقاعدہ کسی کے سامنے جا کر کلمہ پڑھ لے۔

سر سید احمد خان نے کہا تھا۔

''میں مسلمان اس لیے نہیں ہوں کہ میں اس مذہب پر پیدا ہوا ہوں بلکہ میں مسلمان اس لیے ہوں کہ میں نے اس مذہب کو سمجھ لیا ہے۔''

تو وہ سوچتی، وہ اپنے مسلمان ہونے کا ایسا ہی اعلان کر دے گی۔

اور جو ذرا سا ابہام تھا...... جو ذرا سی جھجک تھی۔ وہ اس روز دور ہو گئی جب اس نے حسن المآب کے ہمراہ موسیٰ کو دیکھا۔

ہاں اللہ ہے...... اللہ ہی ہے۔

وہ ولیمے کی تقریب سے واپسی پر ساری رات ہچکیوں سے روتی رہی۔

خدیجہ بانو سمیت سب کو یہ لگا۔ وہ موسیٰ کو کسی اور کا ہوا دیکھ کر رو رہی ہے۔ کسی ایک کو بھی پتا نہ چلا۔ وہ رو رو کر اللہ کو پکار رہی تھی۔

''میں نے تجھے پا لیا۔ اے اللہ تو ہی یہ کر سکتا تھا۔ حلیمہ ٹھیک کہتی ہے۔ تو دعائیں سنتا ہے۔ حسنل بھی ٹھیک کہتی ہے تجھ سے مانگو تو تو دے دیتا ہے۔ سب سمجھ رہے ہیں، میں موسیٰ کے لیے رو رہی ہوں۔ نہیں اے اللہ...... حسنل کو موسیٰ مل گیا اور مجھے تو''

وہ ماہ رو کی زندگی کی سب سے خوب صورت رات تھی۔

مگر اسی رات کی صبح اور پھر شام نے......

☆☆☆

حلیمہ...... حسنل کو سمجھانے کا فریضہ سر انجام دے رہی تھی۔ یہ ذمہ داری اسے عبدالمبین نے سونپی تھی اور حسنل کی امی اور صبغہ نے...... سوطوعاً و کرہاً وہ یہاں موجود تھی۔

اور حسنل...... وہ بھی طوعاً و کرہاً ہی لب بھینچے بے تاثر چہرے کے ساتھ اسے ٹوکے بنا سن رہی تھی۔ حلیمہ کی ہمت بڑھی۔ اگر وہ بیچ راستے ہی میں اسے چپ ہو جانے کا کہہ دیتی، سننے سے انکار کر دیتی تو وہ کیا کر لیتی۔ یعنی اس میں سننے جتنی لچک موجود تھی، لیکن اب وہ اس کی مسلسل خاموشی سے گھبرا گئی۔

جو سینے پر بازو باندھے ٹراؤزر اور نئی شرٹ میں گھر کی آرام دہ کرسی پہ بیٹھی مسلسل ایک پیر کو حرکت دے رہی تھی۔ اس نے ایک بار بھی حلیمہ کی طرف نگاہ نہیں کی۔ قالین کے پھولوں پر نگاہیں ٹکائے ساکت و جامد...... اسے کچھ تو کہنا چاہیے تھا۔ ہاں نہیں تو...... ناں سہی......

یہاں تک کہ حلیمہ نے سب کہہ دیا...... وہ بھی جو اس نے کسی لیکچر کی طرح تیار کر رکھا تھا۔ وہ یہ بولے گی تو میں یہ کہوں گی...... اور وہ بولے گی تو یہ......

لیکن وہ تو کچھ بولی ہی نہیں......

''چائے لو...... سب ٹھنڈا ہو گیا۔'' حلیمہ ہونقوں کی طرح چپ ہو کر اس کی صورت دیکھ رہی تھی۔ منتظر تھی کہ وہ بولے گی، مگر اس نے چائے کا کپ اٹھا کر حلیمہ کی سمت کر دیا۔

حلیمہ نے طیش میں گھور کر کپ رکھ دیا۔

''میں چائے پینے نہیں آئی ہوں۔ جو سمجھانا چاہ رہی ہوں۔ وہ عقل میں آیا کہ نہیں......''

''تمہیں یہ سب کرنے کے لیے کس نے کہا ہے؟'' اس کا لہجہ ٹھنڈا ٹھار تھا۔ ''عبدالمبین نے یا موسیٰ نے......؟''

حلیمہ نے چونک کر دیکھا۔ حسنل کے سوال میں تشکیک نہیں تھی۔

''کوئی کچھ کیوں کہے گا۔ کیا مجھے نظر نہیں آ رہا تم کتنی بڑی غلطی کر رہی ہو۔''

''شکر تم نے گناہ نہیں کہا۔'' حسنل مسکرانے لگی۔ ''پھر بھی تم نام لو...... امی یا پھر صبغہ؟'' اسے وہ بھی یاد آ گئیں۔

حلیمہ نے نظریں پھیر لیں۔ حسنل ہنوز منتظر نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اپنے خیالات کو مجتمع کرنے میں حلیمہ کو وقت لگا۔

''سوشل میڈیا پر لوگوں کی رائے جانتی ہو؟ سب کہتے ہیں کہ ہنی کو موسیٰ کے رنگ میں رنگ جانا چاہیے۔''

''سوشل میڈیا پر ہی لوگ ہیں جو کہتے ہیں'' ہنی ڈٹی رہو۔'' وہ مسکرائی۔

''وہ تمہارے جیسے ہی چند لوگ ہوں گے۔''

حلیمہ نے فوراً کہا۔

''رائے تو بہر حال ہے ناں......'' وہ جیسے اسے چڑا کر مزہ لے رہی تھی۔

''اتنی ہٹ دھرمی اچھی نہیں ہوتی حسنل...... تمہیں اندازہ ہے کہ تم موسیٰ کو نہیں اللہ کو انکار کر رہی ہو۔ موسیٰ خود سے تو کچھ نہیں کہہ رہا۔ وہ وہی کہہ رہا ہے جو اللہ نے کہا ہے۔ ایک مسلمان عورت کو......''

''بس...... ہو گیا تمہارا لیکچر...... کافی ہے......''

حسنل کے چہرے سے درشتی ٹپکنے لگی، ''اب تم میری سنو...... تم جیسے لوگوں نے دین کو پائنچے کی اونچائی، لمبائی تک محدود کر دیا ہے۔ چہرہ ڈھانپنا ہے، چہرا کھلا رکھنا ہے، وہ نہیں کرنا ہے اور ذرا، ذرا سی بات پر گناہ گار ہونے کا ڈراوا دینے لگتے ہو، کیا خدائی فوجدار ہو، ہاں......؟''

''حسنل......!'' حلیمہ کے لبوں سے پکار نکلی۔

''ذرا، ذرا سی بات پر کفر کا فتویٰ لگا دیتے ہو۔ کیا تم مجھ سے زیادہ جانتی ہو دین کے بارے میں...... ہاں؟ مجھے کسی نصیحت کی ضرورت نہیں۔ میں

تم سے زیادہ بہتر سمجھتی ہوں کہ کیا کام کرنا ہے، کیا نہیں کرنا اور رہا موسیٰ...... نیا نیا ایکسپیرینس ہے۔ جیسے بچہ ہر نئی چیز کی طرف لپکتا ہے نا...... وہی بات...... کچھ وقت گزرے گا تو شوق پورا ہو جائے گا۔ واپس پھر اسے وہیں آنا ہے اور میں انتظار کروں گی اس کا...... تم جیسے قدامت پسند لوگ ہی تو اسلام کو جدیدیت میں داخل ہونے نہیں دیتے۔ اس صدی میں تم صدیوں پرانے اصول کیسے لاگو کر سکتی ہو۔"

"بس کرو حسنل خدا کے لیے۔" حلیمہ نے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ "تم واقعی پاگل ہو چکی ہو۔ تم پر شیطان نے پوری طرح غلبہ پا لیا ہے۔ تم اسی کی زبان بول رہی ہو۔ اوہ میرے خدا۔" حلیمہ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ "کہاں سے سیکھ لیں تم نے یہ باتیں۔ توبہ کرو...... فوراً۔" اس نے آگے ہو کر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ جیسے توبہ کروا کے ہی دم لے گی۔

حسنل نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے اپنے ہاتھ کھینچ لیے۔

حلیمہ نے شپٹا کر اسے دیکھا اور پھر مدد طلب انداز سے ان دونوں سے الگ صوفے پر اجنبی بن کر بیٹھی اریبہ کی سمت گھوم گئی۔

جس کے چہرے پر استہزائیہ، بے بس، متاسف تاثرات کا رنگ تھا۔ سلام کے علاوہ، وہ ایک لفظ نہیں بولی تھی۔ بلکہ وہ تو آنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ حلیمہ واسطے دے کر اپنے ساتھ آنے پر قائل کر سکی تھی۔

"دیکھو...... یہ کیا کہہ رہی ہے، تم بھی تو کچھ بولو۔ اس کا دماغ پھر گیا ہے۔ مجھے لگتا ہے اس پر کسی نے کچھ کر دیا ہے اریبہ۔" وہ واقعی پریشان ہو چکی تھی۔

"کوئی کسی پر کچھ نہیں کرتا۔ جو کرتا ہے انسان خود کرتا ہے۔" اریبہ کا پہلا جملہ ہی "ایک لوہار کی" کے مصداق تھا۔ حلیمہ نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ وہ اسے بحیثیت مبصر یہاں کھینچ کر نہیں لے آئی تھی۔ ان دونوں کو مل کر اسے سمجھانا تھا۔

"اسے سمجھاؤ۔" حلیمہ چلائی تھی۔ سال پہلے یہ ایسی باتیں کرتی تو میں اسے موسیٰ بی کی صحبت کا اثر کہتی۔ اس کی پڑھائی پٹی کہتی، لیکن اب کیا کہوں، اسے سمجھاؤ۔

تم ایک لفظ نہیں بولی ہو۔ میں تمہیں چپ رہنے کے لیے نہیں لے کر آئی تھی اپنے ساتھ...... وہ اس پر چڑھ دوڑی۔

"میں اس سب کے لیے بہت دکھی ہوں۔ پریشان ہوں۔ مگر پھر بھی اس معاملے پر ایک لفظ نہیں بولنا چاہتی۔"

اس کی "نہ" کسی طور پر ہاں میں نہیں بدلتی تھی۔ اریبہ کی اپنی وجوہات تھیں، دل دکھتا ضرور تھا۔ مگر کچھ بھی کرنے کو دل کرتا نہیں تھا۔

اس کا دل بھی پندرہ برس پہلے کا ٹوٹ چکا تھا۔ اس نے زندگی میں وہ سب حاصل کر لیا، جو بھی اس کی خواہش تھا۔ باجیوں کی شادیاں...... ہو بھی گئیں...... بھائیوں کی بھی...... اور خود اس کی ماسٹرز کے فوراً بعد...... اسے لیکچرر شپ مل گئی۔

وہ چار بہت ذہین اور خوب صورت بچوں کی ماں بن گئی۔ اس کا شوہر بہترین انسان تھا۔ پندرہ برس کی محنت شاقہ کے بعد وہ ذاتی گھر بنانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اس کا شمار بہترین استادوں میں ہوتا تھا۔

مگر وہ...... وہ جو ٹوٹا ہوا دل تھا۔ وہ جو ایک دراڑ تھی جو چھت میں پڑ جائے۔ ایک ترخ جو پیالی میں ہو۔ ایک چبھن جو ایڑی کو زمین پر ٹکنے نہ دے۔ وہ ہنوز برقرار تھی۔

اور اس ٹوٹے دل کے ساتھ...... وہ خود بدقت چلتی تھی۔ کسی اور کا سہارا کیا بنتی...... مگر یہ حلیمہ...... مصر تھی کہ وہ اس کے ساتھ چلے۔ ہم دونوں مل کر حسنل کو سمجھائیں گے اور اپنی سی کوشش کر لینے کے بعد اب اس سے لڑنے کھڑی تھی کہ وہ کیوں چپ ہے، سمجھاتی کیوں نہیں، بولتی کیوں نہیں۔

"میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں حلیمہ...... کیونکہ میں سمجھتی ہوں کسی کو بھی سمجھانا، باز رکھنا دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔

میں نے دل سے بڑھ کر پتھریلی دوسری کوئی چیز نہیں دیکھی۔ سنگ مرمر کی چٹانوں کو دیکھا ہے کبھی...... جب انہیں توڑا جاتا ہے اور پھر اسے پالش کیا جاتا ہے، اس میں شکلیں ابھر آتی ہیں۔ پھول دکھائی دیتے ہیں۔ مگر بعض انسانوں کے دل اس سے بھی گئے گزرے ہوتے ہیں۔ جن پر کٹائی، رگڑائی اور گھسائی کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔"

"یہ تمہاری کلاس نہیں ہو رہی اریبہ...... کہ تم لیکچر جھاڑنا شروع کر دو۔" حلیمہ بھڑکی۔

"ہاں، یہ واقعی میری کلاس نہیں ہے۔ یہ تو پتھر ہیں جن سے میں سر پھوڑ رہی ہوں۔ تم سمجھنے سمجھانے کی کیا بات کر رہی ہو۔ میں تو سالوں پہلے تمہیں بھی نہیں سمجھا سکی تھی کہ حلیمہ ایسا مت کرو، بلکہ آج تک کہ تم نے غلط کیا۔ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ تم بھی تو آج تک خود کو درست سمجھتی ہو نا؟ سمجھا سکی میں تمہیں؟"

"اس وقت اس ذکر کا مطلب۔" حلیمہ کے ابرو چڑھ گئے۔

"اوہ......!" حسنل نے بھنویں ملائیں۔ پھر شانے اچکائے۔ "اسے ماہ رو یاد آ گئی ہو گی۔"

"یاد......!" اریبہ نے حسنل کی آنکھوں میں جھانکا۔ "وہ مجھے کبھی بھولی ہی نہیں۔"

"تم دونوں نے اس کے ساتھ بہت زیادتی کی۔" اتنے سال بعد بھی اریبہ کی آواز بھرا گئی تھی۔

☆☆☆

ان تینوں کا اچنبھا حد سے سوا تھا۔ ایسے کہ وہ خود کی کیفیت سمجھنے سے قاصر تھیں۔ بے یقینی سی بے یقینی۔

ابھی تو محو حیرت تھیں۔ زبان سے کچھ بھی نہیں نکل پا رہا تھا، مگر اٹھارہ، انیس برس کی عمر کی لڑکیوں کے لیے یہ ناقابل فراموش واقعہ تھا۔

ایک ایسی خواہش اور دعا...... جس کے بارے میں وہ مر کے بھی یقین نہ کرتیں کہ یہ کبھی پوری ہو سکتی ہے۔ وہ پوری ہو چکی تھی۔

ان تینوں کے پاس اپنی حیرت کو بتانے کے لیے الفاظ تھے ہی نہیں۔ وہ تینوں چپ بیٹھی تھیں۔

مگر ان تینوں میں ماہ رو...... اریبہ کو احساس ہوا۔ ماہ رو کا موضوع حسنل اور موسیٰ کا ایک ہو جانا نہیں تھا۔ وہ تو کوئی اور ہی قصہ کہہ رہی تھی۔ جس کا ایک لفظ پلے نہیں پڑتا تھا۔

وہ دو خداؤں کا ذکر کر رہی تھی۔ اریبہ نے لاحول پڑھی، اسے خدا کی وحدانیت کا یقین تھا اور وہ تو یہ بات کر رہی تھیں نا کہ ماہ رو نے حسنل اور موسیٰ کے ولیمے میں شرکت کیسے کر لی۔ سادہ سے سوال کے جواب میں ماہ رو نے کوئی اور ہی کہانی شروع کر دی۔ جس کا کوئی موقع ہی نہیں بنتا تھا۔ تعلق تھا ہی نہیں۔

کون تھے یہ لوگ...... منا اور خدیجہ بانو...... اور ماریہ...... اور ان کا یہاں کیا ذکر...... اریبہ کے تو کچھ پلے نہیں پڑ رہا تھا۔

وہ کسی پنڈولم کا ذکر کر رہی تھی اور یہ کہ اللہ وہ جسے دادی پکارتی ہیں اور خدا وہ ہے جو نانا، نانی کا ہے۔

لیکن تب ہی اریبہ نے حلیمہ کے چہرے کے بدلتے رنگ کو دیکھا۔ اس کی سمجھ میں آ گیا تھا جو ماہ رو کہہ رہی تھی۔

"تم وہی کہہ رہی ہو نا ماہ رو...... جو میں سمجھ رہی ہوں۔"

"کیا سمجھ گئی تھیں حلیمہ......" اریبہ نے حلیمہ کے چہرے پر ابھرتی نفرت کو حیرت سے دیکھا تھا۔ پھر نفرت میں حقارت مل گئی۔ حقارت سے ملامت۔

حلیمہ ماہ رو پر نفرین بھیج رہی تھی۔ وہ گھن کھائے انداز سے اپنی جگہ سے اٹھی تھی۔

"تو تم چرچ جاتی ہو۔ اور پھر بھی خود کو مسلم کہہ رہی ہو۔"

اور حلیمہ نے بولنا شروع کر دیا۔ اریبہ کو دیر سے ہی سہی مگر سمجھ میں آ گیا کہ ماہ رو نے کیا کہا تھا۔ لیکن اس چیز کو سمجھنے سے وہ قاصر تھی کہ حلیمہ کو ہو کیا گیا تھا۔

☆☆☆

میں سمجھتی تھی صرف دادی ہیں جو ماما کی ایسے تحقیر کرتی ہیں۔ مجھے پتا لگا۔ دادی تو کچھ بھی نہیں کرتی

تھیں۔ جو کچھ حلیمہ نے کیا۔ دادی تو پھر بھی ہماری موجودگی کا لحاظ کرلیا کرتی تھیں۔ جبکہ حلیمہ نے کسی چیز کا لحاظ نہ رکھا۔

پہلے تو میں اس کے طیش اور پھنکارتے لہجے پر ہی حیران ہوگئی۔ وہ اتنا غصہ کیوں ہو رہی تھی۔ مجھے لگا وہ میرا منہ طمانچوں سے لال کردے گی۔

میں نے اس سے کہا۔ ”میں الحمدللہ مسلم ہوں۔“

اس نے کہا۔ ”اونہہ......!“

”میرا یقین کرو حلیمہ! میں تم سب لوگوں جیسی مسلمان ہوں۔“

اس نے کہا۔ ”خبردار......“

”تم مجھ سے کلمے سن سکتی ہو۔“ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے کیسے یقین دلاؤں۔ یقین تو مجھے اس پر بھی نہیں آرہا تھا کہ میرے ساتھ اچھوتوں جیسا سلوک کرنے والی حلیمہ ہے۔ جس پر میں سب سے زیادہ رشک کرتی تھی۔ فخر کرتی تھی۔

میں جب جب میری ہوتی تھی۔ میرا دل حلیمہ ہونے کو چاہتا تھا۔ جب میں میرو ہوتی تب سوچتی کاش میں حسن المآب ہوتی۔

ایک معزز پس منظر رکھنے والے والدین کی اولاد۔

ماہ رو فیاض بہت مکمل لڑکی تھی۔ مگر میری اور میرو؟ جبھی میرا دل کرتا میں اریبہ ہوجاؤں۔ جس کے اپنے لیے کوئی خواب نہیں تھے۔ بس باجیوں کی شادیاں ہوجائیں اور بھائی خفا نہ رہیں اور اس سب کے بعد وہ پڑھ لکھ کر کسی مقام پر پہنچ جائے۔

اور پھر امی، ابو کا بہت خیال رکھے۔

یہ سب نہ سہی تو میں چڑیا ہوجاتی۔ ڈال ڈال پھدکتی۔ جس شاخ پر چاہے بیٹھ جاتی، میں بلی ہوجاتی موئی......! اس کے آنسو ٹھوڑی پر جمع ہوکر گود میں رکھے ہاتھوں پر ٹپ ٹپ گرتے تھے اور ”مسجد کے صحن میں لوٹنیاں لگاتی۔

بلیوں کو کوئی منع نہیں کرتا مسجد میں آنے سے۔ ہے نا؟“ اس نے ہچکی بھری۔

”میں حلیمہ کو بتانا چاہ رہی تھی کہ میری زندگی کی ڈولتی کشتی رات کنارے آلگی مگر اس کے رویے نے مجھے دوبارہ منجدھار میں دھکیل دیا۔

اریبہ بھی تھی وہاں......وہ روک رہی تھی حلیمہ کو، ایسے نہ کرے، مگر حلیمہ کچھ سننے کو تیار نہ تھی۔ وہ زعم کا شکار تھی۔ اس نے میرے ایمان پر شک کیا۔

”ایک عیسائی ماں کی بیٹی کیسی مسلمان ہوسکتی ہے۔ مجھے اندازہ ہے۔ صفائی مت دو۔“

”اسلام ایسے تو نہیں پھیلا موئی؟“ اسے بالآخر آنسو پونچھنے کا خیال آگیا۔ بے دردی سے گالوں کو رگڑ کر وہ جیسے نئے مباحثے کے لیے تیار ہوگئی تھی اور وہ ششدر بیٹھا تھا۔

اسے یاد آرہا تھا۔ محی الدین سہگل زندگی بھر اپنے مسلمان ہونے کے زعم میں رہے۔

ان کے لہجے میں جو حقارت و نفرت اسکارلٹ کے لیے ہوتی تھی۔

اور عبادت کا زعم، اسے بھی تو حسنل نے کہہ دیا تھا کہ ”چھٹا کلمہ تک تو یاد نہیں اور چلے ہیں دین کی تعلیم دینے۔“

”ہاں ایک شکل کا غرور ہوتا ہے۔ خاندان کا شرافت و نجابت کا زعم......اپنی عبادت گزاری کا زعم اور دوسروں کے لیے حقارت، ایسی کہ جیسے پیروں تلے مسل دیا جا رہا ہو۔

کس نے کہا، عبادت فخر ہوتی ہے۔ عبادت تو فرض ہوتی ہے۔

کس نے کہا اللہ کو بندے کی عبادت درکار ہے۔ اس کام کے لیے فرشتے بہت۔

اللہ کو تو فرماں برداری سے غرض ہے۔ کون کتنا زیادہ اس کی جانب آتا ہے۔ کون اس کے کہے کو مانتا ہے۔

اور غرور تو صرف اسی کو سجتا ہے جو واحد ہے، خالق ہے اور مالک ہے۔ تو پھر یہ کون لوگ ہیں جو خود کو نیک بنا کر افضل ہوجاتے ہیں۔ دنیا میں کسی کو حق نہیں کہ وہ کسی کو اچھا کہے، برا کہے۔

تبلیغ اس لیے تو نہیں کی جاتی موئی کہ پھر جو مائل ہوں، انہیں ذلیل کیا جائے۔ ان پر یقین نہ کیا جائے۔ ان کے ہر عمل کو شک کی نظر سے دیکھا جائے۔

دادی نے ساری زندگی ماما کے ساتھ یہ ہی کیا۔

حلیمہ نے میرے ساتھ یہی کیا، ذلیل کیا...... یقین نہیں کیا۔

اور دنیا نے میکی کے ساتھ......“ اس کی ہچکی بندھ گئی۔

سحر زدہ ہوکر سنتا موئی چونکا۔ ”ہاں میکی...... بات تو میکی سے شروع ہوئی تھی۔

کیا ہوا تھا میکی کے ساتھ۔؟“

☆☆☆

فاریہ، ٹینا، ایلس و دیگر خداوند کی ستائش کا گیت ہم آواز ہوکر گا رہی تھیں۔ چرچ کی پچاس سالہ تقریبات کی تیاری کے لیے وہ سب یہاں جمع تھیں۔ فاری خالہ نے میری کو بھی انوائیٹ کیا تھا۔ مگر اس نے قطعیت سے معذرت کرلی، اس کے ذہنی خلفشار سے پرے یہ حقیقت تھی کہ وہ دادی کی ناپسندیدگی کو ذہن میں رکھتے ہوئے عموماً انکار ہی کرتی تھی۔

جبکہ میکی...... اس نے وعدہ کرلیا تھا کہ وہ آئے گی۔

اس کی آواز خوب صورت تھی اور اس کا نغمہ تیار تھا۔ جو اس نے تقریب میں سنانا تھا۔ لیکن فاریہ چاہتی تھی وہ کورس میں بھی شامل ہوجائے۔

اس نے سر درد کا بہانہ بنا کر سہولت سے معذرت کرلی۔

اس کی نگاہیں لکڑی سے بنی سامنے گڑی صلیب پر عیسیٰ کی شبیہہ پر گڑی تھیں۔ دائیں جانب والی دیوار پر پاک مریم اور نومولود حضرت عیسیٰ کی بہت بڑی تصویر آویزاں تھی۔ بائیں دیوار پر حضرت عیسیٰ کے دس ارشادات درج تھے۔ وہ بچپن سے اب تک اتنی بار یہاں آچکی تھی کہ آنکھ بند کرکے بتا سکتی تھی کس طرف کیا چیز ہے۔

وہ یہاں حاضر ہوتے ہوئے بھی حاضر نہیں تھی۔

اسٹیج پر رونق تھی۔ تیاریاں زوروں پر تھیں۔ وہ ہال کی سب سے آخری نشست پر بیٹھی ہوئی تھی۔ آرکسٹرا کی آوازیں گونجیں۔ تب بازگشت سے دل ہول سا جاتا۔ اسے اپنا اندر خالی سا لگ رہا تھا۔

”مجھے نہیں آنا چاہیے تھا۔ مجھے میری کے ساتھ رہنا چاہیے تھا۔ کتنی عجیب بات ہے۔ مجھے کبھی اندازہ ہی نہ ہوا کہ وہ کیا سوچتی ہے۔“

ہاں شاید اس لیے کہ اس نے کبھی ظاہر ہی نہ کیا۔ لیکن یہ بھی تو سچ ہے کہ ہم نے نارمل زندگی نہیں گزاری۔ ہم کو یا ادھر ہونا چاہیے تھا یا ادھر......

مگر میں بھی تو ہوں اور میں اس بات پر قائم ہوں کہ میں الحمدللہ مسلمان ہوں۔ یہ چرچ...... یہ ماحول...... یہ رشتے میری زندگی کا ایک حصہ ہیں...... بس...... لیکن جو وجوہات اس نے سمیع الدین کے رشتے سے انکار کے لیے پیش کیں اور جو الزامات اس نے ماما پر لگائے اور دادی پر...... وہ بھی غلط نہیں۔ مجھے نہیں اندازہ تھا میری...... تم اتنی حساس ہو۔“

اور تم اتنی مشکل میں مبتلا رہیں...... لیکن مجھے کیا کسی کو بھی اندازہ نہیں ہوا۔

جس طرح کے ماحول میں ہم بڑے ہوئے ......میری کی ذہنی کیفیت اس سے بھی بدتر ہو سکتی تھی۔ میں شاید اس طرح اس لیے سوچتی ہوں کہ میں بہت مضبوط اعصاب کی مالک ہوں۔

وہ ایک ہاتھ بغل میں دیے دوسرے سے پیشانی کو مسلتے ہوئے بہت باریک بینی سے تجزیہ کر رہی تھی۔

''ہاں۔'' میکی نے سر جھٹک کر پہلو بدلا۔

''میری نے دادی پر جو الزامات لگائے وہ درست ہیں۔ مگر میں اس سے بھی انکار نہیں کر سکتی کہ اس کے ماما پر لگائے الزامات غلط ہیں۔

رات سمیع الدین کے ولیمے سے واپسی کے بعد سے جو میری کی حالت ہے وہ ماما پر لگائے تمام الزامات کو درست ثابت کرتی ہے۔

میری ٹھیک کہتی ہے۔

ماما کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا، ہاں۔ مجھے غور کرنا چاہیے بلکہ ماما سے پوچھنا چاہیے کہ آیا یہ سب جانے انجانے میں ہوا یا پھر۔ وہ ان کی شعوری کوشش شامل تھی۔

میری کو کاؤنسلنگ کی ضرورت ہے۔ اور وہ بھی بہت نارمل طریقے سے ورنہ وہ خود کو نقصان پہنچائے گی کتنے دکھ کی بات ہے کہ مجھے اس کی دلی کیفیت کا ذرا بھی اندازہ نہ ہوا۔

اسے میری کا وہ سفید چہرہ بھولتا نہیں تھا۔

جب وہ موسیٰ اور حسنل کو دیکھتی تھی اور اس سے پوچھتی تھی تو اللہ سن لیتے ہیں۔

اور اس وقت کہاں ہو گی میری ۔۔ اس نے رسٹ واچ دیکھی' مجھے اس کے ساتھ رہنا چاہیے تھا اسے یک بیک فکرمندی نے گھیر لیا تھا۔

دل کو پنکھے سے لگ گئے' دل چاہا اٹھ کر بھاگ جائے یہ وہی وقت تھا جب میری یقینی ماہ رخ فیاض حلیمہ کے گھر میں۔۔ اسے اپنے پکے مسلمان ہونے کا یقین دلا رہی تھی۔

اور دل پر ہاتھ رکھے پھٹی آنکھوں سے اس کی زبان سے اگلتے زہر سے اپنے وجود کے نیلے پڑتے حصوں کو دیکھ رہی تھی۔

یہ وہی وقت تھا۔ کیا کر رہی ہو گی میری ۔۔ میکی نے سوچا اسے گھر جانا چاہیے۔ وہ سخت ذہنی دباؤ کا شکار تھی۔ اسے اس کے پاس رہ کر اسے سمجھانا چاہیے کہ یہ بھی اللہ کی آزمائش ہے۔ وہ اس طرح آزمائے جا رہے تھے۔ اور وہ دور کیوں جاتی ہے۔ میکی ہی کو دیکھے ناں۔ وہ بھی تو یہ سب دیکھتے ہوئے بڑی ہوئی ہے۔

مگر وہ راسخ العقیدہ مسلمان ہے۔

اور یہ اس کے رشتے ہیں یہ سب ٹینا ......ایلس اور فاری خالہ اس کی نظریں اٹھ گئیں فاریہ ہاتھ ہلا ہلا کر اسے اپنی جانب بلا رہی تھی۔

مان۔ محبت۔ لگاوٹ کا اظہار۔

اور کیا میری ٹھیک کہتی ہے۔ فاریہ خالہ نے اور شاید نانا نے جان بوجھ کر غیر محسوس طریقے سے اسے متزلزل کیا۔

میکی اس نقطے پر آ کر رک گئی ہاں یہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں ہو سکتا۔

اسے اچھی طرح یاد تھا کہ نانا کے گھر کے محبت بھرے استقبال میں فاریہ شامل نہیں تھی۔

اور فاریہ کی نظروں میں نفرت کے سوا کچھ نہیں تھا ان سب کے لیے۔۔

میکی نے خود دیکھا تھا اسے نانا نانی سے لڑتے ہوئے۔ وہ ٹینا کا ان سب کے ساتھ ہونا برداشت نہیں کرتی تھی۔ مگر بعد میں فاریہ مہربان ہو گئی بالخصوص میری پر اور اگر یہ درست تھا تو پھر میری کا یہ الزام بھی درست ثابت ہوتا تھا کہ ماریہ نے جانتے بوجھتے اس منظر سے پہلو تہی کی۔

مگر۔ ماریہ نے ایسا کیوں کیا؟۔

وہ ماما سے لازمی پوچھے گی اس نے مصمم ارادہ کر لیا اور کھڑی ہو گئی۔

اسے کرسمس کے حوالے سے کتنے گیت یاد تھے، نانا کے گھر میں سب اسے بے حد سراہتے تھے یہاں تک کہ پادری صاحب بھی۔ وہ اس سے بہت مشفقانہ برتاؤ کرتے تھے۔

خداوند کے گھر کے دروازے ہر ایک کے لیے کھلے ہیں۔ خداوند کی حمد کرنے میں کوئی گناہ نہیں ہوتا میکی

خداوند سب کا ہے۔ مسیح سب کے ہیں۔ پاک مریم سب کے لیے محترم ہیں۔''

پادری صاحب کے سادہ جملوں میں محبت کا سمندر ٹھاٹیں مارتا تھا۔

''تم بہت اچھا کام کر رہی ہو فاریہ......!'' وہ ہر بار فاری خالہ کو بھی سراہتے۔ یہاں میکی کو خاص اہمیت دی جاتی، جیسے وہ مہمان خصوصی ہو۔ خالہ ہر ایک سے بالخصوص اسے ملوائی تھیں میری دادی کے ڈر سے کم آتی تھی۔

مگر کرسمس یا خصوصی دعائیہ سروس میں اس کی آمد ہو ہی جاتی تھی۔ وہ دبک کر ضرور رہتی تھی۔

تو میکی جیسے دادی کا ڈر سمجھتی تھی۔ وہ ڈر نہیں تھا وہ کھوج تھی وہ تقابلی جائزہ لیتی تھی۔

میری نے ٹھیک کہا۔ انہیں بہرحال ایک جانب ہو کر رہنا چاہیے تھا میکی نے اپنے دل کو ٹٹولا۔ ہاں وہ مسلم تھی۔

پھر وہ یہاں کیوں تھی۔

میری نے ٹھیک کہا تھا۔ ماریہ نے ان سب کے ساتھ بہت بڑی زیادتی کر دی اور فیاض نے بھی۔۔

اس کا دل اچاٹ ہو گیا۔ اسے یہاں نہیں ہونا چاہیے تھا قریب تھا کہ وہ خیال کو عملی جامہ پہنا لی۔ اور بھاگتی ہوئی چرچ سے نکل جاتی۔

ایک دھماکا ہوا تھا۔

وہ منہ کے بل گری تھی پھر مائیک اسٹینڈ گر گیا ڈیسک گر گیا روسٹرم گر گیا' علامتی صلیب بھی گر گئی دیوار اور چھت بھی۔

دھواں تھا۔ گرد تھی۔ شور' جلے گوشت کی بو اور چیخ و پکار اور خون۔ چرچ میں بم دھماکا ہوا تھا۔

☆☆☆

کوئی توجیہ نہیں تھی، جو دنیا کے سامنے پیش کی جاتی کہ ایک مسلمان لڑکی چرچ میں کیوں گیت گا رہی تھی۔ جب اخبار اور ٹی وی میں زخمیوں کے ناموں کی فہرست لگی میکی فیاض ۔۔ نانا سالومن کی نواسی تو تھی۔

مگر۔

میکی فیاض' خدیجہ بانو کی ماہ رخ فیاض تھی وہ کس کس کو پکڑ کر یقین دلاتیں اور تادیب کرتیں کہ نہیں میکی فیاض مت لکھو۔ وہ ماہ رخ فیاض ہے۔

ہاسپٹل۔ میں ایک چیخ و پکار اور آہ و بکا کا منظر تھا۔

معاملہ اقلیتی جماعت اور چرچ سے منسلک تھا سو ساری دنیا کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ سیاسی و معاشرتی پہلو......مذہبی پہلو......شدت پسندی وغیرہ وغیرہ۔

ماریہ اور فیاض نے چپ سادھ لی۔ ان کی پیاری بیٹی تکلیف میں مبتلا تھی۔ وہ زخمی تھی اور بری طرح جل چکی تھی۔

بس وہ صحت یاب ہو جائے انہیں اور کچھ نہیں چاہیے مگر یہ چیز چھپنے والی نہیں تھی۔

''فیاض صاحب! آپ کی بیٹی ان زخمیوں میں'' پوچھنے والے کا چہرہ حیرت سے بگڑ سا گیا۔ ''ہاں...... وہ......''

''وہ وہاں کیا کر رہی تھی؟؟ اس کا وہاں کیا کام......؟''

فیاض نے ماریہ کو دیکھا اور ماریہ نے نظریں جھکا لیں۔

پادری صاحب نے میکی کے لیے خصوصی دعا کی اور بتایا کہ کیسے یہ بچی سالوں سے چرچ کی سروس اٹینڈ کرتی تھی اور کرسمس اور گڈ فرائی ڈے پر......''

سننے والوں کے سروں پر دھماکے ہوئے۔ یہ ناقابل یقین حقیقت تھی۔

حیرت سے ابھرے تو دنیا کی زبانیں تھیں اور ان کا پورا وجود کان......سب تھو تھو کر رہے تھے۔

سوال در سوال۔ جو اپنی جگہ درست تھے۔

خدیجہ بانو کے اندر اتنی سکت بھی نہ رہی تھی کہ وہ سینہ پیٹ کر ''اسی دن کے لیے'' والا جملہ ہی بول دیتیں۔

ان کی پوتی...... چرچ میں گیت گا رہی تھی۔

اسے وہ گیت آتے تھے۔اس نے کہاں سے اور کب سیکھے؟

ایک غلط عورت کا انتخاب منے۔۔

ایک غلط فیصلہ۔ایک ذرا سی لاپروائی۔۔

دنیا انگلیاں اٹھا رہی تھی، سوال اٹھ رہے تھے۔

خدیجہ بانو جیسی پنج وقت نمازی پرہیزگار عورت کی پوتی؟

پھر سراغ لگانے والوں نے فساد کی جڑ کو ڈھونڈ نکالا۔

وہی منے اور ماریہ کا قصہ......

بالکل شروع سے ...... جب منے نے پہلی بار لائبریری میں ماریہ کو دیکھا۔ بیان کرنے والوں نے اور پوچھنے والوں نے اپنی اپنی مرضی کا پہلو چن لیا، کسی کو لو اسٹوری میں دلچسپی تھی، کسی کو خدیجہ بانو مجبور دکھائی دیتیں۔ کچھ منے کی ثابت قدمی کو سراہ رہے تھے، تو کچھ کو ماریہ محبت کے مینار پر چڑھی دکھائی دی جس نے محبت کی اور اسے نبھائی چہ خوب......

عوام سے لے کر خواص تک میں اس واقعے کے چرچے تھے۔

”یار! کوئی فرق نہیں پڑتا۔اب تو ہمارے سیاست دان وغیرہ بھی ملی یک جہتی کا مظاہرہ کرنے کے لیے کرسمس و دیوالی وغیرہ پر مبارک باد کے پیغام دیتے ہیں کرسمس کی تقریبات میں شرکت کرتے ہیں۔

بھئی میں تو سارا قصور لڑکی کے باپ کے کھاتے میں ڈالوں گی۔ عشق کرنے کو کوئی مسلمان لڑکی نہیں ملی تھی۔توبہ......اور چلو سنا ہے عشق عقل کو چاٹ جاتا ہے۔ تو اپنی اولاد پر ہی نظر رکھ لیتا۔“

”مسلم ہونے کا دعویٰ اور حرکتیں۔۔ چچ چچ چچ۔۔ قیامت کی نشانی ہے بابا اور ہمیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے ہم کون ہوتے ہیں سزا دینے والے اللہ نے خود ہی انصاف کر دیا۔جلا کر بھسم کر دیا۔“

99ء میں چینلز کی بہتات نہیں تھی اور نہ ہی وہ اتنے فعال تھے۔مگر پھر بھی رپورٹرز کا ایک مائیک بھی خدیجہ بانو کے منہ کے آگے ہوتا۔

کبھی فیاض اور ماریہ کے آگے۔

اخبارات میں کہانیاں تھیں ۔ قیاس اور قیافہ سے بھی جس میں زیب داستان کے لیے من پسند اضافہ تھا۔

☆☆☆

”تم اس سے ملنے نہیں آئے ذیشان؟“

”آیا تھا میں۔“وہ نظر چرا رہا تھا۔

”بس ایک بار۔۔اسے تمہاری ضرورت ہے۔“ اس نے لجاجت سے کہا۔

اسے دعا کی ضرورت ہے میرو۔“

”اچھا تو تم مصلیٰ بچھا کر بیٹھے ہو۔کہاں کدھر؟“

وہ پنجوں کے بل اونچا ہو کر اس کے کندھوں سے پیچھے دیکھنے کی سعی کرنے لگی۔

اور وہ بغلیں جھانکنے لگا۔

”کیسے آئیں میرو۔“پکار پر وہ گھوم گئی۔انکل اور آنٹی کھڑے اجنبی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

”آپ نے پہلے تو کبھی ایسا سوال نہیں کیا۔“ وہ حیرت سے پوچھ بیٹھی۔

”آؤ۔بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔“انکل نے اپنا بازو لمبا کیا۔وہ اسے ذیشان کے کمرے سے دور لے جانا چاہتے تھے میرو کندھے جھٹک دینا چاہتی تھی مگر وہ ہونقوں کی طرح انکل آنٹی کو دیکھتی ہوئی ان کی معیت میں بڑھنے لگی۔

اس نے ایک دوبار پیچھے مڑ کر دروازے پر ایستادہ ذیشان کو بھی دیکھا۔

”اب پہلے جیسے حالات نہیں ہیں میرو! ہمیں بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا ہوگا۔“

انکل کا تمہیدی جملہ ہی سارے مضمون کا آئینہ بن گیا۔

”ہمیں دنیا کو جواب دینا ہے۔“آنٹی نے انکل کو گھور کر دیکھا۔وہ ان لوگوں میں سے تھیں جو صاف گوئی کے اپنے وصف کا ڈھنڈورا پیٹ پیٹ کر تھکتی نہیں تھیں۔

”کیسا جواب؟“میرو کا لہجہ جارحانہ تھا۔

”یہی کہ ہم نے کیسے لوگوں سے رشتہ جوڑا۔“

”کیسے لوگ؟ مطلب آنٹی؟ آپ ہر چیز سے واقف تھیں ہمیشہ سے۔“

”دیکھو‘ ننھیال سے ملنا اور چیز تھا مگر ایسی سرگرمیاں۔“جملہ ادھورا چھوڑ کر وہ نفی میں سر ہلانے لگیں میرو نے انکل کو دیکھا۔

وہ جبڑے بھینچے چشمے کی کمانیاں پکڑے بہت دکھ سے سہی مگر بیوی سے متفق تھے۔میرو کی گردن واپس آنٹی کی سمت گھومی پھر ذیشان کو دیکھا۔

وہ چھوٹا بچہ بنا اپنے ماں باپ کو دیکھتا تھا۔

جو ممی کہیں۔یا جو پاپا کا حکم۔

”آپ ان سرگرمیوں سے بھی واقف تھیں آنٹی! بلکہ یہ ذیشان‘لاسٹ ایئر کی کرسمس پارٹی میں یہ بھی شامل ہوا تھا۔اور ایلس اور یوحنا لوگوں نے نکاح کی خوشی میں جو ڈنر دیا تھا اس نے اس میں بھی شرکت کی تھی۔

اور آپ کتنی کنسرن تھیں ذیشان کی لکس کے حوالے سے کہ وہ پہلی بار ان سب سے ملے گا۔آپ کے لیے تو ٹائی سلیکٹ کرنا مشکل ہو گیا تھا۔“

”وہ اور بات تھی میرو!“ آنٹی نے سر کو جھٹکا اور مدد طلب نگاہ سے انکل کو دیکھا کہ آخر کیسے اس بلا سے جان چھڑائیں۔

”وہ اور بات نہیں تھی آنٹی۔بات کچھ اور ہے۔“

”ہاں بیٹا۔میں فیاض سے بات کرلوں گا۔تم اس معاملے میں مت پڑو۔“

”میں کیسے نہ پڑوں انکل۔۔وہ آدھی سے زیادہ جل گئی ہے۔اس کے منہ سے آواز بھی نہیں نکل رہی۔میں سمجھی وہ اللہ کہہ رہی ہے۔پھر مجھے لگا مجھے پکار رہی ہے۔

پھر مجھے لگا‘ وہ ماما پاپا کو بلانا چاہتی ہے۔

مگر وہ......وہ تو ذیشان کہہ رہی تھی۔آپ سمجھ رہے ہیں انکل! تم سن رہے ہو ذیشان۔۔اسے صرف تم یاد ہو۔“اس کی آواز پھٹ گئی۔آنکھیں بھر آئیں۔

ذیشان کا سر مجرم کی طرح جھک گیا۔

میرو کے سر پر چھت گری گویا

یہ جھکا سر کہہ رہا تھا

”میں کیا کر سکتا ہوں پھر۔۔؟“

اور ایک دن اور دو دن اور میگی کی زندگی کا آخری دن۔

ڈاکٹر کے سوری سے پہلے ذیشان آگیا۔میرو نے ایسے بھاگ کر اس کا استقبال کیا جیسے وہ اس سے لپٹ جانا چاہتی ہو۔اس نے خوشی سے معمور آواز میں میگی کو پکارا۔

”میگی۔!دیکھو ذیشان آیا ہے۔“

میگی کے چہرے پر واحد بچ جانے والی آنکھ میں زندگی کی رمق ایسے جاگی جیسے۔

جیسے ستارہ جگمگایا ہو

جیسے کوئی چپکے سے لالٹین کی لو بڑھا دے۔

جیسے۔۔جیسے

”سوری۔۔“ ذیشان سوری کر رہا تھا۔”ہم پر خاندان کا بہت دباؤ ہے میگی۔۔تمہارا چرچ میں اس طرح سے ہونا اور یہ سب۔“

میرو نے میگی کی آنکھ کی جوت کو بجھتا دیکھا

آگ نے اس کے چہرے پر نقوش رہنے نہیں دیے تھے مگر وہ جو ایک آنکھ بچی تھی۔

بس وہ ایک نظر۔

وہ بے بسی۔وہ التجا۔وہ خواہش۔جسے آخری خواہش کہا جاتا ہے۔

درد اگر مجسم ہوتا تو میگی کی آنکھ ہوتا۔

روز حشر زبان نہیں بولے گی۔اعضاء خود بولیں گے۔

میگی کی آنکھ رحم کی اپیل کرتی تھی۔

”نہ بولے ذیشان۔چپ رہے، کھڑا رہے یونہی۔ ہاں بس چہرہ اس طرف کرے منہ موڑے کیوں کھڑا ہے۔وہ اسے نظر بھر کے دیکھنا چاہتی ہے۔“

اسے کسی نے آئینہ دیکھنے نہیں دیا تھا وہ اس کی آنکھوں میں اپنا عکس دیکھنے کی خواہش مند تھی میگی کی سماعت پر بھی اثر پڑا تھا مگر ذیشان کو اس نے کب

کانوں سے سنا تھا۔ اسے تو وہ دل سے سنتی تھی بلکہ وہ ہی کیوں ذیشان بھی۔ محبت کرنے والے ہر کام دل سے کرتے ہیں۔ سنتا' دیکھنا' سوچنا۔ تو دل کی ماننے والا دنیا کا قصہ کیوں لے بیٹھا۔ دنیا یہ...... دنیا وہ......

وہ اس رشتے کو نہیں چلا سکتا۔

یہ نسلوں کی بقا کا معاملہ ہے۔

صاف پتا لگتا تھا وہ اچھی طرح سکھا کر پڑھا کر بھیجا گیا ہے۔

مگر وہ میکی کی طرف دیکھ کر کیوں نہیں رہا تھا۔

کیا اسے یہ سب کہتے ہوئے شرم آرہی تھی۔

☆☆☆

''مجھے بعد میں پتا چلا موسیٰ۔ اسے شرم نہیں ڈر لگ رہا تھا میکی کی طرف دیکھنے سے وہ مذہب کو بنیاد بنا رہا تھا۔ وہ انسانیت سے گر گیا موسیٰ۔۔

میں جانتی تھی میری بہن نے بچنا نہیں ہے اسے مار دینے کے لیے وہ آگ اور زخم کافی تھے لیکن جلے ہوئے جسم کے اندر اس کا دل ویسا ہی تروتازہ تھا۔

ذیشان نے اس کی روح پر زخم لگائے۔ اس کے دل کو جلا کر راکھ کر دیا۔ اندھے بھی جان لیتے کہ یہ لڑکی اب چند لمحوں کی مہمان ہے۔ وہ اس سے اچھے بول بول لیتا۔ اس کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے ساتھ کا یقین دلا دیتا۔

یہی کہہ دیتا کہ اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتاروں گا تو میری بہن سکون سے مر جاتی۔ میں سمجھ نہ سکی اس نے ایسا کیوں کیا؟ اسے جلدی کس بات کی تھی۔

وہ جھوٹ بول دیتا۔ جھوٹ کو نبھا لیتا چند دن یا مگر وہ سچ کا پرچم میکی کے سینے میں گاڑ کر فاتح بن کر چلا گیا۔

وہ تو مجھے بعد میں پتا چلا موسیٰ کہ مذہب کا محض بہانا تھا اسے میکی کے چرچ جانے پر میکی کی چرچ میں موجودگی پر اعتراض نہیں تھا اعتراض اسے میکی کے جھلسے چہرے پر تھا۔

اسے کتنا اچھا بہانا سوجھ گیا۔ انکار کے لیے

تو میں اس نتیجے پر پہنچی موسیٰ۔ مذہب کچھ نہیں ہوتا۔ انسانیت ہونا چاہیے۔'' وہ ہچکیوں سے رو پڑی۔

موسیٰ نے اسے کھل کر رونے کا موقع دیا۔

''مذہب سب کچھ ہوتا ہے میرا مذہب ہی تو انسانیت سکھاتا ہے جانور کسی مذہب کے پیروکار نہیں ہوتے ہاں کچھ انسان جانوروں جیسے ہو جائیں تو اور بات ہے۔''

اس کے لہجے میں دل گرفتی سمٹ آئی۔

مجھے تو پھر زندگی بھر ایسے انسان ہی ملے۔'' اس نے ملول لہجے میں خود کلامی کی۔

''وادی۔ ماما۔'' اس کی آواز بھاری ہوئی اور آنکھ نم ــــ'' قاری خالہ۔'' اس کے ہونٹ گیلے ہو گئے۔ ''ذیشان۔۔ حلیمہ۔ حسنل۔ سب۔۔''

اس کی تھوڑی ایک بار پھر بھیگنے لگی۔

اس سے بڑھ کر اس کے لیے ملول موسیٰ۔ جو غائب دماغی سے اس کے چہرے پر بہا زلزلے کو دیکھ رہا تھا، چونکا۔

حسنل۔۔ ہاں حسنل کا کیا ذکر۔

اس کا کیا کردار اس سب کے بیچ۔۔

کیا کیا تھا اس نے......؟

☆☆☆

حسن المآب کو موسیٰ بی مل گیا تھا۔ ناقابل یقین ناقابل فراموش واقعہ ظہور پذیر ہو گیا۔ ہوش و حواس کے بحال ہوتے ہی اس نے موسیٰ کے چہرے پر نظر کی جو شوق کا جہان آباد کیے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے پورے وجود میں بجلی بھر گئی۔ بس وہ سارے کام چھوڑے اور اسی لہنگے میں بھاگتی چلی جائے رات کے اس پہر۔۔ اور دروازہ بجا بجا کر ان تینوں کو جگا دے کہ دیکھو کیا ہو گیا۔ اسے موسیٰ مل گیا۔

ہاں ناں...... یہ کیسے ممکن تھا حسن المآب کی نظر موسیٰ بی پر پڑی اور اسے حلیمہ۔ اریبہ اور ماہ رو تو یاد نہ آتیں۔

اسے اپنی ماں سے زیادہ تینوں سہیلیوں سے ملنے کی فکر تھی بس کسی طرح۔ جلد از جلد وہ ان سے جا ملے۔ اور شانوں سے تھام کر جھنجوڑ جھنجوڑ کر کہے۔

''دیکھو۔ دیکھو۔ میں نے کہا تھا ناں۔ میں اسے پالوں گی۔''

اس پر ان تینوں کا خیال ایسا حاوی ہوا تھا کہ جب جب موسیٰ پر نظر پڑتی وہ تینوں چھم سے سامنے آ کھڑی ہوتیں۔

اور اسے صرف نام کا موسیٰ نہیں ملا تھا۔ اسے موسیٰ کی محبت بھی مل گئی تھی لیکن دوستوں تک جانا عملی طور پر مشکل لگ رہا تھا۔

موسیٰ کی بیوی کی حیثیت سے ملنے والا مقام و مرتبہ تو اپنی جگہ تھا۔ مگر ساتھ ہی وہ عقیلہ سہگل اور محی الدین سہگل کی بہو بھی تھی اور ان کا بس چلتا تو وہ اسے پل بھر کو بھی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیتے۔

دوسری طرف موسیٰ کے حوالے سے کی جانے والی دعوتیں۔۔ وہ ہر روز ارادہ کرتی کہ وہ کسی طرح دوستوں سے مل لے، ہاں فون۔ اس پر بھی حلیمہ سے چند حرفی بات ہو سکی اریبہ کا نمبر ڈیڈ جا رہا تھا اور ماہ رو کے گھر کوئی فون اٹھاتا نہیں تھا۔

کیا کرے کس طرح موسیٰ کو میڈل بنا کر ساتھ لے جاتے ان سے ملے موسیٰ کو ملوائے۔

موسیٰ نے جانے سے انکار نہیں کیا مگر وہ خود ہی سوچنے لگی۔

موسیٰ کوئی عام آدمی تو نہیں ہے کہ وہ اسے ایسے ہی کہیں لے کر چلے اور وہ بھی بنا مدعو کیے۔

سو وہ ایک دن سب کی اجازت سے دوستوں سے ملنے اکیلی ہی چلی گئی۔

حلیمہ اسے دیکھ کر نہال ہو گئی۔ اس کے گھر والے اس کے سامنے بچھے جاتے تھے۔ حلیمہ کے ابو بار بار اس سے موسیٰ کو نہ لانے کا شکوہ کرتے رہے اور دعوت کے لیے وقت مانگتے رہے۔ حلیمہ کی امی نے بتایا کہ حسنل کی ایسی جگہ شادی نے حلیمہ کے ابو کی طبیعت میں لچک پیدا کر دی ہے۔ جب مفتی عبید الرحمن ایسا داماد چن سکتے ہیں تو وہ بھی...... حلیمہ کے گھر میں سنجیدگی سے اس موضوع پر بات ہو رہی تھی۔ حسنل نے اس خوش آئند تبدیلی پر حلیمہ کو مبارکباد دی مگر حلیمہ کا دھیان نہیں تھا۔

''اریبہ اور ماہ رو تو سے کا کانٹیکٹ نہیں ہو پا رہا۔ ہم ان کے گھر چلتے ہیں میرے پاس گاڑی وڈرائیور ہے'' حسنل نے بے نیازی سے کہا۔ ماہ رو کے گھر کا ایڈریس تو نہیں پتا...... لیکن اریبہ کو ضرور معلوم ہو گا ہے ناں؟''

وہ پرسوچ انداز میں پوچھ رہی تھی حلیمہ کے چہرے پر استہزا آمیز تلخی دوڑ گئی ''ماہ رو کے بارے میں ہمیں اور بھی کچھ نہیں پتا۔''

''کیا مطلب......؟'' حسنل کو جملے سے زیادہ لہجے نے چونکایا تھا۔

حلیمہ کے پاس جواب کے دو حصے تھے۔ پہلا ماہ رو کا بیک گراؤنڈ جسے اس نے اپنی مرضی کے اضافے کے ساتھ پیش کیا حسنل سکڑی بھنوؤں کے ساتھ سنتی رہی۔

حلیمہ کو لگا اس کے بے حد سنسنی خیز بیان کے باوجود حسنل کا ردِعمل ماٹھا تھا۔ جیسے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا، حلیمہ کو اس چیز کی توقع نہیں تھی۔

وہ چاہتی تھی کہ دونوں مل کر ماہ رو پر نفرین بھیجیں گی۔

جبکہ حسنل۔ یہ سب سننے کے باوجود۔ حیرت کے باوجود اس کا دھیان اسی چیز پر تھا کہ وہ جلد از جلد ماہ رو سے ملے اور اسے بتائے دیکھو میں نے پا لیا اور اس کے بعد موسیٰ کی محبتوں کے قصے۔۔ حلیمہ نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

تب ہی اسے یاد آیا، ماہ رو نے وہ بھی تو بتایا تھا ناں کہ اس نے سمیع الدین کے رشتے سے انکار کیا تھا۔

ہاں اسے حسنل کو بتانا چاہیے کہ جس موسیٰ کو اس دعاؤں سے حاصل کیا ہے وہ بنا دعا مانگے ماہ رو کی جھولی میں جا گرا تھا اور ماہ رو نے دامن جھٹک دیا تھا۔

ہاں یہ بات حسنل کے علم میں لانا بہت ضروری ہے۔

اور تھوڑی ہی دیر میں حسنل کا بے یقین چہرہ رنگ بدلنے لگا۔ جیسے جیسے حلیمہ سناتی رہی کہ وہ ویسے میں شریک تھی، اور یہ کہ کس رشتے سے اور کیوں؟؟

"بکتی ہے وہ۔۔ شکل دیکھی ہے اس نے اپنی۔"
"تم اریبہ سے تصدیق کرسکتی ہو۔" حلیمہ نے بے نیازی سے شانے اچکائے۔ وہ حسنل سے اسی ردِعمل کی خواہش مند تھی۔

☆☆☆

حلیمہ کے گھر سے اریبہ کے گھر کا راستہ۔۔

حسنل نے جیسے انگاروں پر لوٹتے ہوئے گزارا اس کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے اور سر بار بار نفی میں ہلتا تھا۔ حلیمہ کے متوجہ کرنے پر بھی وہ اپنی کیفیت سے نہ ابھری۔

اس کا دل یہ تسلیم کرنے کو تیار ہی نہ تھا۔

"تم اریبہ سے پوچھ سکتی ہو۔" حلیمہ کے پاس گواہ بھی تھا۔

اریبہ سے کیوں وہ خود جا کر اس ماہ رو سے نبٹ سکتی ہے کہ زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں۔

ہاں وہ جان چکی تھی محی الدین سہگل اور عقیلہ سہگل کی پریشانی۔ محی الدین نے بہو کو خاندان کا امین سمجھتے ہوئے سب سچ کہہ سنایا تھا۔

وہی سچ...... اسکار اور بدر۔۔

"موسیٰ تم سے اس بارے میں بات نہیں کرے گا مگر میں چاہتا ہوں' تم ہر چیز جان لو۔" میں نے دعاؤں میں تمہیں مانگا ہے حسن المآب" مجھے موسیٰ کے لیے تم جیسی لڑکی ہی درکار تھی۔

میری دعائیں مستجاب ہوئی ہیں حسن المآب"

تو حسنل اور موسیٰ کا ملنا تو روز ازل سے آسمانوں پر طے تھا پھر یہ تو ماہ رو کیا کہانی سنا رہی ہے ہاں ایک اچھی عورت کی تلاش میں محی الدین نے کنویں میں بانس ڈال دینے والا قصہ سنایا تھا مگر ماہ رو حسنل کے نتھنے پھڑکنے لگے۔

اور پھر آنکھیں انگارہ ہوگئیں جب ماہ رو پر نظر پڑی۔

ماہ رو کے ستارے گردش میں تھے یہ میکی والے واقعے کا چودھواں دن تھا۔

(سترہویں دن اس نے دم توڑ دیا تھا)

ساری دنیا انگلیاں اٹھانے کو رہ گئی تھی۔ کوئی ہاتھ سے پکڑ کر سینے سے نہیں لگاتا تھا۔ دلاسا نہیں دیتا تھا۔ خدیجہ بانو دہرے صدمے سے دوچار ہوکر بستر سے جا لگی تھیں۔ شروع میں یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ انہیں زیادہ دکھ کس چیز کا تھا۔ میکی کے ساتھ ہونے والے سانحہ کا...... یا اس بدنامی کا جس نے سب کو منہ چھپانے پر مجبور کردیا تھا۔ پھر ماہ رو نے رو رو کر اریبہ کو بتایا۔

"انہیں بدنامی کا صدمہ زیادہ تھا۔

اس سے اچھا تھا وہ وہیں مرجاتی۔" خدیجہ بانو نے کہا تھا۔

اریبہ اسے پچکار کر اپنے گھر لے آئی۔ ماہ رو کتنے روز سے نہائی نہیں تھی۔ اس کا لباس میلا کچیلا تھا۔ الجھے بال...... اریبہ دردمندی سے اپنے والد اور باجی کے ہمراہ اسپتال آتی رہی تھی۔ ماہ رو ایک منٹ کے لیے بھی میکی کے پاس سے ہٹنے کو تیار نہیں تھی۔

حسنل اور حلیمہ دونوں کے چہروں پر شدید حیرت کے بعد تنفر پھیل گیا۔

سامنے بیڈ پر ماہ رو تھی۔ اس نے اریبہ کا نیا سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ دونوں بازوؤں کو گھٹنوں کے گرد لپیٹے...... گھٹنے پر ٹھوڑی ٹکائے زمین پر کسی غیر مرئی نقطے کو تک رہی تھی۔ آہٹ پر اس نے نظریں اٹھائیں تو ان میں بے یقینی کے بعد خوشی کا رنگ ابھر کر معدوم ہوا تھا۔

ادھر حسنل ایک قدم آگے بڑھی

جبکہ حلیمہ پیچھے......

ہیئر برش اور پونی پکڑ کر اس کے بھیگے بال سنوارنے کے خیال سے آئی اریبہ نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تھا۔ حسنل پر نگاہ پڑتے ہی وہ یکدم سب فراموش کرگئی۔ برش بیڈ پر پھینک کر وہ بھاگ کر اس سے لپٹی تھی۔ مگر دوسری جانب گرم جوشی کا فقدان تھا۔ اریبہ نے بے ساختہ پیچھے ہو کر حسنل کو دیکھا اور حسنل کی شرربار نظریں ماہ رو پر تھیں جو چند پل ساکت رہنے کے بعد بے قراری

سے اٹھی تھی۔

اس کی بانہیں حسنل کی سمت وا تھیں۔ وہ بھاگ کر اس سے لپٹی تھی۔ "حسنل ...... میری بہن ...... ماہ رخ۔"

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ ایسے درد بھرے فقروں پر اسے خود میں بھینچ لیتی اس کے ماتھے کا بوسہ لیتی اور سب ٹھیک ہوجانے کی امید کے جگنو اس کی مٹھی میں چپکے سے کھول دیتی۔ مگر یہ کیا۔

حسنل نے ماہ رو کی بانہوں کا حلقہ توڑ دیا تھا۔ ماہ رو لڑکھڑا ایک قدم پیچھے سرکی تھی۔ اس کی متعجب نظریں حسنل کے چہرے کی اجنبیت اور درشتی پر ٹک گئی تھیں۔

اریبہ کو بھی کچھ غیر معمولی پن کا احساس ہوا تھا۔ اس کی حسنل کو اپنے گھر دیکھ کر ہونے والی بے پایاں خوشی پر اچنبھا طاری ہوگیا۔ حسنل کچھ کہہ رہی تھی۔

"یہ میں کیا سن رہی ہوں۔ تم کیا کہتی پھر رہی ہو دنیا سے۔"

"میں...... میں کچھ بھی تو نہیں......؟؟؟"

"یہ تو نکر گئی۔" حسنل' حلیمہ کی سمت گھومی۔

حلیمہ رخ موڑے کھڑی تھی۔

"تم اریبہ سے پوچھ لو۔" اس نے بے خوفی سے کہا۔

"کیا پوچھنا ہے۔ اور یہ کیا طریقہ ہے۔ یہاں آؤ ادھر بیٹھو...... کیا بات ہے؟" اریبہ نے معتدل لہجے میں کہتے ہوئے لاشعوری طور پر ماہ رو کا ہاتھ تھام لیا۔

حلیمہ اور حسنل دونوں نے ہاتھوں کو اور پھر ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔

☆☆☆

"میں اگر تمہاری بکواس کو سچ مان بھی لوں ناں...... کہ تمہارا رشتہ...... اور رشتے داریاں تب بھی اسے پہ یہ تکمیل تک نہیں پہنچنا تھا۔ گرینڈ پا (محی الدین سہگل) جتنے پریشان تھے موسیٰ کے رشتے کے حوالے سے...... میں سوچ سکتی ہوں کہ وہ تمہارے گھر تک بھی پہنچ گئے ہوں گے۔ مگر جب عملی طور پر رشتے کی بات آگے بڑھتی ناں۔ تب وہ الٹے قدموں بھاگ جاتے ...... کیونکہ وہ کبھی بھی تمہارے جیسے بیک گراؤنڈ رکھنے والی لڑکی کو بہو نہ بناتے۔

انہیں نجیب الطرفین قسم کی لڑکی چاہیے تھی۔ جو کہ میں ہوں۔ نجیب الطرفین سمجھتی ہو ناں ...... تم جیسی کو بیاہنا ہوتا تو موسیٰ باہر ہی سے نہ لے آتا۔ تم میں اور اس کی ماں میں کیا فرق ہے بھلا...... وہ یہودی ماں کی بیٹی اور تم عیسائی ماں کی......"

"میری ماما مسلمان ہوچکی ہیں۔" ماہ رو نے چلا کر کہا تھا۔

"ہاں......" حسنل نے حقارت سے ہاتھ جھٹکا۔ "جانتی ہوں میں ایسے مسلمانوں کو۔ ایسی لڑکیوں لڑکوں کے قصوں سے بھی خوب واقف ہوں۔ جو محبت کو پانے کے لیے ہر رکاوٹ عبور کر جاتے ہیں۔ راستے میں آئی ہر دیوار کو گرا دیتے ہیں۔ ان میں سے ایک مذہب بھی سہی ...... بلکہ محبت کی راہ میں باپ رکاوٹ ہو تو مشکل لگتا ہے۔ مذہب کا تو اتنا لحاظ بھی نہیں رکھا جاتا۔"

حسنل کا تبصرہ بعض معنوں میں بالکل درست تھا۔ مگر اس وقت ماہ رو کے سامنے وہ تیز دھار تھا جس سے وہ ذبح ہوتی تھی۔

حسنل نے اپنی شرافت، نجابت اور اپنے تقویٰ اپنی دین داری ...... اور محی الدین کی توقعات کو اس زعم سے بیان کیا۔ جیسے اس سے ارفع لڑکی اس وقت اس پورے روئے ارض پر موجود نہیں۔

اور ماہ رہ کو ایسا ذلیل و کم حیثیت بتایا۔ جیسے اس وقت اسے روئے ارضی پر اس سے کمتر وجود کوئی نہیں۔

بلکہ اریبہ کو یوں لگنے لگا۔ جیسے اس پوری دنیا میں صرف دو انسان ہیں۔

بلندی اور عظمت کے سنگھاسن پر براجمان حسن المآب۔

اور ذلت کے گڑھے میں سینے کے بل نیچے کو گرتی ماہ رو فیاض۔

حسنل ہر بات کے لیے حلیمہ کی تائید چاہتی تھی۔ اور حلیمہ زبان سے نہ بھی کہتی۔ تو اندھا بھی جان لیتا۔ وہ گویا یہ بھی میرے دل میں تھا کے مصداق سرہلاتی تھی۔

''تم نے خوامخواہ کی کہانی گھڑی ہے ناں ماہ رو؟ تم سے برداشت نہیں ہوا ناں کہ مجھے موسیٰ مل گیا۔ تم نے مجھے لاتوں کا بھوت کہا تھا ناں...... اور یہ کہ جوتے مار مار کے ساری عاشقی ناک سے نکال دینے کی تجویز دی تھی۔ مجھے نصیحت کرتے کرتے تم خود موسیٰ کے عشق میں گرفتار ہو گئیں۔ آں ہاں' مجھے ٹوکو مت۔ وہ ہے ہی ایسا۔

مجھے خیالات کو پاکیزہ رکھنے کی نصیحت کرتی تھیں ناں تم اور اب جب وہ مجھے مل گیا تو اپنے اندر کی جلن پر قابو نہ پاتے ہوئے تم...... کہانیاں گھڑ لی ہو کہ موسیٰ کا رشتہ تمہارے لیے آیا تھا۔ اور تم نے، تم نے انکار کر دیا۔ ہاں...... سن رہی ہو حلیمہ اور اریبہ تم بھی...... اس نے انکار کر دیا تھا۔''

''میرے پاس انکار کی وجہ تھی حسنل!'' ماہ رو اپنے جسم کی ساری قوت مجتمع کر کے بولی تھی۔

''اچھا......!'' حسنل کا انداز استہزائیہ تھا۔ ''تو کیا بھلا...... ہم بھی تو سنیں۔ ہے ناں حلیمہ......؟''

''مجھے کوئی شوق نہیں۔'' حلیمہ سب سے ہٹ کر ایک کرسی پر براجمان تھی۔ ''موسیٰ تمہارا تھا، تمہیں مل گیا۔ مجھے تو اس اریبہ پر حیرت ہے۔ کیسے اسے اپنے بستر پر بٹھا کر بال سنوارنے لگی ہے۔ اپنے کپڑے پہننے کے لیے دے دیے۔ نیا سوٹ تھا اریبہ...... اب تم دوبارہ کہاں پہن سکو گی۔''

''کیوں نہیں پہنوں گی؟'' اریبہ سب بھول بھال کر اچنبھے سے پوچھنے لگی۔

''میں تو کبھی نہ پہنوں۔ چٹکی سے اٹھا کر باہر پھینک دوں۔'' حلیمہ نے کراہت آمیز انداز سے منہ پھیرا۔

''تم میرے گھر میں بیٹھ کر میری مہمان کی بے عزتی نہیں کر سکتیں حلیمہ۔'' اریبہ شدید طیش میں گھر کر کھڑی ہوئی تھی۔

''اوہ تو تم اس کی خاطر ہمیں یہاں سے جانے کے لیے کہہ رہی ہو۔'' حلیمہ اکساتی نظروں سے حسنل کو دیکھنے لگی۔ جس کی گھورتی استہزائیہ نفرت آمیز نگاہیں ہنوز ماہ رو کے چہرے پر گڑی تھیں۔

''تمہیں ماہ رو سے سوری کرنا ہوگا حلیمہ......!''

''کس چیز کے لیے......؟''

''اس سب بکواس کے لیے جو تم نے اس دن اپنے گھر میں کی اور جو تم میرے گھر میں بیٹھ کر رہی ہو۔ تمہیں کس نے حق دیا ہے اس کی تذلیل کرنے کا۔'' اریبہ اس سے زیادہ میزبانی کا حق ادا نہیں کر سکتی تھی۔

''اور اسے کس نے حق دیا تھا جو یہ چار سال تک ہمیں بے وقوف بناتی رہی۔ ہمارے ساتھ ایک پلیٹ میں کھاتی رہی۔'' حلیمہ نے ایسی شکل بنائی جیسے اسے ابکائی آ رہی ہو۔

''تم زیادتی کر رہی ہو حلیمہ! میں تمہیں اس کی اجازت نہیں دوں گی۔'' اریبہ خطرناک تیور لیے اپنی جگہ سے اٹھی تھی۔ ''میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم اتنی تنگ ذہن' تنگ نظر' تنگ دل ہو گی؟ تم نے تو مجھے شرمندہ کر دیا مجھے شرم آ رہی ہے کہ میں چار سال تک تمہیں اپنا سب سے اچھا دوست کہتی رہی۔''

''ہاں بالکل ویسی ہی شرم مجھے خود سے آتی ہے کہ میں چار سال تک اسے دوست کہتی رہی۔''

''تم انسانیت کے درجے سے گر گئیں حلیمہ! اتنی توہین۔'' اریبہ نے جھرجھری لی۔

''ہم دنیا میں کیسے کسی کے بھی ایمان اور دین داری کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ ہم ہوتے کون ہیں ہماری اوقات ہی کیا ہے۔ یہ تو اللہ کا کام ہے۔ وہی میزان رکھتا ہے۔ تم نے تو اس مذہب کی توہین کر دی جس کے ماننے کا دعوا سینہ ٹھونک کر کرتی ہو۔ اسلام کا ماننے والا یہ سب نہیں کرتا۔''

جب حلیمہ نے سارا لحاظ بالائے طاق رکھ دیا۔ تب اریبہ نے بھی مروت کی چادر اتار پھینکی۔ ایسے تو پھر ایسے ہی سہی......

''میں نے کوئی توہین نہیں کی نعوذ باللہ۔ اس نے دھوکا دیا ہمیں۔''

''کوئی دھوکا نہیں۔'' اریبہ کی آواز حلیمہ کی آواز سے بلند تھی۔ ''ہر بات ہر ایک سے کہنے کی نہیں ہوتی سمجھیں...... کم ظرف اور کم علم کبھی اچھے راز دار اور پردہ پوش نہیں ہوتے۔''

اریبہ نے جیسے تھپڑ دے مارا تھا۔ حلیمہ تلملا کر رہ گئی۔ ادھر حسنل کو جیسے اس بحث سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کی گھورتی نظریں ماہ رو کے چہرے پر جمی تھیں۔

ایک مغرور' بے نیاز استہزائیہ تاثر...... جس میں حقارت کے ساتھ نفرت کی آمیزش تھی۔

''ہمارا دین اس سب کی تعلیم تو نہیں دیتا حلیمہ!''

اریبہ کا لہجہ ملال سے بوجھل ہو گیا۔ اس نے بحث سمیٹنی چاہی۔ اسے پتا لگ گیا۔ اس بحث لاحاصل میں پڑ کر وہ ماہ رو کو مزید تکلیف دے گی۔ کیونکہ حلیمہ ڈٹی ہوئی تھی۔ ٹھیک ہیں یہ دونوں چلی جائیں اس کے گھر سے۔

اسے خیال آیا۔ وہ تو ماہ رو کو دل جوئی کے خیال سے اپنے گھر لائی تھی۔

اس سے اچھا وہ ہاسٹل میں میکی کے ساتھ رہتی۔

''دین کی بات مت کرو۔'' حلیمہ نے ہاتھ لہرایا۔ ''تم مجھ سے زیادہ نہیں جان سکتیں دین کے بارے میں۔'' اریبہ نے چونک کر حلیمہ کو دیکھا۔

اس کا جملہ ایسا تھا جیسے کوئی سور ہیر...... اپنے پٹھے پر ہاتھ مار مار کے مقابل کو اکھاڑے میں آنے کی دعوت دے۔

اریبہ نے تو اپنے تئیں بات ختم کر دی تھی حلیمہ جیسے نیا آغاز چاہتی تھی۔ مگر اریبہ نے لمبا سانس کھینچا اور......

کرسی عین اس کے مقابل رکھ لی اور قطعی تاثرات کے ساتھ حلیمہ کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس کی نظروں میں جارحیت اور درشتی تھی۔

''ہاں...... میں تم سے زیادہ جانتی ہوں دین کے بارے میں...... حلیمہ! تم نے اسلام کو سمجھ کیا رکھا ہے۔ ہر انسان دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ اللہ کی وحدانیت کا اقرار اور بندگی کا وعدہ کر کے دنیا میں آتا ہے۔ تفریق تو پھر دنیا میں آنے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ ہدایت کا راستہ ہر ایک کے لیے کھلا ہوتا ہے۔

تم سے کس نے کہہ دیا کہ مسلمان وہی ہوگا جو مسلمان پیدا ہوگا۔ ایسا ہوتا تو تبلیغ شروع ہی کیوں کی گئی۔ کوہ صفا پر کھڑے ہو کر دیا جانے والا پیغام ہر خاص و عام کے لیے تھا آ جاؤ دین کی طرف حق کی طرف' اللہ کی طرف...... اللہ جو ایک ہے۔ میرے آقا (صلی اللہ علیہ وسلم) چھوڑ دیتے سب کو ان کے حالوں پر...... اور خود اللہ کی عبادت میں مشغول ہو جاتے۔

انہیں تو یہ پیغام دنیا کو دینا تھا ناں۔

اور یہ پیغام صرف ایک فارورڈ میسیج نہیں تھا۔ جسے سینڈ ٹو آل کر کے جان چھڑا لی جاتی...... اس کے لیے انہوں نے کوشش کی اور کوشش بھی ایسی۔''

اریبہ کی آواز بھرا گئی۔

ادھر حلیمہ کے چہرے پر پل بھر کی حیرت کے بعد ناپسندیدگی ابھری تھی۔ وہ ہاتھ اٹھا کر اریبہ کو ٹوک دینا چاہتی تھی۔ اس نے جگہ سے اٹھنا بھی چاہا تھا۔

مگر اریبہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''ابھی تم صرف مجھے سنو گی...... سمجھیں۔

اسلام ایک شخص کے لیے نہیں تھا۔ یہ ایک عالمی دعوت تھی اور عالم میں تو ہر طرح کے لوگ بستے ہیں۔ یہ بت پرستوں کے لیے تھی۔ مجوسیوں کے لیے' صابئین اور الحاد کے لیے...... عیسائیت اور یہودیت بھی اس سے پیغام سے مبرا نہیں تھے۔

یہ پیغام انسانوں کے لیے تھا۔ عورت مرد کی تخصیص نہیں تھی۔ بڑے چھوٹے کا فرق بھی نہیں تھا حلیمہ!

اور قریش ہنستے تھے۔ مذاق اڑاتے تھے۔ پر ہمارے پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے

قدم پیچھے نہیں ہٹے۔ انہیں لوگوں کو مائل کرتا تھا۔ ہجرت حبشہ بھول گئیں۔ معاشرتی مقاطعہ کیوں سہا۔ دین کی تبلیغ کے لیے ناں۔

کون کون سا حربہ استعمال نہ کیا گیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم باز آجائیں۔

''جان عم میرے اوپر اتنا بار نہ ڈال کہ میں اٹھا نہ سکوں۔''

تب ہٹ جاتے میرے نبی..... مگر انہوں نے انکار کردیا۔

پہلی جماعت کے بچے کو بھی وہ جواب یاد ہے حلیمہ جو تم بھول چکی ہو۔

''خدا کی قسم اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے پر چاند رکھ دیں تو بھی میں اپنے فرض سے باز نہ آؤں گا۔ یہاں تک کہ میں کامیاب ہوجاؤں گا یا اسی راہ میں قربان ہوجاؤں گا۔''

ہماری نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو اپنی طرف اپنے اللہ کی طرف بلانے کے لیے جان کی قربانی پیش کرنے کو تیار تھے کہ کسی طرح لوگ حق کی طرف لوٹ آئیں۔ اور تم جیسے لوگ آنے والوں کے ایمان پر شک کرتے ہو۔

کیا نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم ایسا سلوک کرنے کے لیے انہیں بلاتے تھے۔ کوشش کرتے تھے۔ دعا کرتے تھے۔ تکلیفیں برداشت کرتے تھے۔ بولو..... بولتیں کیوں نہیں؟ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے تو کبھی کسی کے ایمان پر شک نہیں کیا۔

حالانکہ وہ منافق اول عبداللہ ابن ابی بغلوں میں بت چھپا کر آیا کرتا تھا۔

کسی کے ایمان کو کمتر نہیں جانا۔ تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آتا کہ میزان اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ دل کا حال وہی جانتا ہے۔'' اریبہ کی آواز گھٹ گئی۔

''تم جواب دو حسنل..... تمہاری علمیت تو ہم سب سے زیادہ ہے۔ ابھی تم نے اپنے خاندان کی علمیت' وہ نجابت گنوائی ہے۔ کیا تمہارے نانا اس لیے تبلیغ کرتے ہیں کہ بعد میں.....''

''میرا اس موضوع سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں یہ سب ڈسکس کرنے نہیں آئی یہاں۔''

حسنل کو اریبہ کے جملوں نے ساکت تو کردیا تھا۔ وہ اٹھنے کی خواہش کے باوجود جنبش بھی نہ کرپائی تھی۔ مگر اب جب پکارا گیا تو بے اعتنائی سے جواب دے کر پرس کی ڈوری کندھے پر ڈال لی۔

''اچھا تو پھر تم یہاں کیوں آئی تھیں۔ اسے ذلیل کرنے کے لیے.....'' اریبہ نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ماہ رو کی سمت جو بھری آنکھوں اور بے تاثر چہرے کے ساتھ ساکت وصامت بیٹھی تھی۔

''مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے کسی کو ذلیل کرنے کی..... مجھے بس یہ کلیئر کرنا تھا کہ یہ پہلے اپنی شکل دیکھے اور پھر جھوٹ گھڑے۔''

''میں جھوٹ نہیں بول رہی..... تم سمیع سے تصدیق کرسکتی ہو۔'' ماہ رو اتنے زور سے بولی اور خود ہی گلا پکڑ کر بیٹھ گئی۔

حسنل پھنکاری۔ ''دوبارہ نام مت لینا سمیع کا..... وہ موسیٰ ہے موسیٰ۔''

''اریبہ کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ ابھری۔

''نام نہ لینے سے حقیقت بدل نہیں جائے گی حسنل..... تمہاری دعا قبول ہوئی ہے اس سے بھی انکار نہیں..... مگر ایک بات یاد رکھنا..... جب جب موسیٰ بی کو دیکھو گی تب تب..... تمہیں یاد آئے گا کہ موسیٰ اور اس کے گھر والوں کی پہلی چوائس ماہ رو فیاض تھی۔ وہ ماہ رو جسے تم شکل دیکھنے کا مشورہ دیتی ہو اور تم.....''

وہ حلیمہ کی سمت گھومی۔ ''جو گھن کھاتی ہو اور کسی ورسے پر کہیں نہیں رکتیں۔''

حلیمہ اتنے زور سے کرسی سے اٹھی کہ کرسی الٹ گئی۔ ''ان جیسے لوگوں کو تم جیسے لوگ ہی سر پر چڑھاتے ہیں۔ اور پھر پچھتاتے ہیں۔'' حلیمہ بولی۔

''اور تم جیسے لوگوں کو پچھتاوا بھی نصیب نہیں ہوتا۔'' اریبہ زہر میں بجھے لہجے میں بولی۔

جہنم میں گئی دوستی اور رواداری۔ جب وہ ایسی

بے دید ہوگئی تھیں۔ اریبہ کو خود پر افسوس ہورہا تھا۔

دوستی کے نام پر اس نے پتھر چن لیے تھے اور اب یہ بوجھ سہا نہیں جاتا تھا۔

اریبہ اس طرح سے دروازے کے سامنے کھڑی تھی کہ گزرنے کے لیے اس کا ہٹنا ضروری تھا۔

وہ یکدم دروازے سے سائیڈ پر ہوگئی۔ حلیمہ اور حسنل نے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا اریبہ کا اشارہ سمجھنے میں کوئی مشکل نہیں تھی۔

اس نے زبان ہلائے بغیر راستہ چھوڑ کر دراصل انہیں گھر سے چلے جانے کا کہہ دیا تھا۔ یکدم ماہ رو اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔

''حسنل کو یہ بھی بتا دو اریبہ..... رشتے داری بھی سچ ہے۔ قیامت تک رہے گی۔ سمیع کا رشتہ آیا تھا یہ تصدیق کرسکتی ہے۔ خدیجہ بانو کا نام لینا..... سب سامنے آجائے گا۔ یہ بھی کہ سمیع کے رشتے سے انکار بھی میں نے کیا تھا۔''

حسنل بل کھائی ناگن کی طرح پلٹی تھی۔ اسے یوں لگا تھا جیسے ماہ رو نے گالی دی ہو۔ پھر وہ رکی نہیں۔ حلیمہ اس کا ہاتھ پکڑ کر نکل گئی تھی۔

ماہ رو بے دم ہو کر بیٹھ گئی تھی۔ اریبہ کو لگتا تھا وہ زندگی بھر ماہ رو سے نگاہ نہیں ملا سکے گی۔

☆☆☆

''ماضی ختم ہوگیا تھا، اور وہ تینوں حال میں بیٹھی تھیں۔ ادھر یہ..... (ادھر لندن میں موسیٰ اور ماہ رو)

''اتنے سال بعد..... عبدالمبین جیسے شخص کی ہمراہی نے بھی تمہارے دل کی کالک کو نہیں دھویا۔ حلیمہ!'' اریبہ کا لہجہ افسردہ تھا۔ ''تم آج بھی ویسی کی ویسی ہو۔ دوسروں کے ایمان پر شک کرنے والی..... تمہاری اپنی عدالت ہے۔ جس میں تم ہر ایک کو مجرم قرار دیتی ہو۔ کوئی صفائی، کوئی گواہ، کوئی ثبوت تمہارے دل پر لگے قفل کو نہیں کھولتا۔ اور تم مجھے منت ترلے کر کے یہاں لے آئی ہو کہ ہم مل کر حسنل کو سمجھائیں گے۔ کیا سمجھانا آسان ہوتا ہے۔ تمہاری سمجھ میں آج تک نہیں آیا کہ تم نے ماہ رو کے ساتھ کتنا غلط کیا تھا۔ مجھے حیرت ہے تمہارے چہرے پر آج بھی شرمندگی کی رمق تک نہیں۔

حالانکہ تمہارا میاں تبلیغ دین سے منسلک ہے۔ تم نے اسے نہیں روکا کہ فضول کوشش ترک کردے۔ اس سے کچھ حاصل نہیں..... کیونکہ ان کے ہاتھوں اسلام قبول کر کے آنے والوں کو جب تم اپنی کسوٹی پر پرکھو گی تو کھوٹا کہہ کر دھتکار دو گی۔''

''ان سب میں سے کوئی بھی اسلام قبول کرنے کے بعد بھی چرچ نہیں جاتا ہے۔'' حلیمہ نے اتنے سال بعد ایک اعتراض ڈھونڈ ہی نکالا تھا۔

''اس نے چرچ جانے کی وجہ بتائی تھی حلیمہ..... تمہیں اس پر ترس نہیں آیا۔ اس نے صحیح اور غلط کے بیچ میں سے صحیح کو ڈھونڈ لیا تھا۔ ہمیں تو وارم ویل کم دینا چاہیے تھا۔ اور ہم نے اس کے ساتھ وہ کر دیا کہ اسے پیچھے دھکیل دیا۔ ایسے کہ وہ کہنے پر مجبور ہوگئی کہ مذہب غیر ضروری چیز ہے۔ مذہب کی کوئی حیثیت ہی نہیں..... ہم نے اسے اپنے دین سے دور نہیں کیا۔ ہم نے اس کا ہر چیز پر سے ایمان اٹھا دیا۔''

اتنے سال بعد بھی ماہ رو کے نام پر اریبہ کا دل اسی درد سے دھڑکتا تھا۔

''ہم کا لفظ کیوں استعمال کر رہی ہو۔ تم تھیں ناں اس کی دلداری کے لیے۔'' خاموش بیٹھی حسنل کا یہ پہلا جملہ تھا۔

اریبہ ماضی کو ٹٹول رہی تھی۔ اس کی اصل مجرم حلیمہ تھی۔ وہ برملا کہتی تھی حالات وواقعات جو بھی رہے ہوں مگر اس میں جو کردار حلیمہ نے ادا کیا وہ سب سے دل خراش تھا۔ کیونکہ حلیمہ دوست تھی۔

دوستی ہنسی ہوتی ہے۔ دو آنکھوں سے بہنے والا ایک آنسو.....

دوستی خوشی ہوتی ہے۔ دوستی سرگوشی ہوتی ہے۔ دوستی راز ہوتی ہے۔

دوستی کتاب ہوتی ہے۔ نصاب زندگی کا سب سے حسین باب.....

اور دوست..... آہ کیا حلیمہ جیسے.....؟؟

"اسے دلداری کی نہیں غم گساری کی ضرورت تھی حسنل......" وہ حلیمہ کی سمت سے رخ موڑ کر اس کی جانب متوجہ ہوئی۔

"تم نے چوٹیوں کو سر کرنے والے دیکھے ہیں۔ وہ کتنی کٹھنائیاں طے کر کے اوپر پہنچتے ہیں اور اوپر سے پہنچنے پر اگر کوئی انہیں شانوں سے تھام کر پیچھے کو دھکیل دے' اس نے یہی کیا ماہ رو کے ساتھ...... کتنا پاکیزہ' بُردبار' متین سراپا ہے اس کا مگر اس کا دل......؟؟

مجھے طعنے مارنے کی عادت نہیں...... لیکن کبھی کبھی سوچتی ہوں۔ تمہاری بے اولادی ماہ رو کی آنکھ سے ٹپک کر منجمد ہوجانے والے آنسوؤں کا نتیجہ تو نہیں۔ تم نے اس کا مان توڑا تھا۔ دل توڑا تھا۔

وہ دل جس کو مصفّیٰ کرنے میں اس نے عمر لگائی تھی۔"

نہ چاہتے ہوئے بھی اریبہ کے منہ سے یہ کلمات نکل گئے تھے۔

حلیمہ کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

ہاں یہ عین ممکن تھا۔ جسمانی لحاظ سے وہ دونوں میاں بیوی بالکل فٹ تھے۔ مگر اس کے باوجود...... اس نے دعا مانگنے میں کسر نہیں چھوڑی تھی۔

عبدالمبین اسے صبر کی تلقین کرتا تھا۔

نانا جان نے اس کی بے قراری دیکھ کر اسے استغفار کی کثرت کا کہا۔

وہ کرتی تھی...... پنجم کلمے کا ورد......

"وہ گناہ جو جان کر کیا...... اور وہ جو جانے انجانے میں۔"

مگر اس کا کیا کیجیے کہ ماہ رو کے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک کو اس نے کبھی گناہ میں شمار ہی نہ کیا۔ اور اب بھی ایک پل کو چونکنے کے بعد اس کے چہرے پر ہٹ دھرمی عود کر آئی تھی۔

اور اریبہ جو متوقع نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ کہ ابھی اس پتھر سے چشمہ پھوٹے گا۔ وہ مانے گی کہ

ہاں وہ ایک گناہ دل توڑنے کا...... سرزد ہوا تھا۔ افسوس صد افسوس۔ ایسا کچھ نہ ہوا۔

اریبہ نے اپنا ڈھلکا دوپٹا سر پر ٹکایا۔ بیگ اسٹریپ کو شانے پر ڈالا۔ اس کا یہاں کوئی کام نہیں تھا۔

نجانے کیوں وہ حلیمہ کے منّت بھرے اصرار پر حسنل بی بی کو سمجھانے چلی آئی تھی۔

"اور جہاں تک تمہیں سمجھانے یا عقل دینے کی بات ہے حسنل ایہ ناممکن ہے۔ ہم نے سیکنڈ ایئر میں معارف اسلام پڑھی تھی۔ اس میں سورۃ البقرہ ہے۔ مجھے "صُمٌّ بُکمٌ عُمیٌ" والی آیت سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ آج تمہیں دیکھتی ہوں ناں...... تو اس آیت کو سمجھانے کے لیے تم سے بڑی مثال اور کوئی نہیں...... تیرہ برس ہو گئے مجھے سورۃ البقرہ ترجمے اور تفسیر سے پڑھاتے ہوئے' خدا کی قسم تفسیر کہتی جاتی ہوں اور چشم تصور میں تم دکھائی دیتی ہو۔

گیارہویں بارہویں جماعت کی بچیوں کو گہرائی سے سمجھ میں نہیں آتا۔ تب میرا دل چاہتا ہے۔ کتاب بند کر کے انہیں تمہاری کہانی سنانا شروع کردوں۔ کیسے تم سب جانتے بوجھتے انکار کرتی ہو۔"

"یہ زیادہ ہوگیا ہے اریبہ! بہتر ہے تم حلیمہ اور ماہ رو تک ہی محدود رہو۔" حسنل اپنی جگہ سے اٹھی تھی۔ اس کے چہرے نے رنگ بدل لیا تھا۔ وہ لال بھبھوکا ہوگیا تھا۔

"مجھ پر تبصرہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ تمہاری سیکنڈ ایئر کی کلاس نہیں ہے۔ جہاں تمہیں خاموشی سے سنا جائے گا۔"

کتنی بڑی بات کہہ دی اریبہ نے اور اسے اتنے سکون سے سن لینا حسنل ہی کا کمال تھا۔

"میں اپنی سیکنڈ ایر کی کلاس میں ایک لفظ بھی اپنی مرضی سے نہیں کہتی۔" اریبہ نے ایک ایک لفظ کو چبایا۔

"جو لکھا ہوتا ہے پڑھ کر سنا دیتی ہوں۔

آج تختہ سیاہ میرے پیچھے ہے۔ کل تختہ سیاہ

میرے سامنے تھا۔ مجھے تمہارا عشق سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھتا تو میرے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا۔ اس عشق کے تصور سے نہ میرے اندر سنسنی کی لہر دوڑتی تھی نہ پہلو میں گدگداہٹ ہوتی تھی۔

میرے گھر میں رشتوں اور جہیز کے مسائل کو لیے بیٹھی بڑی عمر کی بہنیں' بیمار والدین...... میری زندگی میں عشق وعاشقی جیسی عیاشی کی گنجائش ہی نہیں تھی۔

زندگی اپنی تلخ سچائیوں کے ساتھ ہوش سنبھالنے سے بھی پہلے مجھ پر عیاں تھی۔ مجھے تمہارے عشق کی تو کیا یہ لفظ ہی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ لیکن آج اتنے سال بعد تمہیں اس حال میں دیکھ کر اگر کوئی مجھ سے اس عشق کے بارے میں سوال کرے تو میں جواب دے سکتی ہوں۔"

بہت نپے تلے جملے کہتے کہتے اس نے جھٹکے سے سر اٹھا کر وثوق سے کہا۔

حسنل کی ملی ہوئی بھنویں مزید سکڑی تھیں!

"وہ فقط جنس مخالف کی کشش تھی تمہارے خیالات کی پراگندگی...... اپنی نفسانی خواہشات کو عشق کا نام دے کر تمہیں کیا لگا تم چھپ جاؤ گی...... تمہارا اندر عیاں نہیں ہوگا۔ اٹھارہ انیس برس کی عمر میں ہمیں گہرائی سے تجزیہ کرنا نہیں آتا تھا۔ اور یہ خیال گدگداتا تھا کہ حسنل کا ایک آئیڈیل ہے اور وہ انسان مجسم ہو کر سامنے آ گیا۔ اس پر تمہاری تڑپ تمہارا رونا بکھرنا۔ اپنے ماحول سے فرار کی کوشش تھی۔ عشق وشق کچھ نہیں تھا۔

راستہ تھا...... اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے چُنا جانے والا سب سے آسان راستہ...... تم جانتی تھیں۔ مفتی عبدالرحمٰن جیسے انسان کے گھر میں رہ کر لاکھ سر پٹخ کر بھی تمہیں ویسی ہی زندگی گزارنی تھی جیسے وہ سب گزار رہے تھے۔ تمہیں موسیٰ سے بھی عشق تھا ہی نہیں...... تمہیں یہ سب چاہیے تھا۔" اریبہ نے گردن اٹھا کر چھت کو دیکھا' در و دیوار کو دیکھا۔

"یہ تمہارے لاشعور میں بسی خواہشات تھیں۔"

"ڈنکے کی چوٹ پر کہتی پھرتی ہو کہ ہوش سنبھالنے سے بھی پہلے جو شبیہ گھڑی وہ موسیٰ کی تھی۔ نہیں حسنل...... یہ تمہاری سوچ کی گمراہی تھی اور کچھ بھی نہیں۔ ورنہ میں تو پندرہ برس کی عمر تک گڑیا گھر سے کھیلتی تھی۔ میرے نزدیک شادی دلہن بن کر اسٹیج پر بیٹھنے سے بڑھ کر کچھ نہیں تھی۔ وہ عشق نہیں تھا خواہشات کا غلبہ تھا۔

ورنہ عشق میں تو لوگ ایسے لت پت ہو جاتے ہیں کہ وجود مٹی ہو جاتا ہے۔ عاشق تم سے حسابی، تم سے پریکٹیکل نہیں ہوتے۔"

"تم میرے گھر میں کھڑی ہو اریبہ...... اگر اب ایک لفظ اور بولیں تو میں سارا لحاظ بھول جاؤں گی۔"

"اچھا تو تم لحاظ رکھتی بھی ہو؟ تم کبھی محاظ نہیں رکھتیں۔ تم کسی کا لحاظ نہیں رکھتیں۔ حسنل!"

"میں ایسے ہی بلا سوچے سمجھے نہیں بول رہی حلیمہ!" اریبہ نے ششدر بیٹھی حلیمہ کی سمت رخ موڑا۔ "میں نے بہت سوچا اور یہ نتیجہ نکالا ہے۔" اریبہ نے پرزور انداز سے کہا۔

"نفس امارہ کے ہاتھوں مغلوب ہو جانے والی کا نام حسنل ہے۔ اس پر اس کی ڈھٹائی...... اوہ۔"

اریبہ نے جیسے تاب نہ لاتے ہوئے آنکھیں میچی تھیں۔ "اور بے خوفی اسے اس چیز تک کا ڈر نہیں کہ اس کے موٰی سے اختلافات اسے کیا بنا کر پیش کر رہے ہیں۔ یہ موٰی کو انکار نہیں کر رہی، اللہ کو انکار کر رہی ہے۔"

"اللہ کو بیچ میں مت لاؤ......" حسنل کے حلق میں خراش آ گئی تھی۔ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ اریبہ کا منہ نوچ لے۔

"ہاں اللہ۔" اریبہ کو اور بھی کچھ یاد آ گیا۔ "اللہ اور تمہاری دعائیں...... تمہارے تیقن و توکل پر کتنا رشک آتا تھا ہمیں...... خاص طور پر بے چاری ماہ رو کو...... وہ سب تو تمہاری مجبوری تھا حسنل اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ ناں۔

جس گھر خاندان اور پس منظر سے متعلق تھیں تم وہاں یہی تمہارا حربہ تھا۔ حلیمہ تھا تم نے ہوش سنبھالنے سے بھی پہلے ہر مشکل و ناممکن چیز کے ہو جانے کا وسیلہ دعا کو دیکھا تھا۔ تم کو یہی کرنا تھا۔

اس کو ہم ایسے سمجھ سکتے ہیں۔ کہ اگر تم ایک ایسے پس منظر سے تعلق رکھتیں جہاں تمام حاجات کے لیے پیروں فقیروں کے پاس جایا جاتا تو ہم دیکھتے تم کسی ڈھونگی بابے کا گھٹنا پکڑ کر بیٹھی ہوتیں۔ اور پڑھے ہوئے پانی کو گھر کے کونوں میں ڈالتیں اور موٰی کا تصور کر کے ہواؤں میں پھونکیں مارا کرتیں۔

اور اگر ہم دیکھیں کہ تم بادشاہ زادی ہو...... تو تم بزورِ تلوار عشق کو پایہ تکمیل تک پہنچاتیں۔

اور ایسے عشق کا دعویٰ اگر ایک طوائف کرتی تو دریچے میں کھڑے ہو کر ادائیں دکھا کر رجھاتی۔"

"اریبہ...... تم۔" حسنل کا ہاتھ اٹھا تھا مگر اریبہ کے گال تک پہنچنے سے پہلے حلیمہ حائل ہو گئی تھی۔ اس نے حسنل کو جکڑ لیا تھا۔

"چھوڑ دو مجھے۔" حسنل اس کی گرفت میں پھڑ پھڑا رہی تھی اور قابو نہ آ لی تھی۔

اریبہ نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسا کر ہونٹوں پر رکھ لی تھیں۔ اس کے چہرے پر تاسف تھا اور سر نفی میں ہلاتے ہوئے وہ شرم دلاتی نظروں سے حسنل کو تک رہی تھی۔

"تم نے بہت گندی مثال دی اریبہ......!"

حلیمہ سخت متاسف و بے یقین تھی۔

"میں اس سے زیادہ لپیٹ نہیں سکتی تھی۔" اریبہ کے مجبور لہجے میں ماتمی سوز گھل گیا۔

"تم......" حسنل نے بالآخر پورا زور لگا کر خود کو چھڑا لیا تھا۔ اس کی انگلی حلیمہ کی سمت اٹھی جس کا عبایا و اسکارف اس دھکم پیل میں بے ترتیب ہو گیا تھا۔

وہ باقاعدہ ہانپ رہی تھی۔

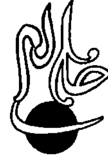
"تم اسے لے کر آئی تھیں ناں میرے گھر..." اس کی انگلی اب اریبہ کی سمت اشارہ کر رہی تھی۔ "تم اسے فوراً یہاں سے لے جاؤ۔ فوراً...... بلکہ تم دونوں چلی جاؤ یہاں سے...... آؤٹ، آؤٹ۔" وہ حلق کے بل چلائی تھی۔

حلیمہ ششدر رہ گئی۔ جبکہ اریبہ کے لبوں پر متاسف تبسم در آیا اسے یہی امید تھی حسنل سے۔

☆☆

(آخری قسط آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

نمرہ احمد



حالم

تالیہ خواب میں فاتح کے بن باؤ والے گھر میں، خود کو ایڈم کے ساتھ خزانہ تلاش کرتے ہوئے دیکھتی ہے۔ فاتح تالیہ سے اپنی فائل کی واپسی کا مطالبہ کرتا ہے اور اسے اپنے گھر آنے سے منع کر دیتا ہے۔ تالیہ کو عصرہ سے پتا چلتا ہے کہ وہ سکہ ایڈم کے پاس ہے۔ ایڈم اسے ایک جیولر کو بیچ دیتا ہے۔ تالیہ اس کے حوالے سے اسے الجھا دیتی ہے اور جیولر کو بلیک میل کر کے سکہ نکلوا لیتی ہے، مگر سکہ اس کے ہاتھ میں دینے کے بجائے ایڈم اپنے قبضے میں کر لیتا ہے۔

فارس صاحب کے ذریعے فاتح کو حالم کا پتا چلتا ہے۔ فائل کی واپسی کے لیے حالم صبح تک کا وقت مانگتا ہے اور اس منصوبے میں فاتح کو بھی شامل کرتا ہے۔ فاتح اس کی باتوں سے متاثر ہو کر راضی ہو جاتا ہے۔ ایڈم پر سکے کا اسرار کھلتا ہے۔ حالم پتا چلا لیتا ہے کہ فائل اشعر کے آفس میں ہے۔

سمیع تالیہ کو بلیک میل کرنے آتا ہے۔ بازار میں داتن سمیع کو دھمکا کر خوفزدہ کر دیتی ہے۔ حالم جان پہ کھیل کے اگلے روز ہی فائل اشعر کے سیف سے چرا کر لا دیتا ہے۔ فاتح، حالم سے بے حد متاثر ہوتا ہے۔



ایڈم کو تالیہ مشکوک لگتی ہے۔ وہ تالیہ کی گردن پہ نشان دیکھتا ہے تو اسے تاریخی کہانی یاد آجاتی ہے اور وہ سمجھ جاتا ہے کہ تالیہ اس سکے کے پیچھے ہے جو ایڈم کے پاس ہے۔ عصرہ سے فاتح جھوٹ بولتا ہے۔ عصرہ کو فاتح اور اشعر دونوں پہ غصہ آتا ہے۔ فاتح سن باؤ کے بیچنے سے پہلے وہاں ایک دن گزارنے جاتا ہے عصرہ تالیہ کی فرمائش پہ اسے بھی بلا لیتی ہے۔ فاتح سن باؤ کے گھر کی کہانی سناتا ہے۔ تالیہ اس گھر کے کنویں کو دیکھ کر سمجھ جاتی ہے کہ خزانہ کہاں ہے۔ وہ فاتح سے اس گھر کو خریدنے کی خواہش کا اظہار کرتی ہے۔ مگر وہ اسے بیچنے سے انکار کر دیتا ہے۔ فاتح کو یاد آتا ہے کہ وہ عصرہ اور بچوں کے ساتھ پہاڑوں کی سیر کو جاتا ہے جہاں آریانہ کو اس کی آیا دھوکے سے اغوا کر لیتی ہے۔ فاتح، آریانہ کے گرائے ہوئے پاپ کارن کے ذریعے آریانہ کی لاش تک پہنچ جاتا ہے۔ آریانہ مزاحمت کے دوران پہاڑ سے گر کر ہلاک ہو جاتی ہے۔ اس کے اغوا کار بھی کھائی میں گر کر مر جاتے ہیں۔ فاتح آریانہ کی مسخ شدہ لاش دفنا دیتا ہے۔ اور اس کی موت کا کسی کو نہیں بتاتا، کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ آریانہ کو صوفیہ رحمٰن نے اغوا کرایا تھا۔

ایڈم ملاکہ پہنچ جاتا ہے۔ ایڈم کو یقین دلانے کے لیے تالیہ بریسلیٹ اس کو دے دیتی ہے۔ ایڈم شک میں پڑ کر راستے میں فاتح کو سچ بتاتا ہے۔

آٹھویں قسط

گلی میں رش اب ماند پڑ گیا تھا۔ دکانیں ابھی تک کھلی تھیں مگر گہما گہمی کم ہو چکی تھی۔ تالیہ اپنا ہاٹ چاکلیٹ اَن چھوا چھوڑ کے اب سن باؤ کے گھر کے سامنے کھڑی تھی۔

دروازے پہ تالا تھا۔ اس نے اس میں لاک پک گھسائی اور چند لمحوں میں تالا کھل گیا۔

اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ سڑک پہ کوئی بھی اس طرف متوجہ نہ تھا' اور جتنے اعتماد سے وہ دروازہ کھول رہی تھی' اسے کسی نے دیکھ کے بھی گھر کی مالکن پہ محمول کیا ہوگا۔

اندر گھر سنسان اور تاریک تھا۔ اس نے پنسل ٹارچ آن کی اور روشنی اطراف میں ڈالتی آگے بڑھنے لگی۔

کنواں کونے میں خاموش پڑا تھا۔ وہ تیزی سے اس تک آئی اور اس کے دہانے سینے کے بل الٹی لیٹی اور کنویں کی دیوار کو اندر سے چھوا۔ وہاں دیوار میں کھدے ننھے ننھے سے زینے تھے جن کی مدد سے نیچے اترا جا سکتا تھا۔ اس نے عصرہ کی ویب سائٹ پہ پڑھا تھا کہ سن باؤ کے کنویں میں قدیم لاک سسٹم تھا' ان زینوں کی مدد سے جب اس کو کھولا گیا تو اندر چند پرانے سکے اور سن باؤ کے استعمال کی چیزیں ملیں جن سے معلوم ہوا کہ یہ گھر واقعی سن باؤ کا تھا۔ مگر وہ جانتی تھی کہ ان ننھے ننھے سوراخوں میں کچھ اور بھی ہوگا۔

سینے کے بل لیٹی وہ کنویں کے اندر جھکی۔ چوٹی الٹی ہو کے نیچے لٹکنے لگی۔ وہ تین سوراخ تھے۔ اتنے بڑے جتنی ایک اینٹ ہوتی ہے۔ گویا اینٹ کی جگہ خالی چھوڑی گئی تھی۔ اس نے پہلے سوراخ میں ہاتھ ڈالا۔ وہ خالی تھا۔

وہ اٹھی اور کنویں کی منڈیر پکڑ کے اندر اتری۔ احتیاط سے پہلے سوراخ میں پاؤں رکھے' اب وہ کنویں کے اندر لٹکی نظر آرہی تھی۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے دوسرا سوراخ ٹٹولا۔ وہ بھی اندر سے خالی تھا۔

اسے پسینہ آنے لگا۔ پیر کو دیوار کے ایک ابھرے پتھر پہ جمایا اور مزید نیچے اتری۔

اب تیسرا سوراخ اس کے سامنے تھا۔ تالیہ نے دھڑکتے دل سے اس میں ہاتھ ڈالا۔

یہ سوراخ زیادہ اندر تک گہرا تھا۔ آس پاس بے تحاشا کائی جمع تھی۔ اندر کوئی پتھر سا پڑا تھا جو مٹی میں جما ہوا تھا۔ وہ زور سے اسے کھینچنے لگی۔ مگر وہ نکل کے نہیں دے رہا تھا۔

چند فٹ نیچے کنویں کا پانی جمع تھا۔ عجیب حبس زدہ ماحول تھا۔ اسے پسینہ آنے لگا۔ پھر بیلٹ سے بندھا خنجر نکالا اور اندر سوراخ میں مارنے لگی۔ یہاں تک کہ پتھر علیحدہ ہو گیا۔ اس نے پتھر باہر نکالا اور دیوار کی اینٹوں کو پکڑے واپس اوپر چڑھ آئی۔

باہر آ کے اس نے گہرے گہرے سانس لیے۔ صحن اندھیرے میں ڈوبا تھا سوائے ٹارچ کی روشنی کے۔ تالیہ نے روشنی پتھر پہ مرکوز کی جس پہ کائی جمع تھی اور اسے صاف کرنے لگی۔

بدقت پتھر کی سطح واضح ہوئی۔ اس پہ قدیم جاوی رسم الخط میں ایک عبارت کھدی تھی۔ کائی نے عبارت میں سبز رنگ بھر دیا تھا۔

''تکن ملایو ہیلانگ دی دنیا۔'' (ملے قوم کبھی بھی دنیا سے غائب نہیں ہوگی۔)

یہ ہانگ تواکا مشہور قول تھا جس کو یاد کرتے کرتے ملے بچے بڑے ہوتے تھے۔

''تکن ملایو ہیلانگ دی دنیا۔'' اس نے سوچتے ہوئے الفاظ دہرائے۔ پھر آنکھیں بند کیں۔ یہ کوئی نشانی تھی۔

کوئی پہیلی۔

کیا مطلب ہوا اس کا؟

ملے نسل کبھی بھی دنیا کے چہرے سے غائب نہیں ہوگی۔

ملے نسل کبھی بھی غائب نہیں ہوگی۔

ملے نسل کبھی بھی مٹے گی نہیں.... غائب نہیں ہوگی....

اس نے آنکھیں کھولیں۔ الفاظ دوبارہ دیکھے مگر اب وہ ان کو پڑھ نہیں رہی تھی۔ وہ اس انداز کو دیکھ رہی تھی جس میں وہ لکھے تھے۔ تیر کی صورت۔ آخر میں چھوٹے ہو جاتے۔ جس پوزیشن میں پتھر پڑا تھا' اس لحاظ سے وہ نیچے کی طرف اشارہ کرتے تھے۔

تالیہ مسکرائی اور نیچے کنویں میں جھانکا جہاں پانی کسی بھرے ہوئے گول تھال کی صورت نظر آرہا تھا۔

وہ پتھر کنویں کے اوپر لائی اور اسے گرا دیا۔ پتھر نے پانی میں ڈبکی کھائی اور لمحے بھر کو سکوت چھا گیا۔

وہ سر جھکائے دیکھتی رہی۔ فلیش لائٹ پانی پہ تان رکھی تھی۔

دھیرے دھیرے پانی سمٹتا گیا۔ گھٹتا گیا۔ جیسے سوکھ رہا ہو۔ یہاں تک کہ اس کی سطح نیچے ہوتی گئی۔ کائی زدہ دیواریں برہنہ ہونے لگیں۔ وہ نیچے جاتا گیا اور بالآخر.... وہ ''غائب'' ہو گیا۔

غائب.... یہی نشانی تھی۔

وہ کنویں میں جھانک رہی تھی کہ صحن کے دوسرے کونے میں گڑگڑاہٹ ہوئی۔ وہ چونک کے گھومی۔ مخالف طرف.... مجسمے کے ساتھ... زمین میں کچھ ابھرا تھا۔ وہ تیزی سے اس طرف آئی۔

وہ لکڑی کا ایک ٹریپ ڈور تھا۔ جیسے فرش میں لگا ڈھکن ہو۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ یہ پہلے یہاں نہیں تھا۔ مگر اب وہ کائی زدہ ڈھکن یوں نظر آرہا تھا گویا صدیوں سے یہیں موجود ہو۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی خیز لہر دوڑ گئی۔ خزانہ کنویں کے نیچے نہیں تھا۔ خزانہ اس کے نیچے تھا۔

اس نے ڈھکن اٹھایا۔ وہ آرام سے اٹھ گیا۔

تالیہ نے روشنی نیچے پھینکی۔ وہاں زینے تھے جو نیچے گم ہو رہے تھے۔ آخر میں مدھم سا ایک دروازہ تھا۔

اسے دروازے کی چابی چاہیے تھی۔ اُف ایڈم۔

''ایڈم۔ کہاں ہو تم؟'' اس نے فون ملایا اور اس کی آواز سنتے ہی بولی۔

"میں جونکر اسٹریٹ پہ ہوں۔ کیا آپ کو خزانہ مل گیا۔"

"ہاں۔ تم سن باؤ کے گھر آؤ۔"

"آپ سن باؤ کے گھر میں ہیں؟ وان فاتح کے گھر؟"

"ہاں۔ ڈونٹ وری وہ چلے گئے ہیں۔ تم جلدی آؤ۔ دروازہ کھلا ہے۔ اور سنو۔" آخر میں قدرے غرائی۔ "اگر تم نے کسی بھی قسم کی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو میں دنیا کے آخری کونے تک تمہارا پیچھا کروں گی ایڈم۔"

"میں آرہا ہوں۔" وہ آہستہ سے بولا تھا۔

تالیہ نے بیک پیک کندھوں پہ ڈالا اور زینہ اترنے لگی۔ ٹارچ کی روشنی اپنے آگے پھینکتی جا رہی تھی۔ سنہری چوٹی بنائے منی کوٹ اور لمبی قمیص پہنے لڑکی بہت پرجوش لگ رہی تھی۔

سیڑھیاں ایک دروازے پہ جا کے ختم ہو گئیں۔

وہ لکڑی کا قدیم دروازہ تھا۔ اس پہ عجیب و غریب سے ہندسے لکھے تھے.... یہی تھا خزانے کا راستہ۔

یہی تھا اس کا وہ آخری موقع ...وہ آخری واردات جس کی وہ کب سے منتظر تھی۔

جزیرے کے اوپر وہ اونچا محل ....وہ پرسکون زندگی....

ان سب خوابوں کی تکمیل کا وقت آن پہنچا تھا۔ وہ جانتی تھی اس نے ایڈم کو چابی دے کر خطرہ مول لیا ہے' مگر اس کے خواب سچ بولتے تھے ہمیشہ۔ ان کے مطابق ایڈم اور وہ اس کھوج میں اکٹھے تھے۔ وہ اس کو بھی حصہ دے دے گی۔ دس فیصد۔ بس یہی بہت ہے۔

اب وہ دروازے کے ساتھ کھڑی بار بار گھڑی دیکھ رہی تھی۔ موبائل اسکرین کے مطابق ایڈم کا ٹریسر جونکر اسٹریٹ سے چل پڑا تھا اور اب وہ قریب ہی تھا۔ ایڈم نے دھوکا نہیں دیا۔ گڈ۔ وہ پرجوش سی دروازے کی سطح پہ ہاتھ پھیرنے لگی۔ لبوں پہ مسکراہٹ تھی۔

اندر کیا ہوگا؟ ضروری نہیں ہے کہ سونے چاندی کے ڈھیر ہوں۔ اونہوں۔ ان سے بھی کچھ زیادہ بیش قیمت ہوگا اندر۔ جیسے نوادرات۔ قدیم آرٹ۔ سکے۔ برتن۔ زیورات۔ مجسمے۔ کروڑوں کے بکتے تھے یہ سب۔ اگر یہ خزانہ سن باؤ کے دور کا تھا یعنی پندرہویں صدی کے وسط کا' تو قریباً چھ سو سال قدیم تھا۔ بلیک مارکیٹ میں وہ باری باری سب کو فروخت کر دے گی' اور تمام رقم آف شور منتقل کر کے وہ یہاں سے چلی جائے گی۔ ڈن۔

دروازے پہ آہٹ ہوئی اور ایڈم کی آواز آئی۔ "یہ تالیہ؟"

"نیچے آجاؤ ایڈم۔" اس نے دروازے پہ لکھے ہندسے پڑھتے ہوئے پکارا۔

"یہ آپ نے کھودا ہے؟" ایڈم نے سیڑھیوں کے اوپر سے جھانکا تو اس نے گردن اٹھائی۔

"باتوں کا وقت نہیں ہے۔ مجھے چابی دو۔"

اس کا سرخ سپید چہرہ جوش سے تمتما رہا تھا۔

اوپر کھڑے ایڈم کے چہرے پہ ہیجان سا ابھرا۔

"چابی جوڑ دی گئی ہے۔ دونوں ٹکڑے جڑ گئے ہیں۔"

تالیہ کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ آنکھوں میں غصہ در آیا۔ "واٹ؟ تم....اسٹوپڈ....میں نے منع کیا تھا ناتمہیں؟ تمہاری ہمت کیسے ہوئی کہ تم اس کو جوڑو۔"

"اس کی نہیں.... میری ہمت ہوئی ہے۔"

ایڈم کے پیچھے سے کوئی نکل کے سامنے آیا۔

تالیہ بنت مراد پتھر ہوگئی۔

وہ فاتح تھا۔

اس کا سانس رک گیا۔ بے اختیار وہ دروازے کی طرف ہٹی۔ مگر اب فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ اسے خشمگیں نگاہوں سے گھورتا زینہ اترنے لگا۔

تالیہ کا چہرہ سفید پڑنے لگا۔ اس نے بے یقینی سے فاتح کے پیچھے آتے ایڈم کو دیکھا جس کے چہرے پہ افسوس تھا۔

"تم نے مجھ سے سچ نہیں بولا تو میں نے باس سے سچ بول دیا۔"

وان فاتح اس کے عین سامنے آن رکا۔ سلگتی' سخت نظریں اس پہ جمی تھیں۔ تالیہ کی کمر دروازے سے لگی تھی۔ بدقت تھوک نگلا۔ "تو انکو!"

"تم....میرے گھر میں....کیا کر رہی ہو؟"

"میں....میں ایک پولیس آفیسر ہوں اور...."

اس نے بات بنانے کی کوشش کی مگر رنگت اڑی ہوئی تھی۔ یہ سب بہت غیر متوقع تھا۔

"تم کوئی پولیس آفیسر نہیں ہو۔ میں بتاتا ہوں تم کیا ہو۔" وہ اس کے قریب رکا اور چبا چبا کے بولا۔ "لالچی' جھوٹی اور چور! یہ ہو تم!"

الفاظ تھے کہ کیا۔ تالیہ نے لب بھینچ لیے۔ چند گہرے سانس لیے۔ تھوڑی دیر کے لیے سب خاموش رہے پھر اس لڑکی کی پیشانی پہ غصے سے سلوٹیں پڑنے لگیں۔ افسوس اور طیش سے اس نے فاتح کے عقب میں زینے پہ کھڑے ایڈم کو دیکھا۔

"وہ عثمان....وہ اس دن تمہیں ٹریپ کر رہا تھا مگر میں نے تمہیں بچایا' میں نے ہر موقع پہ تمہیں بچایا' اور یہ کیا تم نے میرے ساتھ۔ چھوڑوں گی نہیں میں تمہیں۔" انگلی اٹھا کے تنبیہہ کی۔ (ایڈم کا دل جانے کیوں دکھا۔) پھر فاتح کو دیکھا۔ "میں جو بھی ہوں اس سے آپ کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ چابی میری ہے۔ میرے بابا نے بنائی ہے۔ یہ خزانہ بھی میرا ہے۔"

"یہ گھر میرا ہے۔ تمہیں کس نے اجازت دی تھی تم یہاں کھدائی کرو؟" وہ غرایا۔ اتنا زور سے کہ وہ سہم کے ذرا پیچھے ہوئی' پھر دوبارہ ہمت کر کے گردن اکڑائی۔

"گھر آپ کا ہے۔ نیچے دبا خزانہ نہیں۔ اور میں نے یہاں کوئی کھدائی نہیں کی۔ یہ خزانے کا راستہ ہے۔"

"اول تو اس گھر کے نیچے کوئی خزانہ نہیں ہے' اور اگر ہے بھی سہی تو وہ سرکار کا ہے۔ وہ کسی میوزیم میں جائے گا۔"

تالیہ نے تڑپ کے اسے دیکھا۔ "وہ میرا ہے۔ اس پہ میرا حق ہے۔ خیر یہ فیصلہ ہم کورٹ میں کریں گے۔ مجھے میری چابی دیں۔ میں جا رہی ہوں یہاں سے۔" دوٹوک انداز میں ہتھیلی پھیلائی۔

"اور تمہیں لگتا ہے میں تمہیں ایسے جانے دوں گا؟ ایڈم!" اس نے نظریں تالیہ پہ مرکوز رکھے اسے پکارا۔

"جی سر۔"

"پولیس کو کال کرو۔ ابھی۔ بتاؤ کہ گھر میں چور آگیا ہے۔"

"جی باس۔" اس نے فون نکالا تو وہ تڑپ کے بولی۔

"میں نے کوئی چوری نہیں کی۔ یہ میرا حق ہے۔ یہ میرا ہے۔" اس کی آنکھیں سرخ پڑنے لگی تھیں۔ وہ دروازے کے ساتھ کھڑی تھی اور فاتح اس کے عین سامنے اسے غصے سے گھور رہا تھا۔

"ایڈم' میں کہہ رہا ہوں کال کرو پولیس کو۔"

"ایک منٹ۔" وہ جلدی سے بولی۔ دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ "پولیس کو مت بلاؤ۔ ہم تینوں خزانہ بانٹ سکتے ہیں آپس میں۔"

فاتح نے گویا بے بسی سے دونوں ابرو اٹھائے۔ "مجھے یقین نہیں آرہا۔ تم کیا چیز ہو؟"

"آپ کو الیکشن کے لیے پیسے چاہئیں، ہے نا۔" وہ جلدی جلدی بول رہی تھی۔ "آپ گھر نہ بھیجیں۔ خزانے میں سے اپنا حصہ لے لیں۔ تیس فیصد اور ایڈم بھی....." ایک سلگتی نظر اس پہ ڈالی۔ "دس فیصد رکھ سکتا ہے باقی میرا۔"

"صرف دس فیصد۔" ایڈم نے برا سا منہ بنایا تو وان فاتح نے گردن گھما کے غصے سے اسے دیکھا۔

"کوئی خزانہ نہیں بانٹ رہا یہاں۔ اول تو یہاں کوئی خزانہ ہے نہیں، اور اگر ہوا بھی تو یہ ملک کی امانت ہے۔ تم پولیس کو بلاؤ۔" پھر واپس گھوما تو وہ کھڑی بے بسی سے لب کاٹ رہی تھی۔

"تم آج جیل جا رہی ہو۔ ایک لمبے عرصے کے لیے۔ میں نے فائل والے واقعے کو جانے دیا مگر تم میرے گھر میں آ گئیں؟"

ایڈم موبائل پہ کہہ رہا تھا۔ "سن باؤ کا گھر.... وان فاتح کا گھر۔ وہاں پولیس کی ضرورت ہے۔ ایمرجنسی ہے۔" پھر تالیہ کو دیکھا۔ "ایک چور گھس آیا ہے۔ جی! جلدی بھیجیں کسی کو۔" دوسری طرف سے یقین دہانی کروا دی گئی تو اس نے فون ہٹا لیا۔ تالیہ نے صرف تیز نظروں سے اسے گھورا تھا۔ پھر فاتح کو دیکھا۔

"میں نے کوئی فائل نہیں چرائی آپ کی۔ اور کہاں ہے وہ فائل؟ ابھی کیا الزام لگائیں گے آپ پولیس کے سامنے مجھ پہ؟"

"میری بیوی کا بریسلیٹ۔" اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور سنہری چابی نکال کے لہرائی۔

"کیا ثبوت ہے کہ میں نے یہ چرایا ہے؟ یہ تو آپ کے ہاتھ میں ہے۔ میں پولیس کے سامنے انکار کر دوں گی۔"

"میری بات کے آگے تمہاری بات معتبر لگے گی کیا؟" وہ بھنویں اچکائے برہمی سے کہہ رہا تھا۔

تالیہ نے سلگ کے ایڈم کو دیکھا۔ "چھوڑوں گی نہیں میں تمہیں۔"

ایڈم نے اتنی ہی خفگی سے منہ بنایا۔ "آپ نے اگر مجھ سے سچ بولا ہوتا تو....."

"تو تب بھی تم یہی کرتے' ڈفر۔ اس لئے اب چپ رہو۔" جھڑک کے بولی تو وہ چپ ہو گیا۔

"تمہیں ایڈم کی نہیں اس وقت اپنی فکر کرنی چاہیے کیونکہ تم لمبے عرصے کے لیے جیل جا رہی ہو۔"

"ٹھیک ہے۔" اس کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ "آپ مجھے جیل بھیج دیں مگر میں ایک دفعہ خزانہ دیکھنا چاہتی ہوں۔ مجھے دروازہ کھولنے دیں۔"

"اوہ۔ تمہارے خیال میں سو کالڈ خزانہ دیکھ کے میرا ارادہ بدل جائے گا؟" وہ تلخی سے مسکرایا۔

"کیا آپ کو خود خوف ہے کہ خزانہ دیکھ کے آپ کا ارادہ بدل جائے گا؟ آپ دروازہ کھولنے سے ڈرتے ہیں کیا؟" وہ اپنے حواسوں پہ قابو پا چکی تھی اور اب چیلنجنگ انداز میں پوچھ رہی تھی۔ وہ لمحے بھر کو چپ ہوا۔

"مجھے کوئی خوف نہیں ہے۔ پولیس کے آنے تک دروازہ کھول کے دیکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن یہ مت سمجھنا' تم مجھے لالچ دے سکتی ہو۔"

"دیکھتے ہیں....." وہ اسی انداز میں مسکرائی اور دروازے کے سامنے سے ہٹ گئی۔ یہ چیلنج یہ مسکراہٹ.....گویا کہہ رہی ہو پیسے سے کسی کو بھی خریدا جا سکتا ہے.... یہ انداز وان فاتح کو اکسانے کے لئے کافی تھا۔ وہ قریب آیا اور دروازے کے تالے میں چابی گھمائی۔

"تم جیل جاؤ گی' سمجھ میں آیا۔" ایک نظر اسے دیکھا۔

تالیہ نے تعظیم سے سر ہلا دیا۔ "جو حکم....."

توانکو!"

تالا ایک بڑی سی زنجیر پہ لگا تھا اور زنجیر نے دروازے کو جکڑا ہوا تھا۔ فاتح نے چابی گھمائی تو ایڈم پریشانی سے پکارا تھا۔

"سر.....اس کو مت کھولیں۔ پتہ نہیں اندر کیا ہو۔"

تالیہ نے کھول کے اسے دیکھا۔ "تم تو چپ ہی رہو۔"

"میرے پاس گن بھی ہے' بچے تالیہ۔" اس نے شرٹ اٹھا کے ہولسٹر میں لگا پستول دکھایا۔ "اگر آپ اس دروازے کے ذریعے فرار کا سوچ رہی ہیں تو اس خیال کو ذہن سے نکال دیں۔ فی الوقت میں وان فاتح کا باڈی مین ہی نہیں' باڈی گارڈ بھی ہوں۔"

تالیہ نے برہمی سے چہرہ موڑ لیا۔ فاتح صرف مسکرایا' بولا کچھ نہیں۔ وہ زنجیر اتار رہا تھا۔

"ویسے میرا نہیں خیال اندر کوئی خزانہ ہے۔ تم نے اپنا وقت اور زندگی صرف ضائع کی ہے لعل حسیف۔" افسوس سے کہتے ہوئے اس نے دروازہ دھکیلا۔

آگے اندھیرا تھا۔ گھپ اندھیرا۔ تالیہ نے فلیش لائٹ کی روشنی ڈالی تو روش سی نظر آئی۔ پتھروں کی بنی خالی روش۔

فاتح نے ہاتھ بڑھایا۔ "ٹارچ!" بس یک لفظی حکم اور تالیہ نے چپ چاپ ٹارچ اسے تھما دی۔ اس نے روشنی آگے ڈالی اور اندر داخل ہوا۔

"سر ہمیں پولیس کا انتظار کرنا چاہیے۔" ایڈم بے بسی سے بولا مگر وہ دونوں چوکھٹ عبور کر چکے تھے۔ وہ بھی چار و ناچار پیچھے آیا۔ دروازے میں سے آخری داخل ہونے والا شخص ایڈم تھا۔ اس کے اندر آتے ہی دروازہ ہلکی سی آواز سے بند ہو گیا۔

راہداری تاریک تھی۔ کہیں ٹپ ٹپ کی آوازیں آ رہی تھیں گویا پانی ٹپک رہا تھا۔ وہ تینوں قطار کی صورت آگے بڑھتے گئے۔

"پھر کہاں ہے تمہارا خزانہ؟" فاتح آنکھیں چھوٹی کیے اطراف میں دیکھتا روشنی آگے ڈال رہا تھا۔

"ہو گا۔ آگے ہو گا۔" وہ بے چینی سے بولی۔ دل تجسس سے لبریز تھا۔ اس کے خواب جھوٹے نہیں ہو سکتے تھے۔

ایک موڑ مڑ کے وہ آگے آئے تو راہداری چوڑی ہو گئی۔ دو مخالف سمتوں سے دو راہداریاں آ کے مل رہی تھیں اور دونوں میں پانی تھا۔ اتنا کہ پاؤں ڈوب جاتے۔ تالیہ کو عجیب سا احساس ہونے لگا مگر وہ رکی نہیں۔ وہ چلتی رہی۔

"پانی چل رہا ہے۔ یہ سب کیا ہے؟" اسے وحشت سی ہو رہی تھی۔ پیر پانی میں ڈوب چکے تھے اور وہ عجیب پانی تھا جو لگتا تھا وائبریٹ کر رہا ہے۔ دھیرے دھیرے۔

اوپر چھت سے قطرے زور زور سے بہنے لگے۔ ٹپ ٹپ۔ پھر تڑاتڑ۔ تالیہ کو پہلی دفعہ لگا کچھ غلط ہے مگر نہیں.....وہ ہار نہیں مانے گی۔ خزانہ آگے ہو گا۔ کسی محفوظ جگہ پہ۔

"تو کہاں ہے تمہارا خزانہ' تاشہ صاحبہ۔" وہ جو سب سے آگے تھا' اور پانی برسنے کے باوجود آرام سے چلتا جا رہا تھا.... طنز سے بولا۔ تالیہ نے جواب نہیں دیا۔ ادھر ادھر متلاشی نظروں سے دیکھتی رہی۔ وہ پانی سے بھری دونوں راہداریوں کے ملاپ پہ موجود تھی۔

یکا یک وہ ٹھہری۔ بے یقینی سے اطراف میں دیکھا۔ پھر اوپر۔ جھماکے سے کچھ یاد آیا۔

دو دریاؤں کا سنگم۔ برستی بارش۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے مدھم روشنی میں دیکھنا چاہا۔ وہ تنگ سے دو دریا تھے۔ زمین گدلی تھی۔ اس کے پیر کیچڑ میں لتھڑ گئے تھے۔ یہی تو اس کا خواب تھا۔ دو

دریاؤں کا سنگم۔

وہ چونک گئی۔ اپنے پیروں کو دیکھا۔ وہ پانی اور مٹی سے لتھڑے ہوئے تھے۔

اس کے خواب علامتی نہیں تھے۔ وہ مستقبل کا عکس تھے۔ ہو بہو۔

"رک کیوں گئی ہو؟ چلو۔ میں تمہارے خزانے والے ڈرامے کا بھی فائنل شو — دیکھنا چاہتا ہوں۔ آؤ۔" وہ اسے رکتے دیکھ کے سختی سے بولا تو وہ چلنے لگی۔ مگر حالت عجیب ہو رہی تھی۔ اوپر چھت تاریک تھی گویا آسمان ہو۔ پانی ٹپ ٹپ برس رہا تھا۔ وہ تینوں بھیگتے جا رہے تھے مگر چل رہے تھے۔

دوسری راہداری.... یا دوسرا دریا.... اب سکڑتا جا رہا تھا' یہاں تک کہ پتھروں سے بنی سوکھی روش نظر آنے لگی جیسی شروع میں دروازہ کھولتے ہی نظر آئی تھی۔ اس کے آگے ایک اور دروازہ تھا۔ ہو بہو پہلے جیسا دروازہ۔ مگر نیا نکور۔ لکڑی کی خوشبو تک آ رہی تھی۔

پانی ٹپکنا اب بند ہو گیا تھا۔

"تمہارا خزانہ تو نہیں آیا ابھی تک۔" طنز سے بولتے ہوئے اس نے دروازے کے قفل میں چابی ڈالی۔ تالیہ خاموش رہی۔ ایڈم البتہ بے چین سا لگتا تھا۔

"سر.... ہمیں واپس جانا چاہیے۔ کیا پتا آگے بجے تالیہ کے لئے فرار کا راستہ ہو' ان کے گینگ کے ساتھی ان کا انتظار کر رہے ہوں۔"

"یہ فی الحال کہیں نہیں بھاگ سکتی۔" تالا کھول کے اس نے زنجیر اتاری۔ چابی مدھم سی چمک رہی تھی۔ تالیہ کی آنکھیں چھوٹی ہوئیں۔ اس پہ ہندسے ابھرے تھے۔ 863۔

"863؟" وہ الجھن سے بولی۔ ایڈم چونکا۔ ہندسے اب مٹ رہے تھے۔

"اس دن اس پہ کوئی اور ہندسے ابھرے تھے 1437۔"

"1437؟" تالیہ نے بے خودی کے عالم میں دہرایا۔ فاتح نے دروازہ کھول دیا۔ سامنے سیڑھیاں تھیں۔ وہ تینوں چاہنے اور نہ چاہنے کے درمیان اوپر چڑھنے لگے۔ جس وقت فاتح اوپر موجود ٹریپ ڈور کا ڈھکن ہٹا کے پرے رکھ رہا تھا' تالیہ کے ذہن میں وہی الفاظ گردش کر رہے تھے۔

چودہ سو سینتیس.... چودہ سو سینتیس.... آٹھ سو تریسٹھ....

ایک جھماکے سے اسے یاد آیا تھا۔

داتن!

عالم کے گھر کے لاؤنج میں ناشتے کی خوشبو پھیلی تھی۔ چین کیک' خستہ کری پف اور دیگر اشتہا انگیز لوازمات میز پہ سجے تھے اور وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھی تھیں۔ تالیہ گھڑی دیکھ رہی تھی' اس کو عصرہ کی پینٹنگ بنانے جانا تھا' مگر داتن نے اسے روک رکھا تھا۔

"یہ کتاب.... شکار بازوں کے متعلق ہے...."

وہ ایک قدیم کتاب دکھاتے ہوئے بتانے لگی۔ تالیہ نے توجہ دینے کی کوشش کی۔

"اس کے مطابق ان کے پاس ایک علم ہے جس سے وہ ایک ایسی چابی بنا سکتے ہیں جو خزانے کا دروازہ کھول سکتی ہے۔"

"دیکھا۔ یعنی خزانہ ایگزسٹ کرتا ہے۔" تالیہ چہک کے بولی۔

"تالیہ...." داتن سنجیدگی سے آگے ہوئی۔

"شکار بازوں کے مطابق وہ دنیا کے سب سے بڑے خزانے کا قفل کھول سکتے ہیں۔ جانتی ہو' انسانوں کا سب سے بڑا خزانہ کیا ہے؟"

"کیا؟"

"وقت!" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کے بولی تو تالیہ کے ابرو اچنبھے سے اکٹھے ہوئے۔

"وقت؟"

"ہاں۔ شکار بازوں کے مطابق.... اگر وہ وقت کے دروازے کو کھول لیں تو وہ وقت میں سفر کر سکتے ہیں۔ کسی مستقبل کے زمانے میں جا سکتے ہیں۔ کسی ماضی کے عہد میں واپس پہنچ سکتے ہیں۔"

"داتن...." اس نے لیانہ کو یوں دیکھا گویا اس کا دماغ چل گیا ہو۔ "کوئی بھی وقت میں سفر نہیں کر سکتا۔"

"تم نے بھی تو کیا تھا نا۔" داتن نے کہتے ہوئے کتاب اس کی طرف دھکیلی۔ تالیہ الجھن سے اس کو دیکھنے لگی۔

"میں نے کب؟"

"جب تم چرچ میں پہلی دفعہ مسز ماریہ سے ملی تھیں تو تمہارا لباس عجیب تھا اور تم عجیب لہجے میں بول رہی تھیں۔ تمہارے ماں باپ کا کچھ پتا نہیں تھا' اور تم کسی گاؤں کا ذکر کر رہی تھیں۔ کوئی تمہیں لینے نہیں آیا کیونکہ تمہارے ماں باپ.... تمہارا گاؤں.... وہ سب اس زمانے کے نہیں تھے۔ تمہارے بابا نے تمہیں ماضی کے کسی زمانے سے.... اس دروازے کے پار بھیجا تھا.... میں نہیں جانتی کیوں.... لیکن مجھے اتنا یقین ہے کہ تم اکیسویں صدی کی لڑکی نہیں ہو۔ تم کسی پرانے عہد سے آئی ہو۔"

"ہیں؟" اس کو واقعی داتن کی دماغی حالت پہ شک ہونے لگا تھا۔

"وقت کے سفر کا اصول ہے۔ جو بھی روشنی کی رفتار سے تیز چل لے' وہ وقت کی قید سے دور نکل آتا ہے۔ کسی اور زمانے میں۔ اور پیچھے اس کا زمانہ وہیں منجمد ہو جاتا ہے۔"

"کیا کہہ رہی ہو؟"

"جس سکے کو تم ڈھونڈ رہی ہو وہ مظفر شاہ کے زمانے کا ہے یعنی تقریباً چھ سو سال پہلے کا زمانہ۔ تمہاری گردن کا یہ نشان بتاتا ہے کہ تم نے وہ دروازہ کھولا تھا۔ یہ نشان صرف دروازہ کھولنے والوں کی گردنوں پہ ہوتا ہے۔ وقت کی مہر۔ اور مجھے یقین ہے کہ یہ دروازہ تم نے مظفر شاہ کے زمانے میں کھولا تھا۔ پندرہویں صدی کے وسط میں۔ وہ وقت وہیں رک گیا تھا۔ تم آگے نکل آئی تھیں۔ اگر تم دوبارہ واپس جاؤ تو وہ دور وہیں سے شروع ہو گا جہاں سے تم نکلی تھیں۔ اسی لمحے' اسی دن سے۔ یہاں جتنے سال بھی گزر جائیں' پیچھے وقت آگے نہیں بڑھا تھا۔"

"اور میں وہاں دوبارہ جاؤں گی کیسے؟" وہ سنجیدگی سے پوچھنے لگی۔

"کیونکہ اس چابی کے آگے کوئی خزانہ نہیں ہے۔ یہ ایک دروازے کی چابی ہے' اگر تم نے اس کو کھول لیا تو آگے دو دریا ہوں گے۔ وہی دو دریا جو تم نے خواب میں دیکھے تھے۔ ماضی اور مستقبل کے دریا۔ ایک دفعہ تم نے وہ دریا پار کر لیے تو وہاں سے واپسی ممکن نہیں ہو گی۔

میں اسی لیے تمہیں روکتی ہوں اس ملعون چابی کا پیچھا کرنے سے۔ کیونکہ روانگی اور واپسی کا چکر پورا کرنے کے بعد چابی تحلیل ہو جائے گی۔ دروازہ غائب ہو جائے گا۔ تالیہ تم پندرہویں صدی میں واپس چلی جاؤ گی۔ اسی دن میں جب تم گیارہ سالہ بچی کے طور پہ وہاں سے غائب ہوئی تھیں۔ تم کبھی واپس نہیں آ سکو گی۔" وہ دکھ سے کہہ رہی تھی۔ تالیہ نے بدقت اس کی باتوں کو ہضم کیا۔

"تم یہ کہہ رہی ہو کہ میں.... پندرہویں صدی کی ایک لڑکی ہوں...."

"ہاں وہ خواب یاد کرو جو اپنے بابا کے بارے میں تم نے دیکھے.... جنگل لکڑیاں.... مشعلیں.... موم بتیاں.... تم کہتی تھیں نا کہ ان میں کچھ عجیب سا ہوتا ہے۔ وہ زمانہ تھا۔ قدیم زمانہ۔"

"یعنی کہ میں.... پندرہویں صدی کے کسی لکڑہارے کی بیٹی ہوں جو شکار باز بھی تھا اور اس نے مجھے خزانہ لینے وقت میں آگے بھیج دیا۔ میں نے وہ دروازہ پار کر لیا اور میں سن 2000 میں آ گئی۔ اور اگر اب میں واپس جاؤں تو اسی دن میں واپس جاؤں گی جب میں گیارہ سالہ لڑکی کے طور پہ دروازے کو عبور کر گئی تھی۔"

''ہاں۔ دروازے کے پار... یہی شہر یہی ملک ہوگا۔ تمہارا گاؤں' تمہارے ماں باپ ہوں گے مگر زمانہ یہ نہیں ہوگا۔ یہ 2016 ہے۔ وہ کوئی پندرہویں صدی کا سال ہوگا۔ تم وقت میں پھنس جاؤ گی۔ کبھی واپس نہ آنے کے لیے۔''

''تم واقعی ان ساری فضولیات پہ یقین رکھتی ہو' داتن؟''

جواب میں داتن آگے ہوئی اور سنجیدہ نظروں سے اسے دیکھا۔ ''یہ دنیا بہت عجیب ہے تالیہ۔ یہاں سب ممکن ہے۔ ہوسکتا ہے سائنس اس کی وضاحت نہیں کرسکتی کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے' لیکن اس لیے کہ سائنس کی عمر ابھی بہت کم ہے۔''

''کوئی بھی وقت میں سفر نہیں کرسکتا داتن۔ یہ صرف بے کار کی باتیں ہیں۔'' اس نے ناک پر سے مکھی اڑائی۔

''ہوائی جہاز کے بننے سے پہلے لوگ یہی سمجھتے تھے کہ انسان فضا میں اڑ نہیں سکتا۔ مافوق الفطرت چیزوں کا مذاق نہ اڑاؤ۔ اگر عقل ان کو سمجھنے سے قاصر ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ ہوتی نہیں ہیں۔''

''تو تمہارا مطلب ہے کہ اگر میں نے وہ قفل کھول لیا تو میں واپس اس زمانے میں پہنچ جاؤں گی جب میں پندرہویں صدی میں کسی غریب لکڑہارے کی بیٹی تھی؟ اور میں وہاں پھنس جاؤں گی۔ کیونکہ ایک چکر پورا کرنے پہ چابی تحلیل ہوجاتی ہے۔''

اس کے طنزیہ انداز پہ داتن کی آنکھوں میں خفگی ابھری۔ ''میں جانتی ہوں یہ سب تمہارے لیے بہت انہونا ہے اور تم شاید اس پہ یقین نہ کرو لیکن....''

اور تالیہ ایک دم کھلکھلا کے ہنس پڑی۔

داتن کا منہ کھل گیا۔ تالیہ ہنوز گردن پیچھے کو پھینکے ہنستی جا رہی تھی۔ پھر سیدھی ہوئی اور محظوظ مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔

''کیا دیومالائی کہانیاں پڑھتی رہتی ہو تم داتن۔ ایسا کچھ نہیں ہوتا حقیقی دنیا میں۔ ہٹو بھئی۔'' اور وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

پین کیک اور کریم پف کی خستہ' اشتہا انگیز خوشبو وہیں پھیلی رہ گئی۔

☆☆☆

فاتح نے لکڑی کا ڈھکن ہٹایا تو اوپر سے روشنی آ رہی تھی۔ وہ تینوں باری باری باہر نکلے تو روشنی دیکھ کے لمحے بھر کو مبہوت رہ گئے۔ رات کے ساڑھے گیارہ بجے دن جیسی روشنی؟

وہاں آس پاس اونچے درخت تھے۔ گھنے' سرسبز اور اونچے۔ دن نکلا ہوا تھا مگر درختوں کے باعث ٹھنڈی چھاؤں تھی۔ جیسے عصر کا وقت ہو۔

فاتح نے کلائی بلند کی اور گھڑی دیکھی۔ ڈیجیٹل واچ رات کے ساڑھے گیارہ کا وقت بتا رہی تھی۔ اس کے ابرو اچنبھے سے اکٹھے ہوئے۔ گردن گھما کے تالیہ کو دیکھا۔

''یہ کہاں لے آئی ہو تم ہمیں؟''

''یہ تو کوئی جنگل ہے۔'' ساکت کھڑا ایڈم بول اٹھا۔ تالیہ نے گردن اٹھا کے اوپر آسمان کو دیکھا۔

''یہاں روشنی کیوں ہے؟''

''یہی تو میں تم سے پوچھ رہا ہوں کہ کہاں لے آئی ہو ہمیں۔''

وہ ٹکر ٹکر اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

''خزانہ....'' خشک منہ سے اس نے کہنا چاہا۔ ''دروازے کے پار خزانہ ہونا چاہیے تھا۔ کوئی قدیم خزانہ۔''

''سر' ہمیں واپس جانا چاہیے۔ مجھے تو یہ عجیب سی جگہ لگ رہی ہے۔'' ایڈم قدرے پریشانی سے بولا اور واپس مڑا۔ مگر پھر وہ دھک سے رہ گیا۔

''مجھے خزانے کی کہانیاں مت سناؤ۔ مجھے یہ بتاؤ کہ یہ کون سی جگہ ہے۔'' فاتح درشتی سے تالیہ سے مخاطب تھا۔ وہ واقعی پریشان ہوگئی تھی۔

''تو انکو' میرا خیال تھا یہاں خزانہ ہوگا۔ مجھے نہیں معلوم یہ کون سی جگہ ہے۔ میرا یقین کریں۔''

''سر....'' ایڈم کی پھٹی پھٹی سی آواز آئی مگر وہ نہیں سن رہا تھا۔ وہ غصے سے کمر پہ دونوں ہاتھ رکھے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''تم لمبے عرصے کے لئے جیل جا رہی ہو' یہ تو طے ہے۔ مگر پہلے مجھے بتاؤ کہ کیا کھیل کھیل رہی ہو تم ہمارے ساتھ؟''

''میری خود سمجھ میں نہیں آ رہا۔ ہم تو نیچے گئے تھے تو یہ جنگل کہاں سے شروع ہوگیا۔'' وہ پریشانی سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔

''سر....'' ایڈم حواس باختہ سا پکار رہا تھا۔ ''وہ دروازہ کہاں گیا جس سے ہم آئے تھے؟''

ان دونوں نے چونک کے اس طرف دیکھا۔ زمین میں جہاں لکڑی کا ٹریپ ڈور (ڈھکن) تھا' جس کو ہٹا کے وہ اوپر آئے تھے' وہ اب وہاں نہیں تھا۔ کچی مٹی برابر تھی۔ وہ تینوں اونچے درختوں کے درمیان ایک جنگل میں کھڑے تھے۔

تالیہ نے بیگ نیچے پھینکا اور بے اختیار آگے بڑھی۔ ایک درخت سے دوسرے درخت تک۔ وہ ایک ایک تنے کو ہاتھ لگا کے ٹٹول رہی تھی جیسے کچھ کھوج رہی ہو۔ خزانہ۔ راستہ۔ کوئی نشان۔ مگر وہاں کچھ نہ تھا۔

خاموش پرسکون درختوں کے جھنڈ جو ہر جگہ پھیلے تھے۔ اتنے گھنے درخت کہ چند میٹر دور تک کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اور اوپر ان کے پتے باہم گلے ملتے تھے۔ جیسے سبز چھت سی بنی ہو۔ چھت کے سوراخوں میں کہیں کہیں سفید آسمان جھلکتا تھا۔

''ایڈم' پولیس کو کال کرو اور اپنی لوکیشن دو۔'' اسے آگے دوڑتے دیکھ کے وہ برہمی سے بولا تو شل کھڑے ایڈم نے سیل فون نکالا۔ ''سگنل نہیں ہیں۔''

''میں خود کرتا ہوں۔'' فاتح نے اپنے فون کی اسکرین روشن کی۔ سگنل غائب تھے۔ اس نے ایس او ایس بھیجنے کی کوشش کی۔ بے سود۔ اکتا کے چہرہ اٹھایا۔ سنہرے بالوں والی لڑکی پریشانی سے ایک درخت کے ساتھ کھڑی تھی۔

''ہم کہاں ہیں؟'' وہ بے یقینی سی بڑبڑا رہی تھی۔

''میرے سامنے اداکاری مت کرو' تالیہ۔'' اس کو اس کے نام سے پکار کے درشتی سے بولا۔ سفید شرٹ کی آستینیں چڑھائے' وہ ابرو بھینچے شدید بے زار لگ رہا تھا۔

''یہ کوئی جنگل ہے۔'' ایڈم نے گردن اٹھا کے اوپر دیکھا۔ ''رین فاریسٹ۔''

''پانچ سو میٹر بھی نہیں چلے ہوں گے ہم۔ میرے گھر کے اتنے قریب کون سا جنگل ہے بھلا؟ مجھے بتاؤ تالیہ' یہ کون سی جگہ ہے۔ اور یہاں رات کے ساڑھے گیارہ بجے روشنی کیوں ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم' تو انکو۔'' وہ روہانسی ہوگئی۔ خزانہ' محل' جزیرہ۔ عیش وعشرت کی زندگی۔ سب جنگل کی خاک میں مل چکا تھا۔

''تم پہلے سے جانتی تھیں کہ یہاں کیا ہے۔ بتاؤ مجھے۔ سب کچھ بتاؤ۔''

’’میں سچ کہہ رہی ہوں‘ مجھے نہیں معلوم۔ میرا اعتبار کریں۔‘‘

’’مجھے تمہارے ایک لفظ پہ بھی اعتبار نہیں ہے۔‘‘ فاتح نے سر جھکایا اور انگلیوں سے آنکھیں مسلیں‘ گویا چند لمحے کو سوچا۔ پھر آگے بڑھ گیا۔ چند منٹ تک وہ آگے چلتا گیا۔ درخت... درخت... نہ ختم ہونے والا سلسلہ۔ وہ اب غصے کے ساتھ ساتھ بے بسی بھی محسوس کر رہا تھا۔ واپس آیا تو وہ اسی طرح شل کھڑی تھی۔

’’یہ کوئی الوژن ہے‘ ہے نا؟ اور تم شعبدہ باز ہو۔ تم نے یہ کسی فلم کا سیٹ بنایا ہے۔ ایک الوژن۔ جہاں تم جیسے لوگ شکار کو گھیر کے اس کو ذہنی طور پہ مفلوج کر کے اس کے راز‘ کریڈٹ کارڈ نمبرز‘ بینک پاس ورڈز لے لیتے ہیں۔ کیا تم میرے ساتھ اس وقت یہی کر رہی ہو؟‘‘ وہ برہمی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ’’تم ابھی تک مجھے con کر رہی ہو؟‘‘

’’میرا یقین کریں تو انکو‘ مجھے نہیں معلوم یہ کون سی جگہ ہے۔‘‘ وہ ایک دم زور سے چیخی۔ ساری اداکاری‘ سارے دکھاوے‘ سارے ملمعے غائب ہو گئے۔ وہ پریشان تھی۔ شدید پریشان۔

مگر فاتح نے نفی میں سر ہلایا۔ ’’میں مان ہی نہیں سکتا کہ تم یہ سب نہیں جانتی ہو۔‘‘

ایڈم ان دونوں سے بے نیاز زمین پہ اس جگہ بیٹھا جہاں وہ ٹریپ ڈور تھا اور وہاں سے پتے اور لکڑی کی ٹہنیاں ہٹانے لگا۔ نیچے مٹی ہی مٹی تھی۔ وہ روہانسا سا ہو کر سیدھا ہوا۔ ’’ہم واپس کیسے جائیں گے؟‘‘

’’وہ چابی۔ وہ چابی کہاں ہے؟‘‘ وہ چونکی۔ فاتح نے اسے گھورتے ہوئے جیب میں ہاتھ ڈالا مگر مٹھی باہر نکالی تو اس میں راکھ تھی۔ پل بھر کو تو وہ ساکت رہ گیا۔ پھر بے یقینی سے تالیہ کو دیکھا۔

’’کیا تم نے وہ میری جیب سے نکال لی؟ کیا چیز ہو تم؟‘‘

مگر تالیہ کی نظریں اس کی مٹھی میں موجود راکھ پہ جم گئی تھیں۔ چابی راکھ ہو گئی تھی۔ اس کا چکر پورا ہو گیا تھا۔

’’نہیں!‘‘ اس نے بے یقینی سے نفی میں سر ہلایا۔ ’’یہ شاید خواب ہے۔ یقیناً... میں خواب دیکھ رہی ہوں۔‘‘

فاتح نے اکتا کے سر جھٹکا اور دوسری سمت میں آگے چلنے لگا۔ درخت در درخت ــــــ مسلسل چڑیوں کے چہچہانے کا شور۔ دور پانی کے چلنے کی آواز گویا کوئی جھرنا بہہ رہا ہو۔ ہوا۔ آسمان۔ ہر شے حقیقی تھی۔ اس نے درختوں کو چھو کے دیکھا۔

’’نہیں۔ یہ سچ نہیں ہو سکتا۔ ملاکہ میں ایسا کون سا جنگل ہے؟ یہ کوئی الوژن ہے۔ یہ لڑکی ڈراما کر رہی ہے۔‘‘ اس نے موبائل فضا میں بلند کیا مگر وہ سگنل کیچ نہیں کر رہا تھا۔ وان فاتح کی فرسٹریشن اور بے چینی بڑھنے لگی۔

تالیہ ایک درخت کے تنے سے لگی‘ آنکھیں موندے کھڑی تھی۔

’’یہ یقیناً ایک خواب ہے۔ ابھی میں جاگ جاؤں گی۔‘‘ وہ بڑبڑا بھی رہی تھی۔ دل میں بار بار کوئی کہتا کہ آنکھیں کھولو‘ مگر نہیں۔ یہ خواب ہی تھا۔ اس کا خزانہ اصلی تھا۔ یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ دروازے کے آگے سنسان ویران جنگل ہو۔ نہیں۔ وہ ابھی نیند میں ہے۔ جب وہ جاگے گی تو وہ وان فاتح کے گھر جائے گی۔ خزانہ کنویں کے نیچے تھا۔ وہ اسے ڈھونڈ لے گی۔

ایڈم ابھی تک زمین پہ بیٹھا ہاتھوں سے مٹی کھود رہا تھا۔ پھر کسی خیال کے تحت رکا۔ ’’پولیس آنے والی ہو گی۔ اوہ ہاں۔ پولیس سیڑھیاں دیکھ لے گی اور یہاں پہنچ جائے گی۔‘‘ اس کی رنگت بحال ہونے لگی۔ آنکھوں میں امید جاگی۔ ’’شکر ہے میں نے ان کو فون کر دیا تھا۔‘‘ وہ ہاتھ جھاڑتے اٹھ کھڑا ہوا۔

تبھی وان فاتح واپس آتا دکھائی دیا۔ بال ماتھے پہ بکھرے تھے اور ناک پہ غصہ دھرا تھا۔ عین تالیہ کے سامنے آ کے رکا۔

’’آنکھیں کھولو اور مجھے بتاؤ‘ لڑکی کہ یہ سب کیا ہے؟‘‘

تالیہ نے آنکھیں کھولیں۔ جنگل ایک ٹھوس حقیقت کی طرح اس کے گرد موجود تھا۔

’’تو انکو...‘‘ اس کا دل ڈوبنے لگا۔ ذہن خواب کے مفروضے سے نکلا تو پریشانی پھر سے چھانے لگی۔

’’میں سچ کہہ رہی ہوں... میں نہیں جانتی یہ کون سی جگہ ہے۔ میں صرف خزانے کے لیے آئی تھی۔‘‘

’’مجھے کہانیاں مت سناؤ۔ مجھے سچ بتاؤ‘ تالیہ!‘‘ وہ دو تین قدم قریب آیا اور اس کی آنکھوں میں برہمی سے دیکھا۔ تالیہ کے چہرے پہ بے بسی پھیل گئی۔

’’میں کیا کروں جو آپ کو یقین آئے کہ میں بھی اتنی ہی ناواقف ہوں جتنے آپ ہیں۔ میں سچ بول رہی ہوں۔‘‘ وہ روہانسی ہو گئی۔

عجیب وحشت ناک جنگل تھا۔ عجیب ناراض شخص تھا۔

’’چے تالیہ‘ آخر آپ پورا سچ بتا کیوں نہیں دیتیں۔ آپ کو کہاں سے ملی یہ چابی۔ کس نے بتایا نیچے خزانہ ہے؟‘‘ زمین پہ بیٹھا ایڈم جھلا کے بولا۔

’’میں اس چابی کو خواب میں دیکھتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس کے پیچھے خزانہ ہے‘ مگر میری دوست کہتی تھی کہ خزانہ نہیں ہے بلکہ...‘‘ وہ ٹھٹک کے رکی۔ ایک دم شل ہو گئی ہو۔ ایسے جیسے کسی نے سر پہ بیلچہ دے مارا ہو۔

’’بلکہ؟‘‘ فاتح نے غور سے تالیہ کو دیکھتے ابرو اٹھائی۔

’’نہیں۔‘‘ تالیہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ’’وہ فضولیات بول رہی تھی۔ یہ ممکن نہیں ہے۔‘‘ وہ بے یقین تھی۔

’’کیا؟ مجھے بتاؤ‘ کیا کہا اس نے؟‘‘

’’وہ کہتی تھی کہ... اس دروازے کے پار دو دریا ہیں‘ ماضی اور مستقبل کے۔ ان کو پار کر کے میں وقت میں پیچھے چلی جاؤں گی۔ کسی قدیم عہد میں جہاں سے میں کبھی واپس نہیں آ سکوں گی۔ مگر یہ ممکن نہیں ہے۔ کوئی بھی وقت میں سفر نہیں کر سکتا۔‘‘

’’ظاہر ہے کوئی بھی وقت میں سفر نہیں کر سکتا۔‘‘ وہ اکتا گیا۔

’’کر سکتا ہے۔‘‘ ایڈم کی آواز پہ دونوں نے گردن موڑی۔

’’آئن اسٹائن کی تھیوری ہے نا۔ اگر روشنی کی رفتار سے تیز چلو تو انسان ماضی یا مستقبل میں جا سکتا ہے اور اس کی واپسی تک وقت رک جاتا ہے۔‘‘ وہ تحیر سے کہتا آگے آیا۔ اس کی حیرت بھری نظریں تالیہ پہ جمی تھیں۔ ’’تو آپ واقعی پمبورو میں سے ہیں۔ پمبورو کے بارے میں ہم بچپن میں کہانیاں سنتے تھے کہ وہ وقت میں سفر کر سکتے تھے۔ انہوں نے دروازے بنائے تھے جن میں چابی ڈالنے سے وقت کا قفل کھل جاتا تھا۔‘‘ وہ بنا پلک جھپکے تالیہ کو دیکھتا قدم اٹھاتا قریب آ رہا تھا۔ ’’آپ کی گردن پہ نشان ہے‘ آپ پمبورو ہیں۔ بچپن میں ایک کہانی سنی تھی میں نے‘ کہ یہ نشان صرف ’مسافروں‘ کی گردنوں پہ ہوتا ہے۔ کیا واقعی ہم نے وقت کا دروازہ پار کر لیا ہے؟‘‘

’’شٹ اپ ایڈم۔‘‘ وہ بےزاری سے بولا۔ ’’فضول باتیں مت کہو۔ یہ سب (تالیہ کو دیکھا) اس لڑکی کا کوئی ڈراما ہے۔ اس کو سب معلوم ہے۔‘‘

’’مجھے کچھ نہیں معلوم۔ میں سچ کہہ رہی ہوں۔ میں صرف خزانے کے لیے....‘‘

’’تم اور تمہاری کہانیاں۔‘‘ فاتح سر جھٹک کے پلٹ گیا اور موبائل دیکھنے لگا۔ گوگل میپ۔ نو سگنل۔ وائی فائی‘ جی پی ایس‘ موبائل ڈیٹا‘ کچھ بھی کام نہیں کر رہا تھا۔ اس کی گردن جھکی تھی۔ تالیہ اور ایڈم کی نظریں اس کی گردن پہ جم گئی تھیں۔

’’آپ کی گردن پہ بھی نشان ہے‘ سر۔‘‘ ایڈم متحیر سا بولا تو وہ چونکا۔ پھر بے اختیار گردن کی پشت کو چھوا۔ انگلیوں نے کھال میں کوئی فرق محسوس کیا تھا جو اس کے ماتھے کی سلوٹیں غائب ہونے لگیں۔ ایڈم نے اپنے سیل سے اس کی گردن کی تصویر بنائی اور اسکرین اس کے سامنے کی۔ ’’یہ تو چے تالیہ نہیں بنا سکتیں۔ ہو سکتا ہے وہ درست کہہ رہی ہوں۔‘‘

وہ اسکرین پہ اپنی گردن کی پشت دیکھ کے منجمد ہوگیا۔ ”یہ بنادرو کے جلنے کا نشان تھا۔“

”نہیں۔“ تالیہ پریشانی سے نفی میں سر ہلا رہی تھی۔ ”کوئی بھی وقت میں سفر نہیں کرسکتا۔“

”سکے پہ مظفرال سلطان لکھا تھا۔“ ایڈم تیز تیز بول رہا تھا۔ ”پہلے 1437 لکھا آرہا تھا مگر یہاں آتے ہی 863 لکھا آنے لگا۔“

”ان ہندسوں کا کیا مطلب ہے؟“ وہ اچنبھے سے بولی۔ وان فاتح ابھی تک اسکرین پہ تصویر دیکھ رہا تھا۔

”یہ سال 2016 ہے۔ اسلامی کیلنڈر کا 1437 واں سال۔ لیکن یہاں آتے ہی....“ ایڈم خواب کی سی کیفیت میں بول رہا تھا۔ ”ہندسے بدل کے 863 ہو گئے۔ یعنی عیسوی کیلنڈر کا 1459 واں سال۔ پندرہویں صدی کا وسط۔“ وہ دھک سے رہ گیا۔

(پندرہویں صدی سے مراد 1401 سے 1500 تک کے تمام سال ہوتے ہیں۔ جیسے 1980 انیسویں صدی میں نہیں' بلکہ بیسویں صدی میں شمار کیا جاتا ہے۔)

”کیسی باتیں کررہے ہو؟ ایسا ممکن نہیں ہے' ایڈم!“ تالیہ کو وحشت ہونے لگی۔

”1459 سن عیسوی یا 863 سن ہجری وہ سال تھا جب سلطان مظفر شاہ کا انتقال ہوا تھا۔ شاید ہم واقعی مظفر شاہ کے دور میں پہنچ گئے ہیں۔“

”ایسا کچھ نہیں ہے۔“ وہ تڑپ کے پیچھے ہوئی۔ ”میں ملائیشیا کی ہی ایک لڑکی ہوں۔ میں کوئی پندرہویں صدی کے کسی لکڑہارے کی بیٹی نہیں ہوں' اچھا۔“

”یہاں دن نکلا ہوا ہے چے تالیہ۔ یہاں موبائل سگنلز نہیں کام کررہے۔“

”جب پولیس آئے گی تو میں ان سے کہوں گا کہ تمہیں بھی اس لڑکی کے ساتھ گرفتار کرلیں ایڈم۔ کیوں میرا دماغ خراب کررہے ہو۔“ فاتح غصے سے بولا مگر اس کی آواز میں ویسی گرج نہیں تھی۔

”سر... پمبورو کی کہانیاں سب نے سن رکھی ہیں۔ شاید وہ کہانیاں سچ ہوں۔ ہم واقعی پندرہویں صدی میں....“

”یہ اس لڑکی کا کوئی کرتب ہے۔ مجھے اس کی کسی بات پہ اعتبار نہیں ہے۔“ وہ اب بھی ماننے کو تیار نہیں تھا۔ ”پہلے اس نے میرے گھر سے فائل چرائی' پھر....“

تالیہ تڑپ کے اس کی طرف گھومی۔ ”کیا ثبوت ہے آپ کے پاس کہ میں نے آپ کی فائل چرائی' ہاں؟“

”گواہ ہیں میرے پاس۔“

”اچھا۔ کیا دیکھا گواہوں نے؟ مجھے بھی تو پتا چلے۔“ تالیہ کی آواز بلند ہوگئی۔ چند لمحوں کے لئے وہ بھول گئی کہ وہ کہاں کھڑی ہے۔ فاتح کے ابرو اسی طرح تنے رہے۔

”تم اشعر کی پارٹی سے اپنی کار لینے میرے گھر آئیں' جب گھر میں ہم لوگ نہیں تھے۔ پھر تم نے میرے لاکر سے....“

”مگر چے تالیہ تو گھر نہیں آئی تھیں۔“ ایڈم حیرت سے بول اٹھا۔ ”ان کی کار تو میں خود ان کے گھر ڈراپ کرنے گیا تھا۔“

فاتح کے الفاظ وہیں ٹوٹ گئے۔ اس نے ابرو اٹھا کے ایڈم کو دیکھا۔ ”تم گئے تھے؟“

”جی' مجھے مسز عصرہ نے کہا تھا کہ کار چے تالیہ کے گھر چھوڑ آؤں۔ چے تالیہ تو ٹیکسی لے کر سیدھی اپنے گھر گئی تھیں۔“

فاتح نے تالیہ کو دیکھا جو چبھتی خاموش نظروں سے اسے گھور رہی تھی۔ پھر اس نے دوبارہ ایڈم کو دیکھا۔ ”تمہیں.... عصرہ نے کہا تھا؟“

”جی۔ اور آپ کو بتانے سے منع کیا تھا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ اس لئے چے تالیہ کو موردالزام ٹھہرا رہے ہیں تو میں پہلے ہی بتا چکا ہوتا۔ اچھا تبھی مسز عصرہ نے مجھے اگلے دن آپ سے ملنے نہیں دیا' اور....“

”اچھا۔ ٹھیک ہے۔ بس!“ اس نے برہمی سے ہاتھ اٹھا کے روکا۔ تالیہ کی سلگتی نظریں ابھی تک اس پہ جمی تھیں۔ وہ ماتھے پہ بل لیے پلٹا اور ایک طرف چلتا گیا۔ وہ ذہنی طور پہ ڈسٹرب ہوگیا تھا' صاف ظاہر تھا۔

تھوڑی دور وہ ایک درخت تلے رک گیا۔ ان دونوں کی طرف پشت کیے' اس نے پیشانی پہ ہاتھ رکھ کے آنکھیں کرب سے بند کیں۔ (عصرہ.... تم.... اشعر کے ساتھ.... اُف۔)

وہ دونوں وہاں خاموشی سے کھڑے اسے دیکھتے رہے۔ پھر تالیہ نے ایک نگاہ غلط ایڈم پہ ڈالی۔ ”یہ مت سمجھنا کہ تم نے میری حمایت کی ہے تو میں وہ سب بھول جاؤں گی جو تم نے کیا۔“

ایڈم نے جواباً خفگی سے اسے دیکھا۔ ”میرا کیا قصور ہے؟ میں نے تو منع بھی کیا تھا کہ دروازے کو مت کھولیں مگر....“

”چپ کرو۔ یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔“ وہ ناک سے مکھی اڑاتی جھلا کے بولی۔

چند لمحے خاموشی سے گزر گئے۔ فاتح فاصلے پہ خاموش کھڑا رہا۔ تالیہ درخت کے تنے سے ٹیک لگائے کھڑی رہی۔ اور ایڈم ایک پتھر پہ بیٹھا رہا۔

”مجھے یقین تھا کہ خزانہ ہے۔“ کچھ دیر بعد وہ خود سے بولی تھی۔ ”خزانہ ہونا چاہیے تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ خزانہ نہ ہو۔“

”آپ کو اب بھی خزانے کی فکر ہے؟ ہم مصیبت میں پھنس چکے ہیں' چے تالیہ۔“ ایڈم بگڑا تو تالیہ نے گھور کے اسے دیکھا۔

”تمہیں اندازہ بھی نہیں ہے کہ وہ خزانہ میرے لیے کیا تھا۔“

”میں صرف یہ سوچ رہا ہوں کہ اگر یہ واقعی پندرہویں صدی ہوئی تو؟ ہم اگر واقعی وقت میں پانچ سو ستاون برس پیچھے چلے گئے ہوں تو؟“

”ایسا ممکن نہیں ہے۔“ اس نے اوپر دیکھا۔ ”یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ ہوگا۔ میں ڈھونڈتی ہوں۔“ بیگ کندھے پہ ڈالتی وہ شمال کی جانب چل دی۔ مٹی' پتھر' ٹہنیاں۔ وہ ہر شے کو تیزی سے عبور کرتی درختوں کے درمیان آگے بڑھتی گئی۔ چند منٹ ہی چلی ہوگی کہ اسے احساس ہوا' یہ جنگل اصلی تھا اور بہت گھنا تھا۔

تالیہ مراد کا دل بیٹھنے لگا۔

یہ خزانے کا لالچ اسے کہاں لے آیا تھا۔ کیسی جگہ تھی؟ کون سی دنیا تھی یہ؟

”تم پندرہویں صدی کی لڑکی ہو تالیہ۔ کسی غریب لکڑہارے کی بیٹی جو کسی وجہ سے وقت میں سفر کرکے آگے نکل آئی تھیں۔ تم واپس جاؤ گی تو وقت وہیں سے شروع ہوگا جہاں سے تم گئی تھیں۔ جہاں سے مراد نے اپنی گیارہ سالہ بیٹی کو کھویا تھا۔“ داتن کی آواز گونجنے لگی۔ اس وحشت زدہ جنگل میں تو داتن کی آواز کی بازگشت بھی سنائی دیتی تھی۔

اسے خوف سا آنے لگا۔ فوراً پلٹی اور تیز تیز واپسی کے لیے قدم اٹھائے۔ ابھی وہ ایڈم اور فاتح سے چند میٹر ہی دور تھی کہ اس کا پیر رپٹا۔ وہ اوندھے منہ نیچے گری۔

فاتح چونک کے گھوما' پھر تیزی سے اس کی طرف آیا۔ ایڈم بھی جگہ سے اٹھا۔

گرتے کے ساتھ ہی وہ کراہی مگر ان کو اپنی طرف آتے دیکھ کے فوراً سے اٹھی اور کپڑے جھاڑے۔ منہ پہ گیلی مٹی لگ گئی تھی۔ اس نے ہتھیلی سے وہ صاف کی۔ پھر ٹھٹکی۔ ”میرے خواب۔“

”کون سے خواب؟“ وہ جو اس کو گرتے دیکھ کے تیزی سے آیا تھا' سنبھلتا دیکھ کے چہرے پہ وہی بے زاری واپس لائے رک گیا تھا۔

”میرے خواب.... وہ ہمیشہ سچے ہوتے ہیں.... میں نے خواب میں دیکھا تھا یہ جنگل.... ہم تینوں تھے ادھر اور ہماری گردنوں میں پھندے تھے۔“ وہ خود سے بول رہی تھی جیسے۔ بالکل مبہوت ہوئے۔ ”تو میرے خواب علامتی نہیں تھے۔ وہ ہوبہو مستقبل کا عکس تھے۔“

”اور کیا دیکھا تم نے خواب میں؟“ وہ بغور اس

کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ رہا تھا۔ سوال پہ تالیہ پہلے چونکی' پھر ماتھے پہ بل ڈال دیے۔ ہاتھ جھاڑے اور "کچھ نہیں" کہتی آگے بڑھ گئی۔

☆☆☆

جنگل میں تیز روشنی محض آدھے گھنٹے میں گھپ اندھیرے میں بدل جاتی ہے۔ جیسے ہی مغرب کا وقت ہوا' چند منٹوں میں ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ پرندوں کی چہچہاہٹ اونچی ہونے لگی۔ دور جھرنے کے بہنے کی آواز البتہ برابر سنائی دے رہی تھی۔

درختوں کے درمیان ایک قطعے پہ ایڈم کہیں سے تین پتھر اٹھا لایا تھا۔ بڑے بڑے تین پتھر اور خود ایک پہ بیٹھ گیا تھا۔ اب اس ڈوبتی شام میں وہ بار بار گھڑی دیکھ کے ان کو تسلی دے رہا تھا۔

"پولیس ہمیں لینے آجائے گی' کوئی تو آجائے گا۔ ان کو وہ سیڑھیاں مل جائیں گی اور پھر وہ ہمیں یہاں سے نکال لے جائیں گے۔"

تالیہ ساتھ والے پتھر پہ بیٹھی اس کو سنتی رہی۔ فاتح کا پتھر خالی تھا۔

وہ دور ایک درخت کے تنے کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ہاتھ میں ٹہنی لیے اس سے پتے توڑ توڑ کے پھینک رہا تھا۔ گاہے بگاہے موبائل نکال کے دیکھتا۔ نو سگنل۔

پھر ایڈم بھی خاموش ہو گیا۔ پرندے گنگناتے رہے۔ جھرنے کا پانی بہتا رہا۔ اور حقیقت ہر گزرتے پل گہری ہوتی گئی۔ اٹل۔ اور ٹھوس۔

یہ الوژن نہیں تھا۔ یہ واقعی کوئی جنگل تھا۔ کس زمانے کا تھا' کوئی واقف نہ تھا۔ وہاں زمان اور مکان کے سارے پیمانے ختم ہو چکے تھے۔

"کوئی نہیں آیا ابھی تک۔" تالیہ نے کلائی پہ گھڑی دیکھی۔ کوالالمپور کے وقت کے مطابق رات کے ڈھائی بج رہے تھے۔ مگر یہاں اندھیرا ابھی چھایا تھا۔

"کوئی آجائے گا۔ ایسا ہو نہیں سکتا کہ وان فاتح غائب ہو جائیں اور کوئی ان کو لینے نہ آئے۔ سارے ملک میں کہرام آجائے گا۔" پتھر پہ بیٹھے ایڈم نے سنجیدگی سے اسے دیکھتے ہوئے تسلی دی۔ تالیہ نے گھور کے اسے دیکھا۔

"خیر... میں بھی کوئی لاوارث نہیں ہوں۔ رات گھر نہ پہنچی تو وہ موٹی میرے لیے بھی آجائے گی' دیکھنا۔"

"کون موٹی؟" وہ حیران ہوا۔

"میری پرانکر مرغی جیسی دوست لیانہ۔ ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟"

"کسی کو یوں موٹی نہیں کہتے' بے تالیہ۔" وہ برا مان گیا۔

"میں تو اس کو کالی اور بدصورت بھی کہتی ہوں۔" وہ اونچے پتھر پہ ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھی تھی اور چہرہ دائیں ہتھیلی پہ گرا رکھا تھا۔

"کیوں؟" ایڈم کی آنکھیں صدمے سے کھل گئیں۔ درخت تلے بیٹھا فاتح ٹہنی سے پتے توڑ توڑ کے پھینکتا جا رہا تھا۔

"کیونکہ اس سے کوئی اور پیار نہیں کرتا۔ دوست مطلب کے لیے تعلق رکھتے ہیں' اور بے غرض کے لیے۔ کوئی اس کو صحیح غلط نہیں بتا سکتا۔ وہ پچاس سے اوپر ہے' مگر اس کا وزن بڑھتا جا رہا ہے' ڈاکٹرز نے اس کو کہہ دیا ہے کہ اگر وہ اسی رفتار سے چاکلیٹ اور جنک فوڈ کھاتی رہی تو وہ جلد مر جائے گی۔ میری نصیحتوں اور لیکچرز کا جب اس پہ کوئی اثر نہیں ہوا تو میں نے اسے موٹی' کالی اور بدصورت مرغی وغیرہ کہنا شروع کر دیا' تاکہ وہ اپنے وزن اور صحت کا احساس کرے۔"

"یہ تو غلط بات ہے۔" اسے بہت برا لگا تھا۔

"تو کیا کروں؟ موٹی کہنے پہ وہ برا ہی نہیں مانتی تھی۔ بدصورت کہتی ہوں تو اب پتلا ہونے کے طریقے گوگل کرنے لگی ہے۔ دو چار نام اور رکھوں گی تو اپنے وزن کو سیریسلی لے گی۔ اپنی لاپروائی اور بد احتیاطی کی وجہ سے موٹے ہونے والوں کو بار بار ان کی صحت کا احساس دلانا چاہیے۔ کیونکہ انسان جتنا پتلا اور فٹ ہو' وہ اتنا ہی خوش اور motivated (متحرک) رہتا ہے۔ وہ چونکہ ایک عورت ہے اس لیے اگر کسی اور وجہ سے ڈائٹ پہ نہیں جائے گی تو کم از کم اچھا لگنے کے لیے تو چلی ہی جائے گی۔"

"پھر بھی بے تالیہ... یہ کافی بے رحمانہ انداز ہے۔"

تالیہ نے تندی سے اسے گھورا۔ "تمہیں ابھی تک معلوم نہیں ہوا کہ تالیہ تمہاری کوئی ایور آفٹر فیری ٹیل گرل نہیں ہے جو سادہ اور معصوم سی ہو۔ میں کرمنل ہوں' اور کرمنلز ایسے ہی ہوتے ہیں' ہاں۔" پھر ناک سکیڑ کے منہ پھیر لیا۔

دفعتاً فاتح درخت تلے سے اٹھا۔ تالیہ نے کن اکھیوں سے دیکھا' وہ اب اسی طرف آرہا تھا۔ وہ چہرہ موڑ کے دوسری طرف دیکھنے لگی۔ وہ اس کے سامنے پتھر پہ آکے بیٹھا۔

"بولنا شروع کرو۔" انداز غصیلا نہ تھا مگر نرم بھی نہ تھا۔ وہ چونک کے اسے دیکھنے لگی۔

"کیا؟"

"سب کچھ بتاؤ مجھے۔ شروع سے۔ سچ سچ۔"

"اور آپ کو کیسے پتہ چلے گا کہ میں سچ بول رہی ہوں؟ میں تو جھوٹی اور چور ہوں نا۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کے سلگ کے بولی۔ وہ ہنوز اسے انہی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ سیاہ آنکھیں چھوٹی کیے۔ ماتھے پہ بال بکھرے ہوئے تھے اور سفید شرٹ کی آستینیں اوپر چڑھا رکھی تھیں۔ وہ جس فاتح سے واقف تھی' یہ اس سے مختلف نظر آتا تھا۔

"سچ کی پہچان ہو جاتی ہے۔"

"جیسے آپ کو مسز عصرہ کی باتوں کی ہو جاتی ہے۔"

"وہ الگ بات ہے۔ تم نے میری فائل..."

"میں نے آپ کی فائل چرائی ہے' بالکل چرائی ہے' لیکن آپ کے گھر سے نہیں۔"

فاتح نے بے اختیار ابرو اٹھایا۔ "مطلب؟" ایڈم بھی حیران سا اسے دیکھنے لگا۔

"میں نے وہ... اشعر محمود کے... سیف سے چرا کے... آپ کو واپس کی ہے۔" وہ اسی طرح چبا چبا کے بولی۔ گلے میں آنسوؤں کا گولہ سا اٹکا۔

فاتح نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔ "ایکسکیوزمی؟"

تالیہ آگے ہوئی' اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔ "کیا میرا میجک شو اچھا نہیں لگا آپ کو وان فاتح؟"

پل بھر کو وہ بالکل ساکت رہ گیا۔ پلک تک نہ جھپک سکا۔ پھر پتلیاں حیرت اور بے یقینی سے سکڑیں۔ "تم... نہیں..."

"کیا کبھی کسی جادوگر کو اسٹیج پہ کھڑے ٹرک کا راز بتاتے دیکھا ہے آپ نے وان فاتح؟ مگر بیک اسٹیج تو بتایا جا سکتا ہے نا۔ آپ نے کہا تھا کبھی مجھ سے ملنے آؤ' حالم مگر میں نے کہا تھا نا کہ میں آپ کی توقعات کے برعکس ہوں' سر۔ ایسی خواہش نہ کریں تو اچھا ہوگا۔"

فاتح کی قوت گویائی چند لمحے کے لیے زائل ہو گئی۔

"تم... تم حالم ہو؟"

"کوئی مجھے بھی بتائے... حالم کون ہے؟" ایڈم نے ناسمجھی سے باری باری دونوں کو دیکھا مگر وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھے۔ تینوں پتھروں کے گرد اُگے درخت اندھیرے میں ڈوبے خاموشی سے ان کو سن رہے تھے۔

"کیا اب میری بات کا یقین کریں گے آپ؟" وہ شکوے سے بولی۔ آنکھوں کے کنارے بھیگنے لگے۔

فاتح نے سر اثبات میں ہلایا۔ "بولنا شروع کرو۔" اس کا سارا غصہ' کوفت' حقارت' سب غائب ہو گیا تھا۔

تالیہ نے پہلے اسے دیکھا' پھر ایڈم کو۔ "اچھا ہو' اگر آپ لوگ مجھے جج نہ کریں۔"

"تم بولنا شروع کرو' تالیہ۔ سچ بولنا صرف شروع میں مشکل لگتا ہے' پھر یہ وقت کے ساتھ ساتھ آسان ہو جاتا ہے۔" وان فاتح کی آواز میں نرمی

تھی۔ وہ متوجہ تھا۔ سنجیدہ تھا۔ کچھ بدل گیا تھا میجک شو کے الفاظ کے ساتھ ہی سارا سماں بدل گیا تھا۔

تالیہ نے گہری سانس لی' آنکھوں کے کنارے رگڑے اور خاموش درختوں کو دیکھ کے کہنے لگی۔ ''میرا اصل نام تالیہ مراد ہے۔ میں گیارہ برس کی عمر میں ایک چرچ میں پائی گئی تھی۔ پہلے میں نہیں جانتی تھی کہ میں کہاں سے آئی ہوں' لیکن اب....'' اس نے گردن اٹھا کے اوپر دیکھا۔ جہاں گھنے درختوں کے پار گہرا ابرتا آسمان دکھائی دے رہا تھا۔ ایڈم نے ٹارچ جلا دی تھی جس سے سفید نیلی سی روشنی تینوں پتھروں کے گرد پھیلی تھی۔

''اب مجھے یقین آ رہا ہے کہ شاید داتن درست کہتی تھی۔ میں واقعی پندرہویں صدی کے کسی لکڑہارے کی بیٹی ہوں جو مجبور تھا۔ اس نے چابی بنائی تھی۔ جانے کس قسم کی۔ میرے باپ کو خزانہ چاہیے تھا گاؤں کے لیے۔ شاید اس نے مجھے وقت میں آگے بھیج دیا۔ اور میں اکیسویں صدی میں آ گئی۔ یتیم خانے کی منتظم نے مجھ سے میرا بریسلیٹ اتروا لیا تو چابی ٹوٹ گئی اور میری یادداشت ختم ہو گئی....''

وہ دونوں اسے سن رہے تھے۔ جنگل پہ اندھیرا چھا رہا تھا۔ پرندوں کی آوازیں دم توڑ رہی تھیں۔ اب تالیہ نے سر جھکا لیا تھا۔ ''میں کچھ سال یتیم خانے میں رہی۔ پھر ایک فیملی مجھے ایڈاپٹ کر کے لاہور لے گئی۔ وہ میرے اوپر ظلم کرتے تھے۔ میں نوکرانی کی طرح بڑی ہوئی۔ جب خرچ اور کھانے کے لیے مجھے چوری اور جھوٹ کی عادت پڑ گئی۔ میں چھوٹی باتوں پہ بڑے جھوٹ بولتے ہوئے بڑی ہوئی۔ سات سال پہلے انٹرنیٹ پہ رشتہ ڈھونڈ کے میرے ماں باپ نے میری شادی کر دی۔''

فاتح نے تعجب سے ابرو اٹھایا۔ ''تم شادی شدہ ہو؟''

تالیہ نے جھکے سر کے ساتھ گردن ہلائی۔ ''وہ کوالالمپور میں رہتا تھا۔ وہی آدمی جو اس روز تم نے دیکھا' ایڈم۔'' (فاتح نے فوراً ایڈم کو دیکھا جس نے اثبات میں سر ہلایا۔) ''ایئرپورٹ پہ آئی تو پتہ چلا وہ میرے ذریعے منی لانڈرنگ کرنا چاہتا ہے۔ میں ایئرپورٹ سے بھاگ گئی۔ داتن کے ساتھ۔ پھر اس سے طلاق لے لی اور....'' وہ بولتی گئی۔ رات گہری پڑتی گئی۔

کوالالمپور میں گزارے سات سال.... عالم بننا اور لوگوں کی چیزیں چرا کے واپس ڈھونڈ لانے کی فیس لینا.... گھائل غزال.... خزانہ.... وہ سب بتاتی گئی۔ اپنے خواب.... تمام جزئیات کے ساتھ۔

''تم نے بتایا کیوں نہیں کہ گھائل غزال نقلی ہے؟''

وہ افسوس سے اسے دیکھ رہا تھا۔ تالیہ نے شاکی نظریں اٹھائیں۔ آس پاس اندھیرا تھا مگر چاند کی چاندنی کے باعث وہ صاف نظر آ رہا تھا۔

''کیونکہ سچ بولنا مجھے مشکل لگتا ہے۔''

''اب کیسے بول رہی ہو۔''

وہ زخمی سا مسکرائی۔ ''کیونکہ اب آپ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔''

دونوں نے چونک کے اسے دیکھا۔ ''کیا؟''

''سوری ایڈم' مگر ہمیں کوئی لینے نہیں آئے گا۔ ہم وقت کی قید میں پھنس چکے ہیں اور اب واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ چابی تحلیل ہو چکی ہے۔ دروازہ غائب ہو گیا ہے۔ اور اب چونکہ آپ (فاتح کو دیکھا) مجھے پولیس کے حوالے نہیں کر سکتے تو مجھے کسی کا ڈر نہیں ہے۔ ہاں میں چور ہوں' اسکامر ہوں' جھوٹی بھی ہوں۔ پھر کیا کر لیں گے آپ لوگ؟ سوائے مجھ سے نفرت کے؟''

''نہیں تالیہ۔ میں تمہیں جج نہیں کروں گا۔'' وہ اب کے ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا۔ نہ غصہ۔ نہ کوئی ترحم۔ ''تم نے کہا تم اس کام کو چھوڑنا چاہتی تھیں۔ میرے لیے یہی بہت ہے کہ تمہیں احساس تھا۔ میں ماضی میں رہنے والوں میں سے نہیں ہوں۔''

مگر ایڈم کا ذہن تالیہ کے بے رحم الفاظ پہ اٹک گیا تھا۔ ''آپ ہمت کیوں ہار رہی ہیں؟ پولیس ہمیں لینے آ جائے گی۔''

''کوئی نہیں آئے گا' ایڈم۔ ہم واپس نہیں جا

سکتے۔'' وہ تلخی سے بولی۔

''آئے گا' ضرور آئے گا۔ میں پازیٹو ہوں۔ سر کیا انسان کو مثبت نہیں ہونا چاہیے؟'' اس نے دکھی ہو کر فاتح کو مخاطب کیا۔

فاتح نے جواب نہیں دیا۔ وہ گردن اٹھا کے اوپر دیکھنے لگا تھا۔ آسمان سے آوازیں آنے لگی تھیں۔ گڑگڑاہٹ۔ ذرا سی بجلی چمکی اور پھر.... تڑاتڑ بارش برسنے لگی۔

''یا اللہ!'' تالیہ نے بوکھلا کے بیک پیک سر پہ تانا۔ تینوں تیزی سے کھڑے ہوئے مگر بوچھاڑ اتنی تیز تھی کہ چند لمحوں میں ہی بھیگ گئے تھے۔

''ہمیں کوئی شیلٹر ڈھونڈنا ہو گا۔'' فاتح نے ٹارچ اٹھا کے روشنی ایک طرف پھینکی۔

''پولیس آئے گی۔ کوئی تو آئے گا۔'' ایڈم اسی طرح مغموم سا کھڑا بھیگ رہا تھا۔ اسے اور کسی بات کی پروا نہ تھی۔

''میں نے اس طرف چٹانیں دیکھی تھیں۔ میرے ساتھ آؤ تم دونوں۔ ایڈم' میں کہہ رہا ہوں میرے ساتھ آؤ۔'' وہ بلند آواز میں بولا تو ایڈم چونکا اور پھر اس کے پیچھے چلنے لگا مگر وہ غائب دماغ لگتا تھا۔

جنگل میں اندھیرا تھا اور چاندنی مدھم سی درختوں کے درمیان پہنچ رہی تھی۔ وہ بھی اس لیے کہ پورے چاند کی رات تھی ورنہ درخت اتنے گھنے تھے کہ سورج کی روشنی بھی پوری اندر داخل نہ ہو پاتی تھی۔

''چلو ایڈم۔'' وہ بار بار رک جاتا تو تالیہ کو جھڑک کے کہنا پڑتا۔ فاتح رامزل سب سے آگے تھا۔ ٹارچ کی روشنی راستے میں پھینکتا وہ راستہ دکھا رہا تھا۔ درختوں کے درمیان پتھروں' کیچڑ' پتوں اور سوکھی ٹہنیوں کا خاردار راستہ جس کو وہ تینوں آگے پیچھے عبور کر رہے تھے۔

''ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' تڑتڑاتی بوندوں کے درمیان وہ چلا کے بولی۔

''اس طرف ایک چٹان میں کھوہ سی بنی تھی۔'' وہ مڑے بغیر تیز تیز چلتا جا رہا تھا۔

''مزید کتنا چلنا پڑے گا؟''

وہ تیورا کے گھوما۔ وہ مکمل بھیگ چکا تھا۔ بال ماتھے پہ گیلے ہو کے جمے تھے اور آنکھوں میں غصہ تھا۔ اس کے رکنے پہ وہ بھی ہڑبڑا کے رکی۔ ''تم پکنک پہ آئی ہو یہاں' ہاں؟''

''میں بس پوچھ رہی تھی۔'' وہ خفیف ہوئی۔ وہ اسے گھور کے واپس مڑا اور تیز تیز چلنے لگا۔

چند منٹ وہ اس گھنے' تاریک جنگل میں چلتے رہے۔ ساری دنیا جیسے ختم ہو گئی تھی۔ سارے شہر صفحہ ہستی سے مٹ گئے تھے۔ کائنات بس ایک جنگل تک محدود تھی اور وہ اس میں موجود واحد انسان تھے۔ جیسے طوفان نوح ابھی گزرا ہو.... پانی سمٹ چکا ہو.... اور ان کو دنیا پھر سے آباد کرنی ہو....

ایسی حسین وحشت.....

ایک ڈھلان کے نیچے کھوہ سی بنی تھی۔ چھوٹا سا غار جو پتھروں کے گرنے کے باعث بن گیا تھا۔ اس کا دہانہ کھلا تھا اور وہاں پانی کا تالاب سا بنا پڑا تھا۔ فاتح اس کے کنارے آ رکا اور اسے اشارہ کیا۔ (اندر آ جاؤ۔) وہ تیزی سے اندر داخل ہوئی۔ اندر بارش نہیں تھی۔ خشک بھورے پتھروں کا غار.... جیسے کوئی محفوظ سائبان ہو۔ اس نے بیگ اتار کے نیچے پھینک دیا۔ سکون سا محسوس ہوا تھا۔

''اندر آؤ' ایڈم!'' فاتح ابھی تک غار کے دہانے پہ بارش میں کھڑا بھیگ رہا تھا۔ ایڈم قدرے سست روی سے غار میں آیا اور سیدھا ایک کونے میں جا کھڑا ہوا۔ ان دونوں کے سائبان میں آ جانے کے بعد وہ اندر داخل ہوا۔

''کیا کوئی بھی ہمیں بچانے نہیں آئے گا؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم غائب ہو جائیں اور کسی کو پروا بھی نہ ہو۔'' ایڈم وہیں کونے میں بیٹھ گیا اور تھوڑی گھٹنوں پہ ٹکا دی۔ وہ اداس دکھائی دیتا تھا۔ فاتح نے ٹارچ جلا رکھی تھی جس کی روشنی غار کی دیوار پہ گر رہی تھی۔ پورا غار نیلی سرمئی روشنی سے روشن ہو گیا تھا۔

''کوئی نہیں آئے گا' ایڈم۔ بغیر چابی کے کوئی

وہ دروازہ کیسے کھولے گا؟ یاد ہے تمہارے پیچھے دروازہ بند ہو گیا تھا۔" تالیہ اکتا کے بولی۔

"مگر ہمیں مثبت سوچ رکھنی چاہیے۔ یقیناً کوئی آئے گا اور ہمیں بچا لے جائے گا۔"

فاتح خاموشی سے متصل دیوار کے ساتھ کھڑا تھا۔ وہ مسلسل ٹارچ کا بٹن جلا بجھا رہا تھا۔ غار میں روشنی پھیلتی' پھر اندھیرا چھا جاتا۔ پھر روشنی' پھر اندھیرا۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا۔

"کوئی نہیں آئے گا' ایڈم۔ ہم مصیبت میں پھنس چکے ہیں۔"

ایڈم کی آنکھوں میں کرچیاں سی ابھریں۔ "کیا کسی کو ہماری پرواہ بھی نہیں ہو گی؟"

"میں بتا رہی ہوں نا' ہم نے دروازہ بند کر دیا تھا۔"

ایڈم نے سر دونوں بازوؤں میں چھپا لیا۔

"یا اللہ... میرا کیا قصور تھا؟" وہ بے بسی سے روہانسا ہوئے کہہ رہا تھا۔ "اگر مجھے معلوم ہوتا کہ سچ تالیہ ہمیں اس مصیبت میں پھنسائیں گی تو میں کبھی بھی ملاکہ نہ آتا۔ میں کے ایل سے بھی دور بھاگ جاتا۔"

"میں نے پھنسایا ہے مصیبت میں؟" وہ غصے سے بلبلائی۔ "کتنا کہا تھا مجھے سکہ دے دو' تمہیں خود شوق ہوا تھا سراغ رساں بننے کا۔ ہم تمہاری وجہ سے اس میں پھنسے ہیں۔"

"مجھے کوئی شوق نہیں تھا کچھ بھی بننے کا۔" اس نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔ "میری شادی ہے دو ماہ بعد۔ میری ایوا اور بابا میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

"تمہیں لگتا ہے مجھے شوق تھا اس... اس جنگل میں پھنس جانے کا؟ میں کے ایل میں کتنی خوش تھی' میرے کتنے خواب تھے' تم سوچ بھی نہیں سکتے۔"

"میں بھی کے ایل میں خوش تھا۔ مجھے نہیں چاہیے تھا خزانہ۔ آپ نے مجھے اپنے ساتھ کام کرنے کا کہا تھا۔"

"سارا قصور تمہارا ہے' تم فاتح صاحب کو بھی درمیان میں لے آئے' تم نے مجھے مشکل میں ڈالا ہے' میں نے تمہیں نہیں۔"

وہ دیوار کے ساتھ بیٹھا تھا اور تالیہ کھڑی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف چہرہ موڑے تیز تیز بولے جا رہے تھے۔

وہ کمر پہ ہاتھ رکھے ان کو دیکھے گیا۔ افسوس سے... ناپسندیدگی سے...

بارش تھم گئی تھی۔ جیسے وہ ایک لمحے میں اچانک سے شروع ہوئی تھی' ویسے ہی اچانک سے تھم گئی۔ وہ دونوں ابھی تک ترکی بہ ترکی ایک دوسرے کو موردالزام ٹھہرا رہے تھے۔ فاتح غار سے باہر نکل آیا۔

پتوں اور سوکھی ٹہنیوں سے اٹی زمین کی مٹی گیلی ہو چکی تھی۔ پھسلن زدہ اور گیلی۔ دو قدم چلنا محال تھا۔ وہ ٹارچ کی روشنی سامنے پھینکتا چند میٹر دور چلتا آیا۔

یہاں ایک بڑا سا گڑھا بنا تھا جس میں بارش کا پانی تالاب صورت جمع ہو گیا تھا۔ وہ اس کے کنارے آرکا اور سامنے دیکھا۔

پانی کے دوسرے کنارے پہ آریانہ کھڑی تھی۔

فاتح زخمی سا مسکرایا۔

اسے کبھی خواب نہیں آتے تھے۔ جتنی ڈسٹرب نیند وہ سوئے' وہ خواب نہیں دیکھتا تھا۔ آریانہ تو اسے کبھی خواب میں نہیں دکھائی دی تھی۔ عصرہ کے خوابوں میں وہ اکثر آتی تھی۔ البتہ جب وہ بہت پریشان ہوتا' وہ تصور کرتا کہ آریانہ اس کے سامنے کھڑی ہے اور وہ اس سے بات کر رہا ہے۔ صبح جاگنگ پہ جاتے ہوئے... کبھی اپنے ڈریسر مرر کے سامنے ٹائی باندھتے ہوئے... وہ اپنا ذہن کلیئر کرنے اور کسی نتیجے پہ پہنچنے کے لئے اپنا مسئلہ اس تخیلاتی آریانہ کے سامنے رکھا کرتا تھا جو دراصل اس کے لاشعور ——— سے نکات ڈھونڈ ڈھونڈ کے لاتی اور اس کو جواب دیتی تھی۔ وہ جانتا تھا وہ خود سے باتیں کر رہا ہے' مگر اسے آریانہ کو اس گفتگو کا مخاطب بنانا اچھا لگتا تھا۔

"ڈیڈا!" وہ سفید لباس میں ملبوس ہیئر بینڈ لگائے' سامنے کھڑی مسکرا کے اسے دیکھ رہی تھی۔

"ہاں بیٹا۔"

"آپ پریشان ہیں؟"

"بہت زیادہ۔"

"کیوں؟"

"میں پھنس گیا ہوں آریانہ۔ میں اس جادوئی دنیا میں پھنس گیا ہوں۔" وہ بے بسی سے بولا تھا۔

"اور آپ غصہ بھی ہیں۔"

"ہاں۔ مجھے ان دونوں پہ غصہ آ رہا ہے جو ایک دوسرے کو الزام دے رہے ہیں۔ مجھے لوگوں کا مظلوم بننا نہیں اچھا لگتا۔"

"تو لوگ کیا کریں؟" وہ سینے پہ بازو لپیٹے کھڑی غور سے اس کو دیکھ رہی تھی۔ دونوں کے درمیان بارش کے پانی سے بھرا نالہ حائل تھا۔

"اس بات کو سمجھ لیں کہ کوئی ہمارے ساتھ برا نہیں کرتا۔ یا تو ہم اسے اجازت دیتے ہیں۔ یا وہ ہماری تقدیر ہوتی ہے۔"

"اور یہ سمجھ کے وہ کیا کریں؟"

"کیا مطلب کیا کریں؟" اس نے خفگی سے بھنویں سکیڑیں۔ "دوسروں کو اپنی حالت کا الزام دینا چھوڑیں' اپنی قسمت کو قبول کریں اور باہر نکل کے دنیا کا مقابلہ کریں۔" کمر پہ دونوں ہاتھ رکھے وہ خفگی سے کہہ رہا تھا۔

"اور جو برے واقعات سے ہمارا دل غم کا شکار ہو جاتا ہے' اس کا کیا' ڈیڈ؟" وہ یاسیت سے پوچھ رہی تھی۔ ہلکی ٹھنڈی ہوا میں اس کے ہیئر بینڈ سے نکلتے بال اڑ رہے تھے۔

"انسان برے واقعے کو اپنی یادوں میں خود اچھا واقعہ بھی بنا سکتا ہے۔"

"کیسے؟" آریانہ کے ابرو تعجب سے اکٹھے ہوئے۔

"یہ دیکھ کے کہ غلطی کہاں ہوئی اور شکر ادا کر کے کہ اسے ایک سبق سیکھنے کا موقع ملا۔" وہ اب قدرے آرام سے بول رہا تھا۔ اس کا ذہن دھیرے دھیرے ریلیکس ہو رہا تھا۔

"کیا آپ اس مصیبت کو فیس کر رہے ہیں جو آپ کو پھانسے ہوئے ہے؟"

"میں کم از کم کسی کو الزام نہیں دے رہا۔"

"مگر آپ لیڈر ہیں' ڈیڈ۔ لیڈر کی ذمہ داری زیادہ ہوتی ہے۔ آپ کو وہ چرواہا بننا ہے جو سرکش بھیڑوں کو ایک جگہ اکٹھا کر کے ان سے کام لینا جانتا ہے۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے افسوس سے کہہ رہی تھی۔ "مگر مجھے تو لگ رہا ہے کہ آپ نے خود بھی ان حالات کو قبول نہیں کیا ابھی۔"

"میرا ایک ملک ہے پیچھے' آریانہ۔ مجھے.... ایک... ملک چلانا ہے۔"

"وہ ملک اب پیچھے رہ گیا ہے' ڈیڈ۔" اس کے الفاظ وان فاتح کے دل میں بھالے کی طرح کھب گئے۔ تکلیف اتنی تھی کہ چہرے پہ ظاہر ہونے لگی۔

"میں نے اتنے سال ایک مقصد کے لئے کوشش کی ہے۔ وہ... میرا... ملک ہے آریانہ! مجھے اگلے ہفتے تک الیکشن کے لیے پیپرز جمع کروانے ہیں۔" درد اس کے دل سے ہوتا سارے جسم میں سرایت کر رہا تھا۔

"اب وہ سب ختم ہو گیا ہے ڈیڈ۔ اب آپ کو اس جنگل کو قبول کرنا ہو گا۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا اور دو قدم پیچھے ہٹا۔ آنکھوں میں بے پناہ — درد تھا۔ "میرے بغیر میرے ملک کا کیا ہو گا؟"

"آپ کو اس وقت یہ سوچنا ہے صرف کہ آپ کے بغیر آپ کا کیا ہو گا؟" وہ بھی دکھی لگ رہی تھی۔

"کیا سیرا ملائیشیا وقت کی دھول میں غائب ہو گیا ہے' آریانہ؟" اس کے حلق میں کچھ پھنسا۔

"ہو سکتا ہے وہ دوبارہ کسی موقع پہ ظاہر ہو جائے' ڈیڈ۔ مگر اس وقت آپ 'سلطنتِ ملاکہ' میں ہیں۔ یہ جنگل اور اس سے مقابلہ کرنا ہی سب سے بڑی لڑائی ہے۔"

"میں کچھ نہیں جانتا مجھے کیا کرنا ہے۔"

"ڈیڈا!" وہ نرمی سے مسکرائی۔ "میں اتنے

گھنٹوں سے دیکھ رہی تھی۔ آپ اس درخت کے پاس اداس بیٹھے تھے۔ آپ اتنی جلدی اداس نہیں ہوتے تھے مگر وہ آپ کا فطری ردعمل تھا۔ آپ انسان ہیں' آپ گھبرا سکتے ہیں' میں مانتی ہوں۔ لیکن آپ بہت بہادر انسان ہیں' آپ نے زندگی میں اس سے بڑے امتحان دیکھے ہیں۔"

وہ ہلکا سا مسکرایا۔ "یہ جنگل ڈسٹرکٹ اٹارنی آفس کی دوسری کیمپین سے زیادہ خوفناک نہیں ہے۔"

"یاد ہے ڈیڈ' کتنے مسئلوں میں پھنسے تھے ہم' مگر نکل آئے تھے نا۔" وہ ہلکا سا ہنس دی تو اس نے مسکرا کے سر ہلا دیا۔

"تو اب میں کیا کروں؟"

"آپ کو اپنے ساتھ ان دونوں کو بھی جنگل سے نکالنا ہے۔"

"وہ دونوں میرے لیے اجنبی ہیں۔ ایک میں مجھے دلچسپی نہیں اور دوسری مجھے شدید ناپسند رہی ہے۔"

"لیکن آپ پھر بھی ان کو سنبھال سکتے ہیں' ڈیڈ۔ پارٹی چیئرمین کا الیکشن ابھی نہیں ہوا مگر سب جانتے ہیں کہ موجودہ چیئرمین کی پچھلے ایک سال سے غیر دلچسپی کے باعث باریسن نیشنل کو آپ ہی سنبھال رہے ہیں۔"

"وہ ایک سیاسی پارٹی ہے بیٹا۔ وہ اور بات ہے۔"

"سیاست ایک جنگل ہے اور باریسن نیشنل کے اس وقت ڈھائی لاکھ سے زیادہ ممبرز ہیں۔ آپ کے کارکن جن سے آپ ہر وقت ای میل' فون' جلسوں' اور باہمی ملاقاتوں کے ذریعے جڑے رہتے ہیں۔ آپ سے جو کارکن ایک دفعہ ملاقات کرلے آپ کو وہ ہمیشہ یاد رہتا ہے۔ آپ سیاستدان ہیں۔ ڈونٹ ٹیل می جو شخص اپنے ہزاروں کارکنوں کے نام تک یاد رکھتا ہے' وہ ان دو لوگوں کو نہیں سنبھال سکتا؟"

وہ بالآخر مسکرا دیا۔ "تم چاہتی ہو میں ان دونوں کے بارے میں اپنے جذبات پس پشت ڈال کے ان کو کارکنوں کی طرح ٹریٹ کروں؟ ان سے کام لوں اور ان کو لیڈ کرتے ہوئے اس جنگل سے نکالوں؟"

"آپ کو یقین آچکا ہے اب تک ڈیڈ' کہ آپ واقعی وقت میں پیچھے جاچکے ہیں۔ آپ کو جنگل سے نکلنا ہوگا اور آبادی ڈھونڈنی ہوگی۔ اس کے لیے آپ کو وہی کرنا ہوگا جو آپ ہمیشہ سے کرتے آئے ہیں۔"

"لائیک فادر لائیک ڈاٹر!" وہ کھل کے مسکرایا۔

نالے کا دوسرا کنارہ اب خالی تھا۔ آریانہ جاچکی تھی۔

وان فاتح کے ذہن کے سارے جالے صاف ہوچکے تھے۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ چند لمحے گہرے گہرے سانس لیتا رہا پھر آنکھیں کھولیں تو وہ ایک مختلف انسان نظر آتا تھا۔ وہی جو پارلیمان میں گردن اکڑائے ہوئے تقریر کرتا تھا... جو کسی جلسے میں اسٹیج پہ کھڑا مسکراتے ہوئے عوام کی طرف ہاتھ ہلاتا تھا... جو کیمپین آفس میں تیز تیز چلتے ہوئے تحکم سے اسٹاف ورکرز کو ہدایات جاری کرتا تھا... وہ چند گھنٹوں کے لئے کھو گیا تھا مگر اب وہ واپس آچکا تھا۔

اس کے قدم تیزی سے غار کی طرف اٹھنے لگے۔

واپسی کا سفر ویسے بھی جلدی طے ہوجاتا ہے۔

وہ غار کے دہانے تک آیا تو وہ دونوں ابھی تک درشتی سے بحث کررہے تھے۔ تلخ کلامی اب تالیہ کے چور ہونے تک پہنچ چکی تھی' اور وہ جواباً اس کو سکے کا لالچ آجانے کا طعنہ دے رہی تھی۔ فاتح نے ٹارچ جلا کے ایک کونے میں کھڑی کی تاکہ سارا غار روشن بھی ہو جائے اور کسی کی آنکھوں میں روشنی بھی نہ پڑے۔

"وہ ٹھیک کہہ رہی ہے ایڈم۔" وہ سنجیدہ آواز میں بولا تو دونوں نے چونک کے اسے دیکھا۔

"ہمیں لینے کوئی نہیں آئے گا۔ انتظار ترک کردو۔"

تالیہ کے لب ابھی مسکراہٹ میں ڈھلنے لگے تھے کہ...

"مگر وہ غلط کہہ رہی ہے کہ ہم کبھی واپس نہیں جاسکتے... ہم جائیں گے اور ضرور جائیں گے کیونکہ نہ میں ایڈم کی طرح انتظار کرتا ہوں کہ دوسرے آکر مجھے مصیبت سے نکالیں' نہ میں تالیہ کی طرح دنیا میں صرف تلخ حقیقتوں کو دیکھتا ہوں۔" تالیہ کی مسکراہٹ سمٹ گئی۔ ناک سکیڑ لی۔

"مگر سر... کوئی آئے گا۔ ہمیں امید رکھنی چاہیے۔ آپ تو خود کہتے تھے کہ ہمیں مثبت سوچنا چاہیے ہمیشہ۔" اس کے الفاظ غار سے ٹکرا کے واپس پلٹ رہے تھے۔ باہر پانی اور پرندوں کا شور پھر سے سنائی دینے لگا تھا۔

"دوسروں پہ تکیہ کرنا مثبت سوچ نہیں ہوتا۔ وان فاتح نے کبھی دوسروں کا انتظار نہیں کیا کہ وہ آکر اس کو مصیبت سے نکالیں گے۔ ہمیشہ خود کوشش کی ہے۔ اس سے بڑے بڑے جنگل دیکھے ہیں میں نے اور میں کبھی نہیں ہارا۔ مجھے نہیں معلوم ہم کتنے وقت کے لیے اس جگہ پھنسے ہیں مگر دو باتیں آج دماغ میں بٹھالو۔"

وہ دونوں دم سادھے اس کو بولتے دیکھ رہے تھے۔ رعب سا رعب تھا۔ ادب سا ادب تھا۔ ایڈم ڈھیرے سے کھڑا ہوگیا تھا۔

"پہلی بات' ہم یہاں کسی دوسرے کی وجہ سے نہیں پھنسے۔ ہم اپنی مرضی سے آئے تھے۔ اور دوسری یہ کہ... ہم یہاں سے... واپس اپنی دنیا میں... ضرور جائیں گے۔ اِز دیٹ کلیئر؟"

تالیہ نے سر ہلا دیا۔ ایڈم نے سر جھکا دیا۔

"مگر تب تک ہمیں ان حالات کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ ایڈم... تم ملٹری میں رہے ہو' تم نے جنگل میں ٹریننگ حاصل کی ہوگی۔ تم تالیہ کو بتاؤ' جنگل کے بارے میں پہلی بات کیا پڑھائی جاتی ہے؟" وہ آستینوں کو مزید موڑتے ہوئے کسی کمانڈر کی طرح حکم دے رہا تھا۔

ایڈم نے چہرہ اٹھایا اور خالی خالی نظروں سے ان دونوں کو دیکھا۔

"بتاؤ ایڈم... ساری دنیا کے جنگلوں کے بارے میں پہلی اور بنیادی بات کون سی بتائی جاتی ہے؟"

ایڈم کے لب ہلے۔

"Never Fight the Jungle." (جنگل سے لڑائی نہ کرو)

غار میں ایک دم ہیبت ناک سی خاموشی چھا گئی۔

تالیہ کا دل دھک سے رہ گیا۔

"سنا تم نے تالیہ۔ ہم دونوں جانتے ہیں اس بات کو۔ تم بھی جان لو۔ جنگل سے کبھی لڑائی نہیں کی جاتی۔ صرف اس کے اندر سے راستہ بنا کر اس سے نکلنا ہوتا ہے کیونکہ جنگل اور انسان کی لڑائی میں جنگل ہمیشہ جیت جاتا ہے۔"

"لڑیں گے نہیں تو زندہ کیسے رہیں گے؟" اس کا دل ڈوبا۔

"زندہ رہنے کے لئے لڑنا ضروری نہیں ہے' خود کو زندہ رکھنا ضروری ہے۔" وہ قدرے نرمی سے بولا تو تالیہ نے سر ہلا دیا مگر وہ ابھی تک متذبذب لگتی تھی۔ کیا یہ وہی آدمی تھا جو اتنے دن اس کو نظر انداز کرتا یا جھڑکتا نظر آیا تھا۔ اس کے بعد بے اعتباری کا فیز آیا۔ پھر سچ سن کے چپ ہوگیا اور اب...؟؟ اتنا نرم؟ اسے حوصلہ ہوا۔

"کیا ہم... واقعی واپس جاسکتے ہیں۔"

"اگر ہم آسکتے ہیں' تو جا بھی سکتے ہیں۔ میں نہیں جانتا کب' لیکن میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تم دونوں کو واپس لے جانے کے لئے مجھے جو کرنا پڑا' میں کروں گا۔"

"مگر..."

"تالیہ..." وہ ایک دم الرٹ سا سیدھا ہوا۔ "ہلنا مت۔"

وہ دیوار سے لگی کھڑی تھی۔ آنکھیں حیرت سے چھوٹی کیں۔ "کیا ہوا؟"

"ساکن کھڑی رہو۔ بالکل اسٹل۔ خاموش اور اسٹل۔ اب میں جو کہنے جارہا ہوں' اس پہ ری ایکٹ مت کرنا۔"

وہ بالکل ساکت ہوگئی' مگر چہرے پہ حیرانی تھی۔ نظریں گھما کے ایڈم کو دیکھا جو دھیرے دھیرے اس سے دور ہٹ رہا تھا۔ "سس..." اس نے تب وہ پھنکار سنی۔ سارا وجود سن ہوگیا۔

"ریلیکس رہو۔ تمہارے سر کے اوپر سانپ

"ہے اور یہ زہریلا ہے۔ مگر ہلنا مت تالیہ۔ ہلنا مت۔" وہ پلک جھپکے بنا اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ وہ دم سادھے کھڑی رہی۔ پھر پلکیں جھپک کے اثبات میں اشارہ کیا۔

ایک سیاہ چمکیلا سانپ اوپر دیوار پہ پھن پھیلائے بیٹھا تھا۔

"اگر تم اچانک ہلیں تو یہ حملہ کر دے گا۔ سانپ ہمیشہ ڈر کے حملہ کرتا ہے۔" وہ دھیرے دھیرے کہہ رہا تھا۔ "ایڈم... تم بہت آہستہ سے نیچے پڑا بیگ اٹھاؤ اور کھولو۔ تالیہ مجھے بتاؤ' تمہارے پاس کوئی نوکیلی چیز ہے۔"

"خنجر ہے۔" وہ بدقت بول پائی۔ وہ دیوار سے لگی تھی۔ چہرہ سفید پڑ رہا تھا اور پیشانی پہ پسینہ آرہا تھا۔ ایڈم نے آہستہ سے پیر سے بیگ کو قریب کیا اور دھیرے دھیرے نیچے بیٹھا....

سانپ ہل نہیں رہا تھا مگر گردن دائیں بائیں کر کے وہ آگے پیچھے دیکھ رہا تھا۔

"سانپ دشمن ہوتا ہے۔ اور دشمن کو ہرانے کا طریقہ کیا ہے جانتی ہو؟" وہ تالیہ کی آنکھوں میں دیکھ کے کہہ رہا تھا۔ ایڈم نے بیگ کی زپ کھولی۔

"کیا؟" اس کا چہرہ پسینے سے تر ہو گیا تھا۔

"دشمن کے سامنے panic (گھبرایا) نہیں کرتے۔ خود کو ریلیکس رکھتے ہیں۔ اس کو علم نہیں ہونا چاہیے کہ تم اس سے ڈر لی ہو۔"

ایڈم نے بیگ کھولا.... اندر چند اوزار رکھے تھے۔ خنجر سامنے ہی تھا۔ سب کچھ بھیگا ہوا تھا۔ اس نے خنجر نکال کے فاتح کے ہاتھ میں دیا۔

"آپ کو...." وہ فاتح کو دیکھتے ہوئے رک رک کے بولی۔ "لگتا ہے کہ... میں panic.... (بے جا خوف زدہ) کر رہی ہوں؟"

"ظاہر ہے تم panic کر رہی ہو.... بلکہ تم سفید پڑ رہی ہو.... ریلیکس.... ایک سانپ ہی تو ہے۔" اس نے خنجر دستے سے ہاتھ میں پکڑا۔ نظریں کسی شکاری کی طرح سانپ پہ جمی تھیں۔

"میں.... خوفزدہ.... اس لیے نہیں ہوں کہ...." اس کے ابرو سے پسینے کے قطرے ٹپ ٹپ گر رہے تھے اور لب ہلائے بغیر بدقت بول رہی تھی۔ "کہ مجھے سانپ کا ڈر ہے۔"

"رکیلی..... پھر...." وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا تھا۔ قریب آرہا تھا.....

"مجھے ..... اس بات کا ڈر ہے کہ .... آپ دونوں...." اس نے گلابی پڑتی آنکھوں سے فاتح کی آنکھوں میں دیکھا۔ "مجھے.... اس سانپ کے.... حوالے کر کے.... اکیلا.... چھوڑ جائیں گے۔"

وہ ٹھہرا۔ قدرے بے یقینی' قدرے افسوس سے اسے دیکھا۔ "تمہیں لگتا ہے میں اتنا برا ہوں؟"

"نہیں۔ آپ کو لگتا ہے کہ میں اتنی بری ہوں۔" ایک آنسو آنکھ کے کنارے سے ٹپکا اور پسینے کے ساتھ خلط ملط ہو گیا۔

اس نے جواب نہیں دیا۔ سانپ پہ نظریں جمائے مزید قریب آیا اور پھر ایک دم بازو بڑھا کے چاقو اس کے اندر گھونپ دیا۔ لمحے بھر کا عمل تھا۔ سانپ کا سر کٹ کے نیچے جا گرا۔ اور لمبا سا دھڑ دیوار پہ تڑپنے لگا۔

وہ تیزی سے باہر کو بھاگی۔ ایڈم نے سر کے گرتے ہی اسے بوٹ تلے کچل دیا۔

وان فاتح نے اس کا تڑپتا دھڑ اٹھایا اور الٹ پلٹ کے بغور دیکھنے لگا۔ چند سیکنڈ میں اس کی تڑپ دم توڑ گئی۔

وہ ہراساں سی باہر کھڑی تھی۔ رسی نما دھڑ اٹھائے وہ باہر آیا اور اسے دور اچھال دیا۔ جنگل کے گھنے درختوں اور اونچی نیچی ڈھلان میں وہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔ پھر اس نے فرصت سے اس لڑکی کو دیکھا جو بار بار تھوک نگل رہی تھی۔ اسے دیکھتا پا کے وہ دوسری جانب دیکھنے لگی۔

"میں جھوٹے وعدے نہیں کرتا۔ اگر آئندہ کہوں کہ میں تمہیں بچا لوں گا تو اس کا مطلب ہے' میں.... تمہیں... بچا لوں گا۔"

"ہاں۔ جھوٹ تو صرف میں بولتی ہوں۔ آپ سب تو بہت عظیم انسان ہیں۔" اس کا جانے کیوں گلا رندھ گیا۔ بھیگی آواز میں کہتی ہوئی تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

چاندنی اتنی مدھم تھی کہ وہ چند قدم ہی آگے جا پائی۔ پھر رکی۔ (اگر یہاں بھی سانپ ہوئے؟ اوہ نو۔) وہ واپس پلٹی اور غار کی طرف قدم بڑھانے لگی۔ مٹی گیلی تھی' اس لیے اس کے قدموں نے چاپ پیدا نہیں کی۔ پتے تک نہیں کھڑکے۔ وہ غار کے قریب تھی کہ سماعت سے آوازیں ٹکرائیں۔ اندر فاتح اور ایڈم کچھ بول رہے تھے۔ وہ رک کے سننے لگی۔ ایڈم نے جانے منمنا کے کیا کہا تھا' کہ وہ جواب میں کہنے لگا تھا۔

"میں آئندہ کبھی نہ سنوں کہ تم اس کو اس کی پرانی زندگی کا حوالہ دے رہے ہو۔ یاد رکھو اس نے ہم سے سچ بولا ہے۔ اس کے لیے بہت ہمت چاہیے ہوتی ہے۔"

وہ چونک کے غار کو دیکھنے لگی۔

"مگر سر' چند گھنٹے پہلے تک تو وہ اسی زندگی میں تھیں۔ انہوں نے وہ چھوڑی تو نہیں ہے اور کیا معلوم وہ اب بھی کچھ نہ کچھ جھوٹ بول رہی ہوں۔"

"وہ جھوٹ نہیں بول رہی اب۔"

"ہمیں کیسے پتہ چلے گا کہ وہ اب سچ بول رہی ہیں۔"

"ہمیں پتا چلانے کی ضرورت ہے بھی نہیں۔ ہمیں صرف انسان کے اندر کی اچھائی پہ بھروسہ کرنا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی کسی پہ ہمارا یقین اس کو سچا بنا دیتا ہے۔ بہر حال' آئندہ میں تمہارے منہ سے نہ سنوں یہ سب۔" تالیہ کا دل بھر آیا۔

"آئندہ؟" ایڈم کا دماغ ایک ہی لفظ پہ اٹک گیا۔

"ہاں ایڈم.... آئندہ! کیونکہ اس جنگل سے نکلنے میں ہمیں ابھی کافی وقت لگنا ہے...."

"کافی وقت کیوں؟"

"کیونکہ جنگل.... زندہ ہوتا ہے۔"

غار کے باہر کھڑی لڑکی جہاں بہت سے بوجھ سے آزاد ہوئی' وہیں ایک بازگشت اسے چاروں طرف سنائی دینے لگی۔

جنگل زندہ ہوتا ہے۔ جنگل ہمیشہ زندہ ہوتا ہے۔

☆☆☆

رات لمحہ بہ لمحہ بیت رہی تھی۔

رات صدی بہ صدی بیت رہی تھی۔

اتنی سیاہ گھور اندھیر رات.... لگتا تھا کبھی ختم ہی نہیں ہوگی۔ جنگل میں دور دور سے مسلسل آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ پرندوں اور جانوروں کی۔ مگر وہ دکھائی نہیں دیتے تھے۔ ایڈم غار سے نکل آیا تھا اور باہر ایک پتھر پہ بیٹھا تھا۔ فاتح قریب میں تارچ سے روشنی ڈالے کچھ تلاش کر رہا تھا۔ آستینیں چڑھا رکھی تھیں' اور انداز میں ٹھہراؤ تھا۔

تالیہ کافی فاصلے پہ بارش کے جمع ہوئے پانی کے جوہڑ کے ساتھ بیٹھی تھی۔ سیل کی تارچ اس نے جلا رکھی تھی' کہ جانے کب کوئی سانپ بچھو نکل آئے۔ جنگل زندہ تھا۔ احساس ہو گیا تھا۔ پتھروں کے نیچے.... درختوں پہ.... چٹانوں پہ رینگتے کتنے جانور اور کیڑے مکوڑے ان کے ساتھ موجود تھے۔ وہ جنگل کو زندہ رکھے ہوئے تھے۔

اس کے پاس پانی کی ایک ہی بوتل تھی جس سے وہ تینوں پانی پی چکے تھے اور پانی ختم ہو چکا تھا۔ کولا کا کین بھی ختم ہو چکا تھا۔ شدید حبس اور گرمی ہو رہی تھی۔

"سر...." ایڈم نے فاتح کو یوں پتھروں میں کچھ تلاش کرتے دیکھا تو پکار اٹھا۔ "آپ اتنے مطمئن کیسے ہو گئے ہیں؟ میرا تو مارے مایوسی کے برا حال ہے۔" وہ اداس لگ رہا تھا۔

"وان فاتح نے اس سے بڑے حادثے دیکھے ہیں' ایڈم۔"

"کیا آپ جنگلوں میں بہت آیا کرتے تھے؟ چھٹیوں وغیرہ میں...."

"تم نے تو ملٹری میں ٹریننگ لی ہے' تم سے

زیادہ وقت نہیں گزارا ہوگا میں نے جنگلوں میں۔" اس نے ایک لکڑی کی ٹہنی زمین سے اٹھائی اور خنجر سے اسے کاٹا۔

تالیہ رخ موڑے پانی کے قریب بیٹھی تھی' البتہ کان وہیں لگے تھے۔ خنجر سے ٹہنی کے کاٹنے کی آواز کی گونج پلٹ پلٹ کے سنائی دی تھی۔

"ملٹری کی یاد بھی تکلیف دہ ہے....." ایڈم نے چہرہ ہاتھوں میں گرا دیا۔ "میں وہ سب بھلانے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔"

"کیوں؟" فاتح اس کے سامنے پتھر پہ آ بیٹھا اور گھٹنے پہ ٹہنی رکھ لی۔ پھر خنجر سے اسے چھیلنے لگا۔

"کیونکہ مجھے نسلی تعصب کی وجہ سے وہاں سے نکالا گیا تھا۔ میں وہ سب نہیں بن سکا وہاں جو میرے دوست بنتے گئے۔"

"تو اس میں اتنا غمگین ہونے والی کون سی بات ہے؟ ہر انسان کسی نہ کسی مقام پہ جاب میں دھکا کھاتا ہے۔" وہ اب سر جھکائے لکڑی کو مہارت سے خنجر سے چھیل رہا تھا۔ ایڈم نے تعجب سے اسے دیکھا۔

"سر..... میری جاب چلی گئی' میرا کیریئر ختم ہو گیا۔ اس دھکے نے میری زندگی برباد کر دی۔"

"اور تم نے اس سے کیا سیکھا؟" خنجر چلاتے ہوئے پوچھا۔ جواب نہیں آیا تو نظریں اٹھا کے ایڈم کو دیکھا۔ "کیا تم نے اس واقعے سے کچھ نہیں سیکھا؟"

تالیہ نے گھٹنوں سے چہرہ اٹھایا اور مڑ کے اسے دیکھنے لگی۔

"وہ میری زندگی کا ایک المناک ترین واقعہ تھا۔"

"ایڈم' ہمارے رسول اللہ ﷺ نے ہمیں دو چیزوں سے آزاد کر دیا تھا۔ ماضی کے غم اور (تالیہ کو کن انکھیوں سے دیکھا۔) مستقبل کے خوف سے۔ کوئی برا واقعہ تمہارے ساتھ گزرا بھی ہے تو تم اس کو اپنا استاد بنا لو۔ بس۔ بات ختم۔"

"وہ کیسے؟"

"سوچو کہ یہ کیوں ہوا؟ اور اگلی دفعہ وہ کام نہ کرو۔ اس کو میچور ہونا یا گرو کرنا کہتے ہیں۔ کیوں تم لوگ پرانے غم سینے سے لگائے بیٹھے رہتے ہو۔ دنیا ماضی اور مستقبل کی قید سے آزاد لوگوں کی ہے۔" چاقو کے لکڑی پہ چلنے کی آوازیں برابر سنائی دے رہی تھیں۔

"مگر مجھے لگتا ہے میں ایک ٹوٹل فیلیئر ہوں۔ میں بات بات پہ گلٹی فیل کرتا ہوں۔ یہ کیا بول دیا' یہ کیوں کر دیا۔"

تالیہ نے ناک سکیڑ کے چہرہ موڑ لیا۔ (گلٹی کا بچہ۔ اتنے دن میرے پیچھے پڑا رہا۔)

"یہ ان لوگوں کی نشانی ہے جو نہ خود سے پیار کرتے ہیں' اور نہ ہی خود پہ بھروسہ کرتے ہیں۔"

"میرے پاس خود سے پیار کرنے کے لیے کوئی وجہ ہی نہیں ہے' سر۔" اس نے پھر سے چہرہ جھکا لیا۔

"تو پھر خود پہ بھروسہ کرنے کی وجہ ڈھونڈو۔ کسی کام میں تو تم بھی اچھے ہو گے۔" وہ ٹہنی کو اب ایک طرف سے کاٹ رہا تھا۔ ایسی مہارت سے گویا ساری عمر یہی کام کرتا آیا ہو۔

"اگر ہوتا تو جاب نہ چلی جاتی؟ میرا تو کوئی ٹیلنٹ ہی نہیں ہے۔" اس کی گردن ابھی تک جھکی تھی۔ اطراف میں کھڑے اونچے درخت خاموشی سے ان کو دیکھتے رہے۔

"ہر انسان میں کچھ نہ کچھ ہوتا ہے۔ تم میں بھی ہو گا۔ مایوسی چھوڑو' اور یاد کرو۔ تم نے صباح کے جنگلوں میں تربیت لی ہے۔ جنگل میں انسان کو جو معلوم ہوتا ہے' وہ اس کی جان بچاتا ہے' اور جو معلوم نہیں ہوتا (توقف کیا) وہ مار ڈالتا ہے۔"

اس کی آواز کی سنسنی اور رات کا اندھیرا۔ تالیہ کو اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔

ایڈم نے پیشانی کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ "مجھے کچھ بھی نہیں یاد۔ ہم تربیت لیتے تھے۔ ہمارے پاس گنز ہوتی تھیں۔ بس ہم دشمن کا سوچتے تھے۔ دشمن کے مورچے' باوردی سرنگیں۔" اس نے کراہ کے نفی میں سر ہلایا۔ "میں ایک ٹوٹل فیلیئر ہوں سر۔"

وان فاتح نے جواب نہیں دیا۔ وہ لکڑی کو چھیلتا رہا۔ ایڈم چند لمحے بے بسی سے اسے دیکھتا رہا پھر لبوں

کو جنبش دی۔ "آپ کی بیٹی بھی پہاڑوں میں کھوئی تھی نا' سر۔"

خنجر سے لکڑی کو چھیلتے اس کے ہاتھ تھمے۔ سوگواریت سے مسکرایا اور نظر اٹھا کے اسے دیکھا۔ "ہاں۔ کیمرون ہائی لینڈ کے ٹریک پہ۔"

تالیہ پھر سے مڑ کے اس کو دیکھنے لگی۔ اسے آریانہ کے ذکر پہ وان فاتح کے چہرے پہ جس دکھ کی توقع تھی' وہ وہاں نہیں تھا۔

"کیا آپ اس کے بعد دوبارہ بھی جنگل یا پہاڑوں میں گئے؟ آپ کو تکلیف نہیں ہوتی تھی؟"

"ظاہر ہے' میں گیا۔ اور تکلیف کا علاج فرار سے نہیں کیا جاتا۔ جو تکلیف دیتا ہے' اس سے بھاگ جاؤ تو کیا زخم بھر جائے گا؟ نہیں' بے وقوف انسان۔ ماضی سے نکل کے حال میں جینے سے زخم بھرتے ہیں۔ تالیہ..... مجھے تمہارا کوٹ چاہیے۔" آخر میں گردن گھما کے پانی کی طرف دیکھا جہاں وہ گردن موڑے بیٹھی اسی طرف دیکھ رہی تھی۔

"میرا کوٹ کیوں؟" اس نے اچنبھے سے ساتھ رکھے کوٹ کو دیکھا جو گرمی کے باعث اس نے اتار دیا تھا' پھر اسے اٹھایا اور گول مول کر کے فاتح کی طرف اچھال دیا۔

"کیونکہ میں فیز تھری میں ہوں' اور تم دونوں ابھی فیز ون سے نہیں نکلے۔" کوٹ اس کے قریب گرا تو فاتح نے جھک کے وہ اٹھایا اور اسے الٹایا۔ پھر اندر ایک جگہ خنجر رکھا۔ "جنگل میں آنے کے بعد..... تمہیں ملٹری میں بتایا گیا ہو گا ایڈم..... انسان تین فیزز سے گزرتا ہے۔" خنجر کو اندر گھونپا اور زور سے نیچے لایا۔ کوٹ کی اندرونی لائننگ شڑپ کی آواز کے ساتھ کٹتی چلی گئی۔ تالیہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ (میرا رالف لارین کا کوٹ۔)

"فیز ون..... جب انسان جنگل میں اترتا ہے' اور اسے کچھ معلوم نہیں کہ وہ کون سی دنیا میں آ گیا ہے۔ خوف کا فیز۔"

اب وہ ہاتھوں سے لائننگ پھاڑ رہا تھا۔ ریشمی کپڑے کے پھٹنے کی آواز دور دور تک جاتی اور بازگشت پلٹ کے سنائی دیتی۔

"فیز ٹو..... جب اسے احساس ہوتا ہے کہ جنگل زندہ ہے۔ سانپ' بچھو' کیڑے..... وہ اس کے فرش اور درختوں میں چھپ کر انسان کو دیکھ رہے ہیں۔"

تالیہ کی گردن کے بال کھڑے ہونے لگے۔ وہ پانی سے ذرا دور کھسکی۔ ایڈم نے اپنے پیر اونچے کر کے دوسرے پتھر پہ رکھ لیے۔

"اور فیز تھری!" اس نے خنجر رکھ دیا اور کوٹ اٹھا کے دیکھا۔ لائننگ کھل جانے کے باعث وہ بڑا سا کپڑا بن گیا تھا۔ "جب انسان جنگل سے لڑنے کا ارادہ ترک کر کے سمجھ داری سے پلان بناتا ہے کہ اسے کیا کرنا ہے' اور کہاں جانا ہے۔ بہتر ہو گا اگر تم لوگ جلد اپنے حالات سے سمجھوتہ کر لو اور آگے کا سوچو۔" وہ کوٹ اور ٹہنی اٹھائے کھڑا ہوا اور ٹارچ کی روشنی آگے پھینکتا ایک طرف چلتا گیا۔ وہ دونوں گردن موڑ کے اسے جاتے دیکھتے رہے' یہاں تک کہ روشنی غائب ہو گئی۔

"فاتح صاحب کہاں گئے؟" وہ بول اٹھا۔

"وہ اتنے مطمئن کیسے ہو سکتے ہیں؟" وہ بڑبڑائی۔ گردن اٹھا کے اطراف کو دیکھا جہاں مہیب' پراسرار درخت اسے دیکھ رہے تھے۔

زندہ درخت۔ زندہ جنگل۔ اسے جھرجھری آ گئی۔ ایڈم بھی یہی سوچ رہا تھا مگر بولا نہیں۔

دور..... کافی فاصلے پہ وہ ٹارچ کی روشنی آگے ڈالتا چلا جا رہا تھا۔ سفید لباس والی آریانہ چپکے سے اس کے ساتھ چلنے لگی تھی۔

"مجھے پتا ہے ڈیڈ' آپ ان کے سامنے خود کو کتنا مضبوط ظاہر کریں' آپ خود بھی پریشان ہیں۔"

"ظاہر ہے میں پریشان ہوں' فرسٹریٹڈ ہوں' بلکہ وحشت زدہ ہوں۔" وہ ایک درخت کے قریب رکا اور اس سے لگی سوئی ٹہنی کو چھوا۔

"تو آپ کو واقعی یقین ہے کہ آپ ان کو اس جنگل سے نکال لیں گے؟"

”میں نے تمہیں ہمیشہ کیا سکھایا ہے آریانہ؟“ وہ آرام سے بولتے ہوئے ٹہنی کو درخت سے اتارنے لگا جو بیل کی صورت میں اس سے لپٹی ہوئی تھی۔ ”انسان امید نہیں چھوڑتا۔ جتنے برے حالات ہوں‘ آنکھیں ہمیشہ ’انعام‘ پہ رکھنی ہوتی ہیں۔ صبر کے میٹھے پھل پہ۔“

“Eyes on the Prize!”

(نظریں ہمیشہ انعام پر رکھو) وہ ہلکا سا ہنسی۔ مگر اس کی ہنسی کی بازگشت نہیں سنائی دیتی تھی۔

”اور اگر میں ان دونوں کو ایک جنگل سے نہ نکال سکا....“ اس نے ٹہنی اتارتے ہوئے زخمی سا مسکرا کے آریانہ کو دیکھا۔ ”تو میں اپنے ملک کے کروڑوں لوگوں کو ان حالات سے کیسے نکالوں گا جس میں وہ جی رہے ہیں؟“

وہ مسکرادی۔ فاتح ٹہنی کے بل کھولنے لگا۔ جب اسے اتار کے وہ مڑا تو آریانہ غائب ہوچکی تھی۔

وہ گہری سانس لے کر واپسی کے لئے قدم اٹھانے لگا۔

‘Eyes on the Prize’

☆☆☆

رات ایسی طویل تھی کہ کٹتی ہی نہیں تھی۔ اندھیرا چھٹتا ہی نہیں تھا۔ چاند کی روشنی پہنچتی ہی نہیں تھی۔ اس کے موبائل کی بیٹری ختم ہورہی تھی مگر وہ پھر بھی اسے جلائے بیٹھی تھی۔ نیند کا احساس تو غالب نہیں آیا مگر اب بالآخر بھوک لگنے لگی تھی۔

پتھروں اور پتوں پہ بوٹ رکھنے کی آواز آئی تو وہ چونکی۔ فاتح اس کی طرف آرہا تھا۔ وہ ذرا چوکنی سی ہو کے بیٹھی۔ مڑ کے نہیں دیکھا۔ وہ اس کے ساتھ والے پتھر پہ آکے بیٹھا اور کوٹ کا ٹکڑا اس کو دکھایا۔

”تمہیں اس کی ضرورت تو نہیں تھی؟“

اس نے اداس نظریں اٹھا کے اسے دیکھا اور نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں‘ تو انکو۔“ آواز دھیمی تھی۔

”کیا تمہارے پاس کھانے کو کچھ نہیں ہے؟“

”چاکلیٹ..... رکھتے رکھتے رہ گئی۔ اب بہت یاد آرہی ہیں۔“

”صبح ہوتے ہی ہم کھانا ڈھونڈیں گے۔ فکر مت کرو۔“ وہ نرمی سے کہتے ہوئے بغور اسے دیکھ رہا تھا۔ تالیہ بھی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

”میں نے آپ کے گھر میں چوری کی... آپ کو عالم بن کے دھوکا دیا۔ گھائل غزال .... نیلامی.... گھر خریدنا.... پینٹنگ بنانا.... میں نے اتنے اسکام کیے اور آپ ایک دم میرے ساتھ اچھے ہوگئے ہیں۔ کیوں؟“

”کیوں کہ تم نے مجھ سے سچ بولا ہے۔“ وہ اسی نرمی سے بولا تھا۔

”میرے پاس کوئی اور آپشن تھا کیا؟“

”تالیہ‘ اگر تم اب ہمیشہ....“ اس کی آنکھوں میں دیکھ کے الفاظ ادا کیے۔ ”مجھ سے سچ بولوگی... تو مجھے تم سے کوئی پرابلم نہیں ہوگی۔“

”مگر آپ دل سے میری عزت نہیں کرتے نا۔“ وہ دکھی ہوئی۔ ”اگر ہم واپس گئے بھی تو آپ مجھے ایک دن میں ہی بھول جائیں گے۔“

”تمہیں واپس جانے کا یقین نہیں ہے؟“

رات کے اندھیرے میں وہ شخص سامنے بیٹھا تھا جس پہ ایک دوسری دنیا میں جانے کتنے لوگ فدا تھے۔ جس کا ایک ایک منٹ کیلکولیٹڈ ہوتا تھا۔ پولیٹیکل سیکرٹری کی ڈائری میں نوٹ شدہ۔ اور اب وہ اس کے سامنے فرصت سے بیٹھا تھا۔ ایک تنہا جنگل میں۔ جہاں کرنے کو کوئی اور کام نہ تھا۔

”میں کبھی بھی ہمت نہیں ہارتی تھی‘ تو انکو۔ ایڈم کی طرح میں ماضی میں بھی نہیں رہتی۔“ وہ سوگواریت سے پانی کو دیکھتے ہوئے بتانے لگی۔ ”میرے پاس ہمیشہ پلان ہوتا تھا۔ پلان اے فیل ہوا‘ تو سی‘ نہیں تو ڈی۔“

”اور بی؟“

”تالیہ کے پلان ہیں‘ تالیہ کی مرضی۔“ ذرا سے کندھے اچکائے۔ وہ دھیرے سے ہنس دیا۔

”مگر اب میرے پاس کوئی پلان نہیں ہے۔“ اس نے ٹھوڑی گھٹنوں پہ رکھ دی اور تالاب کو دیکھنے

لگی۔ ”میں اتنے عرصے سے ایک بڑی واردات کا انتظار کررہی تھی۔ میرے مستقبل کے سارے خواب اس کے ساتھ جڑے تھے۔ پھر خزانے کا ذکر آیا تو مجھے لگا‘ یہی میرے سارے مسئلوں کا حل ہے لیکن اب.... جب خزانہ نہیں ہے تو میرا مستقبل ہی ختم ہوگیا ہے۔ مجھے کوئی امید نہیں رہی۔“

”تم مستقبل کے خوف کا شکار ہو۔ یہ ماضی کے غم جیسا ہی برا ہوتا ہے۔“ وہ افسوس سے اس کو دیکھ رہا تھا۔ تاریک جنگل خاموشی سے ان کی گفتگو سن رہا تھا۔ اور دور بیٹھا ایڈم بھی۔

”آپ کو مستقبل سے خوف نہیں آتا؟“

”مثلاً کس چیز سے۔“

”جب آپ وزیراعظم نہیں بنیں گے تو جو جگ ہنسائی اور شرمندگی ہوگی۔ ہم سب کو معلوم ہے کہ آپ وزیراعظم نہیں بن سکتے‘ تو انکو۔“

”اچھا۔“ وہ دلچسپی سے مسکرایا۔ ”اور میں وزیراعظم کیوں نہیں بن سکتا۔“

”کیونکہ آپ سیاسی طور پہ مضبوط نہیں ہیں۔ سیاستدان آپ کا ساتھ چھوڑ چکے ہیں۔ آپ ان جیسے داؤپیچ آزمانا نہیں جانتے۔ آپ....“ اس کی آواز بلند ہوئی۔ بے بسی بھرے غصے سے۔ ”آخر آپ کیوں لڑ رہے ہیں سیاسی جنگیں‘ آپ کو خود بھی معلوم ہے کہ آپ نے ہار جانا ہے۔ آپ سب چھوڑ کے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ملک سے چلے کیوں نہیں جاتے؟“

”تم نے کبھی فٹبال میچ دیکھا ہے؟“ وہ اسی طرح دلچسپی سے مسکراتا گویا ہوا تو تالیہ نے گہری سانس لی اور اعصاب کو ڈھیلا چھوڑا۔

”جی تو انکو۔ دیکھا ہے۔“

”ایک دفعہ میں امریکہ میں ایک میچ دیکھنے گیا۔ بچپن کی بات ہے۔ جانتی ہو ایک ٹیم نے چار گول کر لیے تھے‘ اور دوسری کے گول صفر تھے۔ میچ کے آخری تین منٹ تھے اور دوسری ٹیم کے کھلاڑی آخری حد تک مقابلہ کررہے تھے۔ بار بار حملہ کرتے۔ ہمت ہارے بغیر۔ تین منٹ میں ان کو جیتنے کے لیے پانچ گول چاہیے تھے۔“

”وہ تین منٹ میں پانچ گول تو نہیں کرسکتے تھے‘ پھر کیوں؟“

”یہی تو میں نے سوچا.... سب کو معلوم ہے کہ پہلی ٹیم جیت جائے گی‘ پھر دوسری ٹیم آخری سیکنڈ تک کیوں لڑ رہی ہے؟ ہتھیار ڈال دے اور بس کردے۔ اور پھر پہلی ٹیم جیت بھی گئی لیکن آخری سیکنڈ تک دوسری ٹیم کے لڑکے جواں مردی سے لگے رہے۔“

خاموش مگر زندہ جنگل سن رہا تھا۔ ایک ایک حرف کو بغور پرکھ رہا تھا۔ وان فاتح کہے جارہا تھا۔

”مگر جب میں بڑا ہوا اور میں نے دنیا دیکھی تو مجھے احساس ہوا کہ.... لڑائی صرف جیتنے کے لئے نہیں لڑی جاتی۔ دوسری ٹیم ہتھیار ڈالتی‘ تو بھی ہار جاتی۔ آخری منٹ تک مقابلہ کرتی تو بھی ہار جاتی۔ پھر بھی اس نے لڑنے کو اس لئے چنا کیوں کہ جب ہم لڑ کے ہارتے ہیں تو ہم اس سے کچھ سیکھتے ہیں۔“

تالیہ کا موبائل پتھر پہ پڑا چمک رہا تھا اور اس کی روشنی فاتح کے چہرے کو منور کیے ہوئے تھی۔

”پھر ہم اپنی غلطیوں کا جائزہ امید کے ساتھ لیتے ہیں اور اگلی دفعہ زیادہ جذبے سے میدان میں اترتے ہیں۔ زندگی میں یا ہم نیچے جارہے ہوتے ہیں یا اوپر۔ ہمیں ہر لمحہ خود کو اپنے کیریئر‘ رشتوں‘ اور عمل میں بہتر کرنا ہوتا ہے۔ جہاں ہم رکے.... وہاں ہم (ہاتھ سے اشارہ کیا) نیچے گئے۔“

”آپ کو اس بھیانک جنگل میں کون سی امید نظر آرہی ہے؟ میری تو زندگی ہی ختم ہوگئی ہے۔“

وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ وہ شدید مضطرب اور چڑچڑی دکھائی دیتی تھی۔

”تم نے کہا تم ان کاموں کو چھوڑ دینا چاہتی تھیں۔ کیوں؟“

”کیونکہ میں تنگ آگئی تھی۔“ وہ دبا دبا سا چلائی۔ اس کے سر میں درد ہونے لگا تھا۔ ”میں لوگوں کو دھوکے دے دے کر‘ ان سے جھوٹ بول بول کر بے زار ہوچکی تھی۔ مجھے سکون چاہیے تھا۔“

"گڈ۔ اب تمہیں یہاں کسی سے جھوٹ نہیں بولنا پڑے گا۔"

تالیہ مراد بالکل ٹھہر گئی۔ گم صم۔ لاجواب۔

"یو سی..." وہ گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کے اٹھا۔ "تم یہاں بلاخوف و خطر سچ بول سکتی ہو۔ یہاں کوئی پولیس نہیں ہے۔ اگر یہ واقعی پندرہویں صدی ہے تو یہاں کوئی تمہیں اکیسویں صدی کے جرائم کے لیے نہیں پکڑے گا' تالیہ۔ تم نئے سرے سے سب شروع کر سکتی ہو۔"

اس کے کھڑے ہوتے ہی آسمان کا وہ ذرا ذرا سا حصہ جو گھنے درختوں سے نظر آتا تھا' سفید پڑنے لگا۔ سورج کی پہلی کرنیں درختوں کے بیچ سے گزر کے جنگل کے فرش پہ پڑیں تو وہ دنگ رہ گئی۔

رات کو بالآخر صبح نے مات دے دی تھی' رات دم توڑ گئی تھی۔ کیا واقعی؟

وہ تو سمجھنے لگی تھی کہ دنیا سے سارے اجالے ختم ہو گئے تھے مگر... نہیں....

اس نے چونک کے وان فاتح کو دیکھا جو اس کے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا... امید ابھی بھی باقی تھی۔

اس کے چہرے پہ مغموم مسکراہٹ بکھر گئی۔ فاتح کو دیکھتے ہوئے اس نے سر کو خم دیا۔ گویا کچھ باتیں دماغ میں بیٹھی تھیں۔

"میں کچھ کھانے کے لیے ڈھونڈتا ہوں۔" وہ کہتے ہوئے مڑا اور درختوں کی قطار کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ یکدم رکا اور ہاتھ کو جھٹکا دیا۔ کوئی جھکی ہوئی نوکیلی شاخ اس کے ہاتھ کی پشت کو کھرچ گئی تھی۔ جنگل میں ہر طرف سب کچھ اتنا نوکیلا اور تیز تھا کہ بچنا ناممکن تھا۔ وہ رک کے اپنا ہاتھ دیکھنے لگا۔ سطح پہ معمولی سا کٹ لگا تھا اور خون کے دو قطرے بہے تھے۔

"تو انکو!" وہ پریشانی سے کھڑی ہوئی۔ "آپ کو زخم آیا ہے۔"

"ذرا سا کٹ ہے۔"

"آف کورس مجھے پتا ہے کہ یہ ذرا سا کٹ ہے مگر یہ کھلا زخم ہے اور ہم جنگل میں ہیں۔ یہ تو 'سیپٹک' ہو جائے گا۔" وہ اٹھی اور فکر مندی سے کہتی قریب آئی۔

ایڈم جو ابھی تک سامنے اداس سا بیٹھا تھا' بس سر اٹھا کے دیکھنے لگا۔ افسوس اور مزید اداسی سے۔

"امید ہے septic نہیں ہو گا۔" فاتح نے ہاتھ نیچے کر لیا اور عام سے انداز میں تسلی دی مگر وہ پریشانی سے اسے دیکھتی رہی۔

"میرے پاس تو صرف اوزار ہیں۔ کوئی اینٹی سیپٹک ساتھ رکھنے کی عادت ہی نہیں ڈالی بھی خود کو۔ اب کیا ہو گا؟ ہم تو ان چھوٹے چھوٹے زخموں سے ہی مر جائیں گے۔" صبح کی پھیلتی سفیدی بھی اس کی امید کو ناامیدی میں بدلنے سے نہ روک سکی۔

ایڈم بن محمد نے ایک دم سر اٹھایا۔ "اینٹی سیپٹک۔" وہ بڑبڑایا۔

دونوں نے گردنیں موڑ کے اسے دیکھا۔ کسی خواب کی سی کیفیت میں وہ کھڑا ہوا تھا۔

"ہمیں اینٹی سیپٹک کی کیا ضرورت ہے؟ ہم رین فوریسٹ میں ہیں۔ یہ قدرت کی سب سے بڑی میڈیسن کیبنٹ ہے۔" چونکتے ہوئے انداز میں ایڈم اپنی ایڑیوں پہ گھوما۔ گول چکر کی صورت اس نے چاروں طرف دیکھا۔

(رین فاریسٹ اور جنگل میں فرق یہ ہوتا ہے کہ جنگل میں درخت بھی ہوتے ہیں' آسمان بھی دکھائی دیتا ہے اور زمین پہ پودے اور جھاڑیاں بھی اُگی ہوتی ہیں۔ رین فاریسٹ کے درخت اتنے گنجلک ہوتے ہیں' اور اوپر جا کے اتنے گھنے ہو جاتے ہیں کہ ان کی کینوپی سی بن جاتی ہے۔ سورج کی روشنی زمین تک نہیں پہنچ سکتی۔ سو زمین پہ پودے اور جھاڑیاں کم کم ہوتے ہیں۔ اور درخت بارش کے پانی کے باعث نشوونما پاتے ہیں۔)

وہ جو پہلے درختوں سے اٹا جنگل دکھائی دے رہا تھا... ایک دم وہ کچھ اور دکھائی دینے لگا... مختلف قسم کے پتے... مختلف قسم کی لکڑیاں... کہیں کہیں اُگے جنگلی پھول... جڑی بوٹیاں... ہر شے جیسے چمکنے لگی

تھی... ان کے نام... ان کے کام... صبح کی سفیدی نے ذہن کو کسی اور طرح سے بیدار کر دیا تھا۔

"ملائیشیا کے رین فاریسٹ میں دس ہزار سے زیادہ اقسام کے پودے اور درخت ــــ ہیں۔ یہ تو قدرت کی پوری فارمیسی ہے۔" وہ مسحور سا کہہ رہا تھا۔

"تمہیں کیسے معلوم؟" وہ مشتبہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"سیریسلی چے تالیہ... آپ کتابیں نہیں پڑھتیں کیا؟" وہ تیزی سے فاتح کے قریب آیا جو غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کا ہاتھ اٹھا کے دیکھا۔

"ہمیں جنگل میں سکھایا گیا تھا کہ کیا کھانا ہے اور زخم پہ کیا لگانا ہے اور میں خود جڑی بوٹیوں سے اپنے دنے کا علاج کرتا تھا۔ میرے پاس ایک کتاب بھی تھی۔" اس نے فاتح کا ہاتھ اٹھا کے معائنہ کیا۔

"آپ کا کھلا زخم ہے۔ اس کے لیے ہمیں..." اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ "destroyer (تلف شدہ) پودے کے پتے چاہئیں۔ رین فاریسٹ میں ان کی بہتات ہوتی ہے۔ مجھے لگتا ہے میں نے سفید پھولوں والا یہ پودا کل اس طرف دیکھا تھا۔ میں ابھی لے کر آتا ہوں۔"

"اور ساتھ میں کچھ کھانے کے لیے بھی۔"

فاتح مسکرا کے اس کا جوش دیکھ رہا تھا۔

ایڈم کی رنگت بدلی ہوئی تھی۔ وہ بے کار اور ناکام نہیں ہے' یہ خیال اس کے اندر بجلیاں بھر رہا تھا۔ اس نے جلدی سے تالیہ کا خنجر اٹھایا اور آگے بڑھ گیا۔ پھر ذرا ٹھہرا اور قریب میں ایک پودے کے پتوں کو توڑ مروڑ کے ان کا رخ موڑ دیا۔ چند قدم آگے بڑھا اور قطار میں ایک اور پودے کے پتے مروڑ کے موڑے۔

"یہ کیا کر رہا ہے؟" وہ ابھی تک شک سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"وہ راستے پہ نشانیاں چھوڑ رہا ہے۔ تا کہ واپس آسانی سے پہنچ جائے۔ وہ خود پہ بھروسہ کرنا سیکھ رہا ہے۔ جو اسے معلوم ہے' وہ جان بچائے گا' جو نہیں معلوم' وہ جان لے سکتا ہے۔" وہ کمر پہ ہاتھ رکھے مسکرا کے اسے دور جاتے دیکھ رہا تھا۔ پھر تالیہ کا چہرہ دیکھا۔ "تم فکر مت کرو۔ وہ کھانے کے لیے کچھ لے آئے گا۔ پھر ہم اگلا لائحہ عمل تیار کریں گے۔"

"اوکے!" اس نے اثبات میں سر ہلایا اور مسکرائی۔ چلو شکر ہے وہ صحرا میں نہیں تھے' بلکہ جنگل میں تھے۔ یہاں مختلف پھل مل جائیں گے کھانے کے لیے۔ پانی کے تازہ جھرنے بھی کہیں بہہ رہے تھے' آواز آ رہی تھی۔ یہ بارش کے پانی کا جوہڑ تو گندا تھا' مگر جھرنے تک جب وہ جائیں گے تو خوب سیر ہو کے پی لیں گے۔"

اس نے خود کو تسلی دی۔

جنگل میں اچھی خاصی روشنی پھیل چکی تھی۔ درخت کافی اونچے تھے اور اوپر جا کر ان کے پتے آپس میں گھلے مل رہے تھے' گویا سبز چھت بنا رکھی تھی۔ سبز چھت کے درمیان بڑے بڑے سوراخوں سے روشنی چھاؤں کی صورت اندر آتی لیکن گرمی اور حبس بلا کا تھا۔

روشنی سنہری ہو گئی تھی جب ایڈم واپس آیا۔ اپنی اوپری شرٹ اس نے اتار دی تھی اور اب صرف سیاہ شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ دوسری شرٹ میں جانے کون سے پتے اور جڑی بوٹیاں بھر لایا تھا۔

فاتح وہیں پتھر پہ بیٹھا تھا۔ ایڈم نے اس کا ہاتھ تھاما اور ایک پتے کو مروڑ کے اس کا رس زخم پہ لگایا۔

"یہ کسی بھی اینٹی سیپٹک سے زیادہ تیزی سے اثر کرے گا۔" وہ جوش سے بتا رہا تھا۔

"تھینک یو ایڈم!" وہ مسکرا کے اس کا انداز دیکھ رہا تھا۔

پھر وہ کھڑا ہوا اور ایک پتے میں کچھ لپٹا ہوا تالیہ کی طرف بڑھایا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

عندلیب زہرا

قریبِ زندگی

اتوار کا دن اور شام کی چائے اسے ہمیشہ سے پسند تھے۔ ساری فیملی اکٹھی ہوتی۔ چائے اور اسنیکس کے ساتھ گپ شپ ہوتی۔ ٹی وی پروگرامز پر تبصرے' سنڈے میگزین اور سیاسی کالمز پر ابو کے ساتھ بحث... اب تو سب کچھ خواب ہی لگنے لگا تھا۔

لیکن آج بہت دنوں کے بعد گھر میں زندگی کا احساس جاگا تھا۔

"شاید چھ ماہ بعد... یا آٹھ ماہ بعد...' فرح نے سوچنے کی کوشش کی۔

"فرح آپی! کیا آج کی تاریخ میں چائے مل سکتی ہے؟" معاذ نے شوخی سے پکارا۔

ابو کی وفات کے کتنے ماہ بعد اس نے مجھے یوں آواز دی ہے۔ فرح برتن سیٹ کرتے ہوئے سوچنے لگی۔

"گرم پکوڑے' رولز اور پیزا واہ مزا آگیا' آپی قسم سے..." معاذ کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔

ابو کی وفات کے بعد آج لاؤنج میں چہل پہل سے مانوس زندگی کا احساس جاگا تھا اور اس میں شعوری کوشش یقیناً" معاذ کی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ آج شام کو وہ ایک سرپرائز دے گا اور شام کی چائے اس کی طرف سے ہے۔ اب ایک خوش گوار شام کا اختتام ہوا چاہتا تھا۔

"امی! میں گھر بیچ کر باہر جارہا ہوں۔" معاذ نے اپنی خوشی کا راز اگل ہی دیا۔

سب کو دھچکا لگا تھا اور اس دھچکے سے سب سے پہلے امی نکلیں۔

"بیٹا! یہ گھر تمہارے ابو نے بہت محنت سے بنایا ہے۔ ان کی محنت' خواب اور اب یادیں ہیں یہاں۔" امی نے رسان سے سمجھایا۔

"کیا خوابوں اور یادوں سے پیٹ بھر سکتا ہے یا پیسہ مل سکتا ہے۔" معاذ نے بے زاری سے کہا۔ "گھر بیچ کر باہر جاؤں گا۔ اچھی طرح سیٹ ہو کر آپ کو بھی سپورٹ کروں گا۔ شازیہ باجی کی تو شادی ہو گئی ہے لیکن فرح آپی اور نازیہ آپی کا فرض باقی ہے۔ آپ دونوں بہنیں بھی اپنے پاؤں پر کھڑی ہو لیکن میرے لیے یہاں کچھ نہیں ہے۔"

تیز تیز بولتا معاذ سب کو بہت اجنبی اور اپنے سے بہت دور لگ رہا تھا۔

اپنے بارے میں سوچنے والا۔
صرف اپنی بات کرنے والا۔
سب سے لاتعلق اور اجنبی۔

اور واقعی معاذ نے گھر بیچ کر نیا چھوٹا سا گھر خریدا اور پھر اپنے پاسپورٹ اور ویزے کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔

"شاید ہم معاذ کو چھوٹا سمجھتے ہیں۔ اس لیے اب اس کے بڑے بڑے فیصلوں پر حیران ہو رہے ہیں۔" دادی نے پوتے کی طرف سے صفائی دی تھی۔

فرح اور نازیہ چپ چاپ سامان پیک کر رہی تھیں۔ دادی کی اس بات پر فرح مزید چپ نہ رہ سکی۔

"دادی جان! ہم بیٹوں کو صرف لینے کا "فن" سکھاتے ہیں۔ دینے کے ہنر سے تو نا آشنا ہی رکھتے ہیں۔ پھر جب وہ "لینے" سے آگے چھین لینے پر آمادہ نظر آتے ہیں تو ہم سوچتے ہیں کہ ایسا کیوں ہے؟" فرح کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"اچھا لباس' اسکول' اچھا کھانا... پھر بہترین اور اچھی چیز' ہم ان ہی کو دیتے ہیں اور ان ہی کا حق سمجھتے ہیں۔ "فرض" نہ انہیں کوئی سکھاتا ہے اور نہ ہی ان سے لینے کی بات کوئی کرتا ہے۔" وہ بے دردی سے اپنے آنسو صاف کر رہی تھی۔ ماضی کے بہت سے مناظر' واقعات نگاہوں کے سامنے پھرنے لگے تھے۔

☼ ☼ ☼

تین بیٹیوں کے بعد ملنے والی اولاد نرینہ کی قدر و قیمت صرف ان ہی کو معلوم ہوتی ہے جو اس انتظار سے گزرے ہوں اور اس نعمت کے لیے سراپا دعا بن گئے ہوں۔

"پہلے میں گود میں لوں گی۔" تینوں بہنوں میں ہر تھوڑی دیر بعد جھگڑا ہوتا۔

"یہ اللہ تعالیٰ نے میرے لیے بھیجا ہے صرف۔"

ہر بہن کا دعوا۔

آخر دادی اقوام متحدہ بن کر آتیں اور امریکہ بن کر ننھے معاذ کو اپنی گود میں لے کر اس پر دعائیں پڑھ پڑھ کر پھونکتیں اور پوتیوں کو بھگاتیں۔

"جاؤ! بچے کے سر پر شور ڈالا ہوا ہے۔"

"اماں! یہ تو چڑیاں ہیں۔ ان کی چوں چوں سے تو رونق ہے۔" اقبال صاحب اسی وقت کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولتے۔

"اسے رہنے دو۔ میرے گھر کی رونق اور روشنی تو معاذ ہے' یہ چڑیاں تو اڑ جائیں گی پھر وہیں کریں چوں چوں..." اماں کی بے زاری پر اقبال صاحب مسکرا دیتے۔ تینوں بہنیں عام سرکاری اسکول میں جاتیں' جبکہ معاذ کا داخلہ بہترین اسکول میں کروایا گیا۔ اس کے جوتے' کپڑے' ہر چیز بہترین ہوتی۔ بہنیں بھی اپنے راج دلارے کے واری صدقے جاتیں۔ معاذ نے بھی انہیں مایوس نہیں کیا تھا۔ لاڈلا' مغرور اور تھوڑا سا نخریلا۔ شاید اکلوتے بھائی ایسے ہی ہوتے ہیں۔

وقت کا پنچھی اڑ گیا۔ معاذ نے گھر بیچ کر اپنی زندگی بنالی۔ فرح' نازیہ' امی اور دادی کے ساتھ اسی کالونی کے چھوٹے سے گھر میں منتقل ہو گئی تھیں اور یادوں کا ایک لامتناہی سلسلہ پرانے گھر کے بام و در کے ساتھ ہی رہ گیا تھا۔ نئے گھر میں یہ مکین' بڑی اداسی کے ساتھ داخل ہوئے تھے۔

دادی اماں کو اپنے ہاتھ سے لگائے امرود اور مالٹے کے پیڑ بہت یاد آتے۔ "ہاتھ سے لگائے پھلوں اور سبزیوں کا سواد ہی الگ ہوتا ہے۔" وہ اکثر کہتیں۔

نازیہ کو اپنے جھولے کی یاد ستاتی اور فرح کو ٹی وی لاؤنج کی کھڑکی... جہاں سے لان کا منظر اور بارش میں بھیگتے پھول اور پتے... اسے ان انگریزی نظموں اور کہانیوں کی کتابوں کی طرف لے جاتے' جو بچپن میں ابو اس کے لیے لے کر آتے' رنگین تصویری کتابیں' جن کے صفحے چکنے ہوتے اور فرح کو ان میں سے ہمیشہ پھولوں اور پتوں کی خوشبو آتی' وہ خود کو ان کا مرکزی کردار سمجھتی۔ وہ بہنیں جھولے پر بیٹھ کر باتیں کرتیں



اور معاذ کو گود میں لے کر نظمیں گاتیں۔ کتنے لمحے اس جھولے کے ساتھ وابستہ تھے۔

شازیہ شادی کے بعد کبھی کبھار آتی اور اسے بچپن یاد آتا۔ وسیع رزق اور انواع و اقسام کے کھانوں سے مزین۔ جو ہمیشہ پُر حرارت رہتا اور لذیذ پکوانوں کی خوشبو سے لبریز۔

ابو کا دل اور دستر خوان دونوں ہی وسیع تھے۔

اور امی کو... انہیں صرف ابو یاد آتے۔ گزرا وقت... دکھ سکھ... باتیں' سب کچھ... ایک شوہر کے نہ ہونے سے ان کو اپنی ذات بے حد ہلکی لگتی۔ معاذ کی بے حسی اور بے اعتنائی تو کہیں پیچھے رہ گئی تھی۔ اب تو اقبال صاحب کی یادیں تھیں اور بس...

"کاش تھوڑا سا وقت ہم دونوں مزید ایک ساتھ گزار سکتے۔" ان سے وابستہ گلے شکوے تو اب کہیں دور گم ہو گئے تھے۔



معاذ کے ڈرافٹ باقاعدگی سے آرہے تھے... نہ کم نہ زیادہ... بس زندگی گزر رہی تھی۔ فرح اور نازیہ اسکول میں جاب کر رہی تھیں۔ کالونی وہی تھی' سو پرانے پڑوسیوں سے ملاقات ہوتی رہتی۔ ان ہی سے... معلوم ہوا تھا کہ نئے مکین آگئے اور گھر کی تزئین و آرائش میں مصروف ہیں... نازیہ نے فرح سے کہا کہ کسی بہانے ساتھ والوں کے گھر جاتے ہیں اور ان کے ٹیرس پر کھڑے ہو کر لان ہی دیکھ آتے ہیں' لیکن فرح نے سختی سے منع کر دیا تھا۔

"جو چیز اب پرائی ہو چکی ہے' اسے دیکھنا بھی نہیں چاہیے۔"

لیکن یادیں... کیا وہ بھی پرائی ہو سکتی ہیں؟

ان ہی اونگھتے' بسورتے اور اداس نظر آتے دنوں میں معاذ نے انہیں اپنی شادی کی اطلاع دی۔ اس نے وہیں مقیم ایک پاکستانی فیملی کی لڑکی سے شادی کر لی تھی۔ معاذ نے پہلے قدم پر انہیں اتنا دھوکا دیا تھا کہ اب اس کی بے حسی اور بے اعتنائی دکھی نہیں کرتی تھی۔

سب نے اسے مبارک باد دی اور ولیمہ کی بابت استفسار کیا۔ نیٹ پر شادی کی تصاویر دیکھیں۔ جس کی شادی کے انہیں بچپن سے ارمان تھے۔ وہ اسکائپ پر نیا نویلا دولہا بن کر بیٹھا تھا۔

"بھابھی تو میں پسند کروں گی۔" نازیہ کو اپنی صلاحیتوں پر بھروسا تھا۔

بری' نیگ' مایوں' مہندی' ولیمہ... کتنے پروگرامز بنے اور ارمان سجے۔

"نہیں دادو! مریم کو پاکستان نہیں پسند... ہم نے یہیں ولیمہ کر لیا ہے۔" معاذ نے محبت بھری نظروں سے مریم کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"اور پاکستانی؟" فرح نے سوچا' مگر بولی کچھ نہیں۔ مریم کامدار جوڑے میں قدرے نخوت سے بیٹھی تھی۔ اور گاہے بہ گاہے فرح اور نازیہ پر ایسی نظر ڈالتی جو غیر اہم لوگوں پر ڈالی جاتی ہے۔ فرح اور نازیہ پھیکے دل لے کر ہٹ گئیں اور پھر لائٹ چلی گئی۔ پہلی بار انہیں لوڈشیڈنگ نعمت لگی تھی۔



"اماں میری فیملی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اب میں مزید خرچا نہیں بھیج سکتا۔" معاذ نے گنے چنے خرچے سے بھی ہاتھ اٹھا لیا تھا۔

اور فرح اور نازیہ کے فرائض... دادی کا جیتا جاگتا وجود... امی کی بیماری...

"یہاں تو پاس رہنے والے فراموش کر دیتے ہیں' ہمارا بھائی تو پھر سات سمندر پار ہے۔" فرح کو اب معاذ سے کوئی گلہ نہ رہا تھا۔

شازیہ بھی میکے کم کم آتی۔ نہ پہلا سا استقبال ہوتا نہ انواع و اقسام کے کھانوں سے دستر خوان سجتے۔ الٹا گھر کا مایوس ماحول اسے ذہنی خلجان میں مبتلا کر دیتا۔

"ہاں... ہاں... میں رشتوں کی کوشش کر رہی ہوں۔" دادی کے بار بار استفسار پر وہ جان چھڑا لیتی۔

معاذ کی دو جڑواں بیٹیاں ہوئی تھیں۔ بالکل گڑیا جیسی... معاذ اور مریم بہت خوش تھے۔ امی اور دادی دعا گو تھیں۔

"دیکھیں دادی' چڑیوں کی طرح چوں چوں کرتی ہیں۔" معاذ نے دونوں کو گود میں پیار کرتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

"اللہ اگلی بار بیٹا دے گا' بالکل تمہاری طرح..."

دادی نے دعائیہ کہا تو مریم کے چہرے پر اکتاہٹ آگئی۔ وقت کا سفر جاری تھا۔ لیکن فرح کے گھر میں تو ٹھہرا ہوا لگتا تھا جبکہ ان کی زندگی سے باہر یہ وقت تو تین سال میں آگے بڑھ چکا تھا۔ خیالات' رجحانات' ترجیحات اور شاید اقدار بھی...

فون کالز سے پتہ چلتا تھا کہ ان کا کوئی بھائی بھی ہے۔ معاذ کے یہاں پھر بیٹی ہوئی تھی۔ اب کی بار سب کا دل پھیکا ہوا تھا۔ سوائے فرح کے... اسے معاذ کی خوشی اور اداسی سے کوئی سروکار نہ تھا۔ فون پر رسمی انداز میں بات کرتی تھی۔

"کاش اس بار ہمارے ہاں بھی بھتیجا ہوتا۔" نازیہ نے اداسی سے کہا۔ "اور وہ معاذ جیسا ہوتا۔"

"ہاں... ویسا ہی خود غرض اور بے حس..." فرح نے تلخی سے کہا۔ وہ روز بروز چڑچڑی ہوتی جا رہی تھی۔

"تمہیں کیا ہوا ہے۔" نازیہ نے حیرت سے کہا۔ وہ ہمیشہ مثبت اور حقیقت پسند رہی تھی سو ایسا رویہ...

مزید دو سال بیت گئے۔

فرح اور نازیہ اب سینئر اسکول برانچ میں تھیں۔ دادی مزید ضعیف ہو گئی تھیں اور امی کا وقت اب یاد الٰہی میں گزرتا تھا۔ ان کی دعاؤں کا محور فرح اور نازیہ تھیں۔ ان کے نصیب کھل جانے کی دعائیں' ان کے لبوں پر اٹھتے بیٹھتے رہتیں۔ دعائیں جو ہمیشہ سر سبز رہتی ہیں' اس لیے ان کے حصول کے لیے اچھے کام کرنے چاہئیں۔ گھر کی حالت بہتری کی طرف گامزن تھی اور اس کے لیے فرح اور نازیہ کی کوششیں تھیں۔

ان ہی دنوں معاذ کے یہاں بیٹا ہوا تھا۔ سب کی خوشی دیدنی تھی۔ گھنی پلکوں والا گول مٹول معیز' معاذ کی شکل کا تھا۔ سب گلے شکوے بھلا کر گھر میں خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔

"ارے ایک سے شہر آباد ہو۔ جیسے میرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کلمے تک (عمر دراز ہو)۔" دادی بار بار دعا کرتیں۔

معاذ نے انہیں تصویریں بھیجی تھیں۔ نومولود بچے کے ایک ایک لمحے کو قید کیا گیا تھا۔ معاذ کی تینوں بیٹیاں بھائی کے ساتھ ہر جگہ پر تھیں۔ صوفے پر' بیڈ روم میں... پیار کرتے ہوئے... ایک جگہ تینوں بہنیں ننھے معیز کو گود میں اٹھائے ہوئے ایک جھولے پر بیٹھی تھیں۔ ہنستی' کھلکھلاتی بہنیں اور بہنوں کی محبت پر نازاں ننھا معیز۔

فرح کتنی دیر یہ تصویر دیکھتی رہی۔ نازیہ رات کو اپنے کمرے میں آئی تو دیکھا فرح کے ہاتھ میں وہی تصویر تھی۔

"یہ تصویر سب سے زیادہ پیاری ہے نا۔" نازیہ نے محبت سے کہا۔

"تمہیں کیا ہوا ہے۔" اس کی خاموشی پر اس نے استفسار کیا۔

"آج میں اسکول واپسی پر پرانے گھر کی طرف گئی تھی۔" فرح نے آہستہ سے بتایا۔

"نئے مکین' لان میں کمرے ڈال رہے ہیں۔ گھر کا نقشہ تو بدل ہی گیا ہے۔"

"اب تو وہ چیز پرائی ہو گئی ہے' تم خود تو کہتی تھیں۔" نازیہ نے یاد دلایا۔ فرح کچھ نہیں سن رہی تھی۔

"انہوں نے وہ جھولا وہاں سے اکھاڑ دیا ہے' آج میں نے کھلے گیٹ سے دیکھا تھا۔ تمہیں یاد ہے ہم ننھے معاذ کو اس جھولے پر لے کر بیٹھتے تھے اور..."

فرح کی آواز رندھ گئی۔ نگاہیں اب بھی تصویر پر جمی تھیں۔

نازیہ نے ایک نظر تصویر پر ڈالی اور پھر فرح کی آنکھوں میں... وہ بات کی تہ میں اتر گئی اور اس کے گلے لگ گئی۔

آنسوؤں کی ایک ایک لکیر دونوں کی آنکھوں سے نکلی اور ایک دوسرے کے گریبان کو بھگو گئی۔ ☆

دلاسے ،

یہ لرزتے ہوئے حسیں آنسو
میرے عزم سفر میں حائل ہیں
مجھ میں اب ضبطِ غم کی تاب نہیں
میرے قلب و جگر بھی گھائل ہیں

ہجر کو ہجر کیوں سمجھتی ہو
صرف احساس پر ہے غم کا مدار
میں نے دیکھا ہے حوصلوں کے طفیل
ہو گئے ہیں اَلم نشاط آثار

جب کوئی شے ہی پائیدار نہیں
دُکھ کے لمحے بھی بیت جائیں گے
غم کا انجام مسکراہٹ ہے
پھر خوشی کے زمانے آئیں گے

لذتِ درد بڑھتی رہتی ہے
زخم ہر بار کھل کے سلنے میں
مستقل قرب میں وہ بات کہاں
جو مزا ہے بچھڑ کے ملنے میں

تم سے ملنے کے واسطے ہر دم
اپنے دل میں خلش سی پاؤں گا
جانِ من اس قدر اُداس نہ ہو
میں بہت جلد لوٹ آؤں گا

شکیب جلالی

میرا کلام اسے کچھ بُرا لگے گا ضرور
مری کتاب زمانہ مگر پڑھے گا ضرور

سزا کے خوف سے تم چاہے چپ رہو لیکن
جو بات سچ ہے کوئی دل جلا کہے گا ضرور

جو اہل ظرف ہیں شاید زباں سے کچھ نہ کہیں
جو دل پہ چوٹ لگے گی تو دل دُکھے گا ضرور

خود اپنے گھر میں کوئی ہو کہ صحنِ گلشن میں
جو حبس ہو گا فضا میں تو دم گھٹے گا ضرور

ہوا چلے نہ چلے، یہ عمل مقدر ہے
چراغ جو بھی جلے گا، کبھی بجھے گا ضرور

مگر یہ بات بھی اپنی جگہ مسلّم ہے
چراغ جب بھی بجھے گا دھواں اُٹھے گا ضرور

جو بات حق ہے کہے جاؤ مستقل اقبال
تمہاری بات کبھی تو کوئی سنے گا ضرور

اقبال عظیم آبادی



خامشی حرفِ التجا تو نہیں
تجھ کو دیکھا ہے کچھ کہا تو نہیں

اور بھی ہجر کے مراحل ہیں
ایک عمرِ گریز پا تو نہیں

شوقِ دیدار و دردِ مجبوری
تیرے ملنے سے وہ گیا تو نہیں

آپ کے گیسوئے پریشاں تک
میری وحشت کا سلسلہ تو نہیں

نگہِ یار یہ تو بتلا دے
بے نیازی تیری ادا تو نہیں

بینش سلمیٰ

کوئی گماں، کوئی وعدہ تلاش کرتا ہے
وہ واپسی کا ارادہ تلاش کرتا ہے

بچھا کے دھوپ کے کانٹے وہ میرے پیروں میں
مرے خیال کا سایا تلاش کرتا ہے

وہ ریت کر کے مرے خوابوں کی زمینوں کو
مرے وجود میں دریا تلاش کرتا ہے

گنوا کے مجھ کو کسی عہدِ خوش گمانی میں
وہ شاید اب کوئی مجھ سا تلاش کرتا ہے

وہ خوش خیال میرا، ہر نئے تعلق میں
وفا کا رنگ پرانا تلاش کرتا ہے

ناہید قمر

شگفتہ جاہ



نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"اگر تم اتنی غلطیاں کرو کہ تمہاری غلطیاں آسمان تک پہنچ جائیں، پھر توبہ کرو تو (پھر بھی) اللہ تمہاری توبہ قبول فرمائے گا۔"

فوائد و مسائل:۔
یہ ضروری ہے کہ انسان گناہ کے بعد جلد از جلد توبہ کرلے' تاہم اگر نفس اور شیطان کے بہکاوے اور دل کی غفلت کی وجہ سے جلد توبہ نہ کی جاسکے تو جب بھی احساس ہو توبہ کرلینی چاہیے۔ یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ اتنے زیادہ گناہ ہوگئے ہیں۔ وہ معاف نہیں ہوں گے' البتہ توبہ وہ ہے جو دل سے ہو صرف زبان سے نہ ہو۔

ریاکاری،

حضرت عمرؓ نے ایک شخص کو دیکھا کہ اپنا سر نیچے کیے ہوئے ہے یعنی یہ ظاہر کر رہا ہے کہ میں زاہد ہوں۔
حضرت عمرؓ نے اس سے فرمایا۔
"اے گردن ٹیڑھی کرنے والے' گردن سیدھی کر' تواضع اور خاکساری کا تعلق دل سے ہے' گردن سے نہیں۔"

خلوص،

مدائن کی فتح میں ایک مسلمان سپاہی کے ہاتھ کسریٰ کا تاج لگا۔ وہ اس کو اپنے دامن میں چھپا کر امیر افواج اسلامی حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے پاس لایا جیسے کوئی چوری کا مال چھپا کر لاتا ہے۔

"اے امیر! یہ کوئی بہت قیمتی چیز معلوم ہوتی ہے۔ یہ میں آپ کے حوالے کر رہا ہوں تاکہ بیت المال میں داخل ہو جائے۔"
پہلے تو مسلمان امیر نے جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں' سپاہی کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور حیرت کے دریا میں ڈوب گئے کہ اللہ اکبر! اتنا قیمتی جواہرات سے مرصع تاج زریں اور اس غریب سپاہی اور عرب کے بدو کی نیت خراب نہیں ہوئی۔ اس کو کسی وقت یہ خیال نہیں ہوا کہ بجائے یہاں لانے کے اس کو اپنے خیمے میں لے جاکر رکھ دے۔
پوچھا "آپ کا نام؟"
اس نے دروازے کی طرف منہ کرکے اور پیٹھ پھیر کر کہا۔
"جس کے لیے میں نے یہ کام کیا ہے' وہ میرا نام جانتا ہے۔" اور یہ کہہ کر روانہ ہوگیا۔
(از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

حالات کو الزام

لوگ جس حال میں ہوں' اس کا الزام اپنے حالات کو دیتے ہیں۔ میں حالات پر یقین نہیں رکھتا۔ جو لوگ اس دنیا میں چل سکتے ہیں' وہ لوگ ہیں جو اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اور اپنی پسند کے حالات ڈھونڈتے ہیں۔ اور اگر وہ ایسے حالات نہ پاسکیں تو انہیں پیدا کرلیتے ہیں۔"
ناہید ارشد۔ ملیر کراچی

جواہر پارے

☆ اونچا بولنا قوت کا اور بے مصرف بولنا مہلت کا غلط استعمال ہوتا ہے۔
(سفر نصیب۔ مختار مسعود)
☆ زندگی صرف ایک نسل کے لیے ہے، نیک نامی ہمیشہ کے لیے ہے۔
(جاپانی ضرب المثل)
☆ کسی شخص کو مچھلی دے دو۔ تم نے ایک دن کے لیے خوراک مہیا کی۔ تم اسے مچھلی پکڑنا سکھا دو۔ تم نے اسے ساری زندگی کے لیے خوراک دے دی۔
(چینی ضرب المثل)
ثمرہ، اقرا۔ کراچی

مہمان

- جو لوگ اللہ پر اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں' انہیں چاہیے کہ اپنے مہمان کو عمدہ سے عمدہ کھانا کھلائیں اور مہمانی تین دن تک ہے۔
- چالیس سال سے میں نے روٹی وغیرہ کچھ نہیں پکائی البتہ مہمانوں کے واسطے' اور میں اس میں طفیلی رہا ہوں۔
(حضرت ابوالحسن خرقانی)
- مہمان کے ساتھ تکلف نہ کرو ورنہ مہمان رکھنے کو ناپسند کرو گے۔
(امام غزالیؒ)
- جو مہمان خود آجائے اس کے لیے تکلف نہ کر اور جس کو تو بلائے اس کے لیے تکلف میں اٹھا نہ رکھ۔
(امام غزالیؒ)
ندا طارق۔ فیصل آباد

تعریف

خلیفہ منصور' یحییٰ بن خالد برمکی کے اوصاف پر تعجب کیا کرتا تھا اور اس کی تیزیٔ عقل کو بڑا درجہ دیتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ سب باپوں کے ہاں بیٹے پیدا ہوتے ہیں، مگر خالد بن برمکی کے ہاں باپ پیدا ہوتے ہیں۔ (یعنی فہم و فراست میں ان کا ہر بیٹا باپ سے بڑھا ہوا ہوتا ہے۔)
یحییٰ کا مقولہ یہ ہے کہ "جو شخص کسی مرتبے پر پہنچ کر مغرور ہوگیا وہ خبر دے رہا ہے کہ اس کا اصل مقام اس سے کمتر ہے۔"
آسیہ جاوید۔ علی پور چٹھہ

کہکشاں کی اولاد

ایک پڑھا لکھا شہری نوجوان چھٹی پر گاؤں آیا تو اپنے والد کو اپنے ساتھ تفریح کے لیے مرغزار لے گیا۔ وہاں پھولوں سے لدے ہوئے ایک وسیع سبزہ زار میں دونوں نے مل کر خیمہ نصب کیا۔ گھومے پھرے کھانا کھایا اور شب بسری کے لیے خیمے میں سو گئے۔ رات گئے باپ نے بیٹے کو گہری نیند سے جگایا اور کہا۔
"اوپر دیکھو... کیا نظر آرہا ہے؟"
بیٹے نے گہرا سانس لے کر کہا۔ "تاروں بھرا آسمان۔ میرے علم فلکیات کی رو سے اس وسیع آسمان میں اربوں ستارے' لاکھوں کہکشائیں اور نظام بکھرے ہوئے ہیں۔ ہمارا علم ابھی تک پوری طرح ان کا احاطہ نہیں..."
باپ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ اس نے بیٹے کو ایک تھپڑ رسید کرکے غصے سے کہا۔
"اے کہکشاں کی اولاد! کوئی ہمارا خیمہ چرا کر لے گیا ہے اور ہم کھلے آسمان تلے پڑے ہیں۔"
تعنہ یوسف۔ لاہور

گھر میں سکون اور چین رکھنے والے وظائف

، تم بہت خوبصورت ہو۔
، سارا کام کتنا کرتی ہو۔
، کتنی سلم ہو اور بالکل ماڈل کی طرح لگ رہی ہو۔
، کام کرکے تھک جاتی ہوگی۔
، اپنا خیال رکھا کرو۔
، تمہارے میکے والے کتنے اچھے ہیں۔
عائشہ، تحریم۔ محراب پور

قصوروار؟

بیگم جمال نے ایمرجنسی نمبر پر ایمبولینس کو فون کیا۔
آپریٹر نے فون اُٹھایا۔" یس پلیز۔

"میرے پاؤں کی اُنگلی چائے کی میز سے ٹکرا گئی ہے۔" بیگم جمال نے کہا۔
آپریٹر ہنستے ہوئے بولا۔" اور اس کے لیے آپ ایمبولینس بُلانا چاہتی ہیں؟"
"نہیں! ایمبولینس تو میرے شوہر جمال کے لیے ہے، ساتھیں ہنسنا تو نہیں چاہیے تھا؟"

سعدیہ، مریم۔ اسلام آباد

چھوٹی سی بات

ہ۔ جھوٹ کو گھر سے نکلنے کا موقع نہ دیجیے کیونکہ سچ ابھی گھر سے نہیں نکلتا اور جھوٹ پوری دُنیا کا چکر لگا کر آجاتا ہے۔

ہ۔ گہرے سمندر اور گہرے انسان کا چہرہ سطح پر ہمیشہ پُرسکون ہوتے ہیں۔

ہ۔ بادل برسے نہ برسے، اسے دیکھ کر ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے، اولاد خدمت کرے نہ کرے، اسے دیکھ کر ہی دل میں ٹھنڈ پڑجاتی ہے۔

ہ۔ بے وقوف بھی آپ کے استاد ہوسکتے ہیں، جو وہ کرتے ہیں، آپ نہ کیجیے۔

ہ۔ جب کوئی ادیب آپ سے کہے کہ بے شک مجھ پر کڑی تنقید کرو، مطلب یہ ہوتا ہے کہ خدا کے واسطے تعریف کرو۔

(مستنصر حسین تارڑ)

لاریب غوری۔ کورنگی کراچی

فرمودات موڈی سرکار (محمد عامر)

ہ۔ سست شوہر بیویوں کے لیے نعمت سے کم نہیں۔ جو بندہ سامنے پڑا ریموٹ نہ اُٹھائے، وہ کہیں چکر خاک چلائے گا۔

ہ۔ خواتین میں صرف امارت کا ہی مقابلہ نہیں ہوتا، جب سسرال کے ظلم کا ذکر ہوتا ہے تو لگتا ہے سب کے سسرالی چنگیز خان اور ہٹلر ہیں۔

حفصہ وقاص۔ فیصل آباد

کامیاب لوگ،

کامیاب لوگ زیادہ رسک لیتے ہیں، اس وجہ سے ان کو ناکامیاں بھی زیادہ دیکھنا پڑتی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ گرنے کے بعد ہر بار اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ بجلی کے بلب کے موجد ایڈیسن کو اس کے ایک دوست نے طنزاً کہا۔
"تم تو سو نوے مرتبہ ناکام ہونے کے بعد بھی بلب بنانے کے ارادے پر ڈٹے ہوئے ہو؟"
پُرعزم سائنس دان کا جواب تھا۔
"دراصل میں نے یہ سیکھا ہے کہ ان نوسو نوے طریقوں سے میں بلب نہیں بنا سکتا۔ بلب بنانے کے لیے مجھے جو درست طریقہ چاہیے، میں اسی کی طرف جا رہا ہوں۔"

عاصمہ ندیم۔ کراچی

مشورہ،

سلیم کی اپنے دوست سے لالوکھیت کے بازار میں ملاقات ہوئی۔ اس نے دوست کو دیکھ کر حیرت سے کہا۔
"ارے یار! تم بیساکھی استعمال کررہے ہو کیا ہوا؟"
دوست نے جواب دیا۔" کار سے ٹکر ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر نے کچھ دن مجھے بیساکھی استعمال کرائی۔ اب اس کا کہنا ہے کہ میں بالکل ٹھیک ہوچکا ہوں۔"
"پھر تم اب تک بیساکھی کیوں استعمال کررہے ہو؟"۔۔۔ سلیم نے حیرت سے کہا۔
دوست نے کہا۔" ہاں ڈاکٹر تو کہتا ہے میں ٹھیک ہوں مگر میرا وکیل کہتا ہے کہ مجھے ابھی کچھ دنوں اور بیساکھی استعمال کرنا چاہیے۔"

صدف عمران۔ کے ڈی اے

خالدہ جیلانی



فائزہ بھٹی ———— پتوکی

کسی کو دیکھوں تو آنکھوں میں ماہ و سال ملیں
کہیں بکھرتی ہوئی دُھول میں کئی سوال ملیں
آؤ کچھ دیر دسمبر کی دُھوپ میں بیٹھیں
یہ فرصتیں نہ شاید اگلے سال ملیں

نسبت سعید ———— کہروڑ پکا

ڈوبی ہوئی خلوص میں جس کی نگاہ تھی
مجھ کو اسی کی چاہ تھی اور بے پناہ تھی
فرازؔ کس کو علم ہے اس چاند کے بغیر
جو چودھویں کی رات تھی کس قدر سیاہ تھی

گڑیا شاہ ———— کہروڑ پکا

نہ پوچھ کاروانِ آرزو مندی کہاں ٹھہرا
ملا جو رنج بھی مجھ کو وہ رنجِ رائیگاں ٹھہرا
اب ایسا کیا، ہم ہی پر ہارنا ہر بار واجب ہو
مگر کیا ان کو جتلائیں، حسابِ دوستاں ٹھہرا

عذرا ناصر، اقصیٰ ناصر ———— کراچی

لاحاصل کا عشق میں چرچا نہیں کیا
دُنیا جو چاہتی تھی، تماشا نہیں کیا
منظر سے ہٹ کے کردیا آساں جدائی کو
اس فیصلے میں بھی اسے تنہا نہیں کیا

فوزیہ ثمر بٹ ———— گجرات

ہم خوشبو کے سوداگر ہیں سودا سچا کرتے ہیں!!
جو گاہک پھولوں جیسا ہو ہم بن دام بک جاتے ہیں
ہم شہرِ وفا کے لوگوں کا تم کو حال سنائیں کیا
ہم زخم کو دل پر کھاتے ہیں اور آنسو تک پی جاتے ہیں

دلیجہ حبیب ———— عبدالحکیم

تیرا پیمانِ وفا راہ کی دیوار بنا
ورنہ سوچا تھا کہ جب چاہوں گا مر جاؤں گا

اقرا جٹ ———— مین آباد

نہ جانے یہ آنکھیں کیوں اُداس رہتی ہیں
نہ جانے انہیں کس کی تلاش رہتی ہے
یہ جان کر بھی کہ وہ میرے نصیب میں نہیں
پھر بھی اُسے پانے کی اک آس رہتی ہے

ثمرہ، اقرا ———— کراچی

گھڑی بھر کے لیے تجھ سے جدا رہنا بھی مشکل ہے
مگر یہ بات سب کے سامنے کہنا بھی مشکل ہے
بجا ہے ظلم تیرا مگر اے شہرِ ظالم
ستم حد سے گزر جائے تو پھر سہنا بھی مشکل ہے

جمانہ ہمدانی ———— عبدالحکیم

خود اپنے حق کے لیے بھی جھگڑ سکے نہ کبھی
دل اس طرح کا ملا کہ لڑ سکے نہ کبھی
سلامتی کا سبب تھا فقط لچک اپنی
ہوا کی زد میں بھی رہ کر اُکھڑ سکے نہ کبھی

اقصیٰ افضل ———— سرگودھا

دل مچلنے کے اسباب ہوا کرتے ہیں
بعض چہرے بڑے نایاب ہوا کرتے ہیں
نیند سے جن کی ٹھنی رہتی ہے ہر شب یارو
ان کی جھولی میں کئی خواب ہوا کرتے ہیں

آمنہ زاہد ———— میاں چنوں

بہار کیا اب خزاں بھی مجھ کو گلے لگانے تو کچھ نہ پائے
میں برگِ صحرا ہوں یوں بھی مجھ کو ہوا اُڑانے تو کچھ نہ پائے
اسے گنوا کر پھر اس کو پانے کا شوق اس دل میں یوں ہے محسنؔ
کہ جیسے پانی پہ دائرہ سا کوئی بنانے تو کچھ نہ پائے

امت الصبوح

خاروں کی ڈائری

ملیحہ ناصر، اوکاڑہ کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر حالات حاضرہ کی مکمل عکاسی کرتی ناصر زیدی کی یہ غزل آپ سب بہنوں کے لیے۔

تماشا کل جو دیکھا تھا، وہی ہونے والا ہے
ہمارے ساتھ ایسا کیا مسلسل ہونے والا ہے

ابھی بس رہ گئی ہیں کھیل کی دو چار ہی قسطیں
ابھی دو دن میں یہ قصہ مکمل ہونے والا ہے

وہی جس میں تماشائی بھی سارے ہار جاتے ہیں
ہمارے شہر میں پھر سے وہ دنگل ہونے والا ہے

ہماری مشکلوں سے اس عدالت کو نہیں مطلب
یہاں پر کوئی اور مسئلہ حل ہونے والا ہے

سنا ہے شیر کا قانون ہی ہونے کو ہے نافذ
تو لوگو! کیا ہمارا شہر جنگل ہونے والا ہے

نیا قانون نافذ ہو چلا رہبر بدلنے کا
پرانا حکم نامہ پھر معطل ہونے والا ہے

پلٹ کر دیکھتے ہیں ہم کسی کو ہاتھ لہراتے
پرانا موڑ اب آنکھوں سے اوجھل ہونے والا ہے

کرم فرمائی شہر سنگ پہ بارش کی ہو یا رب!
تمہارے نام پر یہ پھر سے پاگل ہونے والا ہے

کہاں ہماری ہے یہ رستہ ملاپی مشکل ہے ستانا
کوئی اب ہاتھ تمہارے حوصلہ شل ہونے والا ہے

تسنیم شریف کی ڈائری سے

جگر مراد آبادی میرے پسندیدہ شاعر ہیں۔ میری ڈائری میں تحریر ان کی یہ غزل قارئین کے لیے۔

وہ ادائے دلبری ہو کہ نوائے عاشقانہ
جو دلوں کو فتح کر لے، وہی فاتح زمانہ

کبھی حسن کی طبیعت نہ بدل سکا زمانہ
وہ نازِ بے نیازی، وہی شانِ خسروانہ

میں ہوں اس مقام پر اب کہ فراق و وصل کیسا
میرا عشق بھی کہانی، ترا حسن بھی فسانہ

مری زندگی تو گزری ترے ہجر کے سہارے
مری موت کو بھی پیارے کوئی چاہیے بہانہ

ترے عشق کی کرامت یہ اگر نہیں تو کیا ہے
کبھی بے ادب نہ گزرا مرے پاس سے زمانہ

تری دوری و حضوری کا ہے یہ عجیب عالم
ابھی زندگی حقیقت، ابھی زندگی فسانہ

میں وہ صاف کیوں نہ کہہ دوں جو ہے فرق مجھ میں تم میں
ترا درد، دردِ تنہا، مرا غم، غمِ زمانہ

ترے دل کے ٹوٹنے پر ہے کسی کو ناز کیا کیا
تجھے اے جگر مبارک یہ شکستِ فاتحانہ

فاکہہ سہیل کی ڈائری سے

چھوٹی چھوٹی باتیں، گلے شکوے، ہم دل میں رکھ لیتے ہیں۔ لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ تعلق توڑ لیتے ہیں۔ ہمیں اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ زندگی کتنی چھوٹی سی ہے اور ہم کتنے قیمتی۔ محسن بھوپالی کی یہ غزل ان ہی جذبوں کا اظہار ہے۔

جوانی زندگانی ہے نہ تم سمجھے نہ ہم سمجھے
یہ اک ایسی کہانی ہے نہ تم سمجھے نہ ہم سمجھے

ہمارے اور تمہارے واسطے میں اک نیا پن تھا
مگر دنیا پرانی ہے نہ تم سمجھے نہ ہم سمجھے

محبت ہم نے، تم نے ایک وقتی چیز سمجھی تھی
محبت جاودانی ہے نہ تم سمجھے نہ ہم سمجھے

گزری ہے جوانی روٹھنے اور منانے میں
گھڑی بھر کی جوانی ہے نہ تم سمجھے نہ ہم سمجھے

ادائے کم نگاہی نے کیا رسوا محبت کو
یہ کس کی مہربانی ہے نہ تم سمجھے نہ ہم سمجھے

روبینہ واجد کی ڈائری سے

حمیدہ شاہین کی یہ چھوٹی سی نظم ایک عورت کی پوری زندگی کا احاطہ کرتی ہے۔ قارئین کے لیے

اک بے دھیانی

میں ٹھنڈے تورے کی روٹی ہوں
مجھے بے دھیانی میں ڈالا گیا
مجھے بے دردی سے پلٹا گیا
مرے کتنے ٹکڑے کھڑے گئے
میں ٹھیک سے سِکی جا نہ سکی
میں کسی چنگیر میں آ نہ سکی
میرا پھینا، گندھنا اور جلنا
بے کار گیا، میں ہار گئی
اک بے دھیانی مجھے مار گئی

نادیہ اقبال کی ڈائری سے

زندگی دائرے کا سفر ہے۔ کتاب زندگی میں رقم کامیابیاں، دولت، شہرت، کمال فن، عروج و زوال، حکمرانی سب ایک ہی انجام تک پہنچتے ہیں۔ گلزار کی یہ غزل ان ہی کیفیات کی ترجمان ہے۔

کھلی کتاب کے صفحے پلٹتے رہتے ہیں
ہوا چلے نہ چلے، دن پلٹتے رہتے ہیں

بس ایک وحشت منزل ہے اور کچھ بھی نہیں
کہ چند سیڑھیاں چڑھتے اترتے رہتے ہیں

مجھے تو روز کسوٹی پر درد کستا ہے
کہ جاں سے جسم کے بخیے ادھڑتے رہتے ہیں

کبھی رکا نہیں کوئی مقام صحرا میں
کہ ٹیلے پاؤں تلے سے سرکتے رہتے ہیں

یہ روٹیاں ہیں، یہ سکے ہیں، یہ دائرے ہیں
یہ اک دوجے کو دن بھر پکڑتے رہتے ہیں

بھرے ہیں رات کے ریزے کچھ ایسے آنکھوں میں
اجالا ہو تو ہم آنکھیں جھپکتے رہتے ہیں

سرورق کی شخصیت

ماڈل	شیزا خان
میک اپ	روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی	موسیٰ رضا

تمہاری مریم کی سارہ

حبہ عزیز سے باتیں

شاہین رشید

1- ''اصلی نام؟''
''حبہ عزیز''

2- ''پیار کا نام؟''
''بچپن میں تو کئی نام تھے۔''

3- ''پیدائش کا سال؟''
''7 فروری 1991ء''

4- ''قد/ستارہ؟''
''5 فٹ 4 انچ/دلو''

5- ''مادری زبان؟''
''اردو''

6- ''فیملی ممبر/آپ کا نمبر؟''
''ہم کل سات افراد ہیں، یعنی پانچ بہن بھائی، والدین اور میرا نمبر دوسرا ہے۔ تین چھوٹے بھائی، ایک بڑی بہن۔ والد صاحب کا انتقال ہو چکا ہے۔ مگر میں پھر بھی یہی کہتی ہوں کہ ہم سات افراد ہیں، کیونکہ وہ ہر جگہ میرے ساتھ ہوتے ہیں۔''

7- ''تعلیم؟''
''اے سی سی اے کر رہی ہوں۔''

8- ''شادی؟''
''نہیں ہوئی......اور ابھی کرنا بھی نہیں چاہتی۔''

9- ''شوبز میں کیسے آئیں؟''
''بس اتفاقاً......حادثاتی طور پر۔''

10- آپ کے علاوہ کوئی ہے اس فیلڈ میں؟''
''جی ہیں......مگر وہ سب کیمرے کے پیچھے رہ کر کام کرتے ہیں۔''

11- ''گھر والوں کی رضامندی سے آئیں؟''
''جی بالکل......سب بہت پسند کرتے ہیں۔''

12- ''پہلا ڈرامہ؟''
''اے پلس سے ایک سوپ ٹیلی کاسٹ ہوا تھا ''ادھورا ملن'' وہ میرا پہلا ڈرامہ تھا۔''

13- ''پہلی کمائی؟''
''ایک یو کے بیسڈ کمپنی تھی ''ای او این'' اس میں پہلی بار جاب کی۔''

14- ''کیا بننا چاہتی تھیں؟''
''پینٹر یا پائلٹ''

15- ''مارننگ پرسن ہیں؟''
''اس وقت جب مجھے کہیں جانا ہوتا ہے، میں صبح جلدی اٹھ جاتی ہوں۔''

16- ''اٹھتے ہی دل چاہتا ہے؟''
''کچھ خاص نہیں......''

17- ''آن ایئر ڈرامے آج کل......؟''
''کرن'' ''تمہاری مریم'' اور ''رانی''

18- ''گھر کے کاموں سے لگاؤ؟''
''ہے......مگر بہت زیادہ سگھڑ نہیں ہوں۔''

19- ''کیا اچھا پکا لیتی ہیں؟''
''اچار گوشت اور شملہ مرچ قیمہ۔''

20- ''پسندیدہ تہوار......؟''
''کوئی ایک نہیں۔ سب کا اپنا اپنا رنگ ہے۔ کشش ہے اس لیے سب تہوار اچھے ہیں۔''

21- ''بھوک کو کم کرنے کے لیے کیا کھاتی ہیں؟''
''صبر، چائے، پانی۔'' (مسکراہٹ کے ساتھ)

22- ''تھکن میں بھی کہاں جانے کو دل چاہتا ہے؟''
''زیادہ تر...... چہل قدمی کرنے کو دل چاہتا ہے یا پھر قیلولہ کرنے کو دل چاہتا ہے۔''

23- ''آپ اداس ہو جاتی ہیں۔''
''سنجیدہ گانے سن کر اور ابو کی کمی اداس کر دیتی ہے۔''

24- ''آپ کو رونا آتا ہے؟''
''جب بہت خوش ہوتی ہوں یا بہت اداس ہوتی ہوں، مجھے رونا آ جاتا ہے۔''

25- ''آپ ضدی ہیں......؟''
''نہیں......یہ برائی نہیں ہے مجھ میں۔''

26- ''بچپن کی ایک بری عادت جو ابھی تک ہے؟''
''جی......کان پکڑنا۔''

27- ''غصہ کب آتا ہے؟''
''بہت سی باتوں پر آتا ہے جس کا کوئی شمار نہیں ہے اور مجھے نفرت ہے نیگیٹیوٹی۔''

28- ''غصے میں ردعمل؟''
''منحصر ہے اس بات پہ کہ غصہ کن باتوں پر آ رہا ہے......ویسے زیادہ تر میں خاموش رہتی ہوں۔''

29- ''سائنس کی بہترین ایجاد؟''
''کمیونی کیشن سسٹم۔''

30- ''گھر میں کس کے غصے سے ڈر لگتا ہے؟''
''سچ بتاؤں......اپنے غصے سے۔''

31- ''فضول خرچ ہیں آپ......؟''
''بالکل بھی نہیں۔''

32- ''پیسہ کس پر خرچ کرتی ہیں؟''
''میں آپ کو اس کا جواب یہ دے سکتی ہوں کہ گھر پر، گھر کی چیزوں پر یا پھر کپڑوں پر۔ کیونکہ بہ حیثیت ایک لڑکی کے اور ایک آرٹسٹ کے ہمیں بہت ضرورت ہوتی ہے۔''

33- ''جھوٹ کب بولتی ہیں؟''
''جب کسی کا دل رکھنا پڑے تب۔''

34- ''لڑکیوں میں کیا بات اچھی لگتی ہے؟''
''میچورٹی۔''

35- ''آپ پریشان ہو جاتی ہیں؟''
''میں وہم کو دل میں نہیں آنے دیتی، مجھے اپنے رب پر بھروسا ہے......ہاں البتہ کسی کو تکلیف میں دیکھ کر ضرور پریشان ہو جاتی ہوں۔ کیونکہ آپ کسی کی تکلیف یا پریشانی دور نہیں کر سکتے۔''

36- ''آپ کی کوئی ایکسٹرا خوبی......؟''
''میں ایک بہت اچھی مصور ہوں اور میں بہت اچھا گا بھی سکتی ہوں۔''

37- ''ایک خواب جو بار بار دیکھتی ہیں؟''
''نہیں ایسا کوئی خواب نہیں ہے۔''

38- ''کیا محبت اندھی ہوتی ہے؟''
قہقہہ......''کر کے بتاؤں گی۔''

39- ''کسی کی سچی محبت دیکھنی ہو تو؟''
''اس کی کوئی ضرورت نہیں، یہ خود بخود معلوم ہو جاتی ہے کہ کون کتنی سچی محبت کرتا ہے۔''

40- ''آپ کے بیگ کی تلاشی لی جائے؟''
قہقہہ......''ہر چیز ملے گی۔''

41- ''شادی کی پسندیدہ رسم؟''
''ڈھولکی اور دودھ پلائی۔''

42- "بدلہ لیتی ہیں؟"
"میرا اللہ کافی ہے۔"
43- "گھر آ کر پہلی خواہش؟"
"چائے مل جائے۔"
44- "گفٹ دینا چاہیے یا کیش؟"
"مجھے گفٹ دینا پسند ہے۔"
45- "کھانے کی ٹیبل پہ کیا ہونا ضروری ہے؟"
"پانی...... بہت ضروری ہے۔"
46- "گھر میں کھانے کے لیے پسندیدہ جگہ؟"
"اپنا بیڈ۔"
47- "لوگ مل کر کیا فرمائش کرتے ہیں؟"
"ڈرامے کا اینڈ بتا دو (ہنستے ہوئے) مگر میں نہیں بتاتی۔"
48- "رول جو کرنا چاہتی ہیں؟"
"ابھی تو آغاز ہے...... میں تو بہت سارے کردار کرنا چاہتی ہوں۔"
49- "کیا چیزیں لے کر گھر سے نکلتی ہیں؟"
"بیگ، موبائل، گلاسز اور شال۔"
50- "گھر میں کوئی ناراض ہو جائے تو؟"
"اف، بہت مشکل ہوتا ہے منانا۔"
51- "بستر پر لیٹتے ہی نیند آ جاتی ہے؟"
"جی...... ہاں...... فوراً۔"
52- "آپ کی فیوچر پلاننگ؟"
"ابھی تو کوئی نہیں...... وقت کے دھارے میں بہتی چلی جا رہی ہوں۔"
53- "چھٹی کا دن کیسے گزارتی ہیں؟"
"منحصر ہے شیڈول کیا ہے یا کچھ کرنا ہے۔ ورنہ تو عام طور پر نیند پوری کرتی ہوں۔"
54- "گھر کا کون سا حصہ پسند ہے؟"
"وہ ایریا جہاں میں چہل قدمی یا واک کرتی ہوں۔"
55- "کس کے ایس ایم ایس کے جواب فوراً دیتی ہیں؟"
"کسی کے بھی نہیں۔ اس معاملے میں بہت سست ہوں۔"
56- "موبائل جلدی جلدی بدلتی ہیں؟"
"نہیں جی بالکل نہیں۔"
57- "وقت کی پابندی کرتی ہیں؟"
"پوری کوشش کرتی ہوں۔"
59- "اپنی کمائی سے اپنے لیے کیا قیمتی چیز خریدی؟"
"اپنے لیے اپارٹمنٹ۔"
60- "پیسہ کس شکل میں جمع کرتی ہیں؟"
"کیش کی شکل میں بینک میں۔"
61- "دعوت میں ملکی کھانے پسند ہیں یا دیسی؟"
"مجھے دونوں طرح کے کھانے پسند ہیں۔ میں فوڈ لور ہوں۔"
62- "فیس بک اور انٹرنیٹ سے لگاؤ؟"
"پچاس فیصد ہے۔"
63- "نصیحت جو بری لگتی ہے؟"
"نصیحت بری نہیں لگتی لیکن ______ طنزیہ جملے یا باتیں بری لگتی ہیں۔"
65- "آپ کی اچھی اور بری عادت؟"
"یہ تو دوسرے ہی بتا سکتے ہیں کہ مجھ میں کیا اچھی اور کیا بری عادت ہے۔"
66- "اچھی اور بری نیوز سب سے پہلے کسے سناتی ہیں؟"
"ابو جب حیات تھے تو انہیں اچھی یا بری خبر پہلے سنایا کرتی تھی، اب بہن کو یا پھر دوستوں کو سناتی ہوں۔"
67- "اپنے آپ میں کیا تبدیلی لانا چاہتی ہیں؟"
"غصے پہ کنٹرول کرنا چاہتی ہوں۔"
68- "آپ کی 'چھٹی حس' کیسی ہے؟"
"بہت تیز ہے۔"
69- "زندگی کا ایک دن باقی ہو تو کیا دعا

مانگیں گی؟"
"شکر ادا کروں گی کہ ایک اچھی زندگی دی خدا نے اور باقی لوگوں کے لیے آسانیاں مانگوں گی۔"
70- "کس ملک کے لیے کہتی ہیں کہ کاش یہ ہمارا ہوتا؟"
"پاکستان سے اچھا کوئی ملک نہیں ہے، بس ہم اس ملک کی مٹی کے ساتھ مخلص ہو جائیں۔"
71- "کوئی گہری نیند سے اٹھا دے تو......؟"
"تو ڈر جاتی ہوں۔"
72- "گھر آتے ہی بیڈ کی راہ لیتی ہیں؟"
"نہیں فریش ہو کر سب کے ساتھ باتیں کر کے۔ کھانا کھا کے پھر بیڈ کی راہ لیتی ہوں۔"
73- "لڑکی ذہین ہونا چاہیے یا حسین؟"
"ذہین ہونا چاہیے...... یہ تو وہ ہی بات ہوئی کہ عقل بڑی یا بھینس۔"
74- "بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ کیا کیا رکھتی ہیں؟"
"ہیڈ فونز، لیمپ ______ لوشن اور پانی۔"
75- "دل کی سنتی ہیں یا دماغ کی؟"
"پہلے دل کی سنتی تھی، اب دماغ کی، اب دماغ چلنے لگا ہے۔"
76- "بچپن کا کوئی کھلونا جو آج بھی آپ کے پاس ہے؟"
"نہیں ایسا کوئی کھلونا نہیں ہے۔ پہلے انڈور سے زیادہ آؤٹ ڈور گیمز زیادہ دلچسپ بھی ہوتے تھے اور ہم سب کھیلتے بھی تھے۔"
77- "ادھار دینے اور لینے والوں کے لیے کیا کہیں گی؟"
"اللہ کسی کو بھی کسی کا محتاج نہ کرے۔"
78- "اپنی شخصیت میں کیا بدلنا چاہتی ہیں؟"
"غصہ اور چپ رہنے کی عادت کو۔"
79- "کوئی سین جو مشکل سے ہوا ہو؟"
"جی ایسے بہت سے سین ہیں۔"
80- "رومینٹک سین کے لیے بہترین



اداکار؟"

"ابھی ایسا کوئی تجربہ نہیں ہوا۔"

81- "اپنے تجربے سے سیکھتی ہیں یا دوسروں کے؟"

"دونوں سے۔"

82- "شاپنگ کے لیے بہترین جگہ؟"

"یہ منحصر ہے کہ ہم نے کیا لینا ہے۔"

83- "ماڈلنگ + فلم؟"

"فلم نہیں کی جب کہ بہ حیثیت ماڈل کے تین ویڈیوز کی ہیں۔"

84- "آپ اکثر سوچتی ہیں کہ......؟"

"بہت کچھ سوچتی ہوں۔ لفظ کم پڑ جائیں گے بتانے کے لیے۔"

85- "بات دل میں رکھتی ہیں یا بتا دیتی ہیں؟"

"کہہ دینے والی ہو تو کہہ دینا ہی اچھا ہے۔ ورنہ خاموشی ہی بہتر ہے۔"

86- "آئینہ دیکھ کر سوچتی ہوں؟"

"پمپلز نہ نکلیں۔"

87- "شوبز میں جگہ بنانے کے لیے ضروری ہے کہ......؟"

"کہ اپنے کام سے منوائیں اور فوکس آؤٹ نہ کریں۔"

88- "شاپنگ کے لیے کتنی رقم لے کر گھر سے نکلتی ہیں؟"

ہنستے ہوئے...... "یہ کیا پوچھ لیا آپ نے، جتنے بھی لے کر جاؤ کم پڑ جاتے ہیں۔"

89- "بلینک چیک میں کم سے کم کتنا اماؤنٹ لکھیں گی؟"

"مجھے پیسے کی کوئی طلب نہیں اور اگر ایسا ہوا تو پھر اس ملک کے غریب بچوں کے لیے جو تعلیم حاصل نہیں کر سکتے ان کے لیے کچھ کروں گی۔"

90- "کب اپنے آپ پر فخر ہوتا ہے؟"

"جب لوگ کہتے ہیں کہ اچھی بچی ہو ایسی ہی رہنا ہمیشہ۔"

91- "اگر آپ سے سیل فون کی سہولت لے لی جائے تو؟"

"تو سکون آ جائے گا۔"

92- "عام لوگ آپ سے مل کر کیا کہتے ہیں؟"

"بہت ہی ڈاؤن ٹو ارتھ ہو۔"

93- "اگر کسی ایئر لائن کا اوپن ٹکٹ مل جائے تو کہاں جانا پسند کریں گی؟"

"پیرا گوئے"

94- "کسی ڈرامے کے لیے گنجی ہونا پڑے تو؟"

"مجھے مزہ آئے گا۔"

95- "ناشتا اور کھانا کس کے ہاتھ کا پسند ہے؟"

"جو اچھا بنا کر کھلا دے۔"

96- "غلطی کا اعتراف کر لیتی ہیں؟"

"جی...... جی کر لیتی ہوں۔"

97- "پیسہ محنت سے ملتا ہے یا قسمت سے؟"

"قسمت کا پتا نہیں۔ محنت میں ہی مزہ آتا ہے۔"

98- "کس دن کا انتظار رہتا ہے؟"

"جب ابو کے لیے فاتحہ پڑھنے جانا ہوتا ہے۔"

99- "اگر آپ کی شہرت کو زوال آ جائے تو؟"

"وقت ایک جیسا نہیں رہتا، عروج و زوال آتے رہتے ہیں۔ یہ زندگی کا حصہ ہے۔ ہر حال میں انسان کو خوش رہنا چاہیے۔"

☆

خبریں وبریں

واصفہ سہیل



نور نے شوبز چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس بارے میں نور کا کہنا ہے کہ "وہ جو کام کر رہی ہیں اس کا قرآن میں کہیں تذکرہ نہیں ہے۔ اس لیے وہ شوبز چھوڑ رہی ہیں۔ آج کل وہ اسلامی کتب کا مطالعہ کر رہی ہیں۔ جن کو پڑھ کر معلوم ہوا کہ وہ جو کام کر رہی ہیں، وہ ٹھیک نہیں ہے۔ میری کوشش ہو گی کہ میں اب یہ کام نہ کروں اور اسلامی طرز زندگی اپناؤں۔" (ہم آپ کی ثابت قدمی کے لیے دعا گو ہیں۔ نور!)

مات

شائل خان فلموں سے ڈراموں کی طرف آئے ہیں اور آج کل مختلف ٹی وی ڈراموں میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھا رہے ہیں۔ ڈراما انڈسٹری کے بارے میں شائل خان کا کہنا ہے کہ "ہماری ڈراما انڈسٹری پی ٹی وی کے زمانے سے ہی کامیاب ہے



انجیر

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں انجیر کی قسم کھائی ہے، جس سے انجیر کی افادیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ موجودہ دور کے سائنس دانوں نے بھی اس کے بے شمار فوائد کا اعتراف کیا ہے۔ یہ پھل قدرتی مٹھاس، معدنیات اور حل پذیر ریشوں سے بھرپور ہوتا ہے۔ یہ تازہ اور خشک دونوں صورتوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔

انجیر میں چونکہ حل ہو جانے والے ریشوں کی مقدار زیادہ ہوتی ہے۔ اس لیے آنتوں کو تقویت دینے اور ان کے افعال درست رکھنے کے لیے اس پھل کا استعمال بہترین ہے۔ بلڈ پریشر، بڑھتے وزن کو کم کرنے اور جسم میں ہڈیوں کو محفوظ رکھ کر اوسٹیو پوروسس کے خطرے کو کم کرنے کے ساتھ ساتھ یہ پھل جسم کو بیماریوں سے محفوظ رکھنے کے نظام کو طاقت ور رکھتا ہے۔

اعلان

کافی دنوں سے خبر گردش کر رہی تھی کہ اداکارہ



اور اب اس مقام پر پہنچ گئی ہے کہ پڑوسی ملک کے ڈراموں کو مات دے دی ہے۔ (شامل! ہماری ڈراما انڈسٹری ہمیشہ ان سے آگے رہی ہے۔ پڑوسی ملک کے انسٹی ٹیوٹ میں پی ٹی وی کے ڈرامے دکھائے جاتے ہیں۔) کیوں کہ ڈراما انڈسٹری کو پروان چڑھانے کے لیے شروع ہی سے سخت محنت کی گئی ہے۔ (جی اور اب......؟) لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ ہمیں کسی سے مقابلہ نہیں کرنا۔ (کیوں بھئی! مقابلہ کرنے پر ہی تو پتا چلتا ہے کتنے پانی میں ہیں، ورنہ تو......؟) بلکہ اپنے کام کو بہتر سے بہتر انداز میں متعارف کرانا ہے۔ (کس سے......؟) تاکہ ہماری ڈراما انڈسٹری اس سے زیادہ کامیابیاں سمیٹ سکے۔ ڈراموں میں یکسانیت کے حوالے سے شامل خان کا کہنا ہے کہ ”بھئی جو لوگ دیکھنا پسند کریں گے وہی تو ہم اپنے اسکرپٹ میں شامل کریں گے اور کون سا ڈراما کس حد تک کامیاب ہے، یہ تو ریٹنگ ہی بتا دیتی ہے۔ (ریٹنگ کا فیصلہ کون کرتا ہے۔)

اعتماد

سری لنکا کے خلاف ابوظہبی میں کھیلے گئے اپنے پہلے ہی ایک روزہ میچ میں سنچری کرنے والے اور پاکستان کی جیت میں اہم کردار ادا کرنے والے امام الحق، انضمام الحق کے بھتیجے ہیں۔ امام الحق کہتے ہیں کہ ”اپنے پہلے ہی میچ میں سنچری اسکور کرنا ان کے لیے باعث فخر ہے۔ انہوں نے کہا کہ ریکارڈ بنانے کے بعد انہیں پتا چلا کہ انہوں نے اپنے ملک کے لیے یہ کارنامہ انجام دیا ہے۔ تو ان کی خوشی دوچند ہوگئی۔ انہوں نے مزید کہا کہ انضمام الحق میرے چچا ہیں، لیکن میں چاہتا ہوں کہ اپنے ناقدین کو اپنی بہترین پرفارمنس کے ذریعے جواب دوں۔“ (دے تو دیا بھئی جواب۔ ان لوگوں کو جو یہ سمجھتے ہیں کہ انضمام الحق چوں کہ سلیکشن کمیٹی کے سربراہ ہیں تو اس لیے بھتیجے کو ٹیم میں لیا ہے۔) میں نے کرکٹ کے ماحول میں آنکھ کھولی ہے اور میں اپنی کارکردگی سے مطمئن ہوں۔ (امام الحق اور سب تو ٹھیک ہے مگر یہ مطمئن ہونا......؟ کارکردگی پر اثر انداز ہوسکتا ہے۔)

مشکل

برطانوی پارلیمانی ممبر ناز شاہ برطانیہ اور یورپ میں مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں کہتی ہیں کہ ”مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ فی الحال تو مسلمانوں کے لیے بہت مشکلات ہیں۔ خاص طور پر ہماری جو بیٹیاں حجاب پہنتی ہیں، وہ سوچ رہی ہیں کہ ہم حجاب اتار دیں۔ یہ بچیاں سب سے قابل ہیں لیکن ان کے جاب کرنے کے چانس 85 فیصد کم ہیں کیوں کہ وہ حجاب پہنتی ہیں ہمارے لیے مشکل وقت ہے۔“

کچھ ادھر ادھر سے

☆ اعتراض یہ ہے حسن اور حسین نواز چھوٹی عمروں میں ارب پتی ہوگئے۔ حسین نواز 46 سال کا ہے اور اس کے دادا 1960ء میں پاکستان کے امیر ترین آدمی تھے۔

(مریم نواز شریف......اخبار جہاں)

☆ پھل اور سبزیوں سے صرف جسمانی صحت کو ہی فائدہ نہیں ہوتا پھل اور سبزیوں کا استعمال بڑھانے سے صرف دو ہفتوں میں ذہنی اور نفسیاتی صحت بھی بہتر ہو جاتی ہے۔

☆ پیراسیٹامول کی گولی یا کیپسول کھانے کے اثرات تقریباً آدھے گھنٹے بعد محسوس ہونے چاہئیں، کیوں کہ ان گولیوں کے گھلنے اور جذب ہونے میں تقریباً اتنا ہی وقت لگتا ہے۔

ایک نئی تحقیق

☆ کراچی والوں کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا ہے کہ پڑھی لکھی، مہذب، امن پسند کہلانے والی اردو کمیونٹی کی تہذیبی، علمی، سماجی اور معاشرتی شناخت ہی تبدیل ہوگئی ہے۔

(حافظ نعیم الرحمٰن)

عمران خان بنی گالا میں تھے۔

شلوار قمیض میں ملبوس عمران اپنے دو بھاری بھرکم کتوں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے تو سفید رنگ کا کتا تو مہمانوں کے انجانے بیگ سونگھ کر باہر نکل گیا لیکن موٹو نامی ایشین اس ملاقات کے دوران عمران خان کی کرسی کے ساتھ بیٹھا رہا۔ معلوم نہیں اسے پاناما کی گردان سننے میں کتنی دلچسپی تھی؟

(برطانوی نشریاتی ادارے کی خصوصی رپورٹ)

جس سیاست دان، فلمی اداکارہ اور کرکٹر کا اسکینڈل نہ بنے، وہ ناکام، ڈھیلا اور کشش سے عاری سمجھا جاتا ہے۔ پھر وہ خود بھی تشویش کا شکار ہوتا ہے اور اس کے عقیدت مند بھی۔

(روزنامہ امت)





شادی مبارک ہو

محمد یاسر امین ہمراہ نادیہ
نمرہ امین ہمراہ عاقب سلیم

شاہین رشید

دو مہینے پہلے سے شادی کی تیاریوں کا سلسلہ شروع کر دیا گیا تھا۔ کیوں کہ نمرہ آپی کی شادی تایا ابو کے بیٹے عاقب سے طے تھی اور تایا ابو چاہتے تھے کہ یاسر بھائی کے ساتھ ہی نمرہ آپی کی بھی شادی کر دی جائے۔ اس لیے یاسر بھائی کی شادی کے ساتھ ہی نمرہ آپی کی شادی کی تیاری بھی شروع ہو گئی۔ سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ ان ہی دنوں میں میرے میٹرک کے پیپر تھے اور چھوٹے بچوں کے پیپر بھی ان ہی دنوں میں شروع ہو رہے تھے۔ بہر حال یاسر بھائی کی شادی کی تاریخ 28 اپریل طے پائی اور 30 اپریل کو یاسر بھائی کے ولیمے کے ساتھ نمرہ آپی کی رخصتی کا پروگرام طے کر لیا گیا۔ شادی کی تیاریوں کا سلسلہ زور و شور سے شروع ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی بازاروں کے چکر لگنے شروع ہو گئے۔ یاسر بھائی اور نمرہ آپی کی بارات کے جوڑے خریدنے تھے۔

چوبیس اپریل کو نمرہ آپی کا نکاح تھا اور ہم سب بہن، بھائی بہت اداس تھے کہ آپی دوسرے گھر کی ہو رہی ہیں لیکن ایک طرف خوشی تھی کہ ہمارے گھر بھابی آ رہی ہیں۔

26 تاریخ کو یاسر بھائی کا نکاح تھا۔ شادی سے کچھ دن پہلے فیصل آباد اور لاہور سے مہمانوں کی آمد شروع ہو گئی۔ گھر میں بہت افراتفری تھی۔ ہر طرف خوشی کا ماحول تھا۔ امتحان کی وجہ سے شادی لیٹ کی گئی لیکن پھر بھی میرا ایک پیپر بارات کے اگلے دن ہونا تھا۔ کیونکہ امتحانات کا شیڈول شادی کی تاریخ کے بعد آیا تھا، لیکن میری پوری تیاری تھی۔

اس لیے میں زیادہ پریشان نہیں تھی اور میں نے شادی میں خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور خوب انجوائے کیا۔

27 اپریل کو گھر کے باہر مہندی کا پروگرام تھا۔ سارے کزنز جمع تھے اور سب نے خوب ہلا گلا کیا۔ دونوں کی مہندی کا فنکشن ایک ساتھ رکھا گیا تھا۔ سارے مہمان ہمارے ہاں ہی جمع تھے۔ رسموں کا سلسلہ شروع ہوا اور میں نے آخر میں عاقب بھائی کی انگلی پکڑ کر ان سے نیگ وصول کیا۔ رسموں کے اختتام پر سب مہمانوں کو کھانا پیش کیا گیا اور رسم مہندی کا اختتام ہوا۔

اگلے دن بھائی کی بارات تھی اور تایا ابو نے پہلے سے یہ کہہ دیا تھا کہ وقت کی پابندی ضروری ہے۔ کیوں کہ شادی ہال بارہ بجے کے بعد بند ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور میں نے تو ابھی ہاتھوں پر مہندی لگوائی تھی، تو سب سے پہلے میں نے یہ کام کیا اور اپنی تیاری مکمل کی۔ جلدی جلدی کرتے بھی جب بارات لے کر نکلے تو رات کے 10 بج گئے۔ وہاں سے بھابھی کے بھائی کے بار بار فون آ رہے تھے۔ کیونکہ بھابھی کی دوسری بہن نجمہ کی شادی بھی ان ہی کے ساتھ طے تھی۔ وہ لوگ بھی پہنچنے والے تھے۔ بھابھی کا گھر ایک گھنٹے کی دوری پر تھا جب ہم آدھے راستے میں پہنچے تو دولہا کی گاڑی خراب ہو گئی۔ اب یہ ایک نئی پریشانی تھی۔ کیوں کہ تایا ابو کی گاڑی ہی دولہا کے لیے سجائی گئی تھی اور وہ خود ہی گاڑی ڈرائیو کر رہے تھے۔

بہر حال آہستہ آہستہ گاڑی ڈرائیو کر کے ہم شادی ہال تک پہنچ ہی گئے اور دولہا کو اسٹیج پر لے جایا گیا۔ اس کے بعد دلہن کو بھی لایا گیا، کیوں کہ نکاح تو پہلے ہی ہو چکا تھا۔ اس لیے اب صرف رسمیں کرنی تھیں، جو کہ شروع ہو گئیں۔ دودھ پلائی کی رسم میں خوب نوک جھونک ہوتی رہی اور بہت مزا آیا۔ بھابھی کی امی نے بھائی کو ہار پہنایا اور بھابھی کے بھائی نے گھڑی پہنائی اور سب نے باری باری دولہا، دلہن کے ساتھ مووی بنائی اور ان ہی باتوں کے دوران یاد آیا کہ دولہا کی کار تو خراب ہے۔ اس لیے ناصر انکل جو کہ پاپا کے بچپن کے دوست ہیں۔ ان کی گاڑی میں دولہا، دلہن کو بٹھانے کا انتظام کیا گیا۔ وہاں سے واپسی میں رات کا ایک بج گیا اور ہم نے گھر پہنچ کر خوب اچھی طرح بھابھی کا استقبال کیا اور کمرے کے دروازے پر روک کرائی، پھپھو، مامی اور بہنوں نے ساری رسمیں کیں اور ان کو خوب تنگ کیا۔

بھائی کی بارات کے اگلے دن کوئی بھی فنکشن نہیں تھا۔ اس ایک دن میں ہم نے گھر میں آپی کے ساتھ بہت انجوائے کیا اور مزے مزے کی رسمیں کیں۔ کیوں کہ اگلے دن آپی کی بارات تھی اور پھر صبح جلدی ہی بھابھی نے آپی کو مہندی لگائی کیوں کہ میری بھابھی کو برائیڈل مہندی آتی ہے۔ آپی کو مہندی لگ گئی اور پھر ہم سب رات دو بجے تک سو گئے۔

امی نے صبح اٹھتے ہی ہم سب کزنز کو اٹھا دیا، کیوں کہ بہت سارے کام باقی تھے۔ کسی کو پارلر جانا تھا، کسی کو بازار جانا تھا۔ پھر چار بجے ممانے گھر سے آپی کو پارلر کے لیے رخصت کر دیا۔ آپی جا رہی تھیں تو





ہم سب بہت اداس تھے اور آپی بھی بہت روئی تھیں، لیکن ہمیں اس بات کی خوشی تھی کہ آپی رخصت ہو کر تایا ابو کے گھر جا رہی تھیں۔ آپی کے ساتھ میں اور بھابھی بھی پارلر چلے گئے، کیونکہ بھابھی کا ولیمہ تھا۔ رات کو آٹھ بجے مما اور پپا ہال میں پہنچ گئے اور ہم لوگوں کو پارلر سے ناصر انکل لینے آئے تھے۔ تھوڑے سے انتظار کے بعد بارات آگئی اور ہم سب کزنز استقبال کے لیے پھول وغیرہ لے کر کھڑے ہو گئے۔ جب بارات آئی تو اظہر بھائی نے گاڑی روک کر عاقب بھائی سے نیگ لیا اور پھر عاقب بھائی کو تایا، تائی اسٹیج پر لے آئے۔

نکاح تو پہلے ہی ہو چکا تھا۔ اس لیے ساری رسمیں جلدی شروع کر دیں اور پھر میں نے دودھ پلائی کی رسم کی، دودھ پلائی کی رسم میں بہت مزا آیا۔ عاقب بھائی دودھ نہیں پی رہے تھے کہ تم لوگوں نے اس میں کچھ ملایا ہے، اس لیے میں نے پہلے آپی کو پلایا، تو عاقب بھائی نے پی لیا۔ پاپا نے عاقب بھائی کو گھڑی پہنائی اور مما نے پیسے دیے اور پھر ڈنر شروع ہو گیا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد تایا ابو نے رخصتی کا کہہ دیا۔ ہم سب کزنز اور باقی لوگ آپی سے ملے اور بھائیوں نے آپی کی گاڑی کو ہاتھ لگا کر رخصت کر دیا۔

اگلے دن صبح ہم سب آپی کا ناشتہ لے کر گئے اور بھابھی بھی ہمارے ساتھ گئیں اور اسی دن آپی کا ولیمہ بھی تھا اور پاپا نے سب کو کہا کہ جلدی جانا ہے۔ میں اور بھابھی پارلر چلے گئے اور ہم سب دس بجے ہال پہنچ گئے۔ وہاں سب نے ہمارا بہت اچھی طرح استقبال کیا۔ پھر آپی اور عاقب بھائی کو اسٹیج پر لے کر آئے۔ سب نے مووی بنوائی اور پھر میں نے اور اظہر بھائی نے آپی اور عاقب بھائی کو گفٹ دیے۔ اس کے بعد ڈنر شروع ہو گیا۔ کھانا کھانے کے بعد سب اپنے اپنے گھر میں چلے گئے اور ہم بھی گھر آ گئے۔

اللہ کا شکر ہے کہ یہ شادی بہت اچھی طرح انجام پائی۔ اللہ تعالیٰ میرے بھائی، بھابھی اور عاقب بھائی اور آپی کی جوڑی ہمیشہ سلامت رکھے اور انہیں اپنے اپنے گھروں میں خوش رکھے۔

(آمین)

آپ کا باورچی خانہ

اقرا اقبال

خواتین کی زندگی میں "باورچی خانہ" بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ جب بچیاں کچھ سمجھ دار ہو جاتی ہیں تو ماؤں کو فکر لاحق ہو جاتی ہے کہ بیٹیوں کو باورچی خانہ سنبھالنا سکھا دیں۔ اسی خیال کے تحت میری والدہ نے بھی باورچی خانہ مابدولت کے سپرد کر دیا ہے۔ کاغذ قلم تھام کر میں نے سوچا کہ بہترین انسان وہ ہے جو دوسروں کے کام آئے۔ اگر میرے کسی تجربے سے کوئی بہن فائدہ حاصل کرتی ہے تو یہ بہت زبردست بات ہو گی۔ لہٰذا سوالات کے جواب حاضر ہیں۔

سوال:۔ کھانا بناتے ہوئے آپ کن باتوں کا خیال رکھتی ہیں؟ پسند ناپسند، غذائیت یا گھر والوں کی صحت؟

جواب:۔ کھانا بناتے ہوئے گھر کے تمام افراد کی پسند، ناپسند کا خیال بھی رکھا جاتا ہے اور غذائیت کو بھی اہمیت دی جاتی ہے۔ مثلاً سرخ مرچ کے بجائے ہری مرچ اور کالی مرچ کا استعمال کیا جاتا ہے۔ گھی کے بجائے تیل کا استعمال کیا جاتا ہے۔ گرم مسالا کم سے کم استعمال کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ پودینہ، معدہ کے لیے مفید ہے۔ اس لیے پودینے کا قہوہ اور چٹنی استعمال کی جاتی ہے۔

سوال:۔ کھانا کھانے کا وقت ہے گھر میں اچانک مہمان آگئے ہیں، کسی ایسی ڈش کی ترکیب بتائیں جو فوری تیار ہو سکے؟

جواب:۔ مہمان رب کی رحمت ہوتے ہیں۔ رحمت بن بتائے بھی گھر آئے تو ہم خوش ہو جاتے ہیں اور میری دوڑیں باورچی خانے کی جانب لگ جاتی ہیں۔ اگر مہمان اچانک گھر آ جائیں تو ڈرائے چکن چلی مسالا بنا کر پیش کر سکتے ہیں۔ ترکیب حاضر خدمت ہے۔

اجزا:۔

چکن بریسٹ	دو عدد
ہری مرچیں	ایک پیالی
ادرک (باریک کٹا ہوا)	آدھا کپ
لہسن (چھیل لیں)	دو کھانے کے چمچے
ٹماٹر	دو عدد
املی کا گودا	دو کھانے کے چمچ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	چار کھانے کے چمچ

ترکیب:۔ مرغی کے گوشت کے باریک اور لمبے ٹکڑے کاٹ لیں۔ ہری مرچوں کو درمیان سے لمبائی میں کاٹ لیں۔ ٹماٹروں کو چھیل کر باریک کاٹ لیں۔ دیگچی میں تیل گرم کر کے ٹماٹر پکائیں۔ اس میں مرغی کے ٹکڑے رنگ تبدیل ہونے تک پکائیں۔ پھر مرچوں کے علاوہ باقی تمام اجزا ڈال کر مسالا خشک ہونے تک بھونیں پھر اس میں مرچیں ڈالیں اور دم پر رکھ دیں۔ دس منٹ بعد ڈش میں نکال کر سرو کریں۔

سوال:۔ کچن خاتون خانہ کی سلیقہ مندی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ آپ کچن کی صفائی کے لیے کیا خصوصی اہتمام کرتی ہیں؟

جواب:۔ بالکل درست! خواتین کا آدھے سے زیادہ دن تو باورچی خانے میں ہی گزرتا ہے۔ اگر کچن میں چیزیں بے ترتیب اور گندی حالت میں

پڑی ہوں گی تو کام کرتے ہوئے دل خراب ہونے کے ساتھ چیزوں کو استعمال کے وقت ڈھونڈ نکالنے میں بھی وقت ضائع ہوگا۔ میرے گھر میں جب چاول، دالیں اور مسالا جات خرید کر لائے جاتے ہیں تو میں وقت نکال کر سب کو صاف ستھرا کر کے محفوظ کر لیتی ہوں۔ اس طرح کوکنگ میں کم وقت صرف ہوتا ہے اور زیادہ کام کا بوجھ سر پر پڑ گیا۔ جیسی ٹینشن سے بھی نجات ملتی ہے کچن کی تفصیلی صفائی بھی مہینے میں ایک دو بار کرتی ہوں۔

سوال:۔ صبح ناشتے میں آپ کیا بناتی ہیں۔ ایسی خصوصی ڈش جو آپ بہت اچھی بناتی ہیں؟

جواب:۔ یکسانیت سے دل اوب جاتا ہے۔

لہٰذا میرے گھر میں ناشتے کے لیے مختلف پکوان پکتے بھی ہیں اور باہر سے بھی بعض اوقات منگوا لیے جاتے ہیں۔ ناشتے کے لیے ایک لذیذ سی ڈش کی ترکیب آپ سب بہنوں کے لیے پیش خدمت ہے۔

ونیلا شیر خرما

اجزاء:۔

باریک سویاں — ایک کپ
چینی — ایک کپ
زردے کا رنگ — ایک چٹکی
دودھ — ایک لیٹر
پستے، بادام (کٹے ہوئے) — حسب ضرورت
گھی — تین کھانے کے چمچے
چھوٹی الائچی — تین عدد
چھوارے (کٹے ہوئے) — آٹھ عدد
ونیلا کسٹرڈ پاؤڈر — دو کھانے کے چمچے
ناریل پاؤڈر — تین کھانے کے چمچے

ترکیب:۔ تھوڑے سے گرم دودھ میں کسٹرڈ اور چٹکی زردہ رنگ گھول لیں۔ چھواروں کو آدھا کپ دودھ میں بیس منٹ کے لیے بھگو دیں۔ برتن میں بقیہ دودھ ابالیں اور اس میں چینی ڈال کر دس سے پندرہ منٹ تک ہلکی آنچ پر پکائیں۔ کڑاہی میں گھی گرم کر کے الائچی کڑکڑائیں، پھر اس میں سویاں ڈال کر تین چار منٹ تک فرائی کریں اور ناریل بھی ڈال دیں۔ پھر آہستہ آہستہ دودھ شامل کر کے ہلکی آنچ پر پانچ سے سات منٹ تک پکائیں۔ آخر میں کسٹرڈ والا دودھ شامل کریں۔ تھوڑا سا پکائیں اور چولہے سے اتار لیں۔ ڈش میں نکال کر پستہ، بادام اور چھوارے چھڑک لیں اور سرو کریں۔

سوال:۔ مہینے میں کتنی بار باہر کھانا کھاتی ہیں؟

جواب:۔ میرے بھائی کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ ہم گھر میں ہی اتنا لذیذ کھانا تیار کر لیں کہ باہر کا غیر معیاری اور مہنگا کھانا ہم کھائیں ہی نہیں۔ اس لیے بھائی کا زور اس بات پر رہتا ہے کہ یہ ڈش بھی سیکھو اور وہ والی بھی سیکھ ہی لو! مگر جب دل باہر گھومنے پھرنے کو چاہے تو ہم باہر کھانا کھانے چلے جاتے ہیں۔ اس طرح کا اتفاق مہینے میں ایک سے دو مرتبہ بھی ہو سکتا ہے اور نہیں بھی۔ پرس میں موجود پیسوں پر بھی اس بات کا انحصار ہوتا ہے۔

سوال:۔ پکانے کے لیے ڈش کا انتخاب کرتے ہوئے موسم کو مدنظر رکھتی ہیں؟

جواب:۔ مختلف موسموں میں مختلف امراض انسان کو لاحق ہو جاتے ہیں۔ جن کا علاج اللہ کریم نے ان موسموں میں ہی اگنے والے پھلوں اور سبزیوں میں رکھا ہوتا ہے۔ اس لیے ہم موسم کے حساب سے ہی کھانا تیار کرتے ہیں۔ سردیوں میں گرم غذائیں اور گرمیوں میں ٹھنڈی غذائیں استعمال کرتے ہیں۔

سوال:۔ ٹپ؟

جواب:۔ پیاز کاٹنے کے بعد ہاتھوں سے آنے والی بدبو ناگوار محسوس ہوتی ہے۔ اسے دور کرنے کے لیے ہاتھوں پر تھوڑا سا نمک ڈال کر چند پانی کے قطروں کے ساتھ مل لیں، بعد میں نیم گرم پانی سے ہاتھ دھو لیں تو بدبو دور ہو جائے گی۔

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

چٹ پٹے کباب

اجزاء:۔

قیمہ — آدھا کلو
ادرک لہسن پسا ہوا — ایک کھانے کا چمچہ
ثابت دھنیا — ایک کھانے کا چمچہ
دہی — دو کھانے کے چمچے
گرم مسالا پسا ہوا — ایک چائے کا چمچہ
ہرا دھنیا — آدھی گٹھی
نمک — حسب ذائقہ
لال مرچ کٹی ہوئی — ایک کھانے کا چمچہ
خشک انار دانہ — دو کھانے کے چمچے
بیسن — تین سے چار کھانے کے چمچے
ہری مرچیں — تین سے چار عدد
تیل یا گھی — حسب ضرورت

ترکیب:۔ قیمے کو دھو کر چھلنی میں رکھ لیں تاکہ پانی اچھی طرح نتھر جائے، انار دانہ صاف دھو کر دس سے پندرہ منٹ بھگو کر رکھیں، پھر باریک پیس لیں۔ دھنیا ہلکا سا بھون کر کوٹ لیں۔ بیسن کو ہلکی آنچ پر بھون لیں اور دہی میں ڈال کر اچھی طرح ملا لیں، ہرا دھنیا اور ہری مرچیں باریک کاٹ لیں۔ قیمے کو اچھی طرح دونوں ہاتھوں میں دبا دبا کر پانی نکال دیں اور ایک پیالے میں رکھ دیں۔ پھر اس میں نمک، ادرک، لال مرچیں، کٹا ہوا دھنیا، بیسن، کٹا ہوا ہرا مسالا اور انار دانہ ڈال کر اچھی طرح ملا لیں اور اس مکسچر کو ایک گھنٹے کے لیے فریج میں رکھ دیں، تاکہ اس میں مسالا رچ جائے۔ کڑاہی میں تیل یا گھی کو درمیانی آنچ پر تین سے چار منٹ گرم کریں اور قیمے کو فریج سے نکال کر دوبارہ سے ملائیں۔ ہاتھ سے یا چمچے سے پکوڑوں کی طرح چھوٹے چھوٹے کباب گرم تیل یا گھی میں ڈالتے جائیں اور درمیانی آنچ پر سنہری تل کر نکال لیں۔

کابلی پلاؤ

اجزاء:۔

چاول (صاف کر کے بھگو دیں) — ایک کلو
بکرے کی چانپ — ڈیڑھ کلو
تیل — ایک کپ
دہی — آدھا کپ
نمک — حسب ذائقہ
پیاز (تل کر سنہرا کر لیں) — ایک عدد
ادرک (چوپ کر لیں) — دو انچ کا ٹکڑا
کشمش (تلی ہوئی) — ایک چوتھائی کپ
لہسن کے جوے (چوپ کر لیں) — دس عدد
بادام (کٹے اور تلے ہوئے) — آدھا کپ
پیاز (کٹی ہوئی) — دو عدد
لیموں کا رس — دو کھانے کے چمچے
ثابت دھنیا — دو چائے کے چمچے
زعفران یا کیوڑا — تھوڑا سا
سونف — دو چائے کے چمچے
ادرک لہسن پیسٹ — ایک چائے کا چمچہ
ثابت گرم مسالا — تھوڑا سا
پانی — آٹھ کپ

ترکیب:۔ چانپوں کو دھو کر اس میں پانی، نمک، ادرک، لہسن پیسٹ، کٹی ہوئی پیاز، ثابت دھنیا اور سونف ڈال کر تقریباً ایک گھنٹے تک پکائیں۔ جب چانپیں گل جائیں تو انہیں نکال کر گرم تیل میں تل کر ایک پلیٹ میں رکھ لیں۔ چانپوں کی یخنی کو چھان کر علیحدہ رکھیں۔ ایک پتیلی میں تیل گرم کریں۔ ثابت گرم مسالا، کٹا ہوا ادرک، لہسن اور

دہی ڈال کر بھون لیں۔ اس میں یخنی ڈال کر پکائیں۔ جب ابال آنے لگے تو بھگوئے ہوئے چاول ڈالیں۔ پانچ منٹ تیز آگ پر پکائیں۔ نمک ڈالیں، پھر آگ کم کردیں۔ جب پانی خشک ہوجائے تو ڈھکن ڈال کر دم پر رکھیں۔ ڈش میں پہلے چاول، پھر اوپر چانپیں۔ پھر تلی ہوئی پیاز، تلی ہوئی کشمش، بادام، کیوڑا اور لیموں کا رس ڈال کر سرونگ ڈش میں نکالیں، مزے دار کابلی پلاؤ تیار ہے، دہی کے رائتے کے ساتھ گرم گرم پیش کریں۔

کاجو کی برفی

اجزا:۔

کاجو	ایک پیالی
چینی	آدھی پیالی
پانی	ایک چوتھائی پیالی
چاندی کا ورق (سجانے کے لیے)	

ترکیب:۔ کاجو کو مشین یا سل پر نہایت باریک سفوف کی شکل میں پیس لیں۔ اب ایک برتن میں پانی اور چینی ڈال کر پکائیں، یہاں تک کہ چینی حل ہو جائے اور ابال آجائے۔ چینی اور پانی کا آمیزہ گاڑھا ہوجائے تو اس میں کاجو کا سفوف شامل کردیں اور جب تک، چینی، پانی اور کاجو کا مرکب یکجان نہ ہوجائے اسے چولہے سے نہ اتاریں۔ دھیان رہے یہ مرکب نرم اور لچک دار ہونا چاہیے، سخت اور خشک نہیں۔ اگر کسی وجہ سے مرکب سخت ہوجائے تو اس میں گھی یا مکھن شامل کرکے نرم کرلیں۔ اب ایک پلیٹ میں پیپر پھیلائیں اور گرم گرم مرکب کو پلیٹ میں نکالیں اور ایک دوسرا پیپر مرکب کے اوپر بھی بچھادیں۔ اب کسی بیلن کی مدد سے مرکب کو سیدھا کرلیں۔ مرکب کی موٹائی ایک چوتھائی انچ ہونا مناسب ہے۔ اب اوپر بچھا ہوا پیپر ہٹادیں اور چھری سے لمبے نمک پارے کی شکل میں کاٹ لیں۔ کاجو کی برفی تیار ہے، چاندی کا ورق سجاکر مہمانوں کو پیش کیجیے۔

چکن چاؤمن

اجزاء:۔

چکن (بغیر ہڈی) (چوکور کاٹ لیں)	ایک پاؤ
پسا لہسن	ایک چائے کا چمچہ
چلی گارلک ساس	ایک کھانے کا چمچہ
سویا ساس	ایک کھانے کا چمچہ
تل کا تیل	دو چائے کے چمچے
ہاٹ ساس	ایک کھانے کا چمچہ
نمک، سیاہ مرچ پاؤڈر	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت
اسپیگھٹی (نمک ملے پانی میں ابال کر چھان لیں)	ایک پیکٹ
گاجر (کدوکش کرلیں)	ایک عدد
شملہ مرچ (بیج نکال کر باریک کاٹ لیں)	دو عدد
ہری پیاز (باریک کاٹ لیں)	دو عدد

ترکیب:۔ ساس پین میں تیل گرم کرکے اس میں گوشت، لہسن ـــــ سیاہ مرچ پاؤڈر اور نمک ڈال کر تین سے چار منٹ تک ہلکا سا تل لیں۔ اس میں ہاٹ ساس، سویا ساس ـــ چلی گارلک ساس اور ایک چوتھائی کپ پانی ڈال کر ہلکی آنچ پر پانچ منٹ تک پکائیں۔ آنچ تیز کرکے پانی خشک کریں۔

اس کے بعد اس میں تیل، ابلی ہوئی اسپیگھٹی، شملہ مرچیں، گاجر، ہری پیاز ڈال کر دو عدد چمچوں کی مدد سے مکس کریں۔ دو منٹ تک دھیمی آنچ پر پکائیں۔ مزے دار چکن چاؤمن تیار ہے، گرم گرم سرو کریں۔



عدنان

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں

ساجدہ عظیم ...... کراچی

میں انٹر میں تھی جب میری ایک لڑکے سے فون پر دوستی ہوئی۔ یہ دوستی کب دوسرے رشتے میں ڈھل گئی۔ اندازہ ہی نہ ہوا۔ وہ کہتا تھا کہ وہ مجھ سے شادی کرے گا۔ بی اے کے بعد میرا ایک رشتہ آیا، میں نے اس لڑکے کو بتایا تو اس نے کہا کہ ابھی اس کی تعلیم مکمل نہیں ہوئی ہے۔ وہ انجینئرنگ کا طالب علم تھا۔ وجہ معقول تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ ابھی صرف منگنی کرلے۔ شادی دو سال بعد ہوجائے گی تب اس نے بتایا کہ اس کی دو بڑی بہنیں ہیں ابھی ان کی شادی تو کیا کہیں رشتہ بھی طے نہیں ہوا۔ ایسی صورت میں وہ اپنی شادی کی بات نہیں کرسکتا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ میں کسی طرح اس رشتہ کو ٹال دوں، جیسے ہی تعلیم مکمل ہوئی، وہ گھر میں بات کرے گا۔ میں نے گھر والوں سے کہا کہ مجھے ابھی آگے پڑھنا ہے۔ میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔ آپ چھوٹی بہن کا رشتہ طے کردیں۔ امی، ابو کو یہ بات پسند نہیں تھی لیکن وہ زبردستی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے چھوٹی بہن کا رشتہ کردیا۔ میں نے ایم اے میں ایڈمیشن لے لیا۔ اس کی تعلیم مکمل ہوگئی۔ اس وقت تک اس کی ایک بہن کی شادی بھی ہوچکی تھی۔ اس نے ایک دو جگہ جاب کی لیکن وہ کہیں بھی مطمئن نہ ہوسکا۔ کسی نہ کسی بہانے جاب چھوڑ دیتا۔ میں نے ایم اے کرلیا لیکن اس کی طرف سے خاموشی تھی۔ اب ہماری ملاقاتیں بھی کم ہونے لگی تھیں۔ عجیب بات یہ ہوئی کہ اب ہم ملتے تو وہ زیادہ تر مجھ پر، میری ڈریسنگ پر تنقید کرتا۔ کبھی کہتا یونیورسٹی جاکر تمہارا رنگ پہلے جیسا نہیں رہا ہے۔ کبھی میرے کپڑوں کو اولڈ فیشن قرار دیتا۔ مجھے بوڑھی روح کہتا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ چاہتا کیا ہے۔ ایک دن اس نے بتایا کہ وہ دبئی جارہا ہے وہاں اس کی جاب ہوگئی ہے۔

میں نے شادی کی بات کی تو اس نے مجھے تسلی دی کہ وہ جلد اپنے گھر والوں سے بات کرے گا۔

دبئی جاکر اس نے مجھ سے رابطہ نہیں کیا۔ نہ ہی اپنا فون نمبر دیا تھا۔ ایک مشترکہ دوست سے میں نے اس کا فون نمبر مانگا تو اس نے عجیب بات کہی کہ اس نے دوست کو منع کیا تھا کہ اس کا نمبر کسی کو نہ دیا جائے۔ بہرحال اس نے نمبر مجھے دے دیا۔ اب پتا نہیں نمبر غلط تھا یا اس نے نمبر بدل لیا تھا۔ میں نے کئی بار کوشش کی لیکن اس سے بات نہ ہوسکی۔ اس دوران دو چھوٹی بہنوں کی شادی ہوچکی تھی۔ میں ایک اسکول میں جاب کررہی تھی۔ اس کو دبئی گئے بھی دو سال ہوچکے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ ہماری دوستی آٹھ دس سال رہی تھی۔ میرا دل اب بھی اسی کی طرف جھکتا تھا، لیکن گھر والوں کا شدید دباؤ تھا۔ وہ اب کچھ بھی سننے کو تیار نہ تھے۔ مجبوراً میں نے شادی کے لیے ہامی بھرلی۔ شادی سے پہلے میں نے لڑکے کو دیکھا تھا۔ بظاہر ٹھیک ٹھاک تھا۔ اچھی جاب تھی۔

شادی ہوگئی۔ مجھے اپنے شوہر سے کوئی شکایت نہیں تھی لیکن میں مطمئن بھی نہیں تھی۔ وہ بہت کم گو تھے۔ کبھی بھی انہوں نے کسی لگاؤ یا محبت کا اظہار نہیں کیا۔ اگر میں ایک گھنٹہ بولتی رہتی تو جواب میں ہوں، ہاں کے سوا کچھ نہ کہتے۔ میں ان کی سرد مہری کی وجہ کبھی نہ جان پائی۔ شادی کے دو سالہ عرصے میں انہوں نے مشکل سے دس بیس روٹین کے جملے بولے ہوں گے۔ زندگی اسی طرح گزر جاتی، لیکن ایک دن ”اس“ کا فون آگیا۔ اس نے میری دوست سے فون نمبر لیا تھا۔ پہلے تو میں نے اس سے بات کرنے سے ہی انکار کردیا، لیکن وہ بار بار فون کرتا رہا تو میں نے مجبور ہوکر بات کرلی۔ اس نے بتایا کہ اس نے جلد پیسہ حاصل کرنے کے لیے دبئی میں سٹہ کھیلا تھا وہ ہار گیا تو

پیسے نہ دینے پر اسے جیل جانا پڑا۔ شرمندگی کی وجہ سے وہ یہاں کسی سے رابطہ نہ رکھ سکا۔ اس نے کہا۔ وہ آج بھی مجھ سے اتنی ہی شدید سے محبت کرتا ہے، میں اگر اپنے شوہر سے طلاق لے لوں تو وہ مجھ سے شادی کر لے گا۔

اگر میں اپنے شوہر سے مطمئن ہوتی تو شاید اس کی باتیں نظرانداز کر دیتی۔ اس کی باتوں نے میرے دل میں پرانی محبت جگا دی۔ اب میں اپنے شوہر سے طلاق لینا چاہتی ہوں لیکن ڈرتی بھی ہوں۔ کیا کروں؟

ج:۔ اچھی بہن! ہوش کے ناخن لیں۔ آپ کا تعلق ایک مڈل کلاس پڑھے لکھے گھرانے سے ہے۔ بہنیں اور بہنوئی ہیں، بھائی بھاوجیں ہیں۔ ان سب کے بچے ہیں۔ آپ اتنے رشتوں میں بندھی ہیں۔ کسی معقول وجہ کے بغیر شوہر سے طلاق لیں گی تو یہ سب آپ کو کس نظر سے دیکھیں گے۔ پھر اس کی کیا ضمانت ہے کہ وہ آپ کو اپنا لے گا۔ اگر آپ غور کریں تو شروع سے اس کا رویہ غیر ذمہ دارانہ رہا ہے۔ پہلے تعلیم کا بہانا، پھر بہنوں کی شادی نہ ہونے کا بہانا۔ اس کے بعد کہیں جم کر جاب نہ کی۔ باہر گیا تو پلٹ کر آپ کی خبر نہ لی اب جب کہ آپ کی شادی ہو چکی ہے تو وہ آپ کا گھر تباہ کرنے کے چکر میں ہے۔

آپ کوئی نوجوان لڑکی نہیں ہیں کہ اس کی لچھے دار گفتگو سن کر اپنا گھر اُجاڑنے پر تُل گئی ہیں۔ اچھی خاصی عمر کی خاتون ہیں۔ زندگی اتنی ارزاں چیز نہیں ہے کہ اس کو اتنے غیر سنجیدہ رویوں کی نذر کر دیا جائے۔ جس راستے پر آپ چل رہی ہیں، اس کی کوئی منزل نہیں۔ اول تو وہ آپ سے شادی نہیں کرے گا۔ بالفرض بحال اس نے شادی کر لی تو اس کا جو غیر ذمہ دارانہ رویہ ہے۔ اس کے ساتھ آپ تو کیا کوئی بھی لڑکی خوش نہیں رہ سکتی۔ بہتر یہ ہے کہ آپ اس کو صاف جواب دے دیں اور آئندہ بھی اس سے بات نہ کریں۔

جہاں تک شوہر کی سرد مہری اور کم گوئی کا تعلق ہے تو یہ ان کا مزاج ہے۔ ممکن ہے آپ کی زندگی میں کوئی بچہ شامل ہو جائے اور وہ باپ بن جائیں تو ان کا مزاج بھی تبدیل ہو جائے۔

صفیہ اعظم......لیہ

س:۔ ہماری شادی کو پچیس سال گزر چکے ہیں۔ میرے چار بچے ہیں۔ دو بیٹے، دو بیٹیاں۔ میرے شوہر سعودیہ میں ملازمت کرتے تھے۔ شادی کے فوراً بعد چلے گئے تھے۔ یہاں ایک بات بتا دوں کہ میرے شوہر کا تعلق ایک بہت غریب گھرانے سے تھا۔ میرے والدین بھی محنت مزدوری کرتے تھے۔ میرے شوہر بہت محنتی تھے۔ وہ اپنے حالات بدلنا چاہتے تھے۔ انہوں نے الیکٹریشن کا کورس کیا اور سعودیہ چلے گئے۔ جس کمپنی میں کام کرتے تھے، وہ انہیں سال میں ایک ماہ کی چھٹی دیتی تھی۔ یہ ہر سال آتے تھے۔ پانچ سال بعد ملازمت چھوڑ دی تو انہوں نے کفیل کے ساتھ کام شروع کیا۔ وہ انہیں آنے نہیں دیتا تھا۔ تین چار سال بعد پندرہ دن کے لیے آتے۔ اب سعودیہ کے حالات خراب ہو گئے ہیں تو یہ مستقل لوٹ آئے ہیں۔ ہمارے بچے اچھی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ بڑا بیٹا ماشاءاللہ ڈاکٹر بننے والا ہے۔ دوسرا بیٹا کمپیوٹر سائنس میں ماسٹرز کر رہا ہے۔ بیٹیوں کے رشتے بھی ہو چکے ہیں۔ کوئی مسئلہ نہیں ہے، لیکن میرے شوہر یہاں ایڈجسٹ نہیں کر پا رہے ہیں۔ ہر وقت بچوں پر تنقید کرتے ہیں، کسی کا ہنسنا بولنا انہیں گوارا نہیں، معمولی شور پر غصہ کرنے لگتے ہیں۔ گھر میں بچوں کا کوئی دوست ملنے آ جائے تو ان کا رویہ انتہائی خراب ہوتا ہے۔ بچے ان کی موجودگی میں سہمے سہمے رہتے ہیں۔ میرے بیٹے ان سے بہت ادب اور احترام کا رویہ رکھتے ہیں، لیکن میں ہر وقت ڈرتی رہتی ہوں کہ ان کا پیمانہ صبر لبریز نہ ہو جائے اور وہ باپ کے دوبدو نہ ہو جائیں۔

ج:۔ آپ کے شوہر نے ایک طویل عرصہ گھریلو ماحول سے دور تنہائی میں گزارا ہے۔ وہ گھر کی ذمہ داریوں، دوست احباب اور رشتہ داروں سے بھی دور رہے ہیں۔ پردیس میں رہنے والوں کی کوئی معاشرتی زندگی

نہیں ہوتی صبح اٹھ کر کام پر جانا اور واپس آ کر جیسا تیسا کھا کر سو جانا۔ اب وہ واپس آ گئے اور فی الحال کوئی کام بھی نہیں کر رہے ہیں۔ ان کے لیے وقت گزاری بھی ایک بڑا مسئلہ ہے۔ وہ اس گھریلو اور معاشرتی زندگی کو ذہنی طور پر قبول نہیں کر پا رہے ہیں۔ ضروری ہے کہ ان کے لیے کوئی مصروفیت ڈھونڈی جائے۔ کسی کام میں مصروف رہیں گے تو مزاج میں خود بخود تبدیلی آ جائے گی۔

م۔ک......بسم اللہ پور

میں نے پہلے بھی آپ کو اپنے بیٹے کے بارے میں بتایا تھا کہ اسے دورے پڑتے ہیں (اب تو نہیں پڑتے) علاج جاری ہے۔ اس کا دھیان اب ہم نے کمپیوٹر کی طرف لگا دیا ہے۔ چلو کچھ نہ کچھ تو سیکھ لے گا نا۔ بے کار بیٹھنے سے تو بہتر ہے، لیکن اب عجیب سی الجھن پیدا ہو گئی ہے۔ بیٹا جو چیز خواب میں دیکھتا ہے یا تصور کرتا ہے، اسے حقیقت سمجھتا ہے۔ ہمارے سمجھانے پر بھی ایک انچ اپنے موقف سے پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں ہوتا۔ مثلاً خالہ نے میرے کان میں ریت ڈالنے کی کوشش کی۔ فلاں ماموں نے مجھے سمندر میں ڈبونے کی کوشش کی۔ فلاں کزن نے مجھے شادی کی آفر کی۔ فلاں کی اماں نے مجھے اپنی بیٹی سے شادی کرنے کو کہا۔ یہ تو ہم جانتے ہیں نا کہ ایک بچہ جس کی تعلیم بھی واجبی سی ہو، ڈھنگ کی نوکری بھی نہ ہو۔ صرف شکل و صورت کے بل بوتے پر بھلا کون ایسی پیشکش کر سکتا ہے۔ غصہ آ جائے تو کنٹرول نہیں کر پاتا۔ اچھے برے کی تمیز بھول جاتا ہے۔

ج:۔ آپ کا بیٹا جس کیفیت کا شکار ہے وہ شیزوفرینیا کی ایک قسم ہے اس بیماری میں مریض طرح طرح کی آوازیں سنتا ہے اور جو کچھ سنتا ہے اسے سچ سمجھتا ہے، یہ بیماری لاعلاج نہیں۔ اگر باقاعدگی سے دوائیں لی جائیں تو آپ کے بیٹے کی ذہنی کیفیت بہتر ہو سکتی ہے۔ علاج جاری رکھیں۔

ق۔ن۔ڈیرہ

میں ان دنوں بہت زیادہ ٹینشن میں ہوں۔ خود کو مصروف رکھتی ہوں، لیکن پھر بھی مجھے ایسا لگتا ہے زندگی ایک زہر کا پیالہ ہے جو میرے سامنے رکھ دیا گیا ہے اور وہ مجھے پینا ہے چاہے دیر سے یا جلدی۔ میں نے زندگی میں ہر وہ بات سہی جو میں نے اپنے لیے ناپسند کی ہو، مجھے یہ بھی معلوم ہے میری زندگی میں روشن صبح کبھی نہیں آئے گی ہر دن کے ساتھ مجھے لگتا ہے میری رات مزید کالی ہوتی جا رہی ہے بھیانک رات۔ میری عمر انتیس سال ہے سنگل ہوں، دو مرتبہ خودکشی کرنے کی بھی کوشش کر چکی ہوں۔ آپ انجان ہیں اس لیے میں اپنے دل کی بات آپ سے کر رہی ہوں ورنہ کوئی کتنا بھی قریبی دوست ہو — میں اس سے اپنے دل کا حال بیان نہیں کر سکتی۔

میں کبھی اتنی بدتمیز بھی ہو جاتی ہوں۔ گھر والوں کے ساتھ کہ لحاظ بھی نہیں رہتا۔ میرے دل میں ان کے لیے بہت شکوے ہیں، لیکن بعد میں خود کو گناہ گار محسوس کرتی ہوں کہ ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا تو خود سے مزید نفرت ہوتی ہے۔

ج:۔ پیاری بہن! اگر آپ ذہنی انتشار کا شکار ہیں تو یقیناً اس کی بہت سی وجوہات ہوں گی۔ جو کچھ آپ محسوس کرتی ہیں، اس کا کوئی ایک سبب یا وجہ نہیں ہو سکتی۔ بہت ساری باتیں جمع ہو جاتی ہیں تو انسان کی قوت برداشت جواب دے جاتی ہے۔ گھر والوں کے ساتھ آپ کا رویہ خراب ہے تو یقیناً اس کی بھی کچھ وجوہات ہوں گی۔ اسی طرح زندگی سے نفرت اور بے زاری کے پیچھے کئی ناکامیاں ہو سکتی ہیں۔ بہتر ہو گا کہ آپ تفصیل سے خط لکھیں اور بتائیں کہ اب تک آپ نے کیا کچھ برداشت کیا ہے جس کی وجہ سے آپ کا ذہن بکھر کر رہ گیا ہے۔ بہت سی تکلیفیں صرف کہہ دینے سے، بیان کرنے سے دور ہو جاتی ہیں۔ فی الحال آپ کسی اچھے سائیکاٹرسٹ سے مشورہ کریں، وہ آپ کو ذہنی سکون کے لیے دوائیں دے گا تو آپ بہتر محسوس کریں گی۔

☆

امت الصبور

بیوٹی بکس

فوزیہ سلیم...... جہلم

س: ۔ میرے بھائی کی شادی ہے۔ ہم لوگ بیوٹی پارلر نہیں جاسکتے گھر پر ہی میک اپ کرتے ہیں۔ پلیز آپ مجھے میک اپ کے بارے میں کچھ بتائیں۔ بھائی دوبئی سے میک اپ کا سامان لائے ہیں۔ اس میں بلشن آن بھی ہے'اسے کیسے لگایا جاتا ہے۔

ج: ۔ میک اپ میں سب سے پہلے فاؤنڈیشن لگایا جاتا ہے'اسے بیس کہتے ہیں۔ اس کو اچھی طرح لگانا ضروری ہوتا ہے۔ یہ چہرے کے ہر حصے پر یکساں بلینڈ ہونا چاہیے'بلش آن بیس لگانے کے بعد لگایا جاتا ہے۔

بلش آن لگاتے ہوئے آپ بھرپور انداز میں مسکرائیں' اب رخسار کی ہڈی کا جو حصہ سب سے ابھر رہا ہو اور سب سے اوپر ہو' وہاں سے بلش آن لگانا شروع کریں۔ بلش آن اگر کریم ہے تو اسے پہلے اپنی انگلیوں کے پوروں پر لگائیں۔ پھر انگلیوں کی مدد سے گالوں پر لگائیں۔

اگر پاؤڈر بلش آن ہے تو برش پر لگائیں۔ اضافی پاؤڈر کو اپنے چہرے پر لگانے سے قبل ذرا سا جھٹک کر جھاڑیں۔ اس کے بعد برش گالوں پر پھیرتے ہوئے نفاست سے بلش آن لگائیں۔ یہ دھیان رکھیں کہ بلش آن زیادہ مقدار میں نہ لگائیں۔ زیادہ مقدار میں لگانے سے آپ بڑی عمر کی نظر آئیں گی۔

نازیہ سحر...... کراچی

س: ۔ موسم سرما میں میرے بال بالکل روکھے اور خشک ہو جاتے ہیں۔ تیل لگانے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بس بال چپچپے سے نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ بالوں کی نوکیں پھٹ گئی ہیں۔ وہ دومونہے والے ہو گئے ہیں۔

ج: ۔ خشک موسم میں بال عموماً زیادہ خشک نظر آتے ہیں۔ بالوں کے روکھے پن کو دور کرنے کے لیے دہی بہترین کنڈیشنر ہے۔ آپ درج ذیل نسخے پر عمل کریں۔ بالوں کا روکھا پن دور ہو جائے گا۔

دہی	چوتھائی کپ
بادام کا تیل	ایک چمچہ
انڈا	ایک عدد (اچھی طرح پھینٹ لیں)

ان سب چیزوں کو اچھی طرح مکس کرلیں اور اپنے بالوں پر لگالیں۔ آدھا گھنٹہ لگا رہنے دیں۔ پھر شیمپو کرلیں۔ بالوں میں چمک آجائے گی اور ان کا روکھا پن بھی دور ہو جائے گا۔

دومونہے بالوں کے لیے پپیتے اور دہی کا مکسچر بہترین ہے۔ پپیتے کا چھلکا اتار لیں۔ اس کے گودے کو اچھی طرح چھان لیں۔ چار چمچے گودے میں دو چمچے دہی ملالیں اس کو ہموار پیسٹ بنالیں۔ اس مکسچر کو بالوں پر لگالیں۔ ایک گھنٹہ لگا رہنے دیں۔ پھر بالوں کو شیمپو سے دھو کر صاف کرلیں۔

عظمیٰ امین...... فیصل آباد

س: ۔ میرے چہرے کی جلد خشک ہے۔ موسم بدلتے ہی یہ کچھ زیادہ ہی خشک نظر آنے لگتی ہے جس کی وجہ سے میں اپنی عمر سے بڑی نظر آتی ہوں۔ چہرہ میلا میلا بھی لگتا ہے۔

ج: ۔ ایک بہت آسان سا نسخہ ہے۔ آپ ایک کھانے کا چمچہ زیتون کا تیل لیں اس میں ایک چمچہ بالائی یا کریم ملالیں۔ اس پیسٹ کو اچھی طرح چہرے پر لگائیں۔ دس منٹ بعد گرم پانی میں ڈوبے ہوئے روئی کے پھاہے سے صاف کریں۔ چہرے کی خشکی بھی دور ہو جائے گی اور چہرے پر چمک بھی آجائے گی۔

کسی بھی پھل (سنگترہ' کیلا' تربوز' پپیتا' سیب) کا گودا لے لیں۔ اسے چہرے پر لگائیں۔ دس منٹ بعد چہرہ دھولیں۔ پھلوں کا گودا جلد صاف کرتا ہے۔ مساموں کو بند کرتا ہے اور دوران خون بڑھاتا ہے۔

ہفتہ میں ایک بار یہ ماسک لگائیں۔